خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

جنوری 2013

خواتین ڈائجسٹ

سالِ نو نمبر



جنوری 2013
جلد 40 شمارہ 9
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2013ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
2012ء بھی وقت کے بہتے سمندر کا حصّہ ہوا۔
وقت کا آغاز و انجام نامعلوم۔ جانے کب اس کا سفر شروع ہوا اور اس کا اختتام کہاں ہوگا — ؟ کوئی نہیں جان سکتا۔ ترقی و تنزلی، عروج و زوال، فتح و شکست کی بے شمار عبرت ناک داستانیں اپنے دامن میں سمیٹے وقت آگے ہی بڑھتا جارہا ہے۔ یہ داستانیں جو گئے زمانوں کی تاریخ کی صورت رقم ہیں اور آنے والے زمانوں کے لیے سبق۔
قرنوں سے جاری وقت کے اس تسلسل میں انسان مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پوری کائنات جو حیران کن حسن ترتیب رکھتی ہے، انسان کے لیے تخلیق کی گئی تو یقیناً انسان کی تخلیق کا بھی کوئی اعلا و ارفع مقصد ہوگا۔ انسان اس مقصد کو سمجھ لے زندگی کامیاب ٹھہرے گی۔
ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے آپ سب کو نیا سال مبارک۔
ہماری دعا ہے کہ نئے سال کا سورج ہم سب کے لیے امن، سلامتی، خوشحالی اور کامیابی لے کر آئے۔ آمین۔

انشاجی کی برسی،

انشاجی ایک شخصیت کتنے پہلو۔
بہترین مزاح نگار، خوبصورت شاعر، بے مثال کالم نگار — سفرنامے لکھے تو تخلیق کا ایک نیا روپ سامنے آیا۔ انشاجی کے کالم پڑھیے۔ وہ آج کے حالات کا آئینہ ہیں۔ زبان کی کاٹ، طنز کی تیزی، جملوں کی معنی آفرینی، شگفتگی اور شوخی کے ساتھ ساتھ نفاست اور شائستگی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔
ان کی شاعری محبتوں کے نرم اور کومل احساسات، ہجر کی کیفیت میں ڈھل کر گہری، سلگتی آنچ دیتی دھیما دھیما سوز جگاتی ہے۔
انشاجی نے سارے جہاں کا سفر کیا، سفرنامے لکھے پھر 11 جنوری 1978ء کو ایسے سفر پر چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں لوٹتا۔
انشاجی دنیا سے چلے گئے لیکن ان کی تحریریں، ان کی شاعری انہیں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

اس شمارے میں،

- سائرہ رضا کا مکمل ناول — آنے والا ہے برف کا موسم،
- تیرے میرے درمیان — مہوش افتخار کے ناول کی دوسری اور آخری قسط،
- زمین کے آنسو — نگہت سیما کا ناول،
- ہم سے ہے زمانہ — ثمرہ بخاری کا ناولٹ،
- راشدہ رفعت، اُمِ ثمامہ اور ایلیا یقین کے افسانے،
- باتیں سجل علی سے، ٹی وی فنکارہ نیلم منیر سے ملاقات،
- نئے سال کی دہلیز پر — قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے،

نئے سال کا پہلا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط لکھ کر ضرور بتائیے گا۔ ہم آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امتِ مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

نیکی

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دروازے پر دو جھگڑنے والوں کی اونچی آوازیں سنیں۔
ان میں سے ایک دوسرے سے قرضے میں کمی اور کچھ نرمی کا مطالبہ کررہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا "اللہ کی قسم! میں (یہ) نہیں کروں گا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس باہر تشریف لائے اور پوچھا۔
"وہ شخص کہاں ہے، جو اللہ پر قسم کھا رہا تھا کہ وہ نیکی نہیں کرے گا؟"
وہ شخص بولا کہ "میں ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!" (اور ساتھ ہی اس نے نرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا) "اور اسے (ان دونوں میں سے) اس چیز کا اختیار ہے جسے وہ پسند کرے۔ (یعنی قرض میں کچھ کمی کرالے یا مہلت لے لے۔)" (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل : 1۔ اس سے معلوم ہوا کہ تنگ دست مقروض کے ساتھ احسان کرنا مستحب ہے، یعنی کچھ قرض معاف کردے یا اس کو ادائیگی قرض میں (آسانی تک) مہلت دے دے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے
"اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو اسے آسانی تک مہلت دے دو اور اگر تم معاف ہی کردو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔"
2۔ کوئی شخص نیکی نہ کرنے کا ارادہ ظاہر کرے تو اسے سمجھایا جائے تاکہ وہ اپنا ارادہ ترک کرکے نیکی کرنے پر آمادہ ہوجائے۔
3۔ باہم جھگڑنے والوں کو یوں ہی نہ چھوڑ دیا جائے بلکہ ان کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کی جائے۔
4۔ جھگڑنے والوں کو بھی مصلحین کے ساتھ تعاون اور ان کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے۔

کمزور، فقیر اور گم نام مسلمانوں کی فضیلت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "اور اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ روک رکھیں جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور

شام' اس کی رضا کے طالب ہیں اور تیری آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں۔"

حضرت حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"کیا میں تمہیں جنتیوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر آپؐ نے خود ہی جواب دیا) ہر کمزور' جو کمزور سمجھا جاتا ہے' اگر وہ اللہ پر قسم کھالے تو اللہ اسے پوری کر دیتا ہے۔ کیا میں تمہیں جہنمیوں کی خبر نہ دوں؟ (پھر جواب دیا) ہر تند خو' سرکش' بخیل (یا اترا کر چلنے والا) اور متکبر شخص۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث میں ان کمزور' غریب اور گوشہ گمنامی لوگوں کی فضیلت کا بیان ہے' جن کو معاشرے میں کوئی امتیازی مقام حاصل نہیں ہوتا' لیکن وہ ایمان و تقویٰ کے ایسے بلند مقام پر فائز ہوتے ہیں کہ اگر اللہ کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم پوری فرمادیتا ہے۔

2۔ اس میں تواضع اور گمنامی کی فضیلت اور تکبر' بخل اور شہرت و ناموری کی ہوس کی مذمت ہے۔

جنت اور دوزخ

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جنت اور دوزخ میں جھگڑا ہوا۔ جہنم نے کہا۔ "میرے اندر سرکش اور متکبر انسان ہوں گے"

اور جنت نے کہا۔ "میرے اندر کمزور اور مسکین لوگ ہوں گے۔ چنانچہ اللہ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ فرمایا (جنت سے کہا' اے جنت! تو میری رحمت ہے' تیرے ذریعے سے میں جس پر چاہوں گا رحم کروں گا۔ (اور دوزخ سے کہا' اے جہنم! تو میرا عذاب ہے' میں تیرے ذریعے سے جسے چاہوں گا' عذاب دوں گا۔

تم دونوں کا بھرنا میری ذمہ داری ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ حدیث میں ضعیف و مساکین سے مراد وہ اہل ایمان و تقویٰ ہیں جو صبر و قناعت سے زندگی گزار دیتے ہیں لیکن دنیا کمانے کے لیے مکر و فریب سے کام نہیں لیتے۔ حدیث میں ان کے لیے بشارت ہے۔ ان کے برعکس اللہ کے احکام سے سرتابی کرنے والے جابر و متکبرین کے لیے جہنم کی وعید ہے۔ اب یہ انسان کی اپنی پسند ہے کہ وہ ان قسموں میں سے جس قسم میں چاہے اپنا شمار کروالے۔

2۔ جنت اور دوزخ کا یہ مکالمہ کوئی ناممکن بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ان کے اندر ادراک و شعور پیدا کر دینا' جس سے وہ باہم بحث و تکرار کریں' کوئی مشکل کام نہیں ہے' اس لیے اس قسم کی احادیث کی تاویل کی چنداں ضرورت نہیں ہے' انہیں اپنے ظاہر ہی پر محمول کیا جائے۔ یہ روایت مسند احمد (3/79) میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے زیادہ مفصل حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

روز قیامت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"یقیناً" قیامت والے دن موٹا تازہ بڑا آدمی آئے گا اللہ کے ہاں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں شان و شوکت کے ان مظاہر کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی جن کو اہل دنیا اہمیت دیتے ہیں۔ وہاں تو انسان کا ایمان' اخلاص اور تقویٰ دیکھا جائے گا اور اسی بنیاد پر اس کی قدر و قیمت ہو گی' اس لیے انسان کی اصل توجہ اپنے

دل کی اصلاح کی طرف ہونی چاہیے نہ کہ صرف پرورش جسم کی طرف۔

2۔ روز قیامت جہاں انسان کے اعمال تولے جائیں گے وہاں خود انسان کا وزن بھی ہو گا۔ جو شخص جتنا زیادہ متقی' پرہیزگار اور زاہد ہو گا اتنا ہی اس کا وزن زیادہ ہو گا۔ نیکیوں کے وزن کا زیادہ ہونا ہی باعث نجات ہے۔

روشنی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے

کہ ایک سیاہ فام عورت یا کوئی نوجوان مسجد میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔ (راوی کو شک ہے کہ وہ عورت تھی یا نوجوان) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے گم پایا تو اس کی بابت پوچھا۔ لوگوں نے بتلایا کہ وہ تو فوت ہو گیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تو تم نے مجھے اس کی اطلاع کیوں نہ دی؟" گویا لوگوں نے اس (کی وفات) کے معاملے کو حقیر گردانا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "مجھے اس کی قبر بتاؤ!"

چنانچہ لوگوں نے آپ کو اس کی قبر بتائی تو آپؐ نے اس پر نماز پڑھی' پھر فرمایا۔

"بے شک یہ قبریں' قبروں والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی ہیں' میرے ان پر نماز پڑھنے سے یقیناً" اللہ تعالیٰ یہ ان کے لیے روشن فرمادیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ بعض روایات کی بنیاد پر علماء نے اسی بات کو راجح قرار دیا ہے کہ جھاڑو دینے والی ایک عورت تھی۔

2۔ اس میں ایک تو مسجد کی صفائی کی فضیلت کا اور دوسرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال خلق و تواضع کا بیان ہے۔

3۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل خیر و صلاح کے جنازوں میں شرکت کرنی چاہیے اور شرکت سے محرومی کی صورت میں اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر بھی نماز جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔

غریب متقی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بہت سے پراگندہ' غبار آلود اشخاص جنہیں دروازوں ہی سے دھکیل دیا جاتا ہے' اگر اللہ پر قسم کھا لیں تو اللہ ان کی قسم پوری فرمادیتا ہے۔" (مسلم)

فائدہ :

اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان کو گندے کپڑے پہننے اور پراگندہ بال رکھنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ شریعت نے صفائی کو پسند کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی صاف رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے' ایسے لوگ جن کا لباس یا حلیہ زیادہ بارعب' قیمتی نہیں ہوتا اور نہ معاشرے میں ان کا کوئی وقار ہی ہوتا ہے اور زہد کی وجہ سے اچھے لباس کا اہتمام بھی نہیں کرتے' تاہم ان کے تقویٰ اور شرعی احکام کی پابندی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضرور پوری فرماتا ہے۔

کلام

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"گہوارے میں صرف تین (بچوں) نے کلام کیا۔" عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام' بنی اسرائیل کے ایک بچے نے اور صاحب جریج رحمتہ اللہ نے۔

جریج ایک عبادت گزار آدمی تھے۔ انہوں نے ایک کٹیا (عبادت کے لیے جھونپڑی) بنائی ہوئی تھی۔ (ایک روز) وہ اس میں تھے کہ ان کی والدہ ان کے پاس آئیں جب کہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

والدہ نے آواز دی۔ "اے جریج!"

تو جریج نے (دل میں) کہا۔

"اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں (مصروف ہوں)۔"

وہ نماز ہی میں متوجہ رہے، چنانچہ ان کی والدہ واپس چلی گئیں۔

دوسرے دن وہ پھر آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آواز دی۔

"اے جریج"

انہوں نے (پھر دل میں) کہا "اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں ہوں۔"

چنانچہ وہ نماز ہی میں متوجہ رہے (اور والدہ چلی گئیں۔)

تیسرے دن وہ پھر آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ انہوں نے آکر کہا۔

"اے جریج!"

انہوں نے (دل میں) کہا۔

"اے میرے رب! میری ماں (مجھے بلا رہی ہے) اور میں نماز میں ہوں۔" وہ نماز ہی میں متوجہ رہے۔

ان کی والدہ نے (انہیں بددعا دیتے ہوئے) کہا۔

"اے اللہ! اسے اس وقت تک موت نہ دینا جب تک یہ بدکار عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے۔"

چنانچہ بنی اسرائیل، جریج اور ان کی عبادت کا چرچا کرنے لگے۔ (ان میں) ایک بدکار عورت (بھی) تھی جس کے حسن و جمال کی مثال دی جاتی تھی۔

اس نے (بنی اسرائیل سے) کہا۔ "اگر تم چاہو تو میں اسے آزمائش میں ڈال دوں۔"

چنانچہ وہ عورت (سولہ سنگھار کرکے) ان کے سامنے آئی، لیکن انہوں نے اس کی طرف التفات نہیں کیا، تو وہ ایک چرواہے کے پاس آئی جس کا ان کی کٹیا میں آنا جانا تھا۔

اس عورت نے اپنے اوپر اس چرواہے کو قدرت دی اور جب اس کا بچہ پیدا ہوا تو دعوا کردیا کہ یہ جریج کا ہے۔

لوگ (یہ سن کر) جریج کے پاس آئے، انہیں کٹیا سے نیچے اتارا۔ ان کی کٹیا کو گرادیا اور انہیں مارنا پیٹنا شروع کردیا۔

انہوں نے پوچھا۔

"بات کیا ہے؟ (تم کیوں میرے ساتھ ایسا معاملہ کر رہے ہو؟)"

انہوں نے کہا۔ "تو نے اس فاحشہ کے ساتھ بدکاری کی ہے اور اس نے تیرا لڑکا بھی جنا ہے۔"

انہوں نے پوچھا! "بچہ کہاں ہے؟"

چنانچہ وہ بچہ اٹھا کر لائے۔ انہوں نے کہا۔

"مجھے چھوڑ دو، میں نماز پڑھ لوں۔" انہوں نے نماز پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر بچے کے پاس آئے اور اس کے پیٹ میں کچوکا لگایا اور اس سے پوچھا۔

"اے لڑکے! تیرا باپ کون ہے۔"

اس نے جواب دیا۔ "فلاں چرواہا۔"

چنانچہ سب لوگ جریج کی طرف متوجہ ہوئے، انہیں (عقیدت سے) بوسہ دیتے اور چھوتے اور انہوں نے کہا۔

"ہم تیری کٹیا سونے کی بنا دیتے ہیں۔"

انہوں نے کہا۔ "نہیں، اسے اسی طرح مٹی کی بنا دو جیسے پہلے تھی۔" چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

(اب تیسرے بچے کا ذکر، جس نے گہوارے میں گفتگو کی۔)

ایک دفعہ ایک بچہ اپنی ماں کا دودھ پی رہا تھا کہ ایک شخص گزرا جو تیز رفتار گھوڑے پر سوار اور عمدہ پوشاک پہنے ہوئے تھا۔ بچے کی ماں نے کہا۔

"یا اللہ! میرے بچے کو (بھی) اس جیسا بنانا۔"

بچہ دودھ پینا چھوڑ کر اس شخص کی طرف متوجہ ہوا اور اسے دیکھا اور کہا۔

"اے اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا۔" پھر (دوبارہ) دودھ پینا شروع کردیا۔

"(حدیث کے راوی بیان کرتے ہیں) گویا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دیکھ رہا ہوں کہ

آپ اس کے دودھ پینے کی کیفیت، اپنی انگشت شہادت منہ میں ڈال کر اور اسے چوس کر، بیان فرما رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کچھ دیر بعد لوگ ایک کنیز کو مارتے ہوئے گزرے اور کہتے تھے۔" "تو نے بدکاری اور چوری کی ہے"

اور وہ کہتی تھی۔

"مجھے میرا اللہ کافی ہے اور وہ اچھا کارساز ہے۔"

بچے کی ماں نے (پھر) دعا کی۔

"اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا نہ کرنا۔"

(یہ سن کر) بچے نے دودھ پینا چھوڑ کر اس لونڈی کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اے اللہ! مجھے اس جیسا (ہی) کرنا۔"

اس کے بعد ماں بیٹے میں گفتگو ہوئی۔

ماں نے کہا۔ "ایک خوش اطوار آدمی گزرا اور میں نے دعا کی اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا بنانا، تو تو نے اس کے برعکس کہا کہ یا اللہ! مجھے اس جیسا نہ بنانا اور لوگ اس لونڈی کو لے کر گزرے جسے کچھ لوگ مار رہے تھے اور اسے کہہ رہے تھے کہ تو نے بدکاری اور چوری کی ہے تو میں نے دعا کی کہ اے اللہ! میرے بیٹے کو اس جیسا نہ کرنا تو تو نے کہا "اے اللہ! مجھے اس جیسا (ہی) کرنا۔ آخر یہ کیا بات ہے؟"

بچے نے کہا۔ "وہ (حسین و جمیل گزرنے والا) شخص بڑا سرکش تھا، لہٰذا میں نے دعا کی یا اللہ مجھے اس جیسا نہ بنانا اور یہ لونڈی جسے لوگ کہہ رہے تھے کہ تو نے بدکاری کی ہے، حالانکہ اس نے بدکاری نہیں کی تھی (اور کہتے تھے کہ) تو نے چوری کی ہے، حالانکہ اس نے چوری نہیں کی تھی، تو میں نے دعا کی یا اللہ! مجھے اس جیسا (پارسا) بنانا۔" (بخاری و مسلم)

سوال و جواب۔ واللہ اعلم۔

فوائد و مسائل :

1۔ اس حدیث میں صرف تین بچوں کے گہوارے میں گفتگو کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد بنی اسرائیل کے تین بچے ہیں کیونکہ صحیح مسلم کی حدیث سے ان کے علاوہ بھی اصحاب الاخدود کے قصے میں بچے کا بولنا ثابت ہے۔

2۔ نفلی نماز کے مقابلے میں ماں باپ کی پکار کو اہمیت دی جائے۔

3۔ نیک لوگوں کے لیے کرامت ثابت ہے۔

4۔ مومن پر بعض دفعہ بڑی بڑی آزمائشیں آتی ہیں، ایسے موقعوں پر صبر و استقامت ضروری ہے، بالآخر اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی مدد فرماتا ہے۔

5۔ متکبرین اور ان کی مشابہت سے بچا جائے، چاہے ان کا ظاہر کتنا بھی حسین و جمیل ہو اور نیک لوگوں کے طور اطوار اختیار کیے جائیں کہ کامیابی اس میں ہے۔

جہنم میں

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ جب خیبر والا دن ہوا (یعنی جنگ خیبر ہوئی) تو اصحاب رسول میں سے کچھ آدمی آئے اور انہوں نے کہا کہ فلاں شخص شہید ہے اور فلاں شہید ہے، حتیٰ کہ ایک آدمی کے پاس سے وہ گزرے تو کہا "فلاں (بھی) شہید ہے۔ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہرگز نہیں، میں نے ایک چادر کی وجہ سے، جو اس نے چرائی تھی، اسے جہنم میں دیکھا ہے۔" (مسلم)

فائدہ :

معلوم ہوا کہ حقوق العباد، شہادت سے بھی معاف نہیں ہوں گے، نیز مسلمانوں کے مشترکہ مال (قومی خزانے) میں خیانت بہت بڑا جرم ہے۔

انشاءجی کی رجائیت کا ایک پہلو

شازیہ عنبرین



"بیمار کا حال اچھا ہے"

اب عمر کی نقدی ختم ہوئی
اب ہم کو ادھار کی حاجت ہے
ہے کوئی جو ساہوکار بنے؟
ہے کوئی جو دیون ہار بنے؟
کچھ سال، مہینے، دن لوگو
پر سود بیاج کے بن لوگو
ہاں اپنی جاں کے خزانے سے
ہاں عمر کے توشہ خانے سے
جب نام ادھار کا آیا ہے
کیوں سب نے سر کو جھکایا ہے
ہم مانگتے نہیں ہزار برس
دس پانچ برس، دو چار برس
آسان بنے، دشوار بنے
پر کوئی تو دیون ہار بنے
ہم بیٹھے ہی کشکول لیے
سب عمر کی نقدی ختم کیے

اب گیت گیا سنگیت گیا
ہاں شعر کا موسم بیت گیا
اب پت جھڑ آئی، پات گریں
کچھ صبح گریں، کچھ رات گریں
یہ اپنے یار پرانے ہیں
اک عمر سے ہم کو جانے ہیں
ان سب کو ہم نے بلایا ہے
اور جھولی کو پھیلایا ہے
جب عمر کا آخر آتا ہے
ہر دن صدیاں بن جاتا ہے
جینے کی ہوس ہی نرالی ہے
ہے کون جو اس سے خالی ہے
یہ پانچ برس، یہ چار برس
چھن جائیں تو لگیں ہزار برس

سب دوست گئے، سب یار گئے
تھے جتنے ساہوکار گئے

اڑتیس شعروں پر مشتمل یہ طویل نظم ابن انشاء (1927-1978ء) نے ٹوکیو میں قیام کے دوران 29 نومبر 1976ء میں لکھی اور مجلّہ "فنون" لاہور میں اشاعت کے لیے بھیجی۔ جب یہ نظم "فنون" میں چھپی تو انشاءجی کے چاہنے والے ان کے دوست، ان کے مداح بری طرح آزردہ ہوئے، ان کے دل تڑپ کر رہ گئے۔ یہ تو سیدھا سادا ایک "نوحہ" تھا جو انشاء نے خود اپنے لیے لکھا تھا۔ جب ان چاہنے والوں کے پیار بھرے گلے شکوے انشاء تک پہنچے تو انہوں نے یہ مضمون لکھا "بیمار کا حال اچھا ہے۔" یہ انشاء کا آخری مضمون ہے، جو انہوں نے اس وقت لکھا جب ڈاکٹروں نے انہیں لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ لیکن جب ہم یہ مضمون پڑھتے ہیں تو اس میں ہمیں وہی انشاء ملتا ہے، ہنستا مسکراتا ہوا، جس کے بارے میں شفیق الرحمٰن کہتے ہیں۔

"ابن انشاء کی کتاب ہو، رسالے میں مضمون ہو یا اخبار میں کالم، ان کا نام پڑھتے ہی ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے کہ اب یہ ہنسائیں گے، پھر وہ ہنساتے ہیں اور خوب ہنساتے ہیں۔"

"بیمار کا حال اچھا ہے۔" بھی ایسا ہی مضمون ہے۔ حالانکہ یہ مضمون انہوں نے اسپتال کے بیڈ پر بیٹھ کر لکھا اور ان پر یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ ان کا مرض لاعلاج ہے اور اب وہ زیادہ دن نہیں جئیں گے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی تحریر میں خود رحمی کی کوئی جھلک ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی۔ وہ پر امید ہیں اور اپنے قاری کو بھی امید اور تسلی دے رہے ہیں۔ مایوسی اور قنوطیت کے بجائے وہی شگفتہ انداز تحریر ہے جو ہمیں ان کے دوسرے مضامین میں ملتا ہے اور جو ان کی خاص پہچان ہے۔

ابن انشاء نے یہ مضمون موت کے سائے میں بیٹھ کر لکھا اور ان لمحات میں بھی ان کی آنکھوں میں زندگی کی چمک اور لبوں پر دل فریب مسکراہٹ ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔ ایک خالص مزاح نگار کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے کہ کیا وہ اس حالت میں بھی اعلا مزاح لکھ سکتا ہے، جب زندگی اپنی بھیانک ترین شکل میں اس پر حملہ آور ہو، اور انشاءجی اس آزمائش میں پورے اترے ہیں۔ شگفتگی کی ایک لہر ہے جو اس مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک موجود ہے۔

خالص مزاح کے لیے تین چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔

(1) ذہانت (2) ہمدردی (3) قوت برداشت

ان تین چیزوں کے بغیر مزاح لکھنا ممکن نہیں، جبکہ ابن انشاء کے یہاں یہ تینوں چیزیں اپنی صحت کے ساتھ موجود ہیں اور اس کا سب سے بڑا ثبوت ان کا زیر نظر مضمون "بیمار کا حال اچھا ہے" میں ہمیں ملتا ہے۔

"بیمار کا حال اچھا ہے" دراصل ایک تفصیلی خط ہے ان چاہنے والے مداحوں کے نام جو انشاءجی کی نظم "اب عمر کی نقدی ختم ہوئی" پڑھ کر دل گرفتہ ہوئے تھے۔ اس مضمون میں انشاءجی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ۔

"فنون" میں ہماری نظم "اب عمر کی نقدی ختم ہوئی" پڑھ کر بہت سے ہمارے دوست اور ہمدرد اور محبت کرنے والے آزردہ ہوئے اور ہمیں خط لکھے۔ اسے اتنی اہمیت نہ دینی چاہیے۔ ہم نے اپنی زندگی کے نفع نقصان کا گوشوارہ بنایا تو دیکھا، کسی طرح گھاٹے میں نہیں رہے ہمیشہ اپنے حق سے زیادہ پایا۔

لہجے میں رجائیت کا عنصر غالب ہے۔ پورے مضمون میں شروع سے لے کر آخر تک رجائی انداز نمایاں ہے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے نمائندے ان کا آخری انٹرویو لینے لندن آئے۔ انشاءجی اس کا ذکر کس قدر شگفتہ انداز میں کرتے ہیں، ملاحظہ ہو۔

"ہمیں معلوم تھا کہ خوش خیالی میں ایسا کر رہے ہیں۔ جی ہی جی میں ہنستے رہے۔ ان کا دل کیا توڑتے، مگر

ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے قومی ادارے پاکستان ٹیلی ویژن کے یہ پیسے ضائع جائیں گے' بلکہ اس انٹرویو کے دکھائے جانے کی حسب حال خواہ تقریب جلد نکلی تو شاید ان کی بازپرس بھی ہو۔"

لفظوں میں رجائی کھنک نمایاں ہے۔ لفظی مزاح کے سارے حربے ابن انشاء نے بڑی خوبی کے ساتھ مکمل مہارت سے اس مضمون میں استعمال کیے ہیں۔ لفظی مزاح' واقعاتی مزاح' پیروڈی' تقابل و تطابق کے ذریعے مزاح کا انداز۔ غرضیکہ صحت مند مزاح کی ساری صورتیں ہمیں اس مضمون میں ملتی ہیں۔

اسپتال میں موجود مختلف مریض کس طرح اپنی بیماری کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کرتے ہیں۔ تاکہ دوسرے مریضوں سے سبقت لے جائیں اور جب کسی مریض نے حسب عادت انشاء جی سے پوچھا ان کے مرض کے بارے میں تو انشاء جی اپنے مرض کی تشریح بڑے خوب صورت اور شگفتہ انداز میں اس طرح کرتے ہیں۔

"ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑا سا غم جاناں ہے۔ یہ مرض ایشیا میں خاص کر ہمارے ملک میں زیادہ ہوتا ہے اور وبائی ہے۔ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گا اس کی علامات بھی نثر میں بتانے سے لطف نہیں اور شاعری کا ترجمہ ہم سے نہیں ہوتا۔"

ابن انشاء نے اس مضمون میں لندن کے اسپتالوں' وہاں کی سہولیات' نرسوں اور ڈاکٹروں کا تقابل پاکستانی اسپتالوں سے نہایت اچھوتے انداز میں کرکے لطیف مزاح پیدا کیا ہے۔

"بستر کی پائنتی میں کئی بٹن ہیں۔ بے ارادہ کسی بٹن پر ہاتھ پڑ گیا تو مشین چلنی شروع ہو گئی اور سر نیچے ٹانگیں اوپر ہوتی چلی گئیں۔ شیطانی کارخانہ ہے۔ ہمارے ملک میں ہتھی گھما کر اوپر نیچے کرتے ہیں' لیکن اس سے زیادہ آزمودہ نسخہ یہ ہے کہ جس طرف سے پلنگ اوپر کرنا ہو ادھر پایوں کے نیچے اینٹیں رکھ دی جائیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اینٹیں وقت پر نہیں ملتیں۔ تب یہ کام کتابوں سے لیا جاتا ہے۔ ایک پائے کے نیچے "بہشتی زیور" دوسرے کے نیچے علی پور کا ایلی "آخر اللہ کر ذرا اونچا ہو جاتا ہے) یوں کتابیں بھی یکسر بے کار چیزیں نہیں ہیں۔ ان کا بھی کوئی نہ کوئی مصرف ہے۔"

اس طویل پیراگراف میں لفظی مزاح کی بھی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ لندن اور پاکستان کے اسپتالوں کا تقابل کرکے بھی مزاح پیدا کیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ لطیف قسم کا طنز بھی ہے اپنے لوگوں پر جو کتاب اور لفظ کی قدر و قیمت سے ناواقف ہیں۔ کتابوں کو بے مصرف سمجھنے کے بجائے اگر وہ ان سے بھرپور استفادہ کریں تو وہ اپنی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

انشاء جی کے ہاں "طنز" (Satire) اور "مزاح" (Humour) توازن کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ انشاء جی کے ہاں طنز کے تیکھے لیکن بے آواز نشتر ہیں جو ان کی تحریروں میں نوک دار سوئیوں کی طرح آویزاں ہوتے ہیں کہ وہ بظاہر نظر آئیں یا نہ آئیں' لیکن ان کی چبھن ضرور محسوس ہوتی ہے۔ انشاء جی کے باغ و بہار اسلوب میں اس قدر شائستگی' نفاست اور خوش مزاجی برقرار رہتی ہے کہ نہ کسی کا دل دکھتا ہے اور نہ کسی فرد یا طبقے کے خلاف نفرت یا حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے نازک اور سنگین معاملات پر وہ ایسی بے ساختگی' شگفتہ طبعی اور چابک دستی سے نہایت کڑی تنقید' تنقیص یا طنز کا بھرپور وار کر جاتے ہیں کہ پرانے محاورے کے مطابق سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ بقول اشفاق احمد!

"اوروں پر ہنسنا' دوسروں کا خاکہ اڑانا اور طنز کی تیغ سے کشتوں کے پشتے لگانا بڑا آسان کام ہے۔ ہر متکبر اسی طرح کیا کرتا ہے' لیکن یہ مزاح نگار کا کام نہیں ہے۔ مزاح نگار تو انشاء جی ایسا ہوتا ہے کہ جس کے ریشے میں تکبر نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو۔ نہ اصل زندگی میں نہ تحریر کے وجود میں۔"

"بیمار کا حال اچھا ہے۔" میں ہمیں انشاء جی کے لطیف "شوگر کوٹڈ" طنز کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

مثلاً "ہمارے محکمہ پولیس اور اس کے کارناموں اور کام کرنے کے طریقوں کو کس خوب صورتی سے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔

"ہمارے اور ان لوگوں کے دین میں بڑا فرق ہے۔ ان کے پادری لوگ اعتراف گناہ کراتے ہیں۔ ہمارے ہاں تھانے دار وغیرہ۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ پادری کے سامنے برضا و رغبت اعتراف کیا جاتا ہے۔ مرچوں کی دھونی یا برف کی سل اور پولیس والوں کے محاورے اور روزمرہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

اس مضمون میں انشاء جی نے ان لوگوں کی ذہنیت کو بھی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے جن کا تکیہ کلام "پدرم سلطان بود" ہوتا ہے۔ جو اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں اور خود پر اور اپنے حال پر توجہ نہیں دیتے۔

"ٹھہریے کرسی پر بیٹھیے۔ میں محمد بن قاسم سے بات شروع کرتا ہوں کہ ہماری ہر بات وہیں سے شروع ہوتی ہے۔"

یہ ابن انشاء کا خاص انداز ہے کہ وہ پطرس کی طرح اپنی ذات کو ہدف بنا کر دوسروں کو خود پر ہنسنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ ایک سچا مزاح نگار اکثر اپنی ذات کے حوالے سے بات کرتا ہے۔ وہ اگرچہ ہر لحہ خارج پر نظر رکھتا ہے' لیکن جب موقع مطالبہ کرتا ہے تو اپنی ذات کو ہدف بنانے سے گریز نہیں کرتا اور دوسروں کو بھی اپنے آپ پر ہنسنے کی دعوت عام دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی افتاد طبع کی کشادگی اور وسعت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اپنے آپ پر ہنسنے کے لیے بڑے وقار اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ انشاء جی کی فنی چابک دستی یہ ہے کہ ان کی ذات پر ہنسنے والے کو جلد ہی یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ انشاء جی پر نہیں بلکہ خود اپنے آپ پر ہنس رہا ہے' انشاء جی کی تحریر کے آئینے میں جھلکنے والا عکس تو خود اس کا اپنا ہے۔

"ایک نرس کو ہم نے ایک اورنج' تین چار کیلے دیے اور کچھ انگور بھی تو اس نے از راہ شفقت ہمارے ماتھے کو چوم لیا' اگر ایک دو سیب اور ایک آدھ ناشپاتی بھی دے دیتے تو شاید اسے اس عمل کے لیے موزوں مقامات بھی معلوم ہو جاتے۔ یہ ہمارا قیاس اور خوش خیالی بھی ہو سکتی ہے۔ دراصل ہمارا ارادہ اس حکایت کو تھوڑے سے حسن بیان سے لذیذ تر بنانے کا تھا۔ آخر سب ہی لکھنے والے اپنے سفر ناموں اور اسپتال ناموں میں ایسا کرتے ہیں۔"

یہاں اپنی ذات کو ہدف بنا کر ایسے لکھنے والوں پر چوٹ کی ہے جو اپنی ذات کو اپنی تحریروں میں مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ایسا مبالغہ جس کا حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

اس مضمون "بیمار کا حال اچھا ہے" میں انشاء جی نے خواتین کے حوالے سے اور اس خاص طور پر نرسوں کے حوالے سے بے باک انداز میں گفتگو کی ہے۔ یہ بے باکی اس لیے بھی اس مضمون میں آئی ہے کہ جب کسی کو پتا چلے کہ اس کی زندگی کے آخری دن ہیں تو شعوری طور پر نہ سہی لاشعوری طور پر وہ یہ سوچتا ہے کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالوں۔ شاید انشاء جی کے لاشعور میں بھی یہی بات چھپی ہوئی تھی۔ کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے۔

"ہمارے بعض دوست جو اسپتال میں رہے ہیں رات میں کئی کئی بار مصنوعی تنفس لیا کرتے تھے' بلکہ ایسے ماہر ہوئے کہ خود نرسوں کو دیا کرتے تھے۔ بتاتے ہیں کہ اس سے بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ کوئی کام کا مسیحا نظر آیا تو ہم بھی یہ علاج آزما دیکھیں گے۔"

"ہم اپنے محبوب مصنف ہیں۔۔۔ کیا انداز تحریر ہے۔ کئی بار تو اپنے ہاتھ چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ حالانکہ قاعدے سے یہ کام کوئی اور کرتا اور صیغہ تانیث میں کرتا تو بہتر ہوتا ہے۔"

غرضیکہ اس مضمون میں شگفتگی' شوخی اور شائستگی کی ایک لہر ہے جو آغاز سے انجام تک رواں ہے اور اس لہر کی روانی کو برقرار رکھنے کے لیے انشاء جی نے مزاح کا ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ لفظی مزاح کی بے شمار مثالیں اس مضمون میں موجود ہیں۔ مثلاً "آخر

اسپتال کے ماہر سے ہماری اپائنٹمنٹ ہوئی۔ نام تھا مسٹر کافن یعنی جناب تابوت۔ خاصا نامبارک نام ہے۔"

طنز و مزاح میں تحریف نگاری ابن انشاء کا خاص میدان ہے۔ وہ تحریف سے پیدا ہونے والے گہرے تاثرات کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ چنانچہ پیروڈی کی صنف سے وابستہ فنی امکانات سے انہوں نے اکثر بہت کام لیا ہے۔ اس مضمون میں بھی پیروڈی کی خوب صورت مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً "فیض احمد فیض کے ایک معروف مصرعے کی پیروڈی ملاحظہ کیجیے۔

"اب آپریشن تھیٹر کی طرف پابجولاں چلے' دست افشاں چلے"

"بیمار کا حال اچھا ہے" یہ مضمون دراصل روداد ہے ان شب و روز کی جب انشاء علاج کی غرض سے لندن کے ایک اسپتال میں مقیم (ایڈمٹ) تھے۔ لہٰذا اسپتال ڈاکٹروں' نرسوں' وہاں موجود ساتھی مریضوں' ان کی تکالیف' بیمار اور ان کے رویوں کے بارے میں' اسپتال کے اندر کے ماحول اور باہر کے موسم کے بارے میں۔ اپنی بیماری' دکھ' تکلیف' درد' آپریشن' اپنوں سے دوری' دیار غیر میں وطن اور وطن کے لوگوں کی یادیں۔ یہاں کے اسپتالوں' ڈاکٹروں' نرسوں کا موازنہ اور تقابل اپنے وطن کے اسپتالوں' ڈاکٹروں اور نرسوں سے نہایت شوخ' شگفتہ' برلہ سنج اور رجائیت آمیز انداز میں پوری جزئیات کے ساتھ لکھا۔ اسپتال میں گزرے ان شب و روز میں کئی دفعہ ایسا موقع بھی آیا کہ اپنی تکلیف' اپنی بیماری جو سب سے بڑی لگتی تھی' دوسرے مریضوں کے سامنے ہیچ محسوس ہوئی۔ ایسے میں کئی بار اللہ کے سامنے سجدہ شکر ادا کیا۔

زندگی کے اس موڑ پر جبکہ موت چند قدم کے فاصلے پر تھی انشاء جی یاسیت اور قنوطیت کا شکار ہونے کے بجائے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں موت کا خوف نہیں بلکہ امید کی روشنی ہلکورے لے رہی ہے۔

"ہم جب بھی ایکسرے کے لیے جاتے ہیں... اور اب تک ہمارے کئی سو ایکسرے ہو چکے ہیں تو کپڑے اتارنے کی کوٹھڑی میں ایک نوٹس لگا پاتے ہیں کہ اگر کوئی مریض امید سے ہو تو ڈاکٹر کو پہلے سے بتا دے۔ یوں تو دنیا بامید قائم اور ہماری تو ساری زندگی امید ہی امید میں گزری ہے' لیکن کبھی ڈاکٹر کو بتانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ جس کی وجہ ہماری مشرقی حیا ہے' بات یہ ہے کہ ایکسرے کرنے والی ہمیشہ کوئی خاتون ہی ہوتی تھی۔ ایک روز ایسی تھیں کہ ذرا بڑی عمر کی تھیں اور ہم نے جھجکتے جھجکتے ان کے سامنے اعتراف کر ہی لیا۔ بہت ہنسیں' جانے کیوں؟"

پورے مضمون میں یہی رجائی انداز ہے۔ وہ پرامید ہیں اور اپنے قاری کو بھی امید اور تسلی دے رہے ہیں۔ خود رحمی کی جھلک کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ انداز بیان شوخ' شگفتہ' بے ساختہ اور شائستہ ہے۔ مضمون پڑھتے ہوئے ایک زیر لب تبسم تمام وقت قاری کے ہونٹوں پر سجا رہتا ہے اور کبھی کبھی وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیتا ہے اور کبھی پڑھتے پڑھتے اچانک رک جاتا ہے اور اس کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اپنی زندگی کی گہری شام کی تاریکیوں میں بیٹھ کر انشاء جی کے شوخ قلم نے روشن لفظوں کی ایک ایسی قوس قزح تخلیق کی ہے کہ جس میں دھنک کے ساتوں رنگ اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ فگن ہیں۔



جمع و تفریق کے اس مسلسل عمل میں
جو لمحہ بھی گزرے پلٹتا نہیں
وقت کے آئینے میں کوئی عکس بھی
اک پل سے زیادہ ٹھہرتا نہیں

شب و روز کی گردشوں کے تسلسل میں وقت کا سفر جاری و ساری ہے۔ وقت کے اس سفر میں کسی لمحہ کو دوام نہیں' کوئی لمحہ ٹھہرتا نہیں ہے۔ وہ خوشیاں' وہ غم جن سے ہم ہو کر گزرتے ہیں۔ وقت کا سیل رواں انہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ آسیں' امنگیں' جیتیں اور ماتیں عمر رواں کا رزق ہو جاتی ہیں۔ خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں وقت کے دشت حیرت میں کھو جاتی ہیں۔ یہ تماشا کیا ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔

امروز کا پردا ہو' ماضی ہو کہ فردا ہو
اک بھید انوکھا ہے' اک راز یہ گہرا ہے

عمر کے اس سراب اجل خیز میں بیتے برسوں کے کچھ نشان رہ جاتے ہیں' کبھی مسکراہٹ بن کر اور کبھی آنسوؤں کی صورت' یادیں جو کبھی ہنساتی ہیں' کبھی رلاتی ہیں۔

نئے سال کی آمد پر دل میں جہاں کچھ امیدوں کے چراغ روشن ہوتے ہیں' وہاں جانے والا سال کچھ دکھ اور ملال بھی چھوڑ جاتا ہے۔

ایک اور نیا سال ہمارے سامنے ہے۔ نئے سال کی آمد پر اپنی قارئین کی شرکت کے لیے حسب روایت سروے شامل ہے۔

سوالات یہ ہیں۔

(1) گیا سال کیا دے گیا؟ کوئی ملال' کوئی خوشی' کوئی خوب صورت احساس یا آگہی؟

(2) 2012ء کی ابتداء میں آپ نے خود سے کئی عہد و پیماں کیے ہوں گے۔ ان میں سے کتنے پایہ تکمیل کو پہنچے اور کتنے ادھورے رہ گئے؟

(3) اس سال جو کتابیں پڑھیں۔ ان میں سے کس کتاب نے آپ کو متاثر کیا؟

(4) کوئی شعر یا اقتباس جو آپ کو اچھا لگا۔

آیئے! دیکھتے ہیں' ہماری قارئین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

نئے سال کی دہلیز پر

ادارہ

قرۃ العین خرم ہاشمی.....لاہور

من بتلاش تو روم یا بہ تلاش خود روم
عقل ودل نظر ھمہ گم شدگان کوری تو

(میں تیری تلاش میں نکلوں' یا اپنی تلاش میں جاؤں' میری عقل' دل اور نظر' سب کے سب تیرے کوچے میں کھو گئے ہیں)

اور کھوئی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈنا کبھی آسان نہیں ہوتا۔ کہتے یہ بھی ہیں کہ جو چیز جہاں پہ کھوئے' دوبارہ وہیں ہی سے مل جاتی ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو وقت سے کہو کہ اپنا پہیہ پیچھے گھمائے۔ مجھے بھی اپنی کھوئی ہوئی



چیزیں واپس لینی ہیں۔
سال کے بارہ مہینوں میں کتنے دن اور شامیں ایسی ہیں جو دل کے آنگن میں رک گئی ہیں۔ ان کے ہونے کا احساس ہر پل ہوتا ہے۔
یہ سال ابتدا سے ہی کچھ مشکل سا رہا۔ کھونے کا عمل سارا سال چلتا رہا اور ہم حیران و پریشان آسمان کو تکتے اور سوچتے کہ یہ سال ہم سے کیا کچھ لے گیا ہے؟

مہینہ کوئی بھی آئے..... مہینہ کوئی بھی جائے
کسی موسم، کسی رت کی تمنا اب نہیں باقی.....
وہ سارے موسموں کے ساتھ بستا ہے مرے اندر

.....

مگر اس کھونے کے عمل میں پہلے دکھ رہا پھر آہستہ آہستہ احساس ہوا کہ کھونے کے اس عمل ہی سے تو آگہی نے کشید ہونا تھا۔
بہت بار ایسا ہوتا ہے ناں کہ ہم سفر کرتے کرتے راہ میں ستانے کے لیے بیٹھتے ہیں اور آگے کا سفر بھول جاتے ہیں۔ راہ کی دل فریبی میں کھو جاتے ہیں۔
میرے ساتھ بھی ایسا ہی کچھ ہوا۔ جو سفر کئی سال پہلے شروع کیا تھا اپنی ذات کو پانے کا، اسے تلاشنے کا وہ ایک جگہ آکر رک سا گیا۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ اب اس سے آگے کیا ہے؟ اگر دنیا میں ہی ہمیں جنت مل جائے ہم محبت کے خدا بن بیٹھے تو پھر سفر سے کیا لینا دینا؟
مگر کچھ لمحے، کچھ رویّے صرف اسی لیے ہوتے ہیں کہ ہمیں نیند سے جگایا جائے۔ ہمیں بتایا جائے کہ ہم انسان سیراب کو جنت سمجھنے کی غلطی کر رہے ہیں۔ سفر اتنی جلدی ختم نہیں ہوتے۔
اس سال بہت اچھے، بہت پیارے کچھ دوست کھو گئے۔ جن پہ گماں تھا بہت..... وہ ہی اپنے نہ رہے۔ اب ان کی یادوں کی قبر پہ دل اکثر دردسے رو پڑتا ہے مگر خیر..... اس کا نام ہی زندگی ہے۔
باقی اس سال "محبت" کا فلسفہ بھی صحیح طرح سے سمجھ میں آنے لگا۔ نجانے اس محبت کے بھی کتنے روپ ہیں۔ ہر روپ ہی عقل کو دنگ کر دیتا ہے مگر ہر بات کا حاصل یہ ہے کہ جس کے پاس محبت ہے..... اس کے پاس سب کچھ ہے سب کچھ کھونے کے باوجود بھی..... واقعی اس دنیا میں اس سے زیادہ خوب صورت احساس کوئی نہیں ہے۔ محبت فاتح عالم.....
(2) آپ کے دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ

عشق کی گرمی ہے معرکہ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات

میں خود سے، بہت زیادہ عہد و پیمان نہیں کرتی اور نہ دوسروں سے۔ اگر کروں تو نبھانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مگر دوسروں سے، خود سے نہیں!!!
تماشائے ذات نے ہی اتنا دنگ کر دیا ہے کہ ہم صرف تماشائی بن کر رہ گئے ہیں۔ میں نے پہلے ہی



عرض کیا ہے کہ زندگی اتنی تیزی سے رنگ بدلتی رہی کہ خود سے باندھے عہد و پیمان کہیں ہوا میں تحلیل ہو گئے۔ رہ گئے تو وقت کے بتائے اور سکھائے گئے اسباق

.....

(3) اس سال کتابیں خریدنے پہ زیادہ زور رہا۔ انہیں ہر روز بک شیلف میں لگا دیکھ کر خیال آتا ہے کہ گیان دینے کے لیے سفید داڑھی والے بزرگ ہاتھ میں لاٹھی ٹیکے پُرسوچ نظروں سے ہمیں گھور رہے ہیں۔ مگر ہمارے ہاتھ میں "کتاب زیست" دیکھ کر مسکرا کر رہ جاتے ہیں۔
"راجہ گدھ" کو شروع کیا تھا مگر ابھی تک ختم نہیں کیا۔ ہاں جہاں تک متاثر ہونے کی بات ہے تو "کتاب زیست" سے زیادہ کس چیز نے متاثر کرنا ہے۔
(4) کچھ اشعار ہیں جو آج کل ذہن سے چپکے بیٹھے ہیں۔

علم و حکمت کا جنہیں شوق ہو آئیں نہ ادھر
کوچۂ عشق میں کچھ بھی نہیں حیرت کے سوا

مجھ کو مجھ میں جگہ نہیں ملتی
تو ہے موجود اس قدر مجھ میں

اور پسندیدہ اقتباس میں سے ایک حاضر خدمت ہے۔
اشفاق احمد "زاویہ" میں عشق حقیقی کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔
"اس دنیا میں سب سے بڑا افلاس محبت کی کمی ہے۔ جس شخص میں محبت کرنے کی صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی وہ اپنے پرائیویٹ دوزخ میں ہر وقت جلتا رہتا ہے۔ جو محبت کر سکتا ہے وہ جنت کے مزے لوٹتا ہے۔ لیکن محبت کا دروازہ ان لوگوں پر کھلتا ہے، جو اپنی انا اور اپنے نفس سے منہ موڑ لیتے ہیں۔ اپنی انا کو کسی کے سامنے پامال کر دینا "عشق مجازی" ہے۔ اپنی انا کو بہت سوں کے آگے پامال کر دینا "عشق حقیقی" ہے۔"

انیقہ انا..... چکوال

(1) عمر عزیز سے ایک اور سال ختم ہونے کو ہے۔ اس بار گزرے دنوں کا حساب لگاؤں تو..... لگتا ہے سب کھویا ہی ہے۔ میں جو بہت پُر امید رہا کرتی تھی بہت قنوطی اور آدم بے زار سی ہو گئی۔ میرے اندر وہ جو رنگوں، تتلیوں، خوشبوؤں سے محبت کرنے ایک والی لڑکی رہتی تھی، وہ مر گئی (یا شاید میں نے خود مار دیا) آگہی یہ ملی کہ "انیقہ! اس کرۂ ارض پر تم جیسا کم تر کوئی نہیں۔" نجانے پھر بھی ذات کا غرور مٹی کیوں نہیں ہوتا۔
اور اس سال کا سب سے خوب صورت احساس ..... آپ بتائیں اگر کوئی آپ کی محض مسکراہٹ یا





آنکھوں کی نمی یا پلکوں کی لرزش سے دل کا حال جان لے تو کیسا محسوس کریں گے آپ؟

یقیناً "بہت اچھا نا...... ایسا ہی میں محسوس کرتی ہوں جب میمونہ (جسے کبھی میں مونا' مونے یا میمون کہتی ہوں) کے دل کی بات میری زبان پر اور میرے دل کی بات اس کی زبان پر ہوتی ہے۔ جی جناب! سال 2012ء کا سب سے خوب صورت احساس میمونہ رہی ہے.....

(2) بھئی میں بڑی بے قاعدہ سی' بد سلیقہ قسم کی لڑکی ہوں۔ عہد و پیماں کروں اور وہ بھی خود سے..... کاش! کہ اتنی اچھی ہوتی انیقہ! تو کیا کہنے تھے۔ کہنے کو تو روز رات کو عہد کرتی ہوں۔ کئی ایک..... پر..... اب جانے دیں۔ کیا کہوں' میرا خیال ہے اس سوال کو یونہی چھوڑ دیتی ہوں۔"

(3) کون سی کتاب.....

بشریٰ سعید کا "سفال گر" (اگرچہ تاحال کتابی شکل میں نہیں ملا) آسیہ مرزا کا "دل اک شہر جنوں" نمرہ احمد کا "بیلی راجپوتاں" علامہ راشد الخیری کی "زلف و زنجیر (زبان و بیان کا شاہکار) سبھی کتابیں اپنی مثال آپ تھیں۔

لیکن ہوا یوں کہ...... اللہ نے مجھ پر کرم کر دیا..... اگرچہ میں اس قابل نہ تھی۔

جو ہیبت سے رکے مجرم تو رحمت نے کہا بڑھ کر
چلے آؤ' چلے آؤ' یہ رحمٰن کا گھر ہے

مجھے قرآن مجید ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی توفیق ملی ..... اب میں اپنے تاثرات زیر قلم لانے سے قاصر ہوں..... چند آیات کا مفہوم ہے جن میں اللہ رب العزت اپنے لیے فرماتا ہے۔

"سب آنکھیں اس کے احاطہ میں ہیں اور کوئی آنکھ اسے احاطہ نہیں کر سکتی۔"

"یہی تو اللہ ہے' پھر کہاں بھٹکے پھرتے ہو۔"

"اللہ کی قدر نہ جانی' جیسی چاہیے تھی۔"

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

ہر ہر لفظ پڑھ کر لگتا' دل گویا پگھل کر آنکھوں کے رستے بہہ جائے گا اور پھر صدہا صد شکر مولا کریم کا' جس نے مسلمان بنایا اور اس عظیم کتاب کو پڑھنے کا شرف بخشا۔

(4) کوئی شعر..... ارے جناب طویل فہرست ہے پسندیدہ اشعار کی۔

سوچا ہے کہ تحفے میں بھیجوں گا انہیں آنکھیں
درشن کا درشن ہو' نذرانے کا نذرانہ

☼ ☼ ☼

وہ لمحے آئے قربت کے
سمٹیں وہ صدیاں لمحوں میں





یا یہ شعر۔

ہر شخص کو اک وصف میں ہوتا ہے کمال
بندے کو کمال بے کمالی میں ہے

اب بات ہو جائے اقتباس کی تو اسکول میں قائد ڈے کے حوالے سے ایک اخلاقی خاکہ لکھا گیا' جس کے چند جملے۔ "دنیا کی مثال بچوں کے لیے کھلونوں کی دکان جیسی ہے۔ جس کے ہر کھلونے کو دیکھ کر ان کا دل مچلتا ہے' بھلے وہ کھلونا ان کے نفع کا نہ ہو' مگر ہم ہر کھلونا تو انہیں نہیں دلوا سکتے نا! لہٰذا ذرا سی روک ٹوک بھی ازحد ضروری ہے۔"

سحر خان..... کوئٹہ

(1) گیا برس ملال و حسرت ہی نہیں خوب صورت ترین احساس' بے پناہ خوشی اور آگہی سب ہی کچھ دے گیا۔ سال کے شروع مہینوں میں تو کچھ خبر ہی نہیں تھی مگر 4 مئی کی خوب صورت ترین دوپہر میں نکاح کے بندھن میں بندھ گئی۔ عبدالرزاق میرے شوہر نے اپنا نام دے کر مجھے بہت محترم کر دیا وہ خونی رشتے جو انسان کے لیے بہت اہم ہوا کرتے ہیں۔ ان کے اپنے ہونے کا ادراک تو ابو کی وفات کے بعد ہی ہو گیا تھا مگر نکاح کے بعد کچھ بے حد قریبی رشتوں کا بہت بھیانک چہرہ نظر آیا۔ میرے لیے ان قریبی رشتوں کے "اپنے پن" سے آگاہ ہونا پل پل مرنے سے کم نہیں۔

(2) بہت کوشش کی' خود سے بار بار وعدے کیے کہ کسی بھی طرح اپنی انا پرست اور ضدی طبیعت کی نفی کر دوں مگر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ مجھے تو لگتا ہے میں مزید ضدی اور انا والی ہو گئی ہوں۔ اچھا کام کرنے کا کوئی عہد کیا ہی نہیں کبھی۔ ہاں اب یہ اور بات ہے کچھ اچھے کام جن کا کوئی ارادہ ہو نہ عہد کیا ہو خود ہی ہو جاتے ہیں۔

(3) کتاب تو میری زندگی کا لازمی جزو ہے اتنا کہ بہت زیادہ ٹف جاب کے باوجود میاں صاحب کو بھی عادی کر دیا مطالعے کا (سول انجینئرنگ کے بعد پاکستان کے حساس ادارے سے منسلک ہیں) کتابوں کے معاملے میں بھی ہم خوش نصیب ہیں (ہر معاملے کی طرح) بانو قدسیہ' مستنصر حسین' یحییٰ خان' نثار بٹ' ممتاز مفتی' عمار مسعود' کرنل محمد خان' اشفاق احمد اور بھی کچھ نام ہیں جو عمار صاحب (بھتیجے) کے شور مچانے کی وجہ سے یاد نہیں آ رہے' سب ہی کو بہت پڑھا' بہت لطف اٹھایا۔

ہر کتاب کا نیا سرور' ہر کتاب میں اک الگ ہی احساس' لیکن نجانے کیا تھا اس بار ماہ رمضان میں جب جب سورہ رحمٰن و سورہ یاسین کو تلاوت کی تو دل کی دنیا تہہ و بالا ہوئی اور اگلی بار ہونے نہ ہونے کا احساس بہت شدت سے دامن گیر ہوا۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تقریباً" ہر کتاب کے مطالعے کے دوران کہیں کہیں

میں نے اللہ کا ذکر اور قرآن کی فکر کو بار بار پڑھا اور میرے لیے یقیناً" قرآن کریم کا مطالعہ بہترین اور متاثر کن رہا۔

(4) سارا سال ذہن و دل میں گردش کرنے والا شعر

صرف میری ہی نہیں پورے ملک کی حالت کا غماز ہے آپ بھی پڑھیے اور بہت نہیں تو ایک بار ضرور سوچیے گا!

قیمتی چادریں مزار پر
زندگی بے لباس پھرتی ہے

سحرش اسلم..... اسلام آباد

(1) دوسرے سالوں کی نسبت میرا یہ سال بہت خوش گوار گزرا۔ رشتوں کے خوب صورت احساسات سے بھرپور آگہی ہوئی۔ ہر رشتے کا خوب صورت رنگ نظر آیا۔ خاص طور پر میری فیملی کے افراد کے بارے میں جن کے بارے میں کبھی کبھی میں بدگمان ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ دوستی کے رنگوں سے آشنائی ہوئی۔ اپنی دوست کے ساتھ اس سال کے بہت سے دن یادگار ہیں۔ یہ پل ہمیشہ یاد رہیں گے۔ خدا کا شکر ہے کوئی غم نہیں ملا۔

(2) میں نے سال کی ابتدا میں نماز کی باقاعدگی کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن یہ وعدہ کسی حد تک پورا ہوا ہے۔ ویسے خدا کا شکر ہے کہ میرا اور اس کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے معاملات میں، میں نے کوئی ارادہ نہیں کیا تھا کیونکہ میں کل کی نسبت آج کو بھرپور انداز میں جیتی ہوں اور آج کے بارے میں ہی سوچتی ہوں۔

(3) میں نے اس سال ہر سال کی طرح بہت سے ڈائجسٹ پڑھے جن میں خواتین ڈائجسٹ بھی شامل ہے۔ اس ڈائجسٹ کا صفحہ "کرن کرن روشنی" بہت سبق دیتا ہے اور اسلام کے بارے میں بہت سی معلومات فراہم کرتا ہے۔

(4) "جھوٹ بول کے مجھے خوشی دینے سے بہتر ہے کہ سچ بول کے مجھے دکھ دے دو۔"

مجھے علم نہیں ہے کہ یہ کس کا جملہ ہے لیکن یہ مجھے بے حد پسند ہے کیونکہ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے اور میری فطرت بھی کچھ ایسی ہے، جس کی وجہ سے مجھے یہ بات بہت پسند آئی ہے۔

شائستہ جاوید..... کراچی

ماہ و سال گزرنے میں، دن رات کے آنے جانے میں اللہ کی قدرت ظاہر ہوتی ہے یہ آتے جاتے سال، یہ بدلتے موسم ہمیں احساس دلاتا ہے کہ

"کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے۔"

سال 2012ء بھی ہمیشہ کی طرح ملا جلا رہا۔ کبھی خوشیوں مسرتوں کی برسات ہوئی تو کبھی غم کی لو چلی۔

(1) ملکی حالات پر کیا کہوں کہ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ہر شخص پریشان ہے، ہر کوئی خوف زدہ۔ ہمارے پیارے شہر کراچی کو کسی کی نظر لگی ہے۔ ہر روز خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے ٹارگٹ کلنگ، مہنگائی، بجلی، گیس سی این جی، پیٹرول کی کمی، آئے دن کی ہڑتالوں نے کراچی کے عوام کو خون کے آنسو رلا دیا ہے "جائیں تو جائیں کہاں"

(2) ہر سال کی طرح 2012ء میں بھی بہت سے عہد و پیماں کیے۔ کچھ کر گزرنے کا عزم چھوٹے موٹے بزنس بھی کیے۔ کچھ کامیاب ہوئے اور کچھ ناکام بھی۔ آج کل میرج بیورو چلا رہی ہوں کچھ فلاحی کام بھی کر رہی ہوں۔

(3) خواتین، شعاع، کرن کے علاوہ جون ایلیا کی "شاید" سعید واثق کی "کہاں ہوتے ہو" محمد عمران انجم کی مرتب کی ہوئی کتاب "تم میری محبت ہو" جس میں انہوں نے تمام مایہ ناز شاعروں کے کلام کو (غالب سے لے کر وصی شاہ تک) سب کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ پروین شاکر کی "خوشبو اور وصی شاہ کو بھی پڑھا اور سب ہی نے متاثر کیا۔

(4) یوں تو بہت سے اشعار نے دل کو چھوا ان گنت اقتباس نے روح کو جھنجھوڑا مگر ایک نظم "ماں"

مجھے بہت اچھی لگی (ماں پر کی گئی ہر نظم، ہر اقتباس دل کو چھوتا ہی ہے۔)

"ماں" یہ تو بتاؤ!
کہ گھروندے ریت کے ہی کیوں ہوتے ہیں؟
جو پاؤں باہر نکالتے ہی ٹوٹ جاتے ہیں

کچی عمر کے خواب ہمیشہ شوخ رنگ کے ہی کیوں ہوتے ہیں؟
آگہی سے پہلے ڈراؤنے خواب کیوں نہیں آتے؟
لڑکیاں اتنی بزدل کیوں ہوتی ہیں؟
تم ان کی تربیت میں "صبر" کی مہر کیوں لگاتی ہو؟
لڑکیوں کی زندگی گھومتا پہیہ کیوں ہوتی ہے؟
جانے کس پل کون سا موڑ سامنے آجائے؟
پیاری ماں!
ایک بات تو بتاؤ!
تم اپنے ہر کرب کو دودھ کے ذریعے اپنی بیٹی کی رگوں میں کیوں اتارتی ہو؟
بتاؤ ناں ماں!
بتاؤ ناں!

صائمہ گل..... گاؤں چمڈھیری ضلع مردان

(1)

کچھ خوشیاں کچھ آنسو دے کر ٹال گیا
جیون کا ایک اور سنہری سال گیا

جی ہاں! انسانی زندگی تو دکھ سکھ اور نشیب و فراز سے ہی مزین ہے۔ ہر گزرتے سال کی طرح اس سال نے خوشیاں بھی دکھائیں۔ اور کچھ دکھوں کا سامنا بھی کرنا۔ انفرادی طور پر گزشتہ سال میرے لیے خوش کن رہا یعنی پہلے مہینے کی 9 تاریخ کو "محمد طلال" بیٹے کی آمد نے ہمارے گلشن کو مزید مہکا دیا۔

میرے اکلوتے بھائی کی منگنی کی یادگار تقریب۔ شادی کے سارے ارمان منگنی پر ہی نکال لیے۔ صرف دلہن وہیں رہ گئی۔ بھئی اسے شادی پر لائیں گے نا!

(2) میں عہد و پیماں کی حامی نہیں ہوں کیونکہ وہ کہتے ہیں ناکہ! وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا۔ جو بھی کرتی ہوں۔ وقت اور حالات کو پیش نظر رکھتی ہوں۔ عہد و پیماں میں خود کو نہیں باندھتی۔

(3) "مصحف" کو پڑھ کر میرے خیال میں ہر قاری بہن نے میری طرح سمجھ کر قرآن پڑھنا شروع کر دیا ہو گا۔ ایک وہ بھی وقت تھا کہ رمضان میں چھ چھ بار قرآن ختم کرتی تھی لیکن مصحف کے بعد ہر آیت کو سمجھ کر پڑھتی ہوں یوں جیسے دل میں اتر رہا ہو۔ وہ جو میں ہر مشکل اور کٹھن وقت میں ناامید ہو جاتی تھی اب صبر کا دامن تھامے رکھتی ہوں اور اللہ میری مشکل آسان کر ہی دیتا ہے۔

(4) اقتباسات تو بہت زیادہ ہیں کیونکہ خواتین اور شعاع کی تمام رائٹرز روشنی اور محبتیں بانٹتی ہیں لیکن یہاں فوزیہ فرخ نے انسانی نفسیات کی ترجمانی کچھ یوں کی ہے۔

"ہر انسان کی زندگی میں عروج و زوال دونوں ادوار آتے ہیں۔ ہاں! کسی کے لیے عروج کا زمانہ طویل ہوتا ہے اور کسی کے لیے زوال کا۔ اصل میں ان دونوں ادوار کی اپنی اپنی آزمائشیں ہیں جن سے انسان کو ہر حال میں گزرنا ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ انسان اس کو سمجھ نہیں پاتا۔ اس کو عیش و آرام مہیا کیا جاتا ہے تو وہ مذہب کو بھول کر جشن منانا شروع کر دیتا ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہ تو اس کا حق ہے یہ تو اس کے لیے ہونا ہی چاہیے تھا اور جب زوال آتا ہے تو گلے شکوے شروع کر دیتا ہے۔ تقدیر کا گلہ، زمانے کا گلہ، زندگی سے گلہ، موت کی خواہش گویا ہر قسم کی تاریکی اپنے گرد سجا کر بیٹھ جاتا ہے یہ سوچے بغیر کہ یہ تو زندگی کے رنگ ہیں ان سے گزرنا ہے۔ ہنس کر گزرو چاہے رو کر گزرو۔ کیا ہو رہا ہے کیا ہونا چاہیے یہ تو انسان کے اختیار میں کبھی نہیں دیا گیا۔"



عنیزہ سید

جز کوزہ گراں سے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔
سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔
سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔
ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی۔ تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔
خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔
سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔
ماہ نور نے "سید پور کلچرل شو" میں شرکت کے لیے اپنی دوست شاہ بانو کے ساتھ اسلام آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ شاہ



بانو نے اپنے بھائی کی معرفت سید پور میں ماہ نور کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا۔ فاطمہ اور خدیجہ نے ماہ نور کو اسلام آباد میں قلزا ظہور سے ملنے کی تاکید کی۔ قلزا ظہور ان کے بچپن کی ساتھی ہے۔ بچپن میں کوئلے سے فرش اور دیواروں پر تصویریں بنانے والی قلزا ظہور اب ایک بڑی آرٹسٹ ہے مگر اسے شہرت سے کوئی غرض نہیں ہے۔

مولوی سراج اور آپا رابعہ قصبے میں رہتے ہیں۔ ان کی اکلوتی بیٹی سعدیہ کلثوم نویں جماعت کی طالبہ بے حد ذہین ہے۔ مولوی سراج اور آپا رابعہ کو اس بات پر فخر ہے کہ ان کی بیٹی سائنس پڑھ رہی ہے۔

ایک رات سارہ نے رکی کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس کے ساتھ سرکس میں کام کرتا تھا۔ رکی اپنے فن کا ماہر جوکر تھا۔

ماہ نور اور شاہ بانو "سید پور کلچرل شو" میں گئیں تو وہاں انہیں ایک کمہار نظر آیا۔ وہ گیلی مٹی کو بہت مہارت سے دیدہ زیب برتنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ ماہ نور کی نظر اس کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک گئی۔ اسے اس پر اسی شخص کا گمان ہوا، جو اسے ہر میلے میں مختلف روپ میں نظر آتا رہا تھا۔

سارہ، ماہ نور سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ بہت روکھا اور خشک تھا۔

واپسی پر گاڑی میں ماہ نور نے سعد سے اعتراف کیا کہ وہ اب تک جتنا سعد کو جان پائی ہے، سعد اس کی نظر میں ایک قابل رشک انسان ہے، سعد نے اسے سارہ کے متعلق بتایا وہ سرکس دیکھنے گیا تھا۔ سارہ خان بلندی سے نیچے گری تھی۔ اس نے اس کی ہڈیاں ٹوٹتے اور خون بکھرتے دیکھا تھا، وہ وہاں سے واپس آگیا لیکن سارہ خان کے لیے بے چین رہا۔ وہ دوبارہ اسے ڈھونڈتے ہوئے اس سے ملنے پہنچا تو وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور زخم زخم جسم کے ساتھ ایک چھولداری میں پڑی موت کی منتظر تھی۔ اس کے زخموں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں۔ سعد اس کو وہاں سے لایا اور اس کا علاج کرایا اور پھر اسے فلیٹ میں منتقل کیا۔

کھاری نے آپا رابعہ سے نماز یاد کرلی تھی اور بہت خوش تھا۔ سارہ خان نے پہلی بار سوچا سعد سے اس کا تعلق صرف ترس اور ہمدردی کا ہے اسے اپنا ماضی یاد آرہا تھا۔ جہاں جاپانی نقش ونگار والا رکی تھا۔ جس کی جاپانی ماں اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور اس کا باپ اس کے بہن بھائیوں کے ساتھ پھوپھی کے حوالے کر گیا تھا۔ باپ نے دوسری شادی کرلی تو سوتیلی ماں کے مظالم سے تنگ آکر وہ گھر سے بھاگ گیا اور قسمت اسے سرکس میں لے آئی۔

آپا رابعہ نے مولوی سراج کو بتایا کہ اسکول والوں نے سعدیہ کی پیدائش کی پرچی مانگی ہے تو وہ پریشان ہوگئے۔

ماہ نور، سارہ سے ملنے آئی اور اس نے سارہ کو بتایا کہ اس کی سعد سے صرف چند دن پہلے ملاقات ہوئی ہے۔ یہ سن کر سارہ کا رویہ اس کے ساتھ بدل گیا۔

سعد نے اپنی بہن نادیہ سے اسکائپ پر بات کی۔ وہ فن لینڈ میں بہت مشقت بھری زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کی ماں کا شوہر اس پر بری نظر رکھ رہا تھا۔ اس لیے وہ فن لینڈ آگئی۔

جیناں بھکارن نے ایک بچہ اغوا کیا لیکن پولیس نے اس سے بچہ برآمد کرلیا۔

ماہ نور کی سعد سے ملاقات ہوئی تو وہ اسے اختر کے پاس لے گیا۔ اختر نے ماہ نور کو دیکھ کر سعد سے کہا "یا تو زن یا من بالو" ایک کی قربانی دینی پڑے گی۔

اس نے ماہ نور سے کہا بی بی آپ کا دل بہت صاف ہے اور زندگی بہت پر سکون ہے لیکن آگے آپ کے لیے بہت مشکلیں ہیں۔

قلزا ظہور، سعد کو فون پر کسی تصویری نمائش کی دعوت دیتی ہیں۔ سعد اپنے فرینکفرٹ کے دورے کی وجہ سے معذرت کر لیتا ہے۔ ماہ نور، فاطمہ اور خدیجہ کو قلزا ظہور سے ملاقات کے بارے میں بتاتی ہے۔ فاطمہ ماہ نور سے سعد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کرتی ہے۔ وہ بے دلی سے ہامی بھرتی ہے کیونکہ سید پور سے آنے کے بعد سے سعد کا فون مسلسل بند مل رہا تھا جبکہ سارہ خان کو اس نے اپنے جرمنی جانے کی اطلاع دے دی تھی۔

دسویں قسط

وہ رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کے سیل فون کی بیل بجی تھی۔ اس نے فون کی اسکرین روشن کرنے سے پہلے کال کرنے والے کو دل ہی دل میں خوب کوسا تھا اور ساتھ ساتھ خود کو بھی کیوں سونے سے پہلے فون کو سائلنٹ پر لگانا بھول گیا تھا۔ سیدھے لیٹتے ہوئے اس نے آنے والی بیل کو نظرانداز کیا۔ کال ایک دفعہ بند ہوئی اور ایک وقفے کے بعد فون دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے ایک بار پھر فون کرنے والے کو کوسا اور کروٹ لے کر فون اٹھایا۔ رات کے ڈھائی بج رہے تھے لیکن فون کرنے والے کا نام پڑھ کر اس کی جھنجلاہٹ ہوا ہو گئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"مجھے اس بات کی کوفت کی وجہ سے نیند نہیں آرہی تھی کہ تم نے وہ تصویریں میرے علاوہ جس کو بھجوائیں اس کا نام قلزا ظہور ہے۔"

فون کان سے لگانے پر اسے ایک کڑوی، تلخ اور غصے سے پیچ و تاب کھاتی آواز سننے کو ملی۔

"میں نے سوچا اکیلی میں ہی کیوں جاگوں تم کیوں نہ جاگو۔ اس وجہ سے۔" اس نے اس بات کے جواب میں منہ سے نکلنے والی ہنسی کو بمشکل دبایا۔

"وہ تو مس ہولیشم تھی' اسے دیکھ کر تمہیں Strgoika Manor کا مشروب یاد آگیا تھا۔ اچانک وہ تمہارے اتنے قریب کیوں ہو گئی کہ ایک میل جس کا عنوان "جسٹ فار یو" ہے تم نے اسے بھی بھجوادی۔" وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی رات کی خاموشی میں فون پر بھی اس کی سانسوں کے زیر و بم کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔

"کیا ہو گیا بھئی! میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔" سعد نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اکھڑی نیند سے بوجھل ہوتی آواز میں کہا۔

"اپنی وہ میل چیک کرو، جو تم نے مجھے بھیجی ہے۔" وہ ایک بار پھر دھاڑی۔

"اس کے ایڈریسز کون کون ہیں، ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔"

"او ہو! لگتا ہے کوئی ٹیکنیکل بلنڈر ہو گیا ہے۔" اس کو سیکنڈز میں شرارت سوجھی۔ "دراصل میں نے اپنی حالیہ گرل فرینڈ کا نام قلزا ظہور رکھا ہوا ہے اور اس کو بھی بول دیا تھا کہ اپنی آئی ڈی اسی نام سے بنائے۔"

"حالیہ گرل فرینڈ۔" دھاڑتی آواز قدرے پست ہوئی "تم گرل فرینڈز بھی بناتے ہو؟" رقابت کا دھارا کسی اور سمت کو بہنے لگا تھا۔

"اور نہیں تو کیا۔" اب وہ مکمل طور پر جاگ چکا تھا اور اس گفتگو کا مزا لینے لگا تھا۔ "آج کے زمانے میں وہ کون سا لڑکا ہوگا جس کی گرل فرینڈز نہ ہوں۔"

"میرے بھائی سلمان کی تو کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولی۔ "وہ آج کے زمانے ہی کا لڑکا ہے اور عظمیٰ پھپھو کے تینوں بیٹوں کی بھی کوئی گرل فرینڈز نہیں ہیں۔ ماریہ کا بھائی علی۔ اتنا ہینڈسم اتنا ڈیشنگ لڑکا ہے مگر انتہائی شریف ہے اس کی بھی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔"

"اچھا تو تم مجھے بدمعاش قرار دے رہی ہو۔" وہ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔ "ٹھیک ہے۔"

"میں صرف گرل فرینڈز کی بات کر رہی ہوں۔" جواب میں اس نے جتایا۔

"ہوتی ہیں یار! سب لڑکوں کی گرل فرینڈز ہوتی ہیں۔ کچھ چھپے رستم ہوتے ہیں اور کچھ میری طرح دل کے صاف اسٹریٹ فارورڈ جیسے ہیں ویسا ہی خود کو ظاہر کرنے والے۔"

"نہیں خیر exceptions بھی ہوتی ہیں۔" آواز پست ہوتے ہوتے بالکل ہی مدھم ہو گئی۔

"اچھا یہ بتاؤ، تم خود کو کس کیٹیگری میں رکھتی ہو؟" سعد نے اسے مزید ستانے کا ارادہ کیا۔ "تم میری بوائے

فرینڈ تو ہو نہیں کیونکہ تم ایک لڑکی ہو پھر تم میری کیسی فرینڈ ہو؟"

"خیر! میں تمہاری گرل فرینڈ تو ہرگز نہیں ہوں۔" وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا' بات تیر کی طرح جا کر ماہ نور کے دل و دماغ دونوں کو ہی لگی تھی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' گرل فرینڈ کیا ہوتی ہے؟" اس نے دائیں طرف کروٹ بدل کر فون کان اور تکیے کے درمیان دباتے ہوئے کہا۔

"گرل فرینڈ۔" وہ سوچنے لگی اور پھر جواب سوجھنے پر بولی "گرل فرینڈ تو وہ ہوتی ہے' جو بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ پر جاتی ہے۔"

سعد اس بار اپنے قہقہے پر قابو نہیں پا سکا۔

"کیا ہوا؟" وہ تشویش سے بولی۔

"یہ بات ہے۔" اس نے اپنی ہنسی کو کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔ "تو پھر جب تم یہاں تھیں اور ہم دونوں ادھر ادھر گھومنے اور کھانے پینے کے لیے نکلتے تھے اور اس کے لیے پہلے طے کرتے تھے کہ کہاں جانا ہے' وہ ڈیٹ نہیں تھی کیا؟"

ماہ نور کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس کو کس قسم کی لڑکی سمجھ رہا تھا۔

"میرا خیال نہیں تھا کہ تم اس کو اس طرح یعنی اس نظر سے دیکھتے ہو گے۔" اس نے دکھ سے کانپتی آواز سے کہا۔

"میں سچ مچ اس کو اس نظر سے نہیں دیکھتا۔" اس کی آواز میں دکھ کی آمیزش محسوس کر کے اس نے جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ لفظوں اور رشتوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنا غلط ہے۔"

"جو بھی ہے۔" ماہ نور اس وقت گہری باتیں سمجھنے کی کوشش کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ "میرا خیال ہے مجھے پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا کہ تم نے وہ تصویریں کسی اور کو بھی کیوں بھیجیں' میں تمہاری نیند خراب کرنے پر معذرت خواہ ہوں۔"

"ماہ نور!" دوسری جانب سے اس کا نام اس طرح لیا گیا' جیسے کسی ایسے انسان کو مخاطب کیا جائے' جس پر بہت مان ہو۔ "خبردار جو تم ناراض ہوئیں اور خبردار جو تم نے اپنا دل برا کیا۔ اس سے زیادہ خبردار جو تم نے فون بند کیا۔" ایک مان بھری دھمکی آئی۔

"یار! تم سے زیادہ سمپل لڑکی میں نے کوئی نہیں دیکھی ابھی تک۔ اگرچہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا اور ماہ نور اس کی ہر بات سنتے ہوئے بار بار یوں سر جھٹک رہی تھی جیسے اس کی کسی بات کا بھی یقین نہ کر رہی ہو۔

"پاگل! گرل فرینڈ تو ایک لفظ ہے جو عام طور پر دوست لڑکی کے لیے بولا جاتا ہے' ہم نے اپنے ذہنوں میں بس اس کا یہ ہی خاکہ بنا لیا ہے کہ گرل فرینڈ وہی ہوتی ہے' جو ڈیٹ پر جاتی ہے اور پیرنٹس کو دھوکا دیتی ہے۔ ہے نا؟" اس نے رک کر پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" سوں سوں کی آواز کے ساتھ جواب آیا۔

"تمہیں یہ تو پتا ہے نا کہ تم میری اس قسم کی فرینڈ نہیں ہو' نہ ہی تم ڈیٹ پر گئی تھیں کبھی میرے ساتھ۔"

"مجھے نہیں پتا۔" پھر وہی جواب تھا۔

"کم آن ماہ نور! میں صرف تمہیں تنگ کر رہا تھا۔" ایک ذرا سے مذاق پر لینے کے دینے پڑ جانے پر بالآخر سعد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"تم پلیز روؤ نہیں' تم سے اچھی' مخلص اور کیئرنگ دوست بائے گاڈ! کوئی دوسری نہیں ہے۔ میں تمہیں کیسی دوست سمجھتا ہوں' تمہیں اسی دن اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ جس دن تم نے سوال کیا تھا کہ کیا وہ سب کچھ میں نے کسی اور کو بھی بتایا ہے' کبھی' اور میرا جواب تھا' نہیں۔ تمہیں اپنے معاملے میں شیور ہونا چاہیے۔ جو تمہارا دل کہتا ہے نا کسی بھی بات پر' وہی سچ ہوتا ہے' وہی حقیقت ہوتی ہے۔"

"میرا دل کچھ نہیں کہتا' وہ تو بالکل بے وقوف ہے' ڈمب ہے۔" ایک اور ناراضی بھرا جواب آیا۔

"نہیں' تمہارا دل تو دنیا کے خوب صورت ترین دلوں میں سے ایک ہے کیونکہ وہ صاف' سچا اور کھرا ہے۔"

"جھوٹ نہ بولو۔" ماہ نور کے ہاتھ چہرے پر پھیلے آنسو صاف کرنے لگے۔

"میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گا؟" وہ نرمی سے بولا۔ "جھوٹ تو وہاں بولا جاتا ہے جہاں کوئی لالچ ہوتا ہے۔ کوئی نفع نقصان کا چکر ہوتا ہے' جہاں مصلحت ہوتی ہے اور جہاں دھوکا دینا مقصود ہوتا ہے۔ میرا تم سے اس طرح کا کوئی واسطہ نہیں' میرے لیے تم ایک بہت قیمتی دوست ہو جسے میں کسی بھی صورت کھونا نہیں چاہتا۔"

"سچی!" ماہ نور نے رونا دھونا بھول کر سوال کیا۔

"ہاں سچی مچی۔" وہ مسکرایا۔

"پھر تم نے فرینکفرٹ جانے سے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا۔" ماہ نور ابھی تک اس بات کو نہیں بھولی تھی۔

"غلطی ہو گئی۔" وہ فوراً" بولا۔ کان پکڑ کر معافی مانگتا ہوں اور جب تک تم معاف نہیں کرو گی۔ "کان نہیں چھوڑوں گا۔"

"پہلے وعدہ کرو جہاں جاؤ گے مجھے ضرور بتا کر جاؤ گے۔" ماہ نور نے موقع غنیمت جانتے ہوئے مزید زحمت سے بچنے کا وعدہ لینے کی کوشش کی۔

"وعدہ کرتا ہوں۔ جہاں جاؤں گا' تمہیں ضرور بتا کر جاؤں گا۔"

"اور آئندہ تمہاری طرف سے آنے والی میل جو تم مجھے کرو گے' میرے علاوہ کوئی ایڈریسی نہیں ہو گا۔"

"وعدہ کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "اف ماہ نور! میرے کان لمبے ہو جائیں گے۔ کب سے پکڑے ہوئے ہیں' اب معاف بھی کر دو۔"

"ہائے۔ تم نے ابھی تک پکڑے ہوئے ہیں؟" ماہ نور نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"تو اور کیا لال ٹماٹر ہو گئے میرے کان۔"

"چھوڑ دو' چھوڑ دو پلیز۔" وہ بے قراری سے بولی۔

"اف شکر ہے۔" وہ شکر کا سانس لیتا ہوا بولا۔ "کان لمبے ہو جاتے تو لوگ تمہیں کہتے کس خرگوش کو دوست بنایا ہوا ہے۔"

"خرگوش۔" وہ ہنس دی۔ "پتا ہے' جو کھاری ہے نا۔ اس نے ایک چینی یا شاید جاپانی خرگوش سے دوستی کر لی ہے۔"

"خرگوشوں کی بھی کوئی نیشنلٹی ہوتی ہے۔" اس نے حیرت سے پوچھا "گھوڑوں' ہاتھیوں' شیروں کی سنی تھی۔"

"اوہو بھئی! یہ اصلی والا خرگوش تھوڑی ہے' یہ تو خرگوش کے کاسٹیوم والا چینی یا جاپانی لڑکا ہے' جو پنجابی بھی بولتا ہے۔"

"کمال کا بندہ ہو گا بھئی وہ ملٹی نیشنل انسان۔" وہ ہنسا۔

"کھاری بتا رہا تھا یہ خرگوش پہلے کسی سرکس وغیرہ میں کام کرتا تھا۔ اس بات سے مجھے سارہ یاد آگئی۔" ماہ نور حسب عادت رو میں آکر بولتی جارہی تھی "سارہ سے یاد آیا وہ کیسی ہے اب؟"
"سارہ بہتر ہے اور اس کے مزید بہتر ہونے کے چانسز بھی ہیں ہم اس کے لیے دعا کرنا پلیز۔"
"ہوں!" ماہ نور نے مختصر جواب دیا۔ "تم اس سے ملنے گئے تھے؟"
"ہاں! گیا تھا۔ میں اس کے لیے کچھ گفٹس لایا تھا وہ اسے دینے تھے اور اس کو دیکھنا بھی تھا۔ اس لیے گیا تھا۔"

سعد کی اس بات نے ماہ نور کے بلیوں اچھلتے دل کو زیر کر لیا تھا۔
"اچھی بات ہے۔" وہ آہستگی سے بولی۔ "او ہو کتنا ٹائم ہو گیا تمہیں سونا بھی تو ہو گا۔" پھر وہ بولی۔
"میری چھوڑو مجھے تو تم جگا ہی چکی ہو اپنی بتاؤ تم نے سونا ہے یا نہیں؟"
"ہاں سونا تو ہے۔" وہ اسی نیچی آواز میں بولی "کل میری ایک کزن کی مایوں کا فنکشن ہے۔ بہت بڑا فنکشن ہو گا۔ ہم سب بہت ایکسائیٹڈ ہیں۔"
"تم سب؟"
"ہاں۔۔۔ میرا مطلب ہے میں اور میری باقی کزنز۔"
"گڈ! پھر انجوائے کرو۔" وہ ہنسا۔
"ٹھیک ہے اب تم سو جاؤ۔"
"ہاں پلیز! اب تم بھی سو جاؤ۔" وہ بولا اور کال منقطع ہو گئی۔
"میں جاگ گیا ہوں ماہ نور! اور اب باتھ لینے جا رہا ہوں۔"
"میں نے باتھ لے لیا ہے اور اب میں تیار ہو کر ناشتا کرنے جا رہا ہوں۔"
"ناشتے کے بعد اب میرا آفس جانے کا ارادہ ہے۔"
"میں ابھی ایک میٹنگ میں جا رہا ہوں۔"
"میٹنگ سے فارغ ہو کر اب میں واپس اپنے آفس جا رہا ہوں۔"
"آج میں آفس سے جلدی اٹھ جاؤں گا کیونکہ آج مجھے ابراہیم کے ساتھ لنچ پر جانا ہے۔"
"لنچ لے لیا اب میں فاران آفس جا رہا ہوں۔ ایک کام ہے وہاں۔"
اگلے روز ماہ نور کو صبح سے شام تک سعد کی طرف سے اسی قسم کے میسجز موصول ہوتے رہے۔
"یہ کیا ہے بھئی؟" شام تک ان میسجز پر حیران ہوتے رہنے کے بعد بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا۔
"ابھی آدھی رات ہی کو تو تم نے وعدہ لیا تھا کہ جہاں جاؤں گا، تمہیں بتا کر جاؤں گا۔" جواب میں اس نے لکھا تھا۔

"اف!" ماہ نور نے کہا۔ "میرا مطلب یہ تھوڑی تھا۔"
"تمہارا جو بھی مطلب تھا، مجھے تو وعدہ نبھانا ہے لہٰذا ایسے میسجز کے لیے تیار رہو۔"
"نہیں۔۔۔ میں نے صرف یہ کہا تھا اگر ملک سے باہر جانے کا ارادہ ہو تو مجھے ضرور بتا دیا کرو۔" ماہ نور کو اگرچہ سعد کے اس قسم کے پیغامات پر دلی مسرت محسوس ہو رہی تھی مگر وہ ان سے ایک ہی دن میں دستبردار ہو گئی تھی۔
"سوچ لو پھر اسی بات پر خفا نہ ہو جانا۔"
"نہیں! ٹھیک ہے۔ تھینک یو فار یور کنسرن اینی ویز۔" ماہ نور نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔



"اب یہ پوچھنے میں بھی کوئی حرج ہے کہ اماں! یہ بتا دیں میرے کوئی ماموں، خالہ، پھوپھو، چچا ہیں یا نہیں۔۔۔ نہیں ہیں تو صاف کہہ دیں۔ یوں جھڑکیاں دے کر ٹالنا کیا بات ہوئی۔"
سعدیہ کی بات نے چولہے میں لکڑیاں رکھتی آپا رابعہ کو جیسے زوردار برقی جھٹکا لگایا تھا۔ انہوں نے چونک کر سعدیہ کی طرف دیکھا۔ اسکول کی نیلی قمیص، سفید شلوار اور بڑے سے سفید دوپٹے والی وردی میں ملبوس سعدیہ کو شاید ان دو تین سالوں میں پہلی بار غور سے دیکھا تھا۔ سعدیہ نے قد نکال لیا تھا۔ اس کا جسم بھر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بچپنے کے نشان معدوم ہو چکے تھے۔ اب ان کے سامنے اپنے آپ سے لاپرواہ، کھلنڈری، بات بے بات ڈر جانے والی سعدیہ کی جگہ ایک ذمہ دار، سمجھ دار اور پہلے کی نسبت پُراعتماد لڑکی بیٹھی تھی، جو لڑکپن سے جوانی کا سفر طے کرنے میں مصروف تھی۔
"تم نے اس طرح بات کرنی کس سے سیکھی؟" آپا رابعہ نے اس واضح طور پر محسوس ہوتی تبدیلی سے آنکھوں میں پیدا ہونے والی چبھن کا احساس کم کرنے کے لیے پوچھا۔
"بات کرنا کون سیکھتا ہے، بات کرنی خود بخود آجاتی ہے۔" وہ اسی لہجے میں بولی، جس نے انہیں چونکایا تھا۔
"ماں سے بات کرنے کی تمیز کس نے بھلا دی تمہیں؟" انہوں نے سلور کا فرائی پین اٹھا کر اس کے گھٹنوں پر مارنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سعدیہ نے اپنے گھٹنے پیچھے کر کے خود کو اس وار سے بچا لیا۔
"جہاں کسی انسان کے پاس کسی بات کا جواب نہیں ہوتا نا، وہیں وہ دوسرے پر حملہ آور ہوتا ہے اماں؟" سعدیہ نے آپا رابعہ کو سب کچھ بھول کر اپنا منہ تکنے پر لگا دیا۔
"آپ نے کوئی بہانہ ہی بنانا ہے نا، غلط بیانی ہی کرنی ہے نا تو کہہ دیں کہ سارے رشتہ دار مر کھپ گئے، کیونکہ جس گاؤں میں وہ رہتے تھے۔ وہاں طاعون کی بیماری پھیل گئی تھی اور اس گاؤں میں چوہوں کو پیچھے لگا کر دریا کے حوالے کرنے کے لیے کوئی باجے والا شہزادہ نہیں آیا تھا۔" سعدیہ کی آواز بلند ہو گئی۔
"یہ کیا کہ جب کوئی سوال پوچھو، جواب میں ڈنڈے، برتن، جوتے کھاؤ۔ کب تک کھاؤ بھئی۔" وہ سر اٹھا کر بول رہی تھی "اور کیوں کھاؤ۔ کوئی ناجائز بات کی ہو تو بندہ کھا بھی لے۔ میرے تو سیدھے اور جائز سوال ہوتے ہیں، پھر بھی پتا نہیں آپ کو کیوں غصہ چڑھتا ہے خیر۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی اور اپنا ململ کا سلیقے سے اوڑھا دوپٹا عادتاً ایک دفعہ اتار کر دوبارہ سر پر رکھ کر کندھوں پر پھیلاتے ہوئے مضبوطی سے بکل باندھ لی۔
"تانگہ آنے والا ہے، میں اب جاتی ہوں، خدا حافظ۔" وہ اپنے سفید فلیٹ بوٹوں سے صحن کے کچے، گیلے فرش پر نشان چھوڑتی ڈیوڑھی کے پردے کے پیچھے غائب ہو گئی۔
ہاتھ میں گندھے آٹے کا پیڑا پکڑے آپا رابعہ وہیں بیٹھی رہ گئیں۔ مولوی سراج سرفراز نے مسجد سے واپسی پر گھر کے داخلی دروازے کا ایک پٹ کھلا پایا۔
"دروازے کو کنڈی تو دھیان سے لگا لیا کرو رابعہ بی بی!" وہ دروازے کو اندر سے کنڈی لگا کر ڈیوڑھی کا پردہ ہٹاتے ہوئے صحن میں آکر بولے۔ ایک غیر متوقع منظر ان کا منتظر تھا۔ چولہے میں آگ جل رہی تھی اور اس پر دھرے توے میں سے نہ صرف دھواں اٹھ رہا تھا، بلکہ اس کے جلنے کی بو پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سلور اور پیتل کے گلاس، پلیٹوں، کٹوریوں اور ڈول پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، سلور کا فرائی پین الٹا پڑا تھا، خشکے کی پرات قریب دھرے آپا رابعہ ہاتھ میں گندھے آٹے کا پیڑا پکڑے گم صم بیٹھی تھی۔
اس صورت حال نے کم فہم مولوی سراج سرفراز کی چھٹی تو نہیں، کوئی دوسری یا تیسری حس ضرور جگا دی تھی، جو انہیں کہہ رہی تھی کہ کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر توا چولہے سے اتار کر نیچے رکھا۔
"خیر ہے بھئی! کیا ہوا؟" انہوں نے نائلون کے ڈبے میں رکھے گندھے آٹے کو مکھیوں سے بچانے کے لیے

اس پر ڈھکن رکھا اور خود آپا رابعہ کے سامنے رکھی پیڑھی پر مریدوں کی طرح بیٹھ گئے۔

"رابعہ بی بی! خیر ہے' کیا بات ہوئی؟" اپنے سوال کے جواب میں جامد خاموشی پر انہوں نے آپا رابعہ کا کندھا جھنجوڑتے ہوئے ایک مرتبہ پھر سوال کیا۔

"ہوں۔" آپا رابعہ جیسے بے ہوشی کے عالم سے ہوش میں آئیں۔

"خیر ہے نا۔ کیا ہوا؟" مولوی صاحب نے رنگ برنگ موٹے نگ جڑی چاندی کی انگوٹھیوں والا ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

"خیر کدھر ہے۔" آپا رابعہ نے دیوانوں کی طرح ہاتھ میں پکڑا پیڑا خشکے کی پرات میں پٹختے ہوئے کہا اور سر سے اترا دوپٹا سر پر جمایا۔

"ہوا کیا ہے؟" مولوی صاحب کا چوہے جیسا دل انجانے خدشات کے تصوّر سے لرزنے لگا۔ "رزق' روزی' مسجد کی چاکری" ان کا دل ان تینوں چیزوں کے جانے کے خوف سے ہی لرزتا تھا۔

"سعدیہ بچی نہیں رہی مولوی سراج! سعدیہ جوان ہو گئی ہے۔" آپا رابعہ نے وحشت زدہ نظروں سے مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

"وہ سر اٹھا کر بولنے لگی ہے اور اسے اپنے سوالوں کے جوابوں کے متعلق اندازہ بھی ہونے لگا ہے۔"

"آرام سے رابعہ بی بی! آرام سے۔" مولوی صاحب نے سکھ کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ رابعہ بی بی کی یہ حالت نوکری' روزی' روٹی کے جانے کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔

"کب تک آرام سے بات کروں مولوی سرفراز؟" آپا رابعہ کو مولوی صاحب کے اطمینان بھرے لہجے پر طیش آگیا۔

"سعدیہ نے جوان تو ہونا ہی تھا نا رابعہ بی بی! کب تک وہ چھوٹی بچی ہی رہتی۔ یہ دس پاس کرلے گی تو اس کا نکاح پڑھا کر رخصت کر دیں گے۔ وقتی سر اٹھانے پر سر قلم کرنے کے بھی طریقے بتاتی ہیں کتابیں۔"

"میں نے اسے ڈاکٹر بنانے کے خواب دیکھ رکھے ہیں مولوی سرفراز! سفید کوٹ والی ڈاکٹر' دل کی دھڑکن چیک کرنے والا آلہ گلے میں ڈال کر رکھنے والی ڈاکٹر۔" آپا رابعہ وحشت زدہ لہجے میں چلّائیں "مگر وہ ابھی سے نشتر لگا کر چیر پھاڑ کرنے کی خواہش کرنے لگی ہے۔"

"میں بڑی بڑی باتیں نہیں جانتا رابعہ بی بی!" مولوی صاحب نے پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے اپنے ہاتھ اپنے گھٹنوں پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "مگر اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ ڈاکٹر چیر پھاڑ کر زخموں اور بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ وہ جب تک جان نہ لیں' بندے کے اندر مرض کیا ہے' مریض کی صرف نبض دیکھ کر دوائی نہیں دیتے' صرف تھرما میٹر کے پارے کا نشان دیکھ کر آگے نہیں بڑھتے۔ وہ ٹیسٹ کرواتے ہیں' ایکسرے کرواتے ہیں۔ ان کی رپورٹیں دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں۔"

"آپ کو یہ پتا ہے تو اتنا بھی پتا ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کس کس مرض کو اندر چھپائے بیٹھے ہیں۔" آپا رابعہ نے ترچھی نظروں سے مولوی صاحب کو دیکھا۔

"ہمیں ہمارے مولا نے سر چھپانے کو اچھا ٹھکانہ دے دیا۔ کھانے پینے کے مسئلے سے آزاد کر دیا۔ اب ہم امراض کے کھرنڈ کیوں کھرچیں؟" مولوی صاحب نے دہی کے ڈبے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

"ہم کیوں کھرچنے لگے۔" آپا رابعہ تیزی سے بولیں "سعدیہ کلثوم کھرچنا چاہتی ہے۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ ہم اس سے کچھ چھپاتے ہیں۔ اسے شک ہو گیا ہے کہ ہمارے ساتھ اور ہمارے پیچھے کوئی گڑبڑ ہے۔"

"کاکی ہے ابھی سعدیہ۔" مولوی صاحب کے معدے نے بھوک اور بوجھل باتوں کے زیر اثر دہائی دینی شروع کر دی تھی "تو ایسے سوال کرنے لگی ہے۔ ذرا اور بڑی ہو گی تو سوچ لو' اپنے طور پر کیا کیا نہ جاننے کی کوشش کرے گی۔" مولوی صاحب نے آپا رابعہ کی سوچ کو مزید انجانے خدشات سے لرزا دیا۔

"وہ۔" پھر مولوی صاحب صافے کے نیچے چھپے بالوں کو کھجاتے ہوئے بولے "ایک روٹی ڈال دو۔ اب تو دن چڑھنے کو آیا۔"

"ان کی ساری فکریں بھوک اور کھانے سے شروع ہو کر بھوک اور کھانے پر ہی ختم ہوتی ہیں۔ انہیں کیا خبر میرا دل کیسے کیسے واہموں سے لرزتا ہے۔"

آپا رابعہ نے دل میں کلستے ہوئے خشکے میں پنچا پیڑا اٹھایا اور روٹی بنانے لگیں۔

"گھی ذرا زیادہ لگا لو۔ دہی پر شکر ڈال کر زیادہ گھی والی روٹی کے ساتھ کھانے کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔" مولوی صاحب نے سرمہ لگی آنکھوں سے دیسی گھی والے ڈبے کے اندر جھانکتے ہوئے فرمائش کی۔

"کھائے جائیں گھی میں تر بتر پراٹھے مولوی جی... بھلے جسم کے ساتھ ساتھ عقل پر بھی چربی چڑھتی چلی جائے اور وقت کے ساتھ اتنی چڑھ جائے کہ انسان اور جانور کا فرق بھی سمجھ سے باہر ہونے لگے۔"

دل ہی دل میں کلستی آپا رابعہ نے سوچا' لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ شوہر کی نافرمانی کرنے والی عورتوں کی بابت وہ اتنی حکایتیں سن چکی تھیں کہ انہیں لگتا' ادھر ان کے منہ سے کوئی غلط لفظ ادا ہوا' ادھر وہ آگ کے شعلوں کے مزید قریب ہوئیں۔



اس نے پندرہویں دفعہ لچک دار آٹے نما ربڑ سے گھوڑا بنانے کی کوشش کی اور پھر اس کی شکل بگاڑ دی۔ گھوڑا اس سے بن نہیں پایا۔ اب وہ مختلف رنگوں کے ڈو کے ڈبے کھول رہی تھی۔ ان ڈبوں کو کھولنے کے بعد اپنے ہاتھوں اور بازوؤں کو تیزی سے حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے انہیں مختلف شکلوں میں ڈھالنے لگی۔

یمی آنٹی نے کچن میں کھانا بناتے ہوئے دوبارہ کچن اور کمرے کی درمیانی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھا۔ وہ میز پر جھکی اس لچک دار ربڑ سے کھیل رہی تھی۔ تیسری بار انہوں نے چشمہ آنکھوں پر لگا کر دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ کیا بنا رہی تھی۔ پیلے رنگ سے اس نے ایک لمبی سی رسی بنانے کی کوشش کی تھی۔ نارنجی رنگ ایک سر' ایک دھڑ' دو بازوؤں اور دو ٹانگوں میں ڈھالا پڑا تھا۔ یہ تمام اعضاء الگ الگ رکھے ہوئے تھے اور اب وہ بھورے رنگ سے نبرد آزما تھی۔

اس کا انہماک اور مسلسل اس کام میں جُتے رہنا یمی کو اچھا لگ رہا تھا۔ وہ رونے' کڑھنے' مایوس رہنے اور حسرت بھری سانسیں لینے کے دور سے ایک قدم آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اس کا یہ قدم منفی لکیر کے بجائے مثبت لکیر کو چھو رہا تھا۔



"مجھے امید ہے' نمائش اچھی رہی ہو گی۔" سعد نے کافی سے لبریز پیالی کی اوپری سطح پر تیرتی جھاگ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں!" کافی کا ایک سپ لینے پر جواب کا انتظار کیے بغیر اس کے منہ سے نکلا۔ "آپ کافی اچھی بناتی ہیں۔"

"یقیناً!" جواب میں وہ اپنے بے تاثر چہرے کو ذرا سا ہلا کر بولی۔ "میں ہر وہ کام اچھا کرتی ہوں' جس میں تلخی کا عنصر موجود ہو۔"

"یقین کیجیے یہ بھی ایک آرٹ ہے۔" سعد نے بے ساختہ کہا۔ "اور بہت دلچسپ آرٹ ہے۔"

"میں جانتی ہوں۔" اس نے سعد کو غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ اور پھر اپنا دھیان اپنی پیالی کی طرف کر لیا۔

"لوگ مٹھاس سے رغبت رکھتے ہیں عموماً"۔ وہ مسکرایا۔ "تلخی میں دلچسپی رکھنے والے لوگ یقیناً" بہت مختلف اور بہت خاص ہوتے ہوں گے۔"

"یقیناً" "تم بہت اچھے انگریزی اسکولز میں پڑھے ہو گے۔ کالج یونیورسٹی میں بھی ضرور ٹاپ کیا ہو گا پھر تمہاری اردو اتنی اچھی اور خالص کیسے ہے؟ تمہارا لب و لہجہ بھی بہت درست ہے، جبکہ تمہاری عمر کے لڑکے منصوصاً جو تمہاری کلاس سے ہی تعلق رکھتے ہیں ان کو تو اس زبان سے اب خار آنا شروع ہو چکی ہے۔" اس نے موضوع کو بالکل ہی بدلتے ہوئے کہا۔

"میں جیسا دیس ویسا بھیس کا قائل ہوں۔ اس لیے۔" سعد نے برجستہ جواب دیا۔ "مجھے پتا تھا آپ عصر حاضر کے علامتی مصوروں کے بجائے ایک ایسی مصورہ ہیں، جس کا رشتہ اپنی زمین ثقافت اور زبان سے بہت گہرا اور مضبوط ہے لہٰذا آپ کے سامنے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہوئے مجھے بہت محتاط رہنا چاہیے۔"

"تم بہت بڑے فنکار ہو" وہ خلاف توقع مسکرائی۔ "بلکہ بہت بڑے ڈرامایاز ہو..... کیوں ایسا ہی ہے کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سعد کی طرف دیکھا۔

"بجا فرمایا آپ نے۔" سعد نے ادب سے جواب دیا۔ "بندہ ناچیز نوٹنکی کا بادشاہ ہو گا عنقریب۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً" سر کو ہلکا سا جھکاتے ہوئے کہا۔ "میرے مستقبل کے منصوبوں میں یہ منصوبہ سرفہرست ہے۔"

"فضل اور میمونہ کو جانتے ہو تم؟" جواب میں اسے ایسا سوال سننے کو ملا جس کی اسے قطعی توقع نہیں تھی۔

"وہ کون؟" اس نے ذہن میں اٹھتے چار قسم کے جوابوں میں سے ایک جواب کا انتخاب کرتے ہوئے کہا۔

"تھی ایک جوڑی۔" وہ کچھ یاد کرتے ہوئے بولی۔ "جس کسی گھر میں ان دونوں نے بطور آیا و کل وقتی ملازم نوکری کی اس گھر کے بچوں کو خالص اردو اور درست لب و لہجہ سکھا کر ہی نکلے۔ میں نے سوچا شاید تمہارے بچپن میں وہ تمہارے گھر میں بھی کوئی تین چار سال لگا گئے ہوں، جب ہی تم اتنی خالص زبان بول رہے ہو۔"

"اچھا!" سعد نے کافی کی پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ "اب کہاں رہتے ہیں یہ دونوں؟"

"ہیں ایک قریبی گاؤں میں..... اب تو صرف زبان ہی باقی رہ گئی ان کے پاس۔ باقی تو سب پر جھاڑو پھر گیا..... تم کافی اور لوگے، بناؤں؟"

وہ اس سے پوچھ رہی تھی اور سعد کا ذہن اس کی بات میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"سعد..... تم اور کافی لوگے؟" اس نے کافی کی پیالی سے چمچ ٹکرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔

"جی..... ضرور لوں گا۔" وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اس گاؤں کا نام معلوم ہے کیا، جہاں وہ دونوں رہتے ہیں؟"

"تم کہاں اٹک گئے بھئی؟" وہ پیالی میں کافی پھینٹتے ہوئے بولی۔ "عرصہ ہوا مجھے ان کی کچھ خبر نہیں ملی۔ یہ تو آخری خبر تھی، جو میں نے تمہیں سنائی۔"

"پلیز فلزا میم! مجھے اس گاؤں کا نام یاد کر کے بتائیے گا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا بہت شوق ہے۔" وہ لجاجت سے بولا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں اپنی ڈائریاں دیکھوں گی کسی وقت۔ شاید کسی یادداشت کے خانے میں ان کا ذکر بھی موجود ہو۔" وہ سرہلا کر بولی۔

"بہت شکریہ میم!" وہ مسکرایا۔
"وہ لڑکی آج کل کہاں ہے، جو تمہارے ساتھ آئی تھی یہاں؟" اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔
"وہ جو آپ کے پاس آپ کی کسی دوست کا پیغام لائی تھی؟" سعد نے جوابی حملہ کیا۔
"ہاں! وہی۔" اس نے اپنا گھنگھریالے بالوں والا سر ہلایا۔ "گرل فرینڈ تھی تمہاری کیا؟"
"اوہ!" سعد نے پیالی میز پر رکھ کر ہنستے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "کبھی وہ نظر آئے یا ملے آپ سے تو اس سے پوچھ مت لیجئے گا کہ وہ میری گرل فرینڈ ہے یا نہیں۔ وہ بہت برا مانتی ہے اس لفظ پر۔"
"ہوں!" جواب میں گھنگھریالے بال پھر ہلے۔ "پھر کون تھی؟ کزن یا محبوبہ؟"
"خدا کا خوف کریں فلزا میم!" سعد نے خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "آپ اس سے مجھے مار پڑوائیں گی!"

"پھر کون تھی وہ؟" اس نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔ "تم نے جو غیر متوقع میل مجھے بھیجی تھی جن میں تمہاری وہ تصویریں تھیں، یہ بتانے کے لیے کہ آج کل کے لڑکے کیا کچھ بنواتے ہیں، وہی میل تم نے اسے بھی کی تھی۔"
سعد نے فلزا ظہور کی اس بات پر نظریں قالین کے ڈیزائن پر ٹکاتے ہوئے کچھ دیر غور کیا۔ اسے آج کل کے لڑکوں کی سوچ پر کیے جانے والے تبصرے پر اچانک آجانے والی ہنسی کو قابو کرنا تھا اور اس اتفاق کو بھی ہضم کرنا تھا کہ ایک میل کو دو مختلف وصول کرنے والوں کا رد عمل کیسا تیکھا اور چبھتا ہوا تھا۔
"ہوں!" کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھائیں اور فلزا ظہور کی طرف دیکھا۔
"میں نے آپ کو وہ تصویریں اس لیے نہیں بھجوائی تھیں کہ آپ کو بتاؤں، میں کیا کچھ ہوں، بلکہ یہ بتانے کے لیے بھجوائیں کہ میں کیا کچھ نہیں ہوں۔"
"جو کچھ تم نہیں ہو، وہ تم سے پہلی ملاقات میں ہی میں اندازہ کر چکی تھی۔" فلزا نے خشک لہجے میں جواب دیا۔
"پھر یوں سمجھ لیں کہ اس لیے بھجوائیں کہ آپ کو بتا سکوں، میں آپ سے رابطے میں رہنا چاہتا ہوں۔"
"اچھا چلو! یوں ہی سہی۔۔۔ اور اس لڑکی کو؟" وہ ابرو چڑھا کر بولی۔
"اسے اس لیے کہ دراصل اسی کو بھجوائی تھیں۔" سعد کے چہرے پر ایک نرم سی مسکراہٹ پھیلی۔
"ہوں!" فلزا نے اس کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
"اچھی لگی تھی وہ مجھے۔" اس کا لہجہ بھی نرم ہو گیا۔ "اور میری جن دوستوں کے حوالے سے یہاں آئی تھی، وہ بھی شاندار پس منظر سے تعلق رکھتی ہیں۔"
"کیا یہ ممکن ہے کہ میں آپ کا اسٹوڈیو دیکھ سکوں؟" سعد نے اچانک موضوع بدلا۔
"وہاں کیا ہے۔" فلزا نے اپنے پھول دار جمپر کو ہاتھ سے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
"کچھ رنگ، جو خشک ہو چکے، کچھ ادھورے کینوس، کچھ اجڑے برش۔"
"جو بھی ہے مجھے، بہت شوق ہے، مصوروں کے اسٹوڈیوز دیکھنے کا۔ کوئی دوسرا بڑا مصور تو شاید مجھے قریب بھی پھٹکنے نہ دے، لیکن آپ نے اتفاق سے مجھ جاہل پر نظر کرم فرما ہی دی ہے تو کوئی حرج تو نہ ہوگا، جو ایک نظر دیکھ لوں۔"

"ہوں!" فلزا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے۔ آؤ! اسٹوڈیو دیکھتے ہیں۔" وہ خلاف توقع جلد مان گئی۔
"ادھر سے آجاؤ۔" وہ چھوٹے سے لونگ روم سے ملحقہ اوپن کچن سے گزر کر اس کا دروازہ ایک مختصر سی راہداری میں کھولتے ہوئے بولی۔ یہ مختصر راہداری ایک طرف سے بند تھی اور اس کے دوسرے سرے پر سے

سیڑھیاں اوپر کو جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے کشادہ جگہ نہ ہونے کے سبب سیڑھیاں ہر تیسری سیڑھی پر جا کر دوسری طرف کو گھوم جاتی تھیں۔
"ذرا دھیان سے قدم رکھنا۔ سیڑھیاں کم چوڑی ہیں۔" فلزا نے بجلی کا ایک بٹن دبا کر ان سیڑھیوں کی چھت پر موجود واحد انرجی سیور روشن کرتے ہوئے کہا۔ کم طاقت کا یہ انرجی سیور مدھم سی روشنی پھیلانے کے سوا کچھ نہ کر سکا تھا۔ سیڑھیوں کے آخری چکر پر لکڑی کا کمزور سا، ہلکا سبز رنگ اڑا دروازہ جڑا تھا، جس کی سنہری ناب بھی پرانی ہونے کے سبب اپنی آب کھو چکی تھی۔ فلزا نے ناب گھما کر دروازہ کھولا۔ دروازے کے دوسری طرف موجود کمرے سے نجانے کب سے بند ہوا کو باہر نکلنے کا موقع ملا تھا۔ سعد نے بے اختیار اپنے چہرے پر ہاتھ رکھا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔
"تھوڑی دیر ادھر ہی رکو۔" فلزا نے سعد سے اگلی سیڑھی پر کھڑے کھڑے کہا اور پھر آگے بڑھ کر کمرے کی ٹیوب لائٹ روشن کی۔ سعد نے تھوڑا آگے جھانک کر اندازہ لگانے کی کوشش کی۔ یہ کمرہ بہت عرصے بعد کھلا تھا۔ اس کے فرش کی گرد باہر ہی سے نظر آ رہی تھی۔
"آجاؤ!" فلزا نے اپنے اول جلول سے ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ گھساتے ہوئے کہا۔
سعد اس کے پیچھے کمرے میں داخل ہو گیا۔ یہاں مختلف سائز کے ایزل اور ان پر رکھے کینوس دکھائی دے رہے تھے۔ دیواروں پر کچھ ادھورے چارکول اسکیچز ٹنگے تھے اور ان پر مکڑی نے خوب صورتی اور مہارت سے اپنے تار پھیلا رکھے تھے۔
"کافی گھٹن ہے یہاں۔" سعد نے دو قدم آگے بڑھ کر اس مختصر سے کمرے میں موجود واحد کھڑکی پر ہاتھ رکھا، جس کے پٹ باہر کو کھلتے تھے۔
"ہاہاہا۔۔۔ نہیں کھلے گی۔" مختصر کمرے میں فلزا کی ہنسی کی آوازیں گونجی کہ ایک لمحے کے لیے سعد کا دل بھی لرز گیا۔ اس نے کھڑکی کی چٹخنی اتار کر اس کے پٹ باہر کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی۔ کھڑکی واقعی نہیں کھل رہی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر اس کے اوپری حصے میں جڑے گرد آلود شیشوں کو دیکھا اسے سبز پتوں کی موہوم سی شبیہہ نظر آئی۔ اس نے کھڑکی کے پٹ پوری طاقت سے باہر کی طرف دھکیلے۔ دونوں پٹوں کی درمیانی جگہ سے اسے کسی پیچ دار بیل کی موٹی شاخیں کھڑکی سے لپٹی محسوس ہوئیں۔ اس نے دونوں پٹوں کی درمیانی جگہ سے آنکھیں جوڑ کر باہر جھانکنے کی کوشش کی پیچ در پیچ بیل کی پتلی اور موٹی شاخوں نے کھڑکی پر قبضہ کر رکھا تھا۔
"ہاہاہا۔" عقب میں ایک بار پھر فلزا ظہور کے قہقہے کی آواز ابھری۔ گرد، جالے، ادھورے کینوس، رنگوں کے زنگ آلود ڈبے، کھڑکی سے لپٹی بیل اور یہ قہقہہ۔۔۔ سعد کو یوں لگا جیسے وہ پیچھے مڑ کر دیکھے گا تو اسے فلزا ظہور کے بجائے لمبے دانت منہ سے باہر نکالے، خون آلود ہونٹوں والی، خوں آشام چڑیل کھڑی ملے گی۔
"واہ! کیا فیری ٹیل سچویشن ہے۔" اس نے کھڑکی کی طرف رخ کیے سوچا۔ پھر آرتھر کانن ڈائل کی کسی کہانی کے منظر کا اسے خیال آیا۔
"ویسے اگاتھا کرسٹی کے کسی کردار کی طرح جو یہاں ابھی میرا قتل ہو جاتا ہے تو اخبار اور ٹی وی کیسے اسکوپس تیار کریں گے۔"
اس نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنے سیل فون پر بغیر دیکھے ایک پیغام ٹائپ کیا اور ایک نمبر پر بھیج دیا۔ میسج ڈیلیور ہو جانے کی ٹون سن لینے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے پیچھے کی طرف مڑا۔ اس کی تمام توقعات غلط ثابت ہوئیں۔ اس کے سامنے فلزا ظہور اپنے جمپر اور اول جلول ٹراؤزر میں ملبوس سینے پر ہاتھ باندھے دروازے سے ٹکی کھڑی تھی۔

"دیکھا میرا اسٹوڈیو۔۔۔ کیسا لگا؟" وہ مسکرائی۔

"ویسا ہی جیسا بڑے مصوروں کا ہونا چاہیے۔" سعد نے اب وہاں موجود کینوس ایک ایک کر کے دیکھنے شروع کیے۔

"کافی تیز رنگ استعمال کرتی ہیں آپ؟" اس نے تبصرہ کیا۔

"کرتی تھی۔" جواب آیا۔

"تھی کیا مطلب؟" سعد نے اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اب پینٹنگز اور چارکول اسکیچ بنانے چھوڑ دیے ہیں۔ یہ میرے آخری "آخری اور ادھورے کینوس ہیں۔ یہ وہیں رک گئے، جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔"

"مگر کیوں چھوڑا۔۔۔ یہ کمال کا کام ہے۔" سعد نے ایک کینوس پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ پھیرنے سے کینوس پر پڑی گرد اس کی انگلیوں پر چپک گئی۔ اس کینوس کے نیچے اس ادھوری پینٹنگ کا عنوان لکھا تھا۔ سعد نے تیزی سے ان لکھے ہوئے الفاظ پر سے گرد صاف کی۔

I want to be a bride when I grow up

(میں بڑی ہو کر دلہن بننا چاہتی ہوں۔)

اس نے یہ عنوان پڑھا اور پینٹنگ پر غور کیا، یہ سلک پر واٹر کلر میں پینٹ کیا گیا ایک ادھورا منظر تھا۔ ایک بچی کے دھڑ پر ایک دلہن کا سر جس پر تیز رنگوں کی آمیزش سے ادھورا سا دوپٹا اوڑھایا گیا تھا۔ وہ دلہن جس سمت دیکھ رہی تھی وہ حصہ بالکل ادھورا تھا۔ اسے مایوسی ہوئی۔ اس نے ادھورے حصے میں کچھ تلاش کرنے کے لیے اس پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ سلک خاصا پرانا ہو چکا ہے۔ اتنی زور سے اسے ہاتھ سے صاف کرو گے تو پھٹ جائے گا۔"

اسے قلزا کی آواز سنائی دی۔ اپنی کوشش ترک کرتے ہوئے وہ دوسرے کینوس کی طرف متوجہ ہوا اور بری طرح چونک گیا۔ اس پینٹنگ میں ایک لڑکی کے بچہ پیدا کرنے کا ادھورا منظر تھا۔ اس تصویر پر سرخ رنگ کا راج تھا۔ اس نے دردزدہ لڑکی کے چہرے کے تاثرات پر نظر ڈالی جو گرد کی تہہ کے نیچے بھی اتنے واضح نظر آ رہے تھے کہ وہ مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

"Midnight in heaven۔"

(جنت میں آدھی رات۔) اس پینٹنگ کا عنوان بھی انتہائی چونکا دینے والا تھا۔ اس نے مڑ کر قلزا کو دیکھا۔

"یہ اب تک کی آخری پینٹنگ ہے۔" وہ جیسے نیند میں بول رہی تھی۔

"اس کے بعد میں نے کچھ شروع کیا، نہ اس کو مکمل کیا۔" اس کی آواز جیسے نامحسوس ہوا میں سرسرا رہی تھی۔

سعد نے کچھ دیر اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے قلزا کو دیکھا اور پھر ہاتھ آگے کرتے ہوئے بولا۔

"چلیں۔"

"ہاں! چلو۔" قلزا نے سرہلاتے ہوئے اسے دیکھا۔ سعد کے چہرے پر تناؤ تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خاموشی سی تن گئی تھی۔ شاید اس کے جبڑے ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے تھے کیونکہ اس کے جبڑے کی ہڈیاں صاف، کھنچی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بھی وہ خاموش رہا تھا۔

لونگ روم میں واپس پہنچ کر اس نے میز پر رکھے ٹشو پیپر باکس سے ٹشو پیپر نکالا اور اپنے ہاتھ صاف کرنے لگا۔

"کچن کے سنک پر سینیٹائزر (sanitlizer) رکھا ہے۔ ہاتھ دھو لو۔" قلزا نے اوپن کچن کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بغیر کچھ کہے سنک کی طرف چل دیا۔

ہاتھ دھونے کے بعد وہ قلزا کی طرف مڑا۔

"کچھ چیزوں کا نہ دیکھنا ان کو دیکھنے سے بہتر ہوتا ہے نا؟" قلزا نے کہا۔

"میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔" اس نے بھاری آواز میں جواب دیا "چیزیں اور حقیقتیں کیسی ہی ظالمانہ کیوں نہ ہوں، انہیں دیکھنے کی ہمت ہونی چاہیے۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

"میں اب چلتا ہوں۔"

"عشائیے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا۔" اس نے جیسے سعد کا موڈ خوش گوار کرنے کے لیے گاڑھی اردو کا استعمال کیا۔

"پھر کبھی سہی۔" اس نے کہا۔

"میں اب منی ایچرز اور کیلی گرافی پر کام کرتی ہوں۔ وہ الگ کمرہ ہے، جہاں بیٹھ کر میں خطاطی کرتی ہوں۔ وہ نہیں دیکھو گے؟"

"میں آپ کے پاس اکثر آیا کروں گا۔۔۔ لہٰذا اسے پھر کسی دن دیکھ لوں گا۔"

"میں زیتون اور مشروم کا سلاد بہت اچھا بناتی ہوں۔ اگر تم مجھے صرف پندرہ سے بیس منٹ دو تو۔" قلزا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے آپ کو بتایا نا۔۔۔ میں آپ کے پاس اب اکثر آیا کروں گا۔" اس نے نرمی سے قلزا کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کے پاس عشائیہ، ظہرانہ اور فجرانہ سب کروں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔"

"تم یقیناً بہت مختلف ہو۔" قلزا نے کہا۔

"نہیں! میں بالکل ویسا ہی ہوں۔ صرف میں کہنے والی بات دل میں رکھنے کے بجائے کہہ دیتا ہوں۔"

سعد نے جواب دیا اور لونگ روم کے میز سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر نکل آیا۔ چھوٹے سے پورٹیکو میں قلزا کی وٹز (Vitz) کھڑی تھی۔ وہ گاڑی کو کراس کر کے گیٹ کے قریب پہنچا اور لاشعوری طور پر سر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس گھر کی مشرقی دیوار پر نیچے سے لے کر اوپر تک بیل پھیلی تھی۔ رینگ رینگ کر اوپر چڑھتی بیل پیچ و خم کا شاہکار بیل اور یہی بیل اوپر جا کر لکڑی کی اس رنگ اڑی کھڑکی پر بھی چڑھی تھی جس کے پیچھے قلزا ظہور کا ادھورا جہاں ویران پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ ہن سرکس میں کام نئیں کرتے ہو؟" کھاری نے لاہور میں اپنے واحد دوست سے پوچھا۔ یہ دوست بھی چوہدرانی کے اس دورہ لاہور کے دوران ہی ملا تھا، جس میں چوہدرانی کے ساتھ کھاری اپنی ڈیوٹی لگ جانے پر کبھی خوش ہوتا اور کبھی اس سے اوبھ جاتا۔

"نہیں یار! اب سرکس میں کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔" اس کے دوست نے جواب دیا تھا۔

"اچھا جی! پر میں نے سنا تھا (کافی) پیسے لبھ (مل) جاتے ہیں سرکس میں۔" کھاری نے چوکیدار کا فون ایک کان سے اتار کر دوسرے کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"پیسے ہی کمانے ہیں نا کھاری صاحب! تو سرکس میں نہ سہی، کسی اور جگہ لوگوں کو ہنسا کر کما لیں۔ کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آہو! یہ تو سولہ آنے سچی بات آکھی تساں نے اپنا۔۔۔" کھاری نے نام یاد کرنے کی کوشش کی۔ "کیا نام بتایا تھا

تساں اپنا؟"

"محمد رضوان الحق۔"

"ہیں جی! کھاری اتنے زیادہ اسلامی نام کی بالکل بھی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر جو آتے ہیں نا جاپانی اور چینی' ان کے نام تو اوکھے اوکھے (مشکل) ہوتے ہیں۔ پنگ کرکے' کبھی چنگ کرکے' کبھی ژاؤ ژاؤ۔ نام لو تو ہنس ہنس کے پیٹ دوہرا ہو جائے بندے کا۔" کھاری زور سے ہنسا۔

"میں مسلمان ہوں کھاری بھائی! الحمدللہ۔"

"او ہووئی (بھئی) واہ جی واہ۔" کھاری بچوں کی طرح خوش ہوا۔ "تساں نے نماز تے قرآن سیکھ لیا ہوا ہے؟"

"ہاں! وہ بھی آتا ہے الحمدللہ۔"

"واہ بھئی بھائی محمد رضوان الحق! تسی ادھر ہمارے فارم ہاؤس پر ضرور آنا۔ میں آپ کو اپنی بھین جی سے ملاؤں گا۔ وہ بڑے خوش ہون (ہوں) گی تساں نال مل کے۔"

"ضرور کھاری بھائی! میں تب آؤں گا جب میلہ ہوگا۔ مجھے میلوں کے ہنگھوڑوں والے جھولے بہت پسند ہیں۔"

"اوئے ہوئے ہوئے۔" کھاری نے خوشی سے اچھلتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

"ایک واری جب میں نکا کا تھا نا! مائی جنتے کے ساتھ ہنگھوڑوں والے جھولے پر بیٹھ گیا تھا۔ لو جناب! ہمارا والا ہنگھوڑا ہی الٹ گیا۔ وب کے سٹ (بری طرح چوٹ) لگی میرے متھے پر گڑومو (سوجن) پڑ گیا تھا۔ گڑومو سمجھتے ہو تسی؟" کھاری کو اچانک مخاطب کی مختلف قومیت یاد آگئی۔

"مجھے سب سمجھ ہے کھاری بھائی! آپ بولیں۔"

"تساں مینوں بھائی بول دتا ہُن میں تساں کو بھائی بن کے دکھاؤں گا جی۔" کھاری نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے اردو بولنے کی کوشش کم کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں محمد رضوان الحق کی ہنسی کی آواز آئی۔

"تسی کتنا میٹھا ہسدے او جی۔" کھاری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"شکریہ کھاری بھائی! اور آپ بھی بہت میٹھی باتیں کرتے ہو۔"

"چلو فیر پکا ہو گیا ناں' تسی میلے پر آرہے ہو۔"

"ضرور ان شاء اللہ لیکن واپس جانے سے پہلے آپ نے میرے پاس چکر لگانا ہے ضرور ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

"او ایدھر جی۔" کھاری نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "بڑی مشکل ہے۔ میں جن کے پاس کاما (ملازم) ہوں انہاں دی فیملی وچ بڑی وڈی شادی ہو رہی ہے اور مجھے وہاں تہاڈے پاس لے کے جانے والا کوئی نئیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں' آپ مجھے پتا بتاؤ کھاری بھائی! میں خود آپ کو لے جاؤں گا۔"

"اچھا جی! کھاری سوچ میں پڑ گیا' اچھا فیر اے لو بھائی چوکیدار نال گل کرو وہ اڈریس سمجھاتا ہے آپ نوں۔"

گل خان نے کھاری کے دوست کو ایڈریس سمجھایا اور فون بند کرکے کھاری کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔

"کی ہویا جی؟" کھاری نے چوکیدار کے دانت نکوسنے پر پوچھا۔

"یہاں بھی دوستیاں بنالیں تم نے کھاری! تم بادشاہ آدمی ہو بھئی۔"

"بندہ ہی بندے دا دارو (ساتھی) ہوتا ہے بھائی جی!" کھاری نے جواب دیا۔ "اس غریب کا بھی آگا پیچھا کوئی

نئیں تے میرا بھی کوئی نئیں۔"

"تمہیں تو چوہدری صاحب نے شہزادوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔ تمہارا آگا بھی وہ' تمہارا پیچھا بھی وہ۔" چوکیدار نے اسے یاد دلایا۔

"اے تے ہے۔" کھاری نے سر ہلایا۔ "پر بھائی گل خان جی' دنیا تو سگے ماں پیو کا پوچھتی ہے نا' جب پار (پچھلے سال) نویں ووٹ بنے تھے نا' اس وقت چوہدری صاب نے میرا ووٹ بھی بنوایا تھا' پھر شناختی کارڈ بھی۔ اب دسو کہ وہ جو والد صاحب کا نام لکھواتے ہیں نا۔ جدھر وہاں چوہدری صاحب کیا لکھاتے؟"

"پھر انہوں نے کیا کیا؟" گل خان سگریٹ کا کش لگانا بھول کر پوچھنے لگا۔

"بس کوئی دال دلیہ کر لیا چوہدری صاحب نے۔" کھاری نے دائیں ٹانگ بائیں گھٹنے پر رکھ کر شان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے چوہدری صاحب مشکل سے مشکل کام بھی کر سکتے تھے۔

"بلے بھی بلے۔ جب ہی چھوٹی پارٹیاں روتی ہیں کہ بڑی پارٹیاں جعلی شناختی کارڈوں پر ووٹ بنواتی ہیں۔" گل خان نے اپنی شہری معلومات جھاڑی۔

"جعلی کیوں بھئی؟" کھاری نے برا مانتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میں ہوں نہیں بھلا' ہوں نا تو پھر شناختی کارڈ کیوں جعلی ہو گیا۔"

"یہ بھی ہے۔" چوکیدار نے سر ہلایا۔ اسی وقت گھر کی اندرونی عمارت کا دروازہ کھول کر ماہ نور باہر نکلی۔

"کھاری! تم ادھر بیٹھے ہو' میں نے رضیہ کو کوارٹرز کی طرف بھیج دیا' تمہیں بلانے کے لیے۔" ماہ نور نے دائیں ہاتھ سے اپنے شانوں سے ذرا نیچے تک آتے بال سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

"جی بی بی!" کھاری مؤدب انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"آؤ ذرا' فاطمہ خالہ کی طرف چلتے ہیں' میں نے ان سے کہا تھا تم سے ملواؤں گی۔" ماہ نور آگے چلتے ہوئے بولی۔ کھاری نے سوالیہ نظروں سے گل خان کی طرف دیکھا' اس نے ساتھ والے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شانے اچکا دیے۔

☼ ☼ ☼

"اتنی مزے کی اور انوسینٹ باتیں کرتا ہے کھاری کہ کیا بتاؤں میں آپ کو۔" ماہ نور نے فاطمہ خالہ کے ٹی وی لاؤنج کے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

سفید شلوار قمیض میں ملبوس' سر پر کروشیے کی سفید ٹوپی رکھے اور پیروں میں نیلی ہوائی چپل پہنے کھاری ایک طرف ہونقوں کی طرح کھڑا تھا۔

"آؤ کھاری بیٹا! بیٹھ جاؤ نا' کھڑے کیوں ہو؟" گوری چٹی مائی نے کہا۔ جو اس دن ماہ نور بی بی کا پوچھ رہی تھی اور انگریزی بھی بول رہی تھی۔

کھاری بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایسے لاؤنجز اور ڈرائنگ رومز میں مہمانوں کو مختلف چیزیں پیش کرنے' ان کی خدمت خاطر کرنے کا عادی تھا۔ خود مہمان بن کر ایسی جگہ پر بیٹھنا اسے کہاں آتا تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور چپل اتار کر نیچے بچھے قالین پر بیٹھ گیا۔

"ارے بیٹا! ادھر کیوں بیٹھے ہو۔ اوپر بیٹھو چلو شاباش۔" خدیجہ نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔

"نہیں جی ادھر ہی ٹھیک ہے۔" کھاری کے لیے یہ بہت نیا اور انوکھا تھا۔

"مجھے تو یوں بالکل بھی اچھا نہیں لگے گا۔ پلیز بیٹا! ادھر اوپر اس اسٹول پر ہی بیٹھ جاؤ۔" خدیجہ نے ایک سنگل

صوفے کے آگے رکھے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ اتنے اصرار پر کھاری کو اور بیٹھنا ہی پڑا۔
"ہاں اب بتاؤ کیا کرتے ہو کیا شوق ہیں تمہارے؟" فاطمہ نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔
"شوق؟" کھاری نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔
"کھاری کو بابے منگو کے میلے پر جانے اور سائیں کی کافی سننے کا شوق ہے صرف۔" ماہ نور نے فاطمہ کی طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔
"اوہ تو کھاری بھی سائیں کا فین ہے۔" فاطمہ نے ماہ نور کا اشارہ سمجھتے ہوئے کہا۔
"اوئے ہوئے کج نہ پوچھو خالہ جی! سائیں جی کی آواز میں کیا بات ہے جی۔"
کھاری اتنا آرام دہ ماحول پا کر تھوڑا سا کھلا۔ "سائیں ہوراں کو ماہ نور بی بی نے پچھیا تھاڈی آواز میں اتنے درد دا راز کی ہے' تے پتا جے کی بولے۔ او آکھیا۔ ایس دا راز عشق ہے۔ ہے نا مہ نور بی بی! یہ ہی دسیا تھا نا! کھاری نے ماہ نور سے تائید چاہی۔
"اچھا عشق میں مبتلا تھے سائیں جی!" فاطمہ نے ماہ نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"اب پتا نہیں یہ عشق مجازی تھا یا حقیقی۔ کیا خیال ہے ماہ نور!" فاطمہ دانستہ ماہ نور کو بولنے پر اکسانے کے لیے بولیں۔
"ہمیں کیا پتا۔" ماہ نور نے ان کے سوال سے نظریں چرائیں۔ "اچھا کھاری! وہ تو سناؤ۔ بندر والے کا قصہ جس کی بندریا لنگڑی اور بندر بھینگا تھا۔" ماہ نور نے بات بدلی۔
اور کھاری کو تو ایسی باتیں سنانے کا موقع درکار تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اس نے ایسے ایسے قصے سنائے کہ مدتوں سے کھل کر نہ ہنسنے والی خدیجہ اور فاطمہ کی آنکھوں میں ہنس ہنس کر پانی بھر آیا۔
"اف توبہ کھاری بیٹا! تم تو دوائے لا مرض ہو۔" خدیجہ نے چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں ٹشو پیپر سے خشک کرتے ہوئے کہا۔
"کیا مطلب خدیجہ خالہ؟" ماہ نور نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔
"مطلب یہ کہ کچھ مرض لادوا ہوتے ہیں یعنی جن کی کوئی دوا نہیں ہوتی اسی طرح کھاری ایک ایسی دوا کی طرح ہے جو کوئی مرض نہ ہوتے ہوئے بھی مریض بنے لوگوں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔" خدیجہ نے وضاحت کی۔
"توبہ! ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ گئے۔"
"اسی لیے تو اسے آپ سے ملوانے لائی ہوں' آپ نے دیکھا' کچھ لوگ کتنے پیور اور نیک فطرت ہوتے ہیں۔ کھاری کو کسی سے کچھ لینا دینا نہیں' لیکن اگر یہ کسی کی زندگی میں شامل ہو جائے تو کیسا ان ڈس پینسیبل (ناگزیر) ہو جاتا ہے۔ جیسے سردار چاچا اور صابرہ چچی کی زندگی میں یہ ایسے داخل ہے کہ وہ اس کا دم بھرتے ہیں۔ دونوں کو اتنا مان ہے اس پر کہ کیا بتاؤں۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو۔" خدیجہ نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ایسے لوگ بہت نایاب ہوتے ہیں اور اس کو دیکھو کیسا خود رو پودا ہے' جدھر کوئی جگہ ملی ادھر ہی کو بڑھ گیا۔ ناتراشیدہ ہیرا ہے یہ۔"
"اب تو کھاری قرآن پاک پڑھنا بھی سیکھ رہا ہے۔" ماہ نور نے جتایا۔ "کیوں کھاری! کتنے سیپارے پڑھ لیے؟ ماہ نور نے کہا۔
"میں ایسہ ہی بات کرنے لگا تھا۔" کھاری نے خدیجہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مہ نور بی بی! جو سچ پوچھو تو انہاں خالہ جی کا ماندرا (چہرہ) ساڈھے بھین جی نال بوت ملاا ے۔ بالکل اوہی نین نقش۔"

خدیجہ نرمی سے مسکرائیں۔ "اگر تمہاری بھین جی میری عمر کی ہیں کھاری بیٹا تو ایسا ممکن ہے کیونکہ اس عمر میں آکر اکثر لوگ ایک جیسے ایکسپریشن چہروں پر سجا لیتے ہیں۔"

"ایکسپریس وا تو مجھے نہیں پتا جی۔" کھاری نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "پر ماندر او یسا ہی ہے۔ بھین جی سے میں سیپارے کا سبق لیتا ہوں جی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کھاری بیٹا! تمہاری بھین جی بہت کلّی ہیں۔" فاطمہ نے ہونٹوں پر آئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔

"ماہ نور! میں نے تمہارے لیے گول گپّے بنائے ہیں کھاؤ گی؟" خدیجہ کو اچانک یاد آیا۔

"گول گپّے۔ آپ نے بنائے؟" ماہ نور نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں بالکل۔" خدیجہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"گول گپے بنانا تو بڑا مشکل کام نہیں فاطمہ خالہ۔ یہ خدیجہ خالہ نے کیسے بنا لیے۔" خدیجہ نے کچن کی طرف چلے جانے کے بعد ماہ نور نے فاطمہ سے پوچھا۔

"ٹی وی کے کوکنگ شوز سلامت رہیں۔" فاطمہ نے صوفے کے بازو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "سارا دن بیٹھی دیکھتی رہتی ہیں۔"

"گول گپے تو جی چاچے خدا بخش دے کھانے والے ہوتے ہیں جی۔" کھاری کو اس گفتگو میں بھی کودنا یاد آیا۔ "تاڑی بالکل نہیں ڈالتا جی پانی وچ' بڑی صفائی ہوندی ہے اس کے برتنوں میں۔ مہ نور بی بی! آپ خالہ جی کو بھی لے کر آنا کبھی فارم ہاؤس' چاچے خدا بخش کو ریڑھی سمیت لے آوں گا۔"

"ضرور کھاری بیٹا! ہم تمہارے فارم ہاؤس پر ضرور آئیں گے' ان شاءاللہ۔" فاطمہ نے اس کی پرخلوص دعوت کا مسکرا کر جواب دیا۔

"محمد رضوان الحق نے بھی وعدہ کیا ہے۔ او وی آئے گا فارم ہاؤس۔" کھاری مسکرا کر بولا۔

"محمد رضوان الحق؟" ماہ نور نے حیرت سے کھاری کو دیکھا۔ "وہ کون ہے؟"

"او ہو وہ ای جیالی کہ پتا نہیں چینی خرگوش۔" کھاری نے سر کے اشارے سے اسے یاد کروایا۔

"اچھا۔" ماہ نور کو ہنسی آگئی۔ "اس کا اتنا مشکل اور بھاری بھرکم نام ہے کیا؟"

"چینی خرگوش کا نام ہے یہ؟" فاطمہ حیرت سے بولیں "ناقابل یقین۔"

ماہ نور' خدیجہ اور فاطمہ کو محمد رضوان الحق کی تفصیل سنانے لگی۔ اس دوران کھاری نے کھانے کی چیزوں سے بھری اس پلیٹ کی طرف توجہ رکھی' جو خدیجہ نے اسے پکڑائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"گاڑی لے تو لی ہے پر ہے چھوٹی۔"

"تم کبھی شکر نہ کرنا کسی بات پر۔"

"ہم نے ہمیشہ اونچے محلوں اور بڑی گاڑیوں کی دعائیں دے کر ویلیں وصول کی ہیں۔ ہم بھاگ لگے رہیں کی دعا جو دیتے ہیں' اس کا مطلب ہوتا ہے کہ قسمت اونچی چمکے' شان دار ہو' اسی لیے تو چھوٹی چیزوں پر حیرت ہوتی ہے' دعا دینے کے لیے اتنا گلا پھاڑا اور چیز ملنے پر آئی تو اتنی چھوٹی۔"

"کبھی گاڑی میں بیٹھنے کا تصور بھی کیا تھا تم نے؟"

"جھوٹ کیوں بولوں' کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم تو چوراہوں اور ٹریفک کے سرخ سگنل پر رکنے والی گاڑیوں کے شیشے بجا کر' لوگوں کو شیشہ نیچے کرنے پر مجبور کرنے والے لوگ ہیں۔ ان کو دعائیں دیتے اور ان کے ڈیش بورڈوں میں رکھے سکوں میں سے اپنا حصہ وصول کرتے ہوئے یہ بھی نہیں دیکھتے کہ گاڑی اندر سے ہے کیسی۔ اب سکہ سکہ جوڑ کر جمع کر بھی لیں تو گاڑی خریدنے جوگے پیسے تو دو زندگیاں مل جائیں' پھر بھی اکٹھے نہیں کر سکتے۔"

"تو پھر شکر کیوں نہیں کرتیں کہ چھوٹی ہی سہی' گاڑی آئی تو سہی۔"

"یہ جو میں چھوٹی بڑی کر رہی ہوں' اپنے لیے تھوڑی کر رہی ہوں۔ یہ تو میں تمہارے لیے کر رہی ہوں' کیونکہ چھوٹی گاڑی تمہاری شخصیت سے چھوٹی لگتی ہے' میں جانتی ہوں تمہارا خاندان بڑا' اس کا نام بڑا' اس کے بھاگ بڑے' پھر تم کیسے چھوٹی گاڑی میں بیٹھو گی۔"

"میرے خاندان کے بھاگ بڑے نہیں' بہت چھوٹے ہیں۔ تم کیا سمجھو اس بات کو۔ جو خاندان بیٹیوں کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر انہیں معاف کرنے کے بجائے انہیں دھکا دے دیں' ان کے بھاگ بہت چھوٹے ہوتے ہیں' بڑے نہیں ہوتے اور دیکھا! تم پھر میرے خاندان کا ذکر لے کر بیٹھ گئیں' کتنی بار تم سے کہا ہے' میرے خاندان کا نام نہ لیا کرو میرے سامنے۔"

"او ہو ہو! غلطی ہو گئی سرکار! کانوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگتی ہوں جناب۔"

"اسلام آباد والے کا بزنس ابھی ڈھنگ سے جما نہیں' پھر بھی اس نے یہ چلتی چلاتی گاڑی لے کر تحفے میں دے دی۔ سوچو گاڑی چھوٹی سہی پر دینے والے کا دل کتنا بڑا ہے۔"

"یہ تو ہے' وہ جو موٹو سیٹھ ہے پیکجز والا۔ اس کے پاس انت کا پیسہ ہے' مگر جتنے اور پیسے کے برعکس دل اتنا سا ہے چڑی جتنا۔ جتنی دیر یہاں رہتا ہے' بیوی کے خوف سے لرزتا رہتا ہے۔ نہ غزل کا لطف اٹھا پاتا ہے' نہ گیت کا اور اٹھتے وقت دیہاڑی کی طرح گنے چنے پیسے دے کر چلتا بنتا ہے۔"

"دل اور پیسہ' دنیا اور لوگ' زندگی کے اس سیاہ دور میں داخل ہونے کے بعد ہی تو دیکھے ہیں میں نے۔"

"تم نے اب دیکھے ہوں گے' میں تو آنکھ کھلنے کے ساتھ ہی دیکھ رہی ہوں۔ میرا ابا اپنے گاؤں کا واحد میراثی تھا۔ جدھر کہیں شادی بیاہ ہوتا اپنی ٹیم اور اپنے بچوں کی فوج لے کر چل پڑتا۔ جگتیں کستا' ویلیں وصولتا' بھاگ لگے رہیں کے نعرے مارتا میراثی۔ ہم بہن بھائیوں کی فوج بارات آنے پر باراتیوں کی طرف سے کئی کئی سوٹ (پیسے پھینکنا) لوٹتے' ابے کی جگتیں سنتے اور ہاتھ میں پکڑے ڈول' لفافے اور ڈبے اٹھائے روٹی کھلنے کا انتظار کرتے۔ جوں جوں ہم بڑے ہوتے گئے' ہمیں جگتیں کرنے' دعائیں اور ویلیں لوٹنے کے فن کے قواعد ازبر ہوتے گئے۔ سو بچپن میں ہی دل بھی دیکھ لیے' پیسہ بھی' دنیا بھی اور لوگ بھی۔"

"اچھا چلو فلسفے نہ جھاڑو۔ کوئی مہمان آتا ہے غزل یا گیت سننے تو تمہاری شکل پر زمانے بھر کی مسکینی چھا جاتی ہے۔ تمہاری نظریں بھاگ لگے رہیں کی دہائی دیتی محسوس ہوتی ہیں اور تمہاری ہر ہر حرکت میں ایسا ندیدہ پن چھلکنے لگتا ہے کہ آنے والا تمہیں علیحدہ سے کوئی چھوٹا موٹا نوٹ پکڑانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔"

"کیا کریں' عادت سے مجبور ہیں۔"

"تمہیں عزت کی زندگی' عزت کی روٹی راس نہیں آئی کیا۔ مجھے تو اس بات کا افسوس ہے کہ میرا ساتھ بھی تمہاری کچھ تربیت نہیں کر پا رہا ہے۔"

"ہائے ہائے۔ اب ایسے تو نہ کہو' میں کتنی بدل گئی ہوں۔ دیکھا نہیں' فیشن کے کپڑے پہنتی ہوں۔ بال بھی تیل سے چپڑنا چھوڑ دیا۔ پلیٹ گلاس میز پر رکھ کر تمہارے ساتھ کھانا کھانا سیکھ گئی ہوں۔ میرے ہاتھ میں پکڑے چمچے نے چاول سنبھالنے بھی شروع کر دیے ہیں۔ آئے گئے کو ادب آداب سے سلام کرتی ہوں۔ موسم کے مطابق چائے' شربت پیش کرتی ہوں۔ نہ بھاگ لگنے کی بات کرتی ہوں' نہ ستے خیراں کا نعرہ مارتی ہوں۔"

"اور وہ کھانے سے پہلے کٹوردان میں سالن ڈال کر نعمت خانے میں کون چھپاتا ہے' تاکہ جب میں سو جاؤں تو باورچی خانے میں بیٹھ کر باسی روٹی کے ساتھ لگا۔ لگا کر بھکر بھکر کھائی جائے آئے گئے کو موسم کا مشروب پیش کرنے سے پہلے جھوٹا کرنا کون لازمی سمجھتا ہے بھلا اور رہا نعرے لگانے کے شوق تو وہ تم تالیاں صاف کرنے والا جمعدار اور سبزی بیچنے والے تک کو سنا کر پورا کر لیتی ہو' کانوں میں ایک وقت میں چار' پانچ بالیاں پہننی تم نے نہیں چھوڑیں اور برانڈے کے گھنگھرو ابھی تک چھنکاتی پھرتی ہو۔"

"تو جی! اتنا کچھ چھوڑ دیا' پھر بھی باتیں۔"

"اچھا' اچھا۔ اب بجائے شرمندہ ہونے کے ناراض ہونے لگیں۔ چلو جاؤ دیکھو! دروازے پر دستک ہو رہی ہے' روٹی لینے آیا ہو گا مولوانوں کا شاگرد۔"

"آئے ہائے! ایک تو میں اس مر بھکے سے بہت تنگ ہوں۔ ٹیچ (عین) اپنے وقت پر آکر دستک دیتا ہے' ایک سیکنڈ نہ آگے' نہ پیچھے۔ دروازہ کھولو تو نظریں نیچے' ہاں کٹورا آگے ہوتا ہے۔"

"چلو جا کر دروازہ کھولو۔ بے چارہ انتظار کر رہا ہو گا اور ہاں دیکھو! میں نے ٹینڈے گوشت کے سالن میں ٹینڈوں کے چھ ٹکڑے اور گوشت کی تین بوٹیاں اس کے لیے رکھی ہیں' خبردار! جو تم نے منہ مارا اس کے حصے پر' میں نے چیک کر لیا ہے۔"

"دل تو کرتا ہے' بتوؤں (بینگن) اور آلو کا سالن دوں اس مردوئے کو' دیکھتی ہوں اگر گرمی کے مارے بساند اٹھانا نہیں شروع کیا تو وہی دوں گی۔ کم بخت کا دل چاہتا ہے گوشت کے ناغے والے دن بھی اس کو بکرے کی پیٹھ اور ران کا گوشت شوربے میں تیرتا ملے۔"

"اللہ جانے تمہیں اس معصوم سے کیا بیر ہے۔ خبردار! جو تم نے اسے کل والا سالن دیا۔ کیا پتا اسی کی دعاؤں سے اللہ ہمیں بھی رزق دے رہا ہو۔"

"اسی کی دعائیں تو ہمیں لگنی ہیں' پتا نہیں کہاں سے بھاگ کر ادھر کو آیا۔ وہ تو مولوانے ہیں' ذرا نیک دل جو اپنے پاس رکھ لیا تو اس کی شکل پر بھی تھوڑی رونق آگئی' ورنہ جب آیا تھا کیسے فاقے نظر آتے تھے اس کی شکل پر۔"

"تم جاتی ہو یا میں خود اٹھوں' بے چارہ پانچویں بار دستک دے رہا ہے' مایوس ہو کر لوٹ جائے گا۔ کچھ سوچو' وہ کلام پاک حفظ کر رہا ہے' اس کے اندر پاک کلام محفوظ ہو رہا ہے۔ تم اس کے بارے میں یوں بات کرتی ہو جیسے نہ جانے کتنا حقیر ہو۔"

"توبہ توبہ اللہ معاف کرے۔ کلام پاک تو سب کلاموں کا بادشاہ ہے۔ میں اندھی' گونگی بہری ہو جاؤں جو اس کی شان میں کوئی گستاخی کروں۔ میں تو اس کی بات کر رہی تھی جو باہر کھڑا ہے' عمر دیکھو اس کی چالیس سال کی عمر میں حفظ کرنے کا شوق آیا ہے اسے۔"

"رکو اب۔ میں خود جاتی ہوں' تم تو اس کی عمر اور حالات کا تجزیہ ہی کرتی رہو گی۔"

"نہیں ٹھہرو میں یہ گئی۔"



"اگر آج رات تک میں تمہارے پاس نہ پہنچ پاؤں تو سمجھنا میں قتل ہو چکا ہوں۔"

ابراہیم نے اپنے فون پر آنے والا یہ پیغام پڑھا اور ان تینوں کا انتظار کرنے میں مصروف ہو گیا جنہیں اس نے سعد کی خبر لانے بھیجا تھا۔ کیونکہ اس پیغام کے آنے کے بعد سعد کا فون آف ہو چکا تھا۔

"اچھا تو تم پینا کولاڈا نوش جاں کر کے میرے مرنے کا غم غلط کر رہے ہو۔" دس منٹ بعد اسے اپنے قریب سعد کی آواز سنائی دی۔

"تم کدھر تھے یار! اور کون تمہیں قتل کرنا چاہتا تھا؟" ابراہیم اسے سامنے دیکھ کر جیسے شادیٔ مرگ کی کیفیت میں مبتلا ہوا۔

"تمہیں کیا فرق پڑتا ہے' تمہارے لیے تو مرنا بھی کھانے کے ساتھ اور جینا بھی کھانے کے ساتھ۔"

"نہیں یار! مذاق نہیں' میں واقعی بہت پریشان تھا۔"

"ابے گدھے! اگر تو پریشان تھا تو تجھے چیز باکس کے بجائے پولیس اسٹیشن میں بیٹھے ہونا چاہیے تھا۔"

"میں نے سکندر' کاشف اور طاہر کو تیرے پیچھے بھیجا ہے۔ ابھی دو منٹ پہلے سکندر نے مجھے بتایا کہ تمہاری گاڑی بنی گالہ کی طرف مڑتے دیکھی تھی کسی نے۔ آج تین بجے کے قریب۔"

"اوئے!" سعد نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ "وہ کسی کون تھا جس نے میری گاڑی وہاں دیکھی۔"

"یہ میں کیوں بتاؤں۔" ابراہیم نے دونوں بازو اپنی باہر نکلتی توند پر باندھتے ہوئے چہرہ دوسری طرف کر لیا۔

"تمہارے تو اچھے بھی بتائیں گے۔" سعد نے دانت پیسے۔

"تم یہ بتاؤ نا' تم قتل کیوں نہیں ہوئے ابھی تک بائے دے وے۔" ابراہیم نے اسے تنگ کرنے کی خاطر کہا۔

"کیونکہ مجھے اپنے حصے کا قتل کرنا تھا ابھی۔" سعد نے ابراہیم کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

"بتا اب' فٹافٹ بتا کون تھا وہ۔" اس نے ابراہیم کی گردن اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے کہا۔

"دوست کے ہاتھوں مرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہو گی' دبا دے میرا گلا۔ میں تیرے دل کی کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دینا چاہتا۔" ابراہیم نے زبان باہر نکال کر دائیں طرف لٹکاتے ہوئے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"ایک نمبر کا فراڈ ہے تو۔" سعد نے اس کی گردن چھوڑ دی۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔" گردن چھوٹ جانے پر ابراہیم نے مشروب کا گھونٹ لے کر سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر تمہارا میسج پڑھ کر میں بدحواس ہو جاتا اور انکل کو وہ میسج پڑھا دیتا تو تم جانتے ہو کیا ہوتا۔ یار! مذاق کرتے ہوئے ذرا ہاتھ ہلکا رکھا کرو۔"

"پھر تم نے کیا کیا۔" "نہیں بتا تو نہیں دیا۔" سعد کو خطرے کی گھنٹی بجتی محسوس ہوئی۔

"نہیں یار! میں پاگل تھوڑی ہوں۔" ابراہیم نے ہاتھ ہلایا۔ "میں نے اپنے طور پر ان تین جاسوسوں کو بھیجا تھا جنہوں نے اتنی دیر میں مجھے صرف ایک اطلاع دی' وہ بھی چار گھنٹے پرانی۔"

"احمقوں کا ابا جان سمجھتا ہے تو مجھے۔" سعد نے ہونٹ دانتوں کے نیچے دباتے ہوئے کہا۔ "مجھے اپنے قتل کا خدشہ ہوا اور میں ایس او ایس کال دوں گا تجھے۔" اس نے ابراہیم کی طرف اشارہ کیا۔

"تُو جو اول تو کبھی جاگتا نہیں اور جاگا ہوا بھی ہو تو پیغام سمجھ کر جب تک کسی کو بتاتا' مجھے قتل ہوئے اڑتالیس گھنٹے گزر چکے ہوتے۔"

"میں نے پندرہ منٹ کے اندر تین بندے بھیجے تھے تیری طرف۔"

"اور ان تین بندوں نے دو گھنٹوں میں تجھے صرف ایک اطلاع دی اور وہ بھی بے تکی۔"

"مگر اس شرارت کی تُک کیا تھی۔" ابراہیم نے اس کی طرف دیکھا۔

"شرارت نہیں تھی' مجھے واقعی خطرہ تھا کہ شاید ایک خون آشام چڑیل مجھے مار دینے کے درپے ہو گئی تھی۔"

"مجھے پہلے ہی پتا تھا' یہ کسی فی میل کا کام ہی ہو سکتا ہے اور بنا سہیلیاں۔" ابراہیم نے کہا۔

"تو جل اور روتا رہ بیٹھ کر۔ چیز باکس کے کاؤنٹر میں سر دیے۔" سعد نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے

قہقہہ لگایا۔
"میں نہیں جلتا۔" ابراہیم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "یہاں سارا دن جتنی لڑکیاں آتی ہیں نا تُو نے خواب میں بھی نہیں دیکھی ہوں گی۔"
"مجھے خواب میں لڑکیاں نہیں حوریں نظر آتی ہیں محترم! میں پاکیزہ سوچ رکھتا ہوں' تیری طرح بگڑے اور فاسد خیالات نہیں ہیں میرے۔" سعد نے کہا اور ابراہیم کے منہ بنا کر سر جھٹکنے پر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔
"ون اپ۔" اس نے ہاتھ کے انگوٹھے سے اشارہ کرتے ہوئے ابراہیم کو مزید چڑایا۔ جواب میں ابراہیم نے ویٹر کو بلا کر اپنے لیے ایک اور ڈرنک منگوایا اور ڈرنک آنے پر سعد کو نظرانداز کرتے ہوئے گھونٹ گھونٹ پینے لگا۔



"بالکا تو کئی مہینے ہو گئے بھاگ گیا' اسے غم تھا کہ فقیر کے ڈیرے کی چاکری کرنے کے باوجود اسے کوئی اشارہ نہیں ملتا' جھلا تھا' عجلت پسند تھا' انتظار کی مشقت نہیں سہہ سکا' صبر کا پیالہ نہیں پی سکا' فقیر کے ڈیرے کی چار دیواری کے ساتھ تو ہمہ وقت صبر کی چادر چمٹی رہتی ہے' توکل کا سایہ ادھر سے ادھر منڈلاتا پھرتا ہے' بے نیازی بکل اوڑھے ذکر میں مگن رہتی ہے' بالکا سمجھا چار دن کا ڈھا تیار کرنے اور خلقت کو پیالے بھر بھر پلانے سے ہی اشارہ دیا جائے گا۔ بالکے کی نظر صرف اپنی غرض پر تھی' سو خطرہ تھا کہ اشارہ ملنے پر بھی سمجھ نہ پاتا' سو اس کا دل ادھر سے اٹھا دیا گیا' اب وہ اپنی غرض لیے کسی اور کٹیا پر' کسی اور ڈیرے پر' کسی اور جھونپڑی پر' کسی اور کے مسکن پر دستک دیتا پھرے گا' عجلت پسندوں اور بے صبروں کا علاج اسی طرح کیا جاتا ہے۔ انہیں انتظار کی مشقت میں ڈال دیا جاتا ہے۔"
ٹانگوں کے گرد بازو لپیٹے' سامنے دیکھتے اختر نے کہا۔

اج سک متراں دی ودھیری اے
اج جندڑی اداس گھنیری اے

اسے وہ شام یاد آگئی جب اس نے اختر کی کٹیا کے باہر بالکے کو آخری بار دیکھا تھا۔ اسے بالکے کی اداسی اور اس کی آواز کا سوز یاد آگیا۔ تو وہ اس لیے اداس تھا اور یہاں موجود نہ ہونے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس نے ہونٹ سیکڑتے ہوئے سوچا۔
"تو اب اس کے جانے کے بعد۔" اس نے اس تنگ سی کٹیا میں جلتے واحد چراغ کی لو کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اب کیسے چلتا ہے سب' میرا مطلب ہے۔"
"اللہ مالک ہے باؤ صاب!" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک بالکا گیا' کوئی دوسرا آگیا' یہ بالکے بھی سبب کی طرح ہوتے ہیں' جو اللہ بندے کو اس کے کاموں کے سلسلے میں لگاتا ہے۔"
"اور جن کو سبب نہیں لگتے' وہ کس کیٹگری کے لوگ ہوتے ہیں؟"
"یہ ناممکن ہے باؤ صاب! کہ کسی بندے کو عمر بھر کوئی سبب نہ لگے' فرق صرف سبب کو سمجھنے اور اس سے فائدہ اٹھانے سے پڑتا ہے۔"
"میں نے تو اکثر لوگوں کو شکوہ کرتے ہی سنا ہے کہ انہیں اچھا سبب نہیں لگا' اس لیے وہ زندگی میں اچھی چیزوں سے محروم رہے۔"
"گلوں' شکووں کا سلسلہ بھی اس دنیا کا کھیل ہے باؤ جی۔" اختر نے گڑگڑی کا کش لگاتے ہوئے کہا۔ "آپ سے پہلے یہیں اسی جگہ پر ایک سرکاری صاحب بیٹھے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے سائیں جی! بددیانتی بہت بڑھ گئی ہے' ہر

شخص بے ایمانی پر تلا ہوا ہے' انہیں گلہ تھا کہ ان کا گوالا پانی کی طرح پتلا دودھ دیتا ہے۔ میں نے سنا اور خاموش رہا' جبکہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کہوں' صاحب اپنے گوالے سے پوچھو' اس کو کس سے گلہ ہے' یقیناً' اسے بھی بہت سے لوگوں سے گلے ہوں گے' سبزی والے سے گلہ ہوگا کہ سبزی پر پانی چھڑک چھڑک کر اس کا وزن بڑھاتا ہے اور تول میں کمی بیشی کرتا ہے' سبزی والے کو فروٹ والے سے گلہ ہوگا چند دانے اچھے فروٹ میں گلا سڑا فروٹ ملا کر دیتا ہے' فروٹ والے کو منڈی کے آڑھتی سے گلہ ہوگا۔ وہ بلٹی چھڑانے میں ٹائم لگاتا ہے۔ اتنے میں کبھی آدھی' کبھی پوری پیٹی فروٹ گل سڑ جاتا ہے' آڑھتی کو بلٹی کرنے والے سپلائر سے گلہ ہوگا' سپلائر کو محکمے والوں سے گلہ ہوگا' سرکار کے دفتر سے اجازت نامے دیر سے ملتے ہیں' سرکار کے دفتر میں گوالے کے گلے جاری ہیں۔ آپ نے دیکھا باؤ جی! سرا کہاں سے شروع ہوا اور واپس کہاں آکر جڑا۔"
اختر نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔
"اسی طرح سبب لگنے کے سلسلے ہیں' مگر انسان گلہ گزاریوں میں اتنا مشغول ہے کہ سبب اس کے سامنے آتے ہیں' گزر جاتے ہیں' اس کی عقل پر' اس کی نظر پر پردہ ہی پڑا رہتا ہے۔"
"ہوں۔۔ سائیں جی عقل اور نظر کے پردے ہٹانے کا کوئی ٹوٹکا تو بتائیں۔"
"آپ باؤ صاب! رہنے دو' ان سلسلوں میں مت پڑو' آپ کو تو سبب کی پہلے ہی کمی نہیں' مگر آپ جو دوسروں کو سبب لگانے کے چکر میں پڑ چکے ہو تو صاف بات بتاؤں' تم آپ نے خوامخواہ خود کو مشکل میں ڈال لیا ہے۔ اب جو آپ رکے اور رک کر ستانے کی کوشش کی تو وقت آپ پر آزمائش کے پہاڑ کھڑے کر دے گا۔ آپ آزمائش کے ان پہاڑوں کو سر کر سکتے ہو' پر آپ اپنے من کے ہاتھوں مجبور ہو کر زن کے چکر میں جو پڑ گئے ہو' وہ بھی آپ کے لیے آزمائش ہے۔"
"نہیں' ایسا نہیں ہے۔"
"فقیر کی کوتاہ نظر جو دیکھ رہی ہے' وہ آپ شاید ابھی دیکھ نہ پائیں۔"
"کوئی اچھی خبر بھی ہے میرے لیے۔"
"سے ہی خیراں ہیں۔ (سب خیریت ہے) اگر آزمائش کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو پھلانگتے آگے گزر گئے تو' آپ کو من بھی ملے گا' زن بھی اور وہ بھی' جس کی تلاش میں آپ کی روح' جان اور جسم سرگرداں ہے' لیکن جو کہیں راستے میں رک گئے تو آزمائش کے بکھرے پتھر سرک سرک کر ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے اور کوہ گراں ثابت ہوں گے آپ کے لیے۔ پھر کڑا وقت آسکتا ہے۔ میری مانیں' اب بھی اس چکر سے نکل آئیں' ہنے یا بنے (اس پار یا اس پار) کی کیفیت بہت مشکل ہوتی ہے۔"
"آپ میرے حق میں دعا کیا کرو سائیں جی! میں نے کتنے ہی آستانوں' کتنے ہی ڈیروں اور کتنی ہی خانقاہوں میں جھانکا ہے' مگر میرے من کو جو آسودگی آپ کے پاس آکر ملتی ہے کہیں اور نہیں ملی۔"
"اس کی وجہ یہ ہے باؤ صاب! کہ میں بھی آپ ہی کی طرح کا عام انسان ہوں' میں نے بھی دنیا ترک نہیں کر رکھی' روح کی آنکھ سے زیادہ تجربہ کاری اور ہشیاری کی آنکھ سے چیزوں کو دیکھتا ہوں' مجھے اس کٹیا سے کاروبار نہیں چمکانا' میں اپنے رزق کے لیے غلّے میں جمع ہونے والے چندے اور ہدیے پر بھروسا نہیں کرتا' میں کون ہوں' کوئی نہیں جانتا' فقیر کا یہ ڈیرا جتنے دن اجڑا رہتا ہے اتنے دن فقیر کہاں رہتا ہے' کوئی نہیں جانتا' فقیر دفتر میں سوٹ پہن کر بیٹھا ہے یا کسی مسجد میں نمازیوں کے جوتوں پر نمبروں والے ٹوکن سجانے میں لگا ہوا ہے۔ وہ کسی اسمگلر کی' کسی ملک دشمن کی جاسوسی پر لگا ہوا ہے یا کسی حکیم کے مطب پر بیٹھا خاک کی پڑیا میں شفا لپیٹ لپیٹ کر مریضوں کو استعمال کی ہدایات کے ساتھ دے رہا ہے' کوئی نہیں جانتا' مگر فقیر خوب جانتا ہے' رزق وہی خالص ہے' جو ہاتوں

سے نہیں ہاتھوں سے کمایا جاتا ہے۔"

"آپ یہ بھی دعا کریں سائیں جی! کہ ہم سب کو ایسا سوچنے کی توفیق مل جائے۔"

"دعا ہی تو کرتے ہیں دعا کرنے کے لیے ہی بیٹھتے ہیں باؤ صاب! آپ راستے میں رکنے کی غلطی کبھی نہ کرنا جو جان جوکھوں میں ڈال ہی لی تو دریغ نہ کرنا۔"

"ہوں۔ سائیں جی! اس روز اس لڑکی کو کن مشکلات کی بات سنا رہے تھے آپ۔"

"ہاں!" اختر نے گڑگڑی منہ سے ہٹا کر سرہلایا۔ "پتا ہے اس پر مشکل کس کی وجہ سے آئی ہے؟ سرمت جھکاؤ باؤ صاب! من اور زن میں توازن پیدا کرلو تاکہ وہ اس مشکل سے بچ جائے۔"

"میرا دل ڈر گیا ہے اس روز سے آپ ایسی باتیں مت کرو۔"

"ڈرنا نہیں نانا ڈرنا نہیں۔" اختر نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کا من صاف ہے باؤ صاب! بس سمت کے تعین میں بھٹک رہے ہو جس دن اس کا تعین ہو گیا اس دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کمال کی بات نہیں ہے کبھی ڈراتے ہیں کبھی تسلی دیتے ہیں میں مانتا ہوں سب ٹھیک ہی کہا ہوگا مگر وہ جو من پالیتے ہیں وہ تو عبادت گزار ہوتے ہیں۔ تسبیح کے دانے گرانے والے طویل سجدوں میں راتیں گزارنے والے دیں تو بڑا گناہ گار ہوں۔"

"واہ باؤ جی! بڑے بھولے ہو۔" اختر ہولے سے ہنسا۔ "عبادت سجدوں اور تسبیحوں ہی کا نام نہیں ہے سجدے اور قیام رکوع اور تسبیح بندگی کی علامت ہے مگر عبادت کے تو کئی رنگ اور بھی ہیں وہ جو اس کی مخلوق کے لیے آسانیاں تلاشتا ہے وہ جو اس کے بندوں کے لیے دل میں بغض اور حسد نہیں رکھتا وہ جو اس کے بندوں کا برا نہیں چاہتا وہ بھی عابد ہے اس کی عبادت کا بھی ایک درجہ ہے۔"

"کیوں گھبرا گئے باؤ جی۔" اختر ہنس کر بولا۔ "فقیر کو اتنی پرسنل باتیں کیسے پتا چل گئیں۔ ایک دن آئے گا جب آپ کو بھی پتا چل جایا کریں گی۔"

"اچھا۔ میں اب چلتا ہوں۔" وہ جیسے مزید برداشت سے قاصر ہوا۔

"ہاں۔ ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی توڑنا نہ اس پر شک کرنا کیونکہ آپ کے معاملے میں وہ بڑا بے لوث ہے بڑا کھرا ہے جو یہ غلطی کر گئے تو سمجھو ساری عبادت مٹی ہو گئی۔" اختر نے اس کے اٹھتے اٹھتے ایک اور وارننگ دیتے ہوئے کہا۔

وہ سرکی کی جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر تازہ ہوا تھی اور سانس لینا آسان تھا۔ اس نے ہوا کے سنگ آتے دھوئیں کے بادل سے چہرا بچانے کی کوشش کرتے ہوئے بھی لاشعوری طور پر اس سمت دیکھا جہاں سے وہ دھواں پھیل رہا تھا۔ ایک نوجوان جو شکل سے تعلیم یافتہ لگ رہا تھا ہلکی مونچھیں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی چہرے پر سجائے سر پر پلاسٹک کی سبز ٹوپی رکھے الاؤ پر دیگچی چڑھائے بیٹھا اس میں ڈوئی چلا رہا تھا۔ اس لڑکے کے چہرے پر نرمی تھی اور ہلکا سا تبسم۔

"السلام علیکم۔" اس نے آگے بڑھ کر اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

"وعلیکم السلام!" اس نے جھکی نظروں کے ساتھ ادب سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"عبدالودود۔"

"کب سے ادھر ہو؟"

"کل ہی آیا ہوں۔"

"اوہ پھر تو انجان ہو گے بالکل۔"

"فی الحال تو۔"

"کاڑھا بنا رہے ہو۔"

"نہیں آلو کی قتلیاں پکا رہا ہوں۔"

" oh i can feel the difference " (میں فرق محسوس کرسکتا ہوں۔)

" Every new face is different from the old one "

(ہر نیا چہرہ پرانے سے فرق ہی ہوتا ہے۔)

لڑکے کے جواب نے اسے حیران کیا۔

"پڑھے لکھے ہو۔"

"نہیں۔ لیکن پڑھنے لکھنے کے لیے آیا ہوں طفل مکتب ہوں۔"

"اللہ کرے ٹکے رہو پہلے والے بالکے کی طرح بھاگ نہ جانا۔"

"قسمت پر منحصر ہے دانے پانی کی بات ہے۔"

"ہوں!" اس نے ہاتھ بڑھا کر عبدالودود سے مصافحہ کیا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ نہ جانے کیوں اسے اپنا آپ عبدالودود کے سامنے بہت چھوٹا لگا تھا۔

"ایک دل ایسا ہے جس کو کبھی نہ توڑنا نہ اس پر شک کرنا۔" واپسی کے سفر کے دوران اس نے بار بار یہ بات دل میں دہرائی۔

"وہ دل کس کا تھا۔ جو اس کے معاملے میں بڑا کھرا اور بے لوث تھا۔" وہ فوری طور پر اندازہ لگا سکا نہ فیصلہ کرسکا تھا۔

☼ ☼ ☼

"منصو نی اور رازی کو ایکسٹینشن نہیں ملنے والی کیا؟" بلال نے سعد کو اپنے آفس میں بلا کر کچھ اہم معاملات ڈسکس کرنے کے بعد پوچھا۔

"آپ کا کیا خیال ہے۔" اس نے بلال سلطان کی طرف دیکھا۔

"میرا اس بارے میں کوئی خیال نہیں ہے یہ مکمل طور پر تم پر منحصر ہے تم جو چاہو فیصلہ کرو۔"

"اچھا!" وہ ہنسا۔ "کیا میں فیصلے کرنے کے لیے اتنا آزاد ہوں۔"

"تمہیں کوئی شک ہے کیا؟"

"شک کا پتا نہیں بس میں تو کنفرم کرنا چاہ رہا تھا۔" اس نے انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے کہا۔

"مس لینا! میں اور ڈیڈی اکٹھے لنچ کریں گے۔ اس کے لیے آپ شیڈول میں جو تبدیلی لا سکتی ہیں لے آیئے۔" اس نے بلال کی سیکریٹری سے کہا تھا۔

"ہوں۔" بلال کے لیے یہ غیر متوقع بات تھی۔ انہیں لنچ کے دوران ایک اہم بزنس ڈیل ڈسکس کرنی تھی ان کے دماغ نے نفع نقصان کے تمام پہلوؤں میں کیلکولیٹ کیے اور کھٹ سے جواب مرتب کیا۔

"کہاں لنچ کررہے ہیں ہم۔ ابراہیم کے ڈھابے پر؟" انہوں نے اپنا فون آف کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں وہ آپ کے معیار پر پورا نہیں اترے گا۔" سعد نے سرہلایا۔ "ہم گھر پر لنچ کررہے ہیں اور اس لنچ کا

اسٹینڈرڈ اور کوالٹی ہی ضوفی اور رازی کے مستقبل کا تعین بھی کرنے والی ہے۔"
"وہ کیسے؟" انہوں نے بغیر سوچے پوچھا۔
"کیا ان کی کارکردگی کا پیمانہ جانچنے کا اس سے بہتر کوئی اور ذریعہ ہوگا کہ وہ دو افراد جن کے لیے ان کے ... درجن بھر عملہ موجود ہے اور جو کبھی اکٹھے کسی ایک بھی کھانے پر موجود نہیں ہوتے، وہ اچانک اکٹھے لنچ کرنے کے پاس پہنچ جائیں تو ان کا ردِ عمل کیا ہوگا۔"
"وائز گائے (عقل مند لڑکا)" بلال نے بے اختیار کہا۔
"جبکہ آپ کا خیال ہے کہ صرف آپ ہی وائز (عقل مند) ہیں اور باقی لوگ otherwise (یوں ہی ...) ہیں۔" وہ مسکرایا۔
"ثابت ہوا تم اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہو۔" بلال کے ذہن سے سعد کی بات شاید نکلی نہیں تھی۔
"ہاں، جب میں ان جاسوسوں کے اپنا پیچھا کرنے کا عادی ہو جاؤں گا جو میری ہر ہر حرکت نوٹ کرنے پر مامور ہیں، تب ثابت ہو جائے گا۔"
"اس بات میں یہ اضافہ بھی کر لینا تھا کہ جن کو میں اکثر چکمہ دینے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔" بلال نے ... ہوئے کہا۔
"وہ میرا Trait (طریقہ) ہے۔ اس کو سراہا جانا چاہیے۔"
"دیکھتے ہیں۔" بلال دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔
سعد زیرِ لب مسکرایا اور ان کے پیچھے چل دیا۔

☼ ☼ ☼

"یہ میں نے کلر کی ہیں، یہ سب۔" سارہ نے سر اٹھا کر ذرا سا اونچا کیا۔
"مگر آئی ایم سوری۔ اس میں بہتری کی گنجائش کافی زیادہ ہے۔" سعد نے ان فگرز پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا جن میں سارہ نے رنگ بھرے تھے۔ سارہ کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ سعد اس کی کارکردگی پر توصیفی جملے کہنے کے بجائے اس پر تنقید کر رہا تھا۔ اس نے بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا۔
"امپروومنٹ کی گنجائش تو ہمیشہ ہوتی ہے نا۔" وہ شاید اس کی نظروں میں چھپی حیرت اور بے یقینی کو سمجھ رہا تھا۔
"ہاں، مگر تم شاید بھول رہے ہو کہ یہ ان ہاتھوں نے کیا ہے۔" سارہ نے اپنے ہاتھ اس کی نظروں کے سامنے پھیلائے۔ "ویک مسلز اور ٹوٹ کے جڑی رگوں کے ساتھ جن میں کم رفتار سے دوڑتا خون، انہیں سست اور کمزور بنا دیتا ہے۔"
سعد نے اپنے سامنے پھیلے ان ہاتھوں کو دیکھا، جن کی ہتھیلی کی کھال چرمرائی ہوئی تھی۔ اس پر جھریاں سی پڑی تھیں اور جن کی کھال زردی مائل تھی، ان میں سرخی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس نے بے اختیار سارہ کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔
"یہ ہاتھ بہت پیارے اور بہت ہمت والے ہیں سارہ!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "ان ہاتھوں نے پہلے بھی بہت ہمت والے کام کیے تھے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ ایسے ہی کام انجام دیں گے۔"
"نہیں۔" سارہ نے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔ "یہ اب کوئی بھی کام بہتر طریقے سے نہیں کر سکیں گے۔"

"تم جانتی ہو۔ مجھ پر ایسی نیگیٹیو باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور اب میں ان کا جواب بھی نہیں دینا چاہتا۔" سعد کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ان ڈرائنگ بکس میں زیادہ سے زیادہ کلر کرو اور اس کلرنگ میں پرفیکشن کے لیے کوشش کرو، جس دن کسی فگر میں تمہاری کلرنگ اتنی پرفیکٹ ہو گئی کہ اس پر حقیقی رنگوں کا گمان ہونے لگے۔ اس دن میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں گا۔"
"کس کے بارے میں؟" سارہ نے پرتجسس لہجے میں کہا۔
"تمہارے بارے میں اور..."
"اور..." سارہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
"اور اپنے بارے میں۔"
سارہ کے اردگرد کوئی پھول کھلا تھا یا روشنی کی کوئی کرن چمکی تھی۔ اسے لگا اس کے اردگرد سب کچھ روشن اور رنگا رنگ ہو گیا تھا۔
"بس اب تم دیکھنا، میری کلرنگ کتنی بہتر ہوتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"اور یہ کیا بنا ہے خیر سے؟" سعد نے لچکیلے ربڑ سے بنے فگرز کی طرف دھیان کیا۔
"یہ چھ انچ کی بار ہے۔" سارہ نے مسکرا کر کہا اور یہ سر، دھڑ، بازو، ٹانگیں میری ہیں، ان کو جوڑنا باقی ہے۔ یہ فگر اس چھ انچ بار پر موو کرے گا۔"
"انٹرسٹنگ۔" سعد مسکرایا۔ "مجھے بھی تو بتاؤ بھئی، یہ فن کیسے سیکھا تم نے۔" سارہ سے پہلی ملاقات سے لے کر اب تک یہ پہلا موقع تھا جب سعد نے اس سے سرکس سے متعلق کوئی بات پوچھی تھی۔
سارہ نے جسم کے وہ مختلف حصے جوڑے اور ان کو انگلیوں کی حرکت سے ہوا میں لہرایا۔ ربڑ کا لچکیلا فگر ہوا میں قلابازی کھانے کے بعد میز پر گرا اور مختلف حصوں میں بٹ گیا۔
"وہ!" سارہ نے افسردہ نظروں سے ان ٹکڑوں کی طرف دیکھا اور پھر سعد سے مخاطب ہوئی۔ "جب میں پہلی بار رنگ میں یہ کرتب کرنے کے لیے داخل ہوئی تھی، اس وقت میری عمر صرف نو سال تھی، میں اس وقت اس سے جستراایکروبیٹ تھی۔"
"نو سال..." سعد نے چونکتے ہوئے کہا۔
"ہاں..." سارہ نے سامنے کی دیوار پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "میں نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا، جس میں سنہری بوٹے چمکتے تھے۔ میرے بالوں کو کس کر یوں باندھ دیا گیا تھا کہ وہ میری کسی جنبش کے دوران میری آنکھوں کے سامنے لہرا کر اسے غلط نہ کرا دیں۔"
"تم بہت ایکسائٹڈ ہو رہی ہو گی، ہے نا۔" سعد نے کہا۔
"پتا نہیں وہ کیا تھا۔" سارہ نے یاد کیا۔ "جوش، خوشی، خوف، کچھ کر دکھانے کا شوق یا پھر مجبوری، جو بھی تھا رنگ میں داخل ہو کر کچھ بھی کر دکھانے سے پہلے... میرے پاؤں جیسے زمین پر ہی نہیں پڑ رہے تھے۔ میں جیسے ہوا میں اڑ رہی تھی۔ میں نے اپنے ٹرینرز کی تقلید میں سینٹرل لائٹ کے نیچے کھڑے ہو کر مجمع کی طرف ہوائی بوسے اچھالے۔"
"نو سال کی بچی اور ہوائی بوسے۔"
"ہاں!" سارہ نے سر ہلا کر کہا۔ "یہ بھی ہماری ٹریننگ کا حصہ تھا، مجمع کو ایکسائٹ کرنے کے لیے۔"
"واؤ... سلام ایسے ٹرینرز کو۔" سعد نے بے ساختہ کہا۔
"پھر میں نے بار پر ہاتھ ڈالے اور اس پر جھول کر اس پر تیر کی طرح سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس پہلے ایکشن پر

مجھے داد اور تحسین، تالیوں اور سیٹیوں کا دس منٹ تک رسپانس ملتا رہا۔ بس پھر وہاں سے جو سفر شروع ہوا تو وقت تک نہیں رکا جب تک اس یار نے میرے پاؤں کے انگوٹھے کا بار اٹھانے سے انکار نہیں کیا۔" سارہ دیوار سے نظریں ہٹا کر سعد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

"یار نے کہا۔ سارہ خان! میرا تمہارا بس اتنا ہی ساتھ تھا' اب تم یہاں سے رخصت ہو جاؤ' تمہیں کسی اور کا حصہ بننا ہے۔" سعد نے کہا۔

"کیا واقعی اس نے یہ کہا تھا؟" سارہ نے سعد کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں' اس نے یہ ہی کہا تھا۔ شاید تم اس کی یہ آخری سرگوشی سن نہیں پائیں۔" سعد مسکرایا۔

سارہ خان کے اردگرد پھیلی روشنی کی لو کچھ اور بڑھ گئی تھی۔



"مہندی کے فنکشن میں مجھ سے زیادہ بونگی کوئی دوسری لڑکی نہیں لگ رہی ہوگی۔" ماہ نور نے آئینے میں خود کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایک تو ماما کو منفرد بننے کا اتنا شوق ہے کہ وہ چاہتی ہیں' ان سمیت ان کے گھر کا ہر فرد اوروں سے ہر جگہ منفرد نظر آئے۔ مجھے نہ سہی' انہیں تو اچھی طرح پتا تھا کہ آج کل مہندیوں پر کیا پہنا جا رہا ہے' لے کر مجھے وہی اولڈ اسٹائل مغلیہ لک دینے کے چکر میں ہنسی کا گول گپا بنا کر رکھ دیا' سب کے سامنے۔" اس نے اضطراری کیفیت میں لپ شائنر کا ایک اور کوٹ ہونٹوں پر لگا لیا۔

"افوہ ماہ نور!" اس کی کزن ثمرہ نے لپ شائنر اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"یار تم اوور ڈو کر رہی ہو خود کو' اور کل کے فنکشن کے بارے میں بھی خواہ مخواہ کامپلیکس کا شکار ہو رہی ہو۔"

you were looking so beautiful baby

اس کی دوسری کزن رانیہ نے اس سے مسکارا چھینتے ہوئے کہا۔

"مجھے سب پتا ہے۔" اس نے منہ بنایا۔ "کوئی بھی میری طرف مسکرائے بغیر نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں اتنی کانشس ہو رہی تھی' مجھ سے تو ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔"

"اسی لیے مسز صدیقی میری ممی سے پوچھ رہی تھیں کہ ماہ نور کا کہیں رشتہ تو طے نہیں کیا نا ابھی فائزہ نے؟" رانیہ نے کہا۔ "یہ شاید انہوں نے اس لیے پوچھا کہ اگر رشتہ طے ہو چکا ہو تو تمہارے ساتھ ساتھ تمہارے منگیتر پر بھی ہنس لیں۔" رانیہ نے ثمو کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس دیں۔

"اڑا لو' اڑا لو میرا مذاق۔" ماہ نور نے ان دونوں سے اپنی چیزیں چھینتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر خود کو آئینے میں دیکھنے لگی۔ شیفون کے ڈیپ ریڈ گھیر دار فراک کے گلے اور بازوؤں پر بلیک ویلوٹ لگا کر ڈیپ ریڈ نگینوں سے نفیس کام ممی نے کسی ماہر کاریگر سے بنوایا تھا۔ بلیک نگینوں سے آویزاں جیولری بھی ممی کا انتخاب تھی۔ اس کے بالوں کو ماہین نے اس روز ایک نیا اسٹائل دیا تھا جس سے اسے خود اپنا آپ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ڈیپ ریڈ لپ اسٹک سجی تھی اور چہرے پر ہلکا میک اپ تھا۔

"کیا میں نے واقعی خود کو اوور ڈو کر لیا ہے۔" آئینے سے نظر ہٹا کر اس نے رانیہ سے پوچھا۔

"ارے نہیں یار! میں نے ایسا صرف اس لیے کہا کہ تم اوور کانفیڈنٹ نہ ہو جاؤ۔" وہ ہنسی۔

"نہیں نا' سچ سچ بتاؤ۔" وہ کنفیوز ہو گئی تھی۔

"تم ایک دم پرنسس لگ رہی ہو۔" ثمو نے کہا۔

"جلدی کرو لڑکیو! ہم لیٹ ہو رہے ہیں۔" فائزہ نے ماہ نور کے کمرے میں جھانک کر کہا۔

شادی کا وہ فنکشن حسب توقع شان دار تھا۔ جس میں ملک کی ہائی کلاس شرکت کر رہی تھی۔ چچی صابرہ نے خاص طور سے اس دن یہ بات نوٹ کی تھی کہ ماہ نور جواب کی بار انہیں اکتائی ہوئی اور ہر چیز سے بے زار نظر آتی تھی۔ اس فنکشن کے دوران خاصی چمک رہی تھی۔

"کتنی پیاری بیٹی ہے فائزہ کی' کاش اللہ نے ہمیں ایک ہی بیٹا دے دیا ہوتا۔" ان کے دل میں نہ جانے کیوں ہوک سی اٹھی۔

فنکشن کے اختتام پر اس فائیو اسٹار ہوٹل کی لابی میں بابا کے کسی دیرینہ دوست کی فیملی سے باتیں کرتے ہوئے ماہ نور کو ان ہائی ہیلز میں اپنے پاؤں اچانک حد سے زیادہ دکھتے ہوئے محسوس ہوئے جن پر وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔

"چلیں نا اب بابا! میں بہت تھک گئی ہوں۔" اس نے تیسری بار بابا سے کہا۔

"بس دو منٹ بیٹا!" انہوں نے نرمی سے کہا اور اس نے روہانسی ہو کر ممی کی طرف دیکھا جو خود بھی کسی آنٹی سے محو گفتگو تھیں اور یہ سلمان کا بچہ نہ جانے کدھر ہے' اب اس کا انتظار بھی کرنا پڑے گا۔

سلمان کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتے اس نے دانت پیسے اور اسی طرح ادھر ادھر گھومتی اس کی نظریں اوپر سے آتی کیپسول لفٹ کے رکنے پر اس سے باہر نکلنے والے لوگوں کے گروپ پر ٹک گئیں۔ اس وقت بلاشبہ وہ کسی نئے بہروپ میں نہیں اپنے اصلی روپ میں کھڑا کسی سے رخصت ہوتے ہوئے ہاتھ ملا رہا تھا۔ اس کے ساتھ دو' تین اور لوگ بھی تھے جو رخصت ہو رہے تھے۔

"سعد!" بے اختیار ماہ نور کے منہ سے نکلا اور وہ چند قدم آگے بڑھی۔ "کیسا اتفاق تھا کہ وہ ایک ہی چھت کے نیچے کھڑے تھے۔ اسی دم سعد کی نظر ماہ نور اور اس کے اپنی طرف بڑھتے قدموں پر پڑی تھی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ماہ نور کو وہیں رک جانے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے فون پر تیزی سے اس کے لیے میسج ٹائپ کیا تھا۔

"میں ابھی تمہارے شہر میں ہی ہوں' لیکن ابھی نہیں ہم پھر ملیں گے۔"

ماہ نور اس کا اشارہ دیکھ نہیں پائی یا پھر شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ اس کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی' جب اس کے ہاتھ میں پکڑے فون پر میسج کی ٹون بجی تھی۔ اس نے رک کر میسج پڑھا اور بے یقینی سے سعد کی طرف دیکھا۔ وہ اس انداز میں سر ہلا رہا تھا جیسے اسے یقین دلا رہا ہو۔

"ہاں یہ میں نے ہی بھیجا ہے۔"

ماہ نور یوں منع کیے جانے پر ششدر کھڑی تھی۔ مگر اس میسج نے سعد کی طرف اس کے پیش قدمی روک دی تھی۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

ایلیاالیقین



"بیٹا! دروازہ کھولو میں آپ کی پھپھو ہوں۔"

عینی نے کھڑکی سے جھانکا تو ایک الٹرا ماڈرن خاتون کھڑی تھیں۔ لوئر مڈل کلاس کے محلے میں اتنی امیری پھپھو؟ اول تو اس کی کوئی پھپھو تھی ہی نہیں تو پھر یہ کون ہے۔ اس نے تذبذب کے عالم میں دروازہ کھول دیا۔

"قاسم بھائی گھر پہ ہیں؟" خاتون نے اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! بابا کو فوت ہوئے سال ہو گیا۔" عینی نے کہا کہ تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

"مجھے بتایا کیوں نہیں؟" ان سبز آنکھوں میں سرخی سی گھل گئی۔

"معذرت پھپھو! میں آپ سے کبھی نہیں ملی میں آپ کو پہچانتی بھی نہیں۔ امی پڑوس میں گئی ہیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔ آپ بیٹھیے تب تک تو آ ہی جائیں گی۔" اجنبیت سے بولتے بولتے اسے مہمان نوازی یاد آ گئی۔

وہ بے تکلفی سے ننگے فرش پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئیں۔ باوجود اس کے کہ انہوں نے نہایت قیمتی اور نفیس لباس پہنا ہوا تھا۔

"نہ میرا بیٹا! میں چائے نہیں پیتی۔ تم آ کر میرے پاس بیٹھو۔" ان کی صاف ستھری جلد پر آنسو اور دکھ چمک رہا تھا۔ وہ قاسم سے ملنے آئی تھیں' ان کی موت کی خبر یقیناً ان کے لیے دھچکا ہی تھی۔

"میں نے انہیں سعودیہ سے اتنے خط لکھے کوئی جواب ہی نہیں ملا' تین دن پہلے ہی ادھر آئی ہوں کراچی۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولیں۔

"تمہارا باپ بہت اچھا آدمی تھا۔" وہ عینی کو مخاطب کر کے بولیں۔ عینی نے گہری نظروں سے ان کا جائزہ لیا۔ وہ اس کی امی کی عمر کی خاتون تھیں مگر خوش حالی اور بے فکری کی بدولت وہ اپنی عمر سے کئی برس کم دکھائی دے رہی تھیں۔ پیڈسٹل فین کی ہوا ان کے دوپٹے کے نیچے چھپے سرمئی بالوں کو جھانک رہی تھی۔ اسے اچانک وارد ہونے والی پھپھو پر حیرت ہوئی تھی جو کسی طور کم نہیں ہو رہی تھی۔ ان کا حلیہ چہرے خدوخال اور اطوار لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے ان کے چہرے پر نہ ہی اس کے بابا کی کوئی مشابہت تھی۔

"بہت ہی ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا تمہارا باپ مجال ہے جو ذرا بھی غصے میں آ جائے۔ اتنے پیارے دل کا تھا کہ جیسے اللہ نے اس کا دل اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو۔" اب ان کی سفید رنگت میں سرخی گھل گئی تھی۔

عینی نے انہیں پانی لا دیا اور پھر وہیں بیٹھ گئی۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے اس کی پڑھائی اور مشاغل کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کے بعد بھی جب صباحت نہ آئیں تو وہ دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئیں۔ اس نے بھی نہیں روکا کیونکہ صباحت

کے ساتھ اسپتال گئی تھیں جانے کتنی دیر ہو جاتی۔



"میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے عینی!" اس نے کالج کا یونیفارم بھی نہیں اتارا تھا کہ صباحت نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ وہ سیکنڈ ایر کا آخری پرچہ دے کر آئی تھی۔ اس نے صباحت کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ گزشتہ دن والی الجھن اور پریشانی اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں۔

"اچھے لوگ ہیں' پڑھے لکھے ہیں۔ لڑکا بھی کم عمر ہے' بائیس تیئس کا ہوگا۔ ایک' دو سال میں شادی ہو جائے گی کیونکہ لڑکے کو پڑھنے باہر جانا ہے تو وہ اکیلا نہیں جائے گا۔" صباحت دھیرے دھیرے بتانے لگیں۔

"بیٹیوں کو ایک نہ ایک دن اپنے گھر جانا ہی ہوتا ہے۔ ہر سسرال میں مسائل ہوتے ہیں۔ ہر قوم ہر خاندان کی تہذیب میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن بیٹا! ہم سب کا ایک دوسرے سے انسانیت اور اسلام کا رشتہ ہے۔ تم اس کا خیال رکھنا۔" صباحت نے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کی۔

"لیکن امی! ابھی تو میں۔۔۔"

"پڑھائی بھی ہو جائے گی عینی! میں تمہیں اس عملی زندگی پڑھا رہی ہوں' غور سے پڑھ لو۔"

"دیکھو! تمہارے بابا کہا کرتے تھے۔ ایک چپ سو سکھ۔ کبھی کسی بڑے کو' چھوٹے کو' برابر والے کو جب غلط لہجے' غلط الفاظ میں تم سے بات کرے' جواب نہ دینا اور اپنی عزت نفس کی حفاظت کرنا۔ انا اور عزت نفس میں فرق ہوتا ہے۔ اپنی عزت خود کرو گی تو دوسرے بھی تمہاری عزت کریں گے۔ انا میں اکڑ ہوتی ہے۔"

صباحت چونکہ کم کم ہی نصیحت کرتی تھیں' سو اس نے سب باتیں دھیان سے سنیں اور پلو سے باندھ لیں۔ براہ راست کچھ پوچھنے کی اور کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ کوئی ذریعہ بھی نہ تھا۔ اسے اپنے اکلوتے پن پر کھل کر دکھ ہوا۔ کم از کم بابا ہوتے تو وہ بھی مجھے کچھ نہ کچھ تو کہتے۔ اس نے سوچا' وہ ماں سے زیادہ باپ کے قریب تھی۔



"تم خوش ہو بیٹا؟" صباحت نے نم آنکھوں سے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جی امی میں بہت خوش ہوں۔ پھپھو کل آئیں گی۔" وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولی۔ پچھلے تین ہفتوں بعد وہ اپنی بیٹی کو دیکھ رہی تھیں' جس کے چہرے پر واقعی طمانیت اور خوشی تھی' جو ان کی تین ہفتوں کی بے چینی کو نگل گئی۔

"امی! میں اب تک نہیں جان سکی کہ وہ آخر کس طرح میری پھپھو ہیں؟ بابا کی تو کوئی بہن نہیں تھیں' نہ ہی کوئی دور پرے کی کزن تھیں۔" اس نے فرصت ملتے ہی پوچھا' جس پر صباحت مسکرا کر رہ گئیں۔

"بیٹا! یہ تو اپنی پھپھو سے ہی پوچھنا۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ جب تم بہت چھوٹی تھیں تو یہ سلیمان کے ساتھ آئی تھیں۔ دو دن رکی تھیں اور تمہارے لیے ڈھیر ساری چیزیں لائی تھیں۔"



اس سے زیادہ تو میں بھی نہیں جانتی۔" انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

"پھپھو! میں ایک بات پوچھوں؟" عینی نے دودھ کا گلاس انہیں تھمایا اور سامنے بیٹھتے ہوئے اجازت چاہی۔ وہ انہیں پھپھو ہی کہتی تھی۔ بقول ان کے وہ پھپھو کہے گی تو ان کو یاد رہے گا وہ کس شخص کی بیٹی ہے اور امی کہے گی تو وہ ساس نہ بن جائیں۔

"ہاں بیٹا! پوچھو۔" وہ کتاب ایک طرف رکھ کر شفقت بھرے لہجے میں بولیں۔

"آپ میری پھپھو کیوں ہیں؟ میرا مطلب بابا آپ کے کون تھے۔" وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر الجھن اور تجسس تھا۔

"بیٹا! بات یہ ہے کہ بہت عرصے پہلے جب میں تمہارے جتنی تھی تب میں اپنی گاڑی لے کر باہر نکلی۔ میں ڈرائیونگ میں نو آموز تھی۔ ایک ٹھیلے والے کو میں نے ٹکر مار دی۔ اسے کافی چوٹیں آئیں، بازو میں فریکچر ہو گیا، پاؤں میں موچ بھی آئی شاید۔ میں ایک کم عمر لڑکی تھی۔ ڈرتے ڈرتے گاڑی سے اتری۔ اس سے معذرت کی۔ اپنی گاڑی میں اسپتال چلنے کو کہا تو اس نے مجھ پر صرف ایک نظر ڈال کر کہا کہ کوئی بات نہیں، آپ پریشان نہ ہوں۔ اس میں اتنا ظرف تھا کہ میں حیران رہ گئی۔ تمہیں پتا ہے وہ شخص تمہارا باپ تھا۔ اس دن میں گھر سے لڑ کر نکلی تھی، میرے بڑے بھائی سلیمان کے طالب ماموں کی گھڑی مجھ سے گر کر ٹوٹ گئی تھی۔ انہوں نے اتنا غصہ کیا تھا، اتنا زیادہ کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ پھر جب میں نے تمہارے بابا کو دیکھا تو مجھے اتنی حیرت ہوئی کہ اس دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو فوراً" معاف کر دیتے ہیں اور باوجود غلطی کے بے عزت نہیں کرتے۔" وہ جذباتی ہو رہی تھیں۔

"ہاں، یہ تو بابا کی عادت تھی۔" اس نے عام سے انداز میں کہا۔

"نہیں بیٹا! تم اس تجربے سے نہیں گزریں۔ انیس سال کی لڑکی اکیلے ڈرائیو کرتے ہوئے کوئی حادثہ کر دے تو اس کا جی یا جتنا دل بہت سہم جاتا ہے۔ میں وہ ڈر آج بھی جب محسوس کرتی ہوں تو قاسم بھائی کے لیے دل سے دعا کرتی ہوں۔"

"اچھا تو پھر آپ نے کیا کیا؟"

"پھر میں نے گاڑی میں ان کا پیچھا کیا۔ اتنی ہمت مجھ میں تھی نہیں کہ ان کی کوئی مدد کر پاتی بس گھر دیکھ لیا ان کا۔" وہ خاموش ہو گئیں۔

"اچھا تو آپ نے سلیمان سے میری شادی اس لیے کی ہے کہ میں بابا کی بیٹی ہوں۔"

"صباحت نہیں چاہتی تھی کہ یہ شادی ہو۔ ماں کے دل میں بہت خدشے ہوتے ہیں۔ مگر میں نے صباحت کو قاسم بھائی کا واسطہ دیا کہ اگر میں ان سے کبھی منع نہ کرتے اور سلیمان کو طبقاتی فرق کی وجہ سے اعتراض تھا۔"

"پھر۔"

"میں نے اس سے کہا کہ اتنے بڑے دل والے آدمی کی بیٹی چاہے جیسے بھی پلی بڑھی ہو، کبھی بھی کم دل نہیں ہو گی اور نہ ہی اس میں طبقاتی فرق کی نشانی نظر آئے گی۔ یوں بھی میں تمہیں تو دیکھ ہی چکی تھی۔ قاسم بھائی اور صباحت نے بہت اچھی پرورش کی ہے تمہاری۔ جب میں تمہارے کالج جانے کے وقت میں آ کر صباحت کی منتیں کرتی تھی تو سلیمان کہتا تھا کہ میں پچھتاؤں گی۔ اب تم خود دیکھو! وہ خوش ہے تمہارے ساتھ۔"

"تو آپ نے شادی اتنی جلدی کیوں کی؟" اس کے سوال ختم نہیں ہو رہے تھے۔

"تمہاری ماں نے یہ نہیں بتایا کہ ساس سے سوال جواب نہ کرنا۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"کہا تھا، لیکن آپ تو میری پھپھو ہیں نا۔"

"سلیمان کو پڑھنے جانا تھا۔ میں کیا کرتی اکیلی سارا دن۔ میں نے سوچا کہ ہم دونوں ساتھ رہیں گی پردیس میں .... تو اچھی گزرے گی، ورنہ تمہاری تمہیں اور شادی نہ ہو جائے۔"

عینی سوچ رہی تھی کہ واقعی اعلا ظرفی اور حسن سلوک سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں۔

راشدہ رفعت



"لڑکیوں کو اتنا پڑھانے لکھانے کا کیا فائدہ بھئی کرنا تو انہوں نے ہانڈی چولہا ہی ہوتا ہے۔"

اس کی ساس محلے کی کسی خاتون سے مخاطب تھیں۔ موضوع گفتگو جانے کیا تھا مگر دوران گفتگو اس کی ساس نے اپنا من پسند فقرہ ضرور ٹانک دیا تھا اور وہ جو کچن میں کھڑی ہانڈی بھون رہی تھی اس کا جی چاہا کہ اپنے جہیز کے سوٹ کیس میں سنبھال سنبھال کر رکھی گئیں ڈگریاں واقعتاً "چولہے میں جھونک دے۔ پتا نہیں ابا نے اس خاندان میں کیا دیکھ کر اسے بیاہا تھا۔ شاید فرقان کی ڈگری ہی ابا کے من کو بھائی تھی لیکن فرقان کے گھر والوں پر ابا نے غور و فکر کی زحمت ہی نہ کی۔

وہ لوگ ان پڑھ نہیں تھے جاہل تھے اور اپنی جہالت پر مغرور اور مسرور تھے۔ فرقان جانے کیسے پڑھ لکھ گیا تھا اور پڑھ لکھ کر اس میں بھی ایک خاص قسم کا گھمنڈ آ گیا تھا جب ہی اس نے ماں بہنوں کو جتا دیا تھا کہ اس کے لیے خاندان کی مڈل پاس یا میٹرک فیل لڑکی ڈھونڈنے کے بجائے کوئی پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈیں حالانکہ اس کی ذہنی مطابقت ان ہی مڈل پاس یا میٹرک فیل لڑکیوں سے ممکن تھی مگر قسمت کے ستارے ٹکرا گئے بسمہ اکرام سے۔

بسمہ فرقان کی خالہ زاد بہنوں کو ٹیوشن پڑھاتی تھی فرقان کی خالہ کا گھر بسمہ کے گھر کے قریب والی رہائشی کالونی میں ہی تھا۔ جب ان کی بڑی بیٹی شہر کے مشہور انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کے باوجود مسلسل چار سال تک چوتھی جماعت میں فیل ہوتی رہی تو انہوں نے اسکول بھی بدل ڈالا اور ٹیوٹر بھی۔ نئے اسکول جا کر بچی نے اپنی بہت سی کلاس فیلوز کے منہ سے بسمہ کا نام سنا جو شام کے وقت بچوں کو اپنے گھر پر کم فیس میں زیادہ وقت دے کر بہت محنت سے پڑھاتی تھی۔ حرا اپنی ماں کو لے کر بسمہ کے گھر پہنچ گئیں۔

نسیمہ بیگم نے ناقدانہ نگاہوں سے بسمہ اور اس کے گھر کا جائزہ لیا۔ یہ ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر کا گھر تھا جس نے ہمیشہ بچوں کو اپنی دولت جانا تھا اور جو تھوڑی بہت دولت پاس رکھتے تھے وہ اپنے بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر خرچ کر چکے تھے لیکن یہ بہت رکھ رکھاؤ والا مڈل کلاس گھرانہ تھا جس کی تہذیب، اخلاق اور شرافت کی دوسرے بھی گواہی دیتے تھے۔ نسیمہ بیگم نے مطمئن ہو کر اپنی دونوں بیٹیوں کو بسمہ کے پاس ٹیوشن لگوا دیا۔ ساتھ ہی باور کروا دیا۔

"دیکھو بھئی! فیس منہ مانگی دوں گی مگر میری بچی پاس ہونا چاہیے۔"

"میں کوشش کروں گی آنٹی! مگر گارنٹی نہیں دے سکتی۔ اگر یہ خود محنت کرے تب ہی بات بنے گی۔" بسمہ نے حرا کو دیکھا تھا۔

"میں محنت کروں گی جی۔" حرا کو اپنی نئی نازک سی ٹیچر بہت پسند آئی تھی جب ہی فوراً "محنت کرنے کی" حامی بھر لی۔ حرا سے دو سال چھوٹی شہزا ابن کے مقابلے میں کچھ ذہین تھی۔ وہ چوتھی جماعت میں صرف دو سال فیل ہو کر پانچویں میں پہنچ چکی تھی۔

بسمہ نے بہت توجہ اور لگن سے بچیوں کو پڑھایا تھا جب سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلا تو شہزا پاس اور حرا بھی رعایتی پاس ہو چکی تھی۔ نسیمہ بیگم دو کلو والا مٹھائی کا ڈبا لے کر آئیں اور محض دو دن بعد مزید دو کلو مٹھائی کے ساتھ اپنی بڑی بہن ثمینہ بیگم کو بھی لے آئیں۔

"فرقان میرا پہلو ٹھی کا بیٹا ہے۔ ہمیں اس کے لیے پڑھی لکھی لڑکی کی تلاش ہے۔ آپ نے اپنی بیٹی کا کہیں رشتہ وشتہ طے تو نہیں کیا ہوا؟" انہوں نے چھوٹتے کے ساتھ ہی بسمہ کی امی سے پوچھ ڈالا تھا۔

"نہیں! ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی تو بسمہ پڑھ کر فارغ ہوئی ہے۔ ان کے ابو کا نظریہ ہے کہ تعلیم کے دوران بچیوں کے رشتے کی بات چھیڑ کر انہیں ڈسٹرب نہ کیا جائے تاکہ یہ یکسوئی سے پڑھ سکیں۔ البتہ آج کل ہم بسمہ کا بر ڈھونڈ رہے ہیں۔"

بسمہ کی امی نے شائستگی مگر صاف گوئی سے جواب دیا۔

"بس تو پھر ہمارا بیٹا آ کر دیکھ لیں۔ ماشاء اللہ پڑھا لکھا ہے۔ اچھی نوکری ہے اور اگر نوکری نہ بھی ہوتی تو



بچی بات ہے کہ نوکری کی اسے خاص ضرورت بھی نہیں۔ اس کے ابا کا چلتا ہوا کاروبار ہے۔ مین بازار میں کراکری کی دونوں بڑی دکانیں ہماری ہیں۔ اللہ کا دیا سب کچھ ہے ہمارے پاس۔ دولت کے معاملے میں تو اللہ کا خاص کرم ہے ہمارے خاندان پر۔ بس بچے نے ضد پکڑی ہوئی ہے کہ شادی کرنی ہے تو پڑھی لکھی لڑکی سے۔ نسیمہ نے آپ کی بیٹی کا ذکر کیا کہ ماشاءاللہ پڑھی لکھی بھی ہے اور خوب صورت بھی۔ میں نے کہا چلو چل کر دیکھتے ہیں اگر قسمت میں ہوا تو رشتہ داری بن جائے گی نہیں تو خیر صلا۔"

فرقان کی والدہ کا لہجہ کچھ بے نیازی لیے ہوئے تھا۔ بسمہ کی امی کو خاتون پسند نہ آئیں سو ٹالنے کو کہہ دیا کہ بسمہ کے والد سے مشورے کے بعد جواب دیں گی پھر اکرام صاحب سے اس رشتے کے بارے میں سرسری سا ہی ذکر کیا تھا کہ وہ بولے "لڑکا دیکھنے میں کچھ حرج نہیں" اور پھر جانے کیسے معاملات طے پاتے ہی چلے گئے۔

منگنی کی انگوٹھی بسمہ کی انگلی کی زینت کیا بنی کہ فرقان کے گھر والوں نے شادی کا شور مچا دیا اور وہ جو تعلیم سے فراغت کے بعد لیکچرر شپ کے حصول کے لیے کوشش کرنا ہی چاہتی تھی۔ زرتار آنچل اور زیور کے بوجھ سے جھکی گردن کے ساتھ حجلۂ عروسی میں جا پہنچی۔

"میرے گھر والوں کو پڑھی لکھی لڑکی کے حوالے سے بہت سے تحفظات ہیں۔ تمہیں کوشش کرنی ہو گی کہ تم گھر والوں کے بے بنیاد خدشات کو غلط ثابت کرو۔"

سہاگ رات کو فرقان نے اسے منہ دکھائی کا تحفہ بعد میں دیا اور نصیحت پہلے کی۔ اس وقت تو اس نے سر ہلا دیا لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ جن خدشات کی کوئی بنیاد ہی نہ تھی وہ انہیں کس طور ختم کرتی۔

صبح دیر سے آنکھ کھلتی تو پڑھی لکھی لڑکی ہونے کا طعنہ ملتا۔ روٹی گول نہ بنتی تب اس کی پڑھائی اور پھوہڑ پن پر ایک ہی جملے میں تبصرہ کر کے نمٹا دیا جاتا۔ اگر کوئی ایسا قصور اس کے کھاتے میں لکھ دیا جاتا جو [illegible] سے سرزد ہوا ہی نہ ہوتا تب وہ وضاحت یا صفائی [illegible] کے لیے لب کھولنے کی کوشش ہی کرتی کہ آگے [illegible] سننے کو ملتا۔

"دیکھا پڑھی لکھی ہے نا۔ کیسے زبان چلا [illegible] ہے۔"

زبان بے چاری اس الزام پر ششدر رہ [illegible] نے تو عرصہ ہوا اس کا استعمال ہی چھوڑ دیا تھا۔ [illegible] کل سسرال میں بے زبان گائے کی مانند رہ رہی [illegible]

یونہی وقت سرکتا گیا۔ اس کی گود میں شاہ ظل [illegible] بے رنگ زندگی کچھ کچھ اچھی لگنے لگی لیکن جب وہ سوچتی کہ اس گھٹے ہوئے فرسودہ ماحول میں اس [illegible] بچے کی پرورش ان خطوط پر ہو پائے گی جس کی وہ [illegible] ہے؟ اندر سے جواب نفی میں ملتا۔ کیا اس کا بیٹا بھی [illegible] ہو کر فرقان ثابت ہو گا، صرف نام کا پڑھا لکھا مگر [illegible] اور تمدن سے کوسوں دور۔ اور شاہ ظل تو چلو پھر [illegible] لڑکا ہے اگر اللہ نے اگلی بار اپنی رحمت سے نواز دیا [illegible] ان کی بیٹی فرقان کے خاندان کی لڑکیوں کا پر تو ہو گی۔ بدزبان، جھگڑالو، فلموں ڈراموں کی رسیا، اخلاقی اقد[illegible] سے بے بہرہ گھر کے مردوں سے چھپ کر موبائل [illegible] پر معاشقے لڑانے والی۔

وہ کانپ کر رہ جاتی۔ خود کو سمجھاتی کہ اس۔ [illegible] خدشے بے بنیاد ہیں۔ اس کی تربیت اس کے بچوں [illegible] اس ماحول کا عادی نہ ہونے دے گی لیکن جب شاہ [illegible] کی توتلی زبان سے اس نے کلمہ سننے کے بجائے [illegible] اسے کالی دنوں سے سکھا رہی تھی نئی انڈین فلم کا [illegible] تو اس دن وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پہلی بار اس۔ فرقان سے اپنے خدشات کا ذکر کیا۔

"مجھے ڈر ہے، ہمارا بچہ اس ماحول میں رہ کر بگڑ جا[illegible] گا۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو۔ کھل کر کہو۔" فرقان نے [illegible] تیوروں سے دیکھا۔

"نہیں تو میں کیا کہنا چاہوں گی۔" وہ سہم گئی۔

"دیکھو بسمہ! میں اپنے گھر والوں سے الگ ہو[illegible]

تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پہلے ہی تمہارے پڑھے لکھے ہونے کی وجہ سے اٹھتے بیٹھتے طعنے ملتے ہیں لہٰذا کوئی خوش گمانی دل میں مت پالنا۔"

فرقان جانے کیسے اس کے دل کے نہاں گوشوں میں چھپی خواہش بھانپ گیا تھا حالانکہ یہ صرف ایک بے ضرر سی خواہش ہی تو تھی جس کا اس نے کبھی فرقان کے سامنے اظہار تک نہ کیا تھا اور اب بھی وہ فرقان سے اس بارے میں بات کب کر رہی تھی اس نے تو صرف اپنے خدشے، اپنے دکھ کا اظہار کیا تھا۔ اس گھر کے مکین کیسے بات پکڑتے تھے۔ اگر انسان شریک حیات سے بھی اپنی دلی کیفیات شیئر نہ کر سکے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔ بسمہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"اُفوہ بھئی کیا کہہ دیا میں نے۔ ایک تو تم پڑھی لکھی لڑکیاں بہت چھوٹے دل کی مالک ہوتی ہو یار! ذرا ذرا سی باتوں کو لے کر پریشان مت ہوا کرو۔ بچہ ہی ہے نا شاہ ظل، پھر آج کل ذیشان کی شادی کا ہنگامہ ہے۔ چوبیس گھنٹے تو بچیاں ڈھولکی سنبھالے گانے بجانے میں مصروف ہوتی ہیں۔ اس کی زبان پر کوئی بول چڑھ گیا تو کیا ہوا۔ ذرا سا بڑا ہو گا تب ڈانٹ ڈپٹ کر سمجھا لیا کرنا۔"

فرقان نے اس بار نرمی سے مخاطب کیا تھا۔ اس نے مجازی خدا کی اسی نرم گفتاری کو بہت جانا تھا، سو دل سے مسکراتے ہوئے گردن ہلا دی۔

"اچھا! اتنے دور بیٹھے بیٹھے کیا گردن ہلا رہی ہو۔ آج تو تم لگ بھی بہت پیاری رہی ہو۔ یہاں آؤ نا میرے پاس۔" اس نے بلایا تھا۔ بسمہ کی مسکراہٹ یک لخت غائب ہوئی۔ وہ واقعی بہت خوش گمان تھی۔

"باہر میرے نام کی پکار پڑ رہی ہو گی۔ کمرے سے نکلنے میں ذرا دیر ہو گئی تو اماں کہیں گی، پڑھی لکھی بہو بند کمرے میں ہر وقت ان کے بیٹے کو پٹیاں پڑھاتی رہتی ہے۔"

اگلے ہی پل اس نے زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر سرتاج محترم کو ہری جھنڈی دکھائی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔



آج کل گھر میں اس کے دیور کی شادی کا ہنگامہ تھا۔ ذیشان کو فرقان کے برعکس پڑھائی لکھائی میں چنداں دلچسپی نہ تھی۔ روپیٹ کر میٹرک کرنے کے بعد اس نے باپ کے ساتھ کاروبار سنبھال لیا تھا۔ اس کی شادی بھی اپنے ماموں کی بیٹی سے ہو رہی تھی۔

اس شادی پر اس کے سسرال والوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بسمہ کو اپنی شادی یاد آتی۔ اس کے سسرال والے کتنے رسمی سے انداز میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ قدرے بے دلی سے اسے بیاہ کر لائے تھے لیکن اب چونکہ دلہن ان کے اپنوں سے آ رہی تھی، سو وہ دل میں دبے سارے ارمان نکال رہے تھے۔

بہت دھوم دھام سے ثروت بیاہ کر آئی تھی۔ بالائی منزل پر اس کے لیے نیا پورشن تعمیر ہوا تھا۔ شروع شروع میں اس کے بے حد چاؤ چونچلے اٹھائے گئے۔ وہ بھی ہنستی، مسکراتی، اٹھلاتی، ناز نخرے اٹھواتی رہی مگر پھر بہو کو سسرال میں تھوڑے بہت اعتراضات، معمولی سی روک ٹوک کا تو سامنا کرنا پڑتا ہی ہے۔ بسمہ کو تو وہ واقعی بہت معمولی لگتے تھے۔ وہ ثروت کے ساتھ اپنا موازنہ کرتی تو دل پر لگے کتنے گھاؤ یاد آ جاتے۔ ثروت کے ساتھ تو سب کا رویہ حیران کن حد تک اچھا تھا لیکن ثروت چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنے والی لڑکی تھی۔ محسوس کرنے کی حد تک تو ٹھیک تھا۔ وہ ان باتوں کو بڑھا چڑھا کر شوہر کے سامنے سناتی۔

ذیشان کے ساتھ فرقان والا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ فرقان نے پڑھی لکھی لڑکی سے شادی کرنے کی شرط کے عوض گھر والوں کی خفگی مول لی تھی اور پھر وہ اسی خفگی کو دور کرنے کے جتن کرتا رہا تھا۔

اس چکر میں اس ہستی کو بھی فراموش کر بیٹھا، جو اس کی خواہش کے مطابق ڈھونڈ کر اس کی زندگی میں شامل ہو گئی تھی۔ اس کے گھر والوں کو بسمہ کے ساتھ پھر نامناسب رویہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا لیکن ذیشان تو گھر والوں کی پسند پر سر جھکاتے

ہوئے ثروت سے شادی پر راضی ہوا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے اس کا محلے کی ایک لڑکی سے زوردار چکر چلا تھا لیکن لڑکی کے گھر والوں نے ایمرجنسی میں اس کا نکاح پڑھوا کر اسے رخصت کیا تو ذیشان نے بھی ماموں زاد ثروت کے لیے ہاں کردی۔

شادی ہونے کی دیر تھی کہ ذیشان سابقہ محبوبہ کو بھول بھال کر بیوی کا دم بھرنے لگا۔ ثروت اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ وہ اس کی آنکھ میں ایک آنسو بھی دیکھتا تو گھر والوں سے باز پرس کرنے پہنچ جاتا۔ نسیمہ بیگم کو لاڈلی بھتیجی سے لاکھ پیار سہی مگر بھتیجی اب بہو تھی اور بیٹا بیوی کے مقابلے میں ماں بہنوں کی باتوں کو رتی برابر اہمیت دینے پر تیار نہ تھا۔

شروع شروع میں نسیمہ بیگم نے بہو کو بھی سمجھانے کی کوشش کی اور شاید زندگی میں پہلی بار بیٹیوں کو بھی بھاوج کی باتوں کو درگزر کرنے کی تلقین کی لیکن نہ نئی بہو نے اس سبق کا اثر لیا' نہ بیٹیوں کو ماں کی بات سمجھ میں آئی۔ ہر روز گھر میں نت نئے ہنگامے ہونے لگے۔

بسمہ کی منجھلی نند جو پہلے ثروت کی بیسٹ فرینڈ تھی' اب اسی کو ثروت سے سب سے زیادہ شکایتیں ہونے لگیں۔

"ثروت کام کو ہاتھ نہیں لگاتی۔"

"دن چڑھے سو کر اٹھتی ہے۔"

"روز بن ٹھن کر میاں کے ساتھ سیر سپاٹے پر نکل جاتی ہے۔"

"ہاں ہاں تو جاؤں گی اپنے میاں کے ساتھ سیر سپاٹا کرنے' تمہاری طرح تو نہیں جو بازار جانے کے بہانے ــــ"

"اے اے خبردار! میرے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات کی تو' تمہارے کچے چٹھے بھی کھول دوں گی۔"

عارفہ نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی دھمکی دی۔ ثروت پاؤں پٹخ کر کمرے میں گھس گئی۔ ماضی کی ہمجولیاں یقیناً" ایک دوسرے کے رازوں سے واقف تھیں۔ نسیمہ بیگم حالات کو اس نہج پر جاتا دیکھ کر خوف زدہ ہو گئیں۔ بھتیجی کو بہو کی حیثیت میں لائی تھیں۔ اس کے ماضی کے قصوں پر تو مٹی پڑ چکی تھی مگر بیٹی کو بیاہنا باقی تھا' وہ ثروت کی گز بھر لمبی زبان سے آگاہ ہونے کے ساتھ ساتھ خائف بھی ہو چکی تھیں۔ اس لیے جب ایک دن ذیشان نے کہا۔

"اماں! اس روز روز کی چخ چخ سے تنگ آگیا ہوں میں۔ ابا سے کہہ کر کرائے داروں سے مکان خالی کروا کر میں وہاں شفٹ ہو جاتا ہوں۔"

نسیمہ بیگم کے پاس بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

شادی کے ساڑھے چار ماہ بعد ہی ثروت کے جہیز کا سامان دوبارہ ٹرک پر لوڈ ہوا اور وہ گھر والوں پر ایک فاتحانہ نگاہ ڈالتی ہوئی شوہر کا ہاتھ پکڑ اپنی نئی راجدھانی میں جا بسی۔ اس شام سارا گھر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"اچھا ہوا اماں! اس ڈائن سے جان چھوٹی۔ اب ذیشان کے سر پر چڑھ کر ناچے گی' جب اسے اس کی خصلت کا اندازہ ہو گا۔" منجھلی نند نے ماں کو دلاسہ دیا۔

"چاچی' چاچو کے سر پر ڈانس کریں گی۔" شاہ ظل قلقاری مار کر ہنسا تھا۔ بسمہ نے اسے گھور کر دیکھا مگر بچے کو ماں کی گھوری کی سمجھ ہی کہاں تھی' وہ جیسے سنتا تھا اسی کے مطابق بولتا تھا۔ نسیمہ بیگم البتہ پوتے کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑی تھیں۔

"ارے یہ ہے ناں میرے گھر کی رونق۔ ان کم بختوں کے جانے پر ہم کیوں سوگ منائیں۔" انہوں نے شاہ ظل کی چٹاچٹ بلائیں لی تھیں۔

"اور کیا اماں! وہ لوگ اس قابل ہیں ہی نہیں کہ ہم ان کا ذکر بھی کریں۔ ثروت بھابھی تو ہماری اپنی تھیں مگر شادی کے بعد کیسا غیر بن گئیں۔ ہمارے ہی بھائی کو ہم سے چھین لیا۔ بسمہ بھابھی بھی تو ہیں۔ اتنی پڑھی لکھی مگر نخرہ نام کو نہیں' کیسے گھل مل کر ہمارے درمیان رہتی ہیں۔" اس کی چھوٹی نند کو اس پر لاڈ آیا۔

"ہاں تو اور کیا۔ ساری بات تربیت کی ہے۔ بسمہ کے ماں باپ نے کتنی اچھی تربیت کی ہے اپنی بچی کی۔" اس کی ساس نے بھی اسے پیار سے دیکھا۔ قریب بیٹھا فرقان مسکرا دیا۔

"اسی لیے تو اماں! میں پڑھی لکھی بیوی چاہتا تھا۔" اس نے کریڈٹ خود لینا چاہا۔

"ہاں میرے چاند صحیح کہتا تھا تو۔" انہوں نے تسلیم کرلیا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

بسمہ کے لیے یہ سب سننا اتنا حیران کن تھا کہ وہ بوکھلا کر منظر سے ہی ہٹ گئی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے سسرال والوں کو بسمہ کی شادی کے اتنے عرصے بعد اس کی جو قدر آئی ہے وہ عارضی ہے یا وہ ہمیشہ ہی اس کے اتنے قدر دان رہیں گے اور رات کو جب وہ سب کاموں سے فارغ ہو کر بیڈ روم میں آئی تو فرقان کو اپنا منتظر پایا۔ اس نے شاہ ظل کو تھپک تھپک کر پہلے ہی سلا دیا تھا۔

"سلا دیا اسے ــــ میں تو دودھ لائی تھی اس کے لیے۔" بسمہ نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر سوئے ہوئے بیٹے کا گال چوما۔

"آج تو خوش ہو تم؟" فرقان نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔

"کس لیے؟" اس نے سنجیدگی سے فرقان کو دیکھا۔

"اچھا اب انجان مت بنو۔ آج تو تمہاری جیت کا دن ہے۔ تم نے میرے گھر والوں سے منوا ہی لیا اپنے آپ کو۔ تمہیں دکھ ہوتا تھا ناکہ ہمیشہ تمہیں پڑھی لکھی ہونے کا طعنہ ملتا ہے دیکھو! آج تمہاری تعلیم اور تمہاری تربیت دونوں کو سراہا گیا ہے۔"

آج یقیناً" فرقان بھی بہت خوش تھا۔ اس کا انتخاب اس کے گھر والوں کے معیار پر پورا اترا۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ بسمہ نے نظر بھر کر شوہر کو دیکھا۔ ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔

"ہاں فرقان! میرے والدین نے مجھے بہترین تعلیم اور تربیت سے نوازا ہے۔ لیکن میں اپنے بچے کی پرورش ان خطوط پر کیسے کر پاؤں گی۔" اس کا لہجہ صدیوں کی تھکن لیے ہوئے تھا۔

"کیا مطلب؟" فرقان نے بھنویں اچکائیں۔

"نہیں' کچھ نہیں۔" تعلیم جانے بزدل کیوں بنا دیتی ہے۔ اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے دل میں سوچا تھا۔ ذہن کے پردے پر ثروت کی شبیہہ لہرائی تھی۔ کس طمطراق سے شوہر کا ہاتھ پکڑ کر وہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھی۔ اب وہ اپنا الگ گھر بسائے گی۔ اپنی مرضی کی مالک ہو گی۔ اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق پروان چڑھائے گی مگر نہیں ــــ ثروت نے یقیناً" الگ گھر کی خواہش اس بنیاد پر نہیں کی تھی۔ اس قسم کی سوچیں تو صرف اسی کے ذہن میں کلبلاتی تھیں۔ بچوں کو صحت مند تعمیری ماحول فراہم کرنا جو اس گھر میں رہتے ہوئے ناممکن تھا۔ فرقان کہہ رہا تھا کہ آج کا دن اس کے لیے بہت خوشی کا دن ہے۔ پہلی بار اس کے پڑھے لکھے ہونے پر تنقید نہیں کی گئی بلکہ اسے تعریف کے قابل سمجھا گیا پھر جانے کیوں خوش ہونے کے بجائے آج بھی اسے اپنے اندر سناٹے اترتے محسوس ہو رہے تھے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" فرقان نے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو بغور دیکھا تھا۔ وہ ہولے سے ہنس پڑی۔

"میں سوچ رہی ہوں کاش! میں بھی پڑھی لکھی نہ ہوتی ثروت کی طرح جاہل ہوتی۔"

"کیا مطلب؟" اس بار فرقان واقعی نہ سمجھ پایا۔

"کچھ نہیں' مذاق کر رہی تھی۔" اگلے ہی پل وہ اپنے مذاق سے خود ہی لطف اٹھاتے ہوئے زور سے ہنس پڑی تھی۔ فرقان اسے ناسمجھی سے تکتا رہ گیا۔



ام ثمامہ

جنوری کی ڈھلتی شام

رت بدل رہی تھی مگر اس کے دل میں جانے کب سے ایک ہی موسم ٹھہرا ہوا تھا۔ برف کی طرح سرد اور سخت تنہائی کا موسم۔ چاندنی راتوں کا سحر' آسمان پر چمکتے تارے' پھول اور ان پر بیٹھی رنگ برنگی تتلیاں' بارش کی جلترنگ بجاتی بوندیں اور ٹھنڈی میٹھی ہوا کے سبک جھونکے... ان سب چیزوں سے اس کا تعلق تب سے ٹوٹا ہوا تھا' جب سے وہ اس بیرک میں بند تھا۔

بلال ابھی ابھی اسے ایک لفافہ دے کر گیا تھا' جو ہر سال جنوری کی اولین شاموں میں اسے موصول ہوتا تھا۔ اس لفافے کی آمد جنوری کی اداس شاموں اور ٹھٹھرتی صبحوں کو اور بھی مشکل بنا دیتی تھی۔ اس نے سرد ہاتھوں اور بجھے دل سے لفافہ چاک کیا۔ اجلے سفید کاغذ پر لکھی سیاہ روشنائی کہیں کہیں سے مٹی ہوئی تھی۔

26 جنوری کے نام
جنوری کی کتنی شامیں آئیں اور
آکر گزر گئیں
دل نے کبھی کوئی کمی محسوس نہ کی
لیکن جانے آج کی شام میں
ایسا کیا ہے
دائیں آنکھ کا دایاں کونا بھیگ گیا ہے۔

تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بنے روشن دان سے شام کا مٹیالا اجالا دھیرے دھیرے اندھیرے میں ضم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ خنک ہوا کے جھونکے نے ہاتھ میں دبے کاغذ کے کان میں جانے ایسی کیا سرگوشی کی کہ وہ پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ یادوں کے پنچھی اندھیری کوٹھڑی سے نکل کر دور افق میں محو پرواز ہوئے تو کچھ دھندلا دھندلا سا منظر آنکھوں کے سامنے واضح ہونے لگا۔

لکڑی کا مٹیالا سا ٹوٹا ہوا دروازہ اس پر لٹکا ہوا ٹاٹ کا پھٹا ہوا پردہ۔ صحن میں لگا ٹاہلی کا درخت' درخت کے نیچے رکھا تخت اور دو گھروں کے آنگن کو جوڑتی ایک مشترکہ دیوار اور اس دیوار کے پار سے جھانکتی ایک موہنی سی صورت۔

"ارے اماں! آج پھر دال... قسم سے اب تو دال کھا کھا کر جسم میں خون کی جگہ مسور اور مونگ کی دال ہی دوڑنے لگی ہے۔" نبیل نے دال کو دیکھتے ہی برا سا منہ بنایا اور پلیٹ پرے کھسکا دی۔

"ہاں تو تو گورنر لگ گیا ہے۔ لال نیلے نوٹ بھر بھر کر میری مٹھی میں لا کر دیتا ہے' جو میں تیرے لیے مرغ مسلم پکاؤں... کھانی ہے تو کھا ورنہ زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

صفیہ کو یوں پلیٹ ہٹا کر رزق کی بے حرمتی کرنا بالکل نہیں بھایا تھا۔

"آج کل حالات اور ہڑتالوں کی وجہ سے کام کا مندا چل رہا ہے۔ باپ اور چھوٹا بھائی سارا دن ہاتھ منہ کالے کرتے ہیں تو یہ دال روٹی چلتی ہے۔ مفت کی کھاتے باتیں آرہی ہیں۔" صفیہ کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی اس کے سامنے سے اٹھ کر اندر چلی آگئیں۔



ارم اور صنم سامنے برآمدے میں چٹائی پر بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھیں۔ حالانکہ وہ خود ابھی میٹرک اور فرسٹ ایر میں تھیں مگر پھر بھی ہر بچے سے سو پچاس مل ہی جاتا تھا۔ نبیل چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا مگر احساس ذمہ داری نام کو نہیں تھا۔ اس سے چھوٹا عدیل کم عمری سے ہی باپ کے ساتھ گیرج جانے لگ گیا تھا اور اب وہ کاروں کا اچھا مستری تھا۔

"او مسٹر ہیرو! یہ لو' کل پکائی تھیں۔ بچ گئیں' سوچا تھا کسی بھوکے فقیر کو دے دوں' پھر تائی کی آواز آئی تو سوچا تمہیں ہی دے دوں۔ آخر رشتے داروں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔"

نبیل ابھی بھوک کے مارے دال زہر مار کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کٹوری سمیت سحر دیوار کے پار سے نمودار ہوئی۔ گرما گرم بھری ہوئی بھنڈیاں' وہ ایسی ہی تھی۔ اپنے حصے کا سالن اس کے لیے لے آتی تھی۔

"ہاں مس ہیروئن! تم سارا دن چھپکلی کی طرح دیواروں سے کیوں چمٹی رہتی ہو اور تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔ چاچی پہلے ہی میرے حصے کا سالن نکال کر رکھ لیتی ہیں۔" سحر کو دیکھ کر نبیل کی ساری بے زاری

اڑن چھو ہوگئی تھی۔

ساتھ والا گھر ابا کے تایا زاد بھائی کا تھا۔ اماں اور چاچی کے درمیان — روایتی جٹھانی اور دیورانی کا رشتہ نہیں تھا۔ فیض چاچا کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ سحر اور فجر۔ ابا نے بچپن سے ہی سحر کو نبیل کے لیے مانگ رکھا تھا۔ تب سے دونوں کے درمیان پنپتی محبت ٹاہلی کے درخت کی طرح تناور اور مضبوط ہوچکی تھی۔ سحر رات میں نبیل کے خواب دیکھتی اور دن میں اس کا خیال رکھتی۔

نبیل نے ایم اے کرلیا تھا اور آج کل صبح و شام نوکری کے لیے جوتیاں چٹخار رہا تھا کیونکہ اس کے پاس نہ تو کوئی بھاری بھر کم لفافہ تھا اور نہ کوئی تگڑی سی فون کال۔۔۔ سحر نے بھی اس کے ساتھ ہی ایم اے کیا تھا مگر اس نے فارغ رہنے کے بجائے گلی کے ایک اسکول میں نوکری کو ترجیح دی۔ ایک تو پاس ہی تھا اور دوسرا اس مہنگائی کے دور میں اپنا خرچا نکل آتا تھا مگر نبیل تو اس تین چار ہزار کی نوکری کو نوکری ہی نہیں مانتا تھا۔ اس کے لیے تو نوکری کا مطلب بنگلہ، گاڑی، شوفر اور بے تحاشا دولت تھا۔

☼ ☼ ☼

صحن میں لگے واش بیسن کے میلے شیشے کے سامنے کھڑا نبیل بال بناتے ہوئے بڑے موڈ میں گنگنا رہا تھا کہ اتنے میں سحر اندر داخل ہوئی۔ سرخ اور سیاہ امتزاج کے سوٹ میں آج وہ بہت نکھری نکھری لگ رہی تھی۔

"اماں نے دودھ میں جلیبیاں بھگوئی تھیں۔ سوچا تایا جی کے لیے لے جاؤں۔" پیالی ہاتھ میں تھامے وہ ہنوز منہ پھیرے کھڑی تھی۔

رات ہی ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا لڑکے کا اپنا جنرل اسٹور تھا۔ پڑھا لکھا اور محنتی تھا۔ (نبیل کی بے پروائی اور خیالات کی اونچائی کو دیکھتے ہوئے اماں جز بز تھیں اس لیے رشتے لانے والی کو صاف انکار نہیں کیا تھا۔)

"چاچی کو پتا ہے۔ ابا دوپہر کو گھر میں نہیں ہوتے اور پھر انہیں تو سوجی کا حلوہ پسند ہے۔ تم یہ کٹوری مجھے دے دو چاچی کو میری طرف سے شکریہ کہہ دینا۔ وہ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں۔ میرا دل کرتا ہے ان کے ہاتھ چوم لوں۔" وہ اس سے پیالی لیتے ہوئے پھر شروع ہوگیا۔

"نبیل! زندگی یونہی ہنسی مذاق کرتے نہیں گزرتی۔ اسے گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔" سحر نے بے اختیار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آنکھیں رونے کی وجہ سے سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر دکھ کی واضح تحریر رقم تھی۔

"تم رو رہی ہو۔ خیر تو ہے کیا ہوا؟" وہ پیالی ایک طرف رکھ کر یکدم پریشان ہو کر اس کی طرف پلٹا۔ وہ کتنا ہی لاابالی سہی مگر سحر کے آنسو اس کے دل پر گرتے تھے۔ سحر نے سارا قصہ کہہ سنایا۔

"سحر! مجھے احساس ہے مگر میں اپنی صلاحیت اور کامیابی کی لگن کو یونہی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ پتا ہے آج کل عادل دبئی سے آیا ہوا ہے۔ اس دفعہ اس کے پاس روسی ریاستوں کے ویزے ہیں۔ میں ایک بار باہر جانے میں کامیاب ہوجاؤں، پھر دیکھنا حالات کیسے بدلتے ہیں اب مسکرادو اور میرے لیے دعا کرنا۔"

اس نے اس کے صبیح رخسار کو چھوا اور اپنی دھن میں مسرور گھر سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں! تم بس ابا کو راضی کرلو۔ ایک بار میرے جانے کی دیر ہے۔ ہمارے حالات بدل جائیں گے۔" ابا کا بڑا سارا شوروم پلس گیرج، ارم اور صنم کی اچھے گھرانوں میں شادی، بڑا سا گھر۔

"بس کر نبیل! بہت اونچے خواب دیکھنے والے جب نیچے گرتے ہیں تو بہت چوٹ لگتی ہے۔" صفیہ نے بیچ میں ٹوکنا ضروری سمجھا۔

اماں! بس چند سالوں کی بات ہے پھر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ عادل بھی تو ایسے ہی گیا تھا۔ آج اس کے

پاس کیا نہیں ہے۔ حالانکہ اس کے پاس نہ کوئی ہنر تھا نہ تعلیم۔" نبیل کب سے اماں کے پاس چارپائی پر بیٹھا اماں کے کان میں کھسر پھسر کررہا تھا۔

"نبیل! کسی کا لال منہ دیکھ کر اپنے منہ کو تھپڑوں سے لال نہیں کیا کرتے۔"

دوسری چارپائی پر سے سر اٹھا کر ابا نے دبی زبان میں گھرکا، جو عدیل کے ساتھ بیٹھے کالے کالے نوٹوں کو جوڑ توڑ کر حساب کررہے تھے مگر دھیان شاید ان دونوں کی باتوں کی طرف ہی تھا، پھر انہوں نے صفیہ بیگم کو مخاطب کیا۔

"اس بات کو یہیں ختم کردو اور صاحبزادے سے کہو، کل صدیقی کے پاس چلا جائے۔ ان کے داماد نے اسکول کھولا ہے اسے اپنے کمپیوٹر سیکشن میں رکھ لیں گے۔ ابھی چھ ہزار دیں گے۔ آگے اللہ مالک ہے۔" ابا نے ہاتھ اٹھا کر دوٹوک کہا۔

"ابا! میں کولہو کے بیل کی طرح تمام عمر غربت کے مدار میں چکر نہیں لگا سکتا۔ میں زندگی بنانا چاہتا ہوں گزارنا نہیں۔" وہ بول اٹھا۔

"نبیل! میرا منہ مت کھلوا۔ جو گھر برے وہ باہر بھی برے ہی ہوتے ہیں۔ وہاں جا کر ایمان داری سے جان توڑ محنت کرنی پڑتی ہے۔ جو تیرے بس کی بات نہیں ہے۔ ہنر تو نے نہیں سیکھا کہ ہاتھ پیر کالے ہوتے ہیں۔ تجھے اپنا پیٹ کاٹ کر تعلیم دلوائی تو تو کون سا افسر لگ گیا۔" وہ گرج کر بولے تو دیوار کے اس پار سحر کا دل دہل کر رہ گیا۔

"بیٹا! اپنا ملک، اپنے لوگ اپنے ہی ہوتے ہیں پردیس کی زندگی کانٹوں سے بھری چادر ہے۔" ابا نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔ آخر جوان اولاد تھی۔

"کون سا اپنا ملک، کون سے اپنے لوگ ابا! یہاں اب بھوک، بے روزگاری اور بم دھماکوں کے علاوہ رہ ہی کیا گیا ہے۔ پانی، گیس اور بجلی جیسی بنیادی ضرورتوں کے لیے تو سارا دن عوام سڑکوں پر دھکے کھاتے ہیں۔ یہاں ہے ہی کیا۔۔۔ نہ عزت، نہ مزدوری اور نہ جان و مال کا تحفظ۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے، میں باہر ضرور جاؤں گا۔ ایجنٹ کو پیسے دینے کا بندوبست کردیں ورنہ میں کوئی اور طریقہ بھی اختیار کرسکتا ہوں جو یقیناً" غلط ہی ہوگا۔ پھر شکایت مت کیجئے گا کیونکہ میں اس سیلن زدہ گھر میں پائی پائی کا حساب کتاب کرتے ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔" نبیل نے ہر طرح کا لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی بات پوری کی اور زور سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل گیا۔

دیوار کے اس پار ننھا سا دل دھڑکنا بھول گیا۔ آنکھوں سے ڈھیر سارا پانی بہہ نکلا۔

☼ ☼ ☼

اماں نے ارم اور صنم کے جہیز کے لیے رکھے سونے کے بندے بیچے۔ ابا نے اپنے ایک دوست سے قرض لیا۔ کچھ رقم چاچا نے فراہم کی اور یوں ایجنٹ کو پیسے دے دیے گئے۔ چھ ماہ کے اندر اندر تمام کاغذی کارروائی مکمل کرلی گئی اور بالآخر وہ دن بھی آن پہنچا کہ جب اگلے دن اس نے محو پرواز ہونا تھا۔

آج اس سیلن زدہ گھر میں اس کی آخری رات تھی۔

صحن میں بڑا مسرور اور مطمئن سا ابا اور تایا کے درمیان بیٹھا نبیل، سحر کی نم آنکھوں کا مرکز تھا۔ ملن کی تمام تر دعاؤں کے باوجود آخر ہجر کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

"یار! کل میں چلا جاؤں گا اور میں چاہتا ہوں کہ تمہارا ہنستا مسکراتا چہرہ اپنی آنکھوں میں بسا کرلے کر جاؤں۔" نبیل نے اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے پیار سے کہا۔

وہ ہاتھ چھڑا کر دھیرے سے اٹھی اور بیگ کے اندر سے ایک سویٹر نکال لائی۔

"نبیل! اس کے ایک ایک ٹانکے میں میں نے اپنی بے لوث محبت اور انتظار بن دیا ہے۔ اپنا خیال رکھنا اور یاد رکھنا یہاں کوئی ہے جس نے اپنی تمام عمر تمہارے نام لکھ دی ہے۔ میرے انتظار کو میری ہار مت بننے دینا۔" وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس

کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔

"تم دعا کرنا۔ میں جلد واپس آ کر تمہارے تمام جملہ حقوق اپنے نام کرلوں گا۔"

اک تحیر میلی سی مسکان سحر کے چہرے پر نمودار ہوئی اور وہ کھانا لگانے کے بہانے باہر چل دی۔

سامان کی پیکنگ کو آخری بار دیکھتے ہوئے اسے ایک خاکی لفافہ ملا جس میں اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ سمجھ گیا اندازکہ یہ سحر نے ہی رکھا ہے۔ اپنی تنخواہ میں سے کچھ پس کرکے اس نے ایک کمیٹی ڈالی ہوئی تھی۔ اس نے وہ لفافہ اور سویٹر سنبھال کر اندر رکھ لیا۔ اسے اس کی محبت پر بے طرح پیار آیا۔

نبیل کے لیے یہ صبح بڑی اور چمکیلی تھی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ سحر بھی صبح سے یہیں موجود تھی۔ صفیہ نے نبیل کے دائیں بازو پر امام ضامن باندھا تھا۔ ابا اور عدیل نے اسے ایئرپورٹ چھوڑ آنے کو کہا مگر اس نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ایجنٹ خود ہی اپنی گاڑی میں سب لڑکوں کو لے کر جائے گا اور یوں وہ سیلن زدہ گھر کی دہلیز پار کر گیا۔

دوپٹے کے پلو سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے سحر نے سوچا، جانے کیسی نئے سال کی صبح نو ہے، جو ملن کے بدلے جدائی کا سبب بن گئی تھی اور جانے اس جدائی کے آگے منزل تھی یا بند گلی۔۔۔

☼ ☼ ☼

آج اس قفس میں اسے ڈھائی سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ جب وہ یہاں آیا تھا ایک پاکستانی نژاد سارجنٹ سے اس کی سلام دعا ہو گئی تھی اور چار ماہ کی طویل خاموشی کے بعد۔ بلال کے ایڈریس سے ایک خط ارسال کروایا تھا، جس کا لب و لباب کچھ یوں تھا کہ اسے یہاں قانونی طور پر کچھ مسائل کا سامنا ہے اور فی الحال وہ یہاں کوئی نوکری وغیرہ نہیں کرسکتا اور اس کے کاغذات بھی اس کے پاس نہیں ہیں۔ واپسی میں کچھ عرصہ لگ جائے گا مگر وہ خیریت سے ہے۔

بلال کے ایڈریس پر ہی ابا کے ہاتھ کا لکھا خط موصول ہوا تھا۔ اس خط کے اک اک لفظ میں اپنوں کی پریشانی، اداسی، دکھ، آنسو اور دعائیں رقم تھیں۔ اسے ماں کے کہے الفاظ یاد آنے لگے۔

"اونچے خواب دیکھنے والے جب نیچے گرتے ہیں تو بہت چوٹ لگتی ہے۔"

وقتاً فوقتاً وہ خیریت کی اطلاع گھر بھیج دیا کرتا تھا۔ سحر کے انتظار اور محبت میں ڈوبے خط موصول ہوتے تھے مگر اس کے جواب دینے کا خود میں حوصلہ نہیں پاتا تھا۔ اسے لگتا وہ اپنی کم عقلی اور شارٹ کٹ کی لگن میں زندگی کی سب سے اہم بازی ہار گیا ہے اور اب پردیس میں کسی داماں ہر گزرتے لمحے اپنوں کی یادیں اسے کچوکے لگاتی تھیں۔ وہ جنوری کے مہینے میں یہاں آیا تھا اور اب اس کی ذات پر اذیتوں کے دروا ہوئے دو جنوریاں گزر چکی تھیں۔ اس نے تھک کر آنکھیں موندلیں آنکھوں کے سامنے وہ منظر واضح ہوتا چلا گیا۔ جب وہ خوش و خرم گھر کی دہلیز سے نکلا تھا اور پیچھے اپنوں کی محبتیں اور نم آنکھوں کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ سب کے چہرے ایک ایک کرکے سامنے آتے چلے گئے۔ نبیل نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں اور اب کھلی آنکھوں میں اک اور دردناک منظر در آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس کنٹینر کے اردگرد آگ کے شعلے رقصاں تھے۔ کنٹینر کی دیواریں اور فرش ناقابل حد تک گرم ہو رہے تھے۔ اندر کثیف دھواں بھر رہا تھا۔ تمام نوجوان کھانس کھانس کر بے حال ہو رہے تھے۔ کھانستے ہوئے نبیل کو یاد آیا کہ ایجنٹ نے پہلے انہیں کچھ سفر بذریعہ جہاز کروایا پھر اک انجان اور چھوٹے سے ملک میں انہیں اتار کر کہا کہ سفری کاغذات میں تھوڑا مسئلہ ہو گیا ہے اس لیے تھوڑا سفر ایک کنٹینر میں کرنا ہوگا۔ کاغذی کارروائی مکمل کرکے پھر ڈائریکٹ فلائٹ میں منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ دو تین لڑکوں نے اعتراض بھی کیا مگر انجان لوگ، انجان ماحول اور پھر وہ سب اس وقت ایجنٹ کے رحم و کرم پر تھے، اس لیے

ناچار کنٹینر میں سوار ہو گئے۔

سب لڑکوں کی سانسیں اکھڑنے لگی تھیں۔ خوابوں سے بھری آنکھوں میں دھوئیں کے باعث پانی بھرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ نبیل کے ہاتھ سے زندگی کی ڈور چھوٹتی، اس نے کنٹینر کے باہر لوگوں اور فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنے اور پھر وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گیا۔

اسے ہوش آیا تو وہ ایک اسپتال کے بیڈ پر پڑا تھا اور بہت ساری نلکیاں اس کے بازوؤں میں پیوست تھیں۔ جسم کا کافی حصہ جل چکا تھا مگر سرہانے لگی مشین میں نظر آتی آڑی ترچھی لکیریں اس کے زندہ ہونے کا ثبوت دے رہی تھیں۔ اس نے نظریں گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ اس کے سرہانے کانسٹیبل جیسے حلیے میں ایک بندہ بیٹھا تھا۔ اس نے اسے بتایا کہ کنٹینر میں زندہ بچ جانے والوں میں جو چند خوش نصیب ہیں تم بھی ان میں شامل ہو مگر غیر قانونی طور پر ہمارے ملک کی سرحد عبور کرنے کے جرم میں تم پولیس کی تحویل میں ہو اور تمہارے پاس سے ایک نقشہ بھی برآمد ہوا ہے جس کے بارے میں ابھی جانچ پڑتال کی جارہی ہے۔ تمہارے علاج کے ختم ہو جانے کے بعد تمہاری سزا کا تعین کیا جائے گا۔

ساری تفصیل سننے کے بعد نبیل کو لگا سب کچھ ایک دم گول گھوم گیا ہو۔ چند لمحے تو اسے یہ سمجھنے اور ماننے میں لگے کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہو گیا ہے۔

اب اسے یاد آرہا تھا ایجنٹ نے جاتے ہوئے اسے ایک لفافہ پکڑایا تھا کہ وہاں اس کا بھائی لے لے گا۔ اک لمحے کے لیے اس کے دل میں آیا تھا کہ لفافہ لوٹا دے مگر وہ ایجنٹ کو انکار کرکے اس سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا اور اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ نقشہ یقیناً اس ملک کی کسی اہم تنصیب کا ہوگا جس میں وہ بذریعہ کنٹینر غیر قانونی طور پر داخل ہوئے تھے۔

نبیل نے بارہا اپنی بے گناہی کا اعتراف کیا مگر اسے پانچ سال کی سزا سنا دی گئی تھی۔۔۔ دوسری طرف

پاکستان میں ابا اور چچا نے بڑا زور لگایا کہ کسی طرح ایجنٹ کا پتا لگ جائے۔ حکومتی دفاتر کے چکر کاٹے مگر وہاں غریب کی کون سنتا ہے بالآخر مجبور ہو کر چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔ وہ اسی میں شاکر تھے کہ وہ جہاں ہے صحیح سلامت ہے۔ دوسرے بدنصیب لوگوں کی طرح انہیں جوان بیٹے کی میت کو کندھا نہیں دینا پڑا تھا۔



"سحر! ان چار سالوں میں کوئی درجن بھر اچھے رشتے تم نے ٹھکرا دیے ہیں۔ فجر ماشاء اللہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی ہے اور تم اک فضول سی ضد کے پیچھے لگی بیٹھی ہو۔ اسے تمہاری یا اپنے گھر والوں کی فکر ہوتی تو یہ قدم ہی نہیں اٹھاتا۔ کتنا منع کیا تھا اسے بھائی صاحب اور بھابھی نے مگر اس پر تو امارت اور آسائشوں کا بھوت سوار تھا۔ آج وہ اپنی بے وقوفی اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے سب کے لیے دکھ اور اذیت کا باعث ہے۔ بھابھی کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی اور نبیل سے تو پہلی اولاد ہونے کے ناتے فطری طور پر محبت زیادہ تھی' بھائی صاحب اندر ہی اندر گھل رہے ہیں۔ اب جا کر بے چارے عدیل کی انتھک محنت سے قرضے سے جان چھوٹی ہے اور پھر اگر فجر کا دیور اتنا اچھا نہ ہوتا تو بغیر جہیز کے ارم کی ڈولی اٹھتی؟"

سحر سر جھکائے اماں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کی حالت کسی مجرم کی تھی۔

"اماں! میں نے آپ سے کہا نا کہ مجھے اس موضوع پر بات نہیں کرنی۔ ابھی تو میں نے لیکچررشپ جوائن کی ہے۔ ابھی مجھے پوری توجہ سے جاب کر لینے دیں۔" وہ دھیرے سے بولی کہ اپنا' اپنی محبت کا اور نبیل کا دفاع کرتے کرتے وہ تھک چکی تھی۔

"اللہ جانے خود تو وہاں مزے کر رہا ہو اور ہمیں یہاں ٹانگ رکھا ہے۔ آنے دو تمہارے ابا کو کرتی ہوں دو ٹوک بات۔" اماں کا غصہ بجا تھا۔ آخر وہ بھی ایک ماں تھیں۔ بیٹی کی اداسی تنہائی اور ڈھلتی عمر سے انہیں خوف آنے لگا تھا۔ اس نے ہتھیلی سے آنسو پونچھتے ہوئے اماں کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں نبیل کو جانتی ہوں وہ ضرور کسی مشکل میں ہے۔ بس اماں! چند برس اور ٹھہر جاؤ' پھر جیسا تم کہو گی میں مان لوں گی۔"

اماں نے اختیار اسے گلے سے لگا لیا اور خود بھی روتے ہوئے اس کے نیک نصیب کی دعا کرنے لگیں۔

نئے سال کی صبح کے سورج!

جو جاؤ ادھر......

تو ان سے کہنا!

تمام عمر کے دکھ اپنے نام کرنے کا

سمجھوتا کر کے

خوشیوں کی کرنوں سمیت

کوئی محو انتظار ہے!!!

آج جنوری کی اوائل تاریخیں تھیں۔ یاسیت' تنہائی اور دکھ میں اب کمی آگئی تھی کیونکہ تھوڑے دنوں میں نبیل کو رہائی کا پروانہ ملنے والا تھا اور پھر اسے ڈی پورٹ کر دیا جاتا۔ اس نے سحر کے کسی خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے والدین اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس کی شادی کسی اچھی جگہ کر دیں۔ ابا نے بھی دو تین بار ذکر کیا تھا مگر اس نے دل کے لاکھ کرلانے کے باوجود چپ سادھ لی تھی۔ اس جیسا نکما اور ناکارہ شخص بھلا اسے دے بھی کیا سکتا تھا۔ وہ واپس جا رہا تھا مگر ندامت کے ساتھ اور خالی ہاتھ۔ اور آگے بھی جانے کب نصیب یاوری کرتا مگر سحر اور اس کی محبت مستقل مزاج ثابت ہوئے تھے اس کا نصیب اچھا تھا یا پھر اپنوں کی دعائیں کہ وہ زندہ سلامت واپس لوٹ رہا تھا۔

اس نے کاغذ کو مسکراتے ہوئے تہہ لگا کر بقایا خطوط کے ساتھ رکھا اور لفافہ بند کر دیا کیونکہ اب اس کی زندگی میں اداسی' دکھ اور یاسیت سے بھری یہ آخری جنوری تھی۔ ملن کی اک نئی اور روشن صبح اپنی سرزمین پر اس کی منتظر تھی اور اس نے سوچ کیا تھا کہ وہ اسے اپنے زور بازو سے مزید روشن اور تابناک بنائے گا۔



ثمرہ بخاری

ہم سے ہے زمانہ



دادی کا آنگن (دادی کے خیال میں) اس وقت نیک لوگوں کی پر مغز، پر ہدایت باتوں کی وجہ سے امن و سکون اور پاکیزگی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ زرینہ بیگم جھوم جھوم کر باجی اللہ والی کے کارنامے بیان فرما رہی تھیں۔ جتنا وہ جھوم کر بتاتیں، اس سے زیادہ جھوم کر دادی "سبحان اللہ، واہ واہ، اللہ اکبر" کی صدائیں بلند کرتیں۔

جوادی، شبلی شان کی نئی فلم دیکھ کر شان کے اسٹائل میں ہی گھر میں داخل ہوئے تھے مگر اس نئی صورت حال نے چکرا کر رکھ دیا۔ زرینہ بیگم سر پر دوپٹا اوڑھے اتنی شیرینی لہجے میں سمو کر آخر کہہ کیا رہی ہیں۔ اصل میں چونکایا زرینہ بیگم کے اس بہروپ نے ہی تھا۔ ابھی کل ہی تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے انہوں نے خود زرینہ بیگم کو عقیلہ بیگم کے گھر میں ان کے پوتے کی مبارک باد دینے آنے والے کھسروں کے ساتھ ناچتے ٹھمکے لگاتے دیکھا تھا۔ شبلی نے تو بڑھ کے مشورہ بھی دیا تھا۔

"آنٹی زرینہ! ان سے اچھا تو آپ مٹکتی ہیں۔ ہماری مانیں، ان کے ساتھ ہی چلی جائیں۔" ساری عورتیں متفق تھیں مگر زرینہ نہیں مانیں۔ الٹا ان سے خفا ہوئی تھیں اور آج آنگن میں ایک بالکل ہی دوسرے موڈ کے ساتھ۔ "کمال ہے بھئی۔"

"یہ کس حرافہ کا ذکر ہو رہا ہے؟" جوادی کی زبان پہ کھجلی ہوئی تھی۔

دادی اور زرینہ بیگم تھرا کر چیخ اٹھیں۔ "آپا بیگم! اب تو آپ کے گھر پہ آفت آئی ہی آئی۔ یہ بے

ناولٹ

ہدایت لڑکے ضرور کسی شیطان کے چیلے ہیں۔ جہاں شیطان ہو وہاں باجی اللہ والی نہیں آیا کرتیں۔"

"وے جوادی! بولنے سے پہلے سوچ لیا کر۔ کم از کم باجی اللہ والی کے لیے تو یہ لفظ استعمال نہ کرتا۔" دادی صدمے سے چور تھیں۔

"اتنی نیک، ایسی پاک خاتون ہیں، ایسی ایسی کرامات ان سے منسوب ہیں کہ سن کر بے اختیار منہ سے سبحان اللہ نکلتا ہے۔"

"او اچھا آپ ان کا ذکر خیر فرما رہی تھیں۔" جوادی نے پینترا بدلا تھا۔

"سچ دادی! ان کی کرامات تو ایسی ہیں، بے اختیار سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ پچھلے دنوں پچھلے محلے کی ایک عورت اپنے کنوارے، نازوں کے پالے دیور کے ساتھ باجی کے آستانے پر دعا کے لیے گئی تھی۔ بے چاری کی شادی کو ڈیڑھ مہینہ ہو رہا تھا۔ ابھی تک گود ہری بھری نہیں ہو رہی تھی۔ ساس، نندوں نے طعنے دے دے کر کلیجہ چھلنی کر دیا تھا۔ خاتون دیور کو ساتھ لے کے آستانے پہ پہنچی۔ ادھر حاضری کے لیے آواز پڑی، ادھر موبائل پر ایک بچھڑی سہیلی کا میسج آگیا۔ خاتون تو میسج پڑھنے میں مصروف ہو گئی دیور نے باجی کے پاس جا کے دکھڑا رو دیا۔ باجی نے فکر نہ کرنے کا پکا وعدہ لیا اور جلدی ہی گود ہری ہونے کی گڈ نیوز بھی سنا دی۔ اب جی کرنا خدا کا یہ ہوا کہ پورے نو مہینے بعد دیور کی گود ہری تے سارے خاندان کی شکلیں نیلی پیلی ہو گئیں نے۔"

"آپا! دیکھو، دیکھو، اپنے پوتوں کو، انہوں نے کل بھی بڑی بے عزتی کی ہے میری۔ سن رہی ہو ان کی بکواس ناہان کا مطلب ہے میں جھوٹ بکواس کر رہی ہوں۔ میں اپنے پاس سے قصے گھڑ گھڑ کے سنا رہی



ہوں۔ میں ذلیل ،جھوٹی عورت ہوں؟"

"آپ نے اپنے منہ سے اقرار کرلیا ہے' اب اللہ یقیناً" آپ کو بخش دے گا۔" مسلسل بولنے میں مصروف انہوں نے سنا ہی نہیں۔

"تم دونوں شرم کیا گھول کے پی گئے ہو ؟" دادی نے چلا کر پوچھا۔

"گھول کے نہیں' گھوٹ کے۔" جوادی نے اطلاع دی۔

"دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔ تم دونوں نری شرمندگی ہو میرے لیے۔"

"لو بھلا... آپ کا اس میں کیا قصور' یہ کرامت تو سراسر باجی اللہ والی کی تھی۔ اب شرمندہ ہوں باجی یا پھر وہ دیور یا اس کے گھر والے۔ شبلی نے ڈھارس بندھائی۔

دادی نے ادھر ادھر دیکھا پھر قریب رکھا جگ اٹھالیا۔ ارادے خطرناک تھے۔ دونوں کو کھسکنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

محفل گرم تھی۔ دادی کے آنگن میں شبلی ،جوادی کی والداؤں کے ساتھ سویرا کی بھابھی' زیبا اور اس کی والدہ بھی موجود تھیں۔ عزیزی شبو بھی فرش پہ پونچھا لگانا بھول کے محفل کی رونق بڑھانے آموجود ہوئی تھیں۔ زرینہ بیگم مہمان خصوصی کی طرح اکڑ کر کرسی پر بیٹھی تھیں۔ اب تک چار کپ چائے کے چڑھا چکی تھیں اور باجی اللہ والی کے کارنامے تھے کہ ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔ حاضرین کی آنکھیں نمناک تھیں۔ چہرے عقیدت سے تمتمارہے تھے۔

جوادی ،شبلی نے جیسے ہی لاؤنج میں قدم رکھا صورت حال نے ٹھٹکا دیا۔ آگے بڑھنے کے بجائے وہیں دروازے کے قریب کھڑے ہوگئے۔

"زرینہ! تو بس کسی طرح باجی اللہ والی کو میرے اس غریب خانے پہ حاضر ہونے کے لیے راضی کرلے۔ ساری عمر دعائیں دوں گی۔"

زرینہ نے پہلے اثبات میں سرہلا کر سب کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑائی 'پھر بولی۔

"بات اصل میں یہ ہے کہ یہ سب کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ باجی اپنے آستانے سے باہر کم ہی تشریف لے جاتی ہیں۔ اصل میں کتنے ہی غریبوں کے لیے روزانہ لنگر کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ لوگ آستانے پر حاضر ہوتے ہیں۔ نذرانے دیتے ہیں۔ تب ہی لنگر چلتا ہے نا۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔ بھوکے ننگے کنجوس مکھی چوس لعنتی' ہم بھی نہیں ہیں۔ وہ تشریف تو لائیں نذرانوں سے جھولی بھردیں گے۔" شہناز نے عقیدت سے کہہ کر جوادی کو صدمے سے دوچار کیا تھا۔

"کل میں نے ہزار روپے مانگے تھے۔ جواب میں اماں نے ہزار صلواتیں سنائی تھیں۔ اس چڑیل کے لیے کتنا بڑا دل ہے اماں کا۔"

"چپ کر جا دوست! میں آنے والے وقت کی چاپ سن رہا ہوں۔ دولت کی جھنکار کو محسوس کررہا ہوں۔" شبلی کی سرگوشی پر جوادی نے شبلی کی طرف دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تو باجی اللہ والی دادی کے آنگن میں تشریف لا رہی ہیں۔ چشم ما روشن دل ماشاد۔"

زرینہ نے کہا تھا۔ باجی آج سے ٹھیک پانچویں روز اس گھر میں رونق افروز ہوں گی۔ آس پڑوس میں بھی اطلاع کردیں تاکہ زیادہ سے زیادہ خواتین رخ زیبا کی زیارت سے مستفید ہوسکیں۔

پہلے تو دادی کا ارادہ شبلی' جوادی کو محلے میں دوڑانے کا تھا' مگر زرینہ نے سنا تو صاف انکار کردیا۔

"بھئی' آپا جان! مجھے تمہارے ان چھلاوں پر بالکل بھروسا نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو ان کے بتائے کارناموں کی وجہ سے ادھر محلے میں داخل ہوں' ادھر محلے والے ان پر ٹوٹ پڑیں۔ میں آپ ہی سارے محلے میں اطلاع کردوں گی اور ہاں خیال رکھنا' باجی ناشتے میں میٹھی لسی پسند فرماتی ہیں۔ ساتھ میں دیسی گھی کا پراٹھا اور دو فرائی انڈے۔ دوپہر میں چوزے کی یخنی' کباب اور تھوڑا سا بھنا گوشت۔ رات کو البتہ بڑا شوق سے نوش فرمالیتی ہیں۔"

"اتنی سادہ خوراک' یہ تو ہمیں بہت ہی اپنی اپنی سی لگی ہیں۔ عمر کیا ہے ان کی؟" جوادی نے بے صبری سے پوچھا تھا۔

زرینہ گہرائی نہیں ناپ سکی۔ جھٹ بولی۔ "عمر تو زیادہ نہیں ہے۔"

"بس چہرے پر خرانٹ پن کی وجہ سے بڑی لگتی ہیں۔" شبلی نے بات مکمل کی۔

"دیکھیں دیکھیں آپا جان!" زرینہ پھر مچلی۔ دادی بھی جلال میں آگئیں۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے تک جو نیکی کی باتیں ہو رہی تھیں' خواب و خیال ہوئیں اب دادی پوری آب و تاب سے پوتوں پر گرج برس رہی تھیں۔

"دادی! میں نے آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتیں مجھے کوئی نیک ہم سفر نصیب ہوجائے؟"

"ہم سفر... تیری باجی... اللہ... والی۔" دادی تو غش کھاکے گر گئیں۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو ایک ہی بات پر اصرار کرتی رہیں۔

"توبہ کروے توبہ کر۔"

جوادی اس وقت فلم دیکھ رہا تھا' کہہ دیا۔ "اس وقت تو ایک اور گناہ میں مصروف ہوں۔ زندگی رہی تو ساری توبہ اکٹھی ہی کرلوں گا۔"

☼ ☼ ☼

چار دن تک گھر میں خوب افراتفری رہی۔ کونے کونے کو پونچھا مانجھا جارہا تھا۔ جیسے باجی اللہ والی صفائی کی چیکنگ کے لیے ہی آرہی ہیں۔ یہاں تک کہ نانا' ماموں نے اپنے سالوں سے ان دھلے گرم کپڑے بھی نکال کر ڈرائی کلین کروالیے تھے۔

"آپا! میرے لیے دعا ضرور کروایئے گا۔" اٹھتے بیٹھتے وہ دادی سے التجا کررہے تھے۔

"یہ بھی تو بتادیں' دعا کروانی کیا ہے؟" شبلی نے آخر پوچھ لیا۔

ماموں پہلے شرمائے' کان کی لوئیں سرخ کیں' پھر دھیرے سے بولے۔

"میں اپنا سونا کمرا آباد کرنا چاہتا ہوں۔"

دادی نے چونک کر ابراہیم کو دیکھا اور اس لہجے میں گویا ہوئیں جو شبلی جوادی کے لیے مخصوص تھا۔

"وے بے حیا! بے غیرت! اب اس عمر میں تو کمرا آباد کرنے کی سوچ رہا ہے۔ کیا ہوگیا ہے تجھے۔ نہ میں نہیں کرواتی ایسی دعا۔ میں تو سمجھی تو کاروبار میں ترقی کے لیے دعا کروانا چاہ رہا ہے۔"

"نانا' ماموں! ہزار' ہزار کا نوٹ پکڑائیں' ہم دعا کروانے کا خاطر خواہ انتظام کروا دیں گے۔" دونوں نے تسلی دی اور زبردستی نوٹ وصول کیے۔

حالانکہ دو ہزار میں دعا کا سن کر نانا' ماموں ارادہ ہی بدل رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

شام کو سویرا دو عدد نئے جوڑے کپڑوں کے پکڑے اٹھلاتی پہنچ گئی۔

"آنٹی شہناز کدھر ہیں؟" جوادی سامنے تھا مگر وہ اسے نظر انداز کر کے آنٹی کے نام کی مالا جپ رہی تھی۔

"کیا کام پڑ گیا ہے میری اماں سے؟ اور یہ زرق برق کپڑے اٹھائے کدھر گھوم رہی ہو؟"

"وہ باجی اللہ والی آنے والی ہیں نا۔"

"تو؟" جوادی نے بھنویں اچکائیں۔

"تو ظاہر ہے ان کے سامنے حاضری دینی ہے۔ پتا ہے جوادی! میں نے سوچ لیا ہے ان سے تمہارے اور اپنے لیے دعا ضرور کروانی ہے۔"

"کیوں؟" جوادی نے پھر اسی انداز میں سوال کیا۔

"کیوں... کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا مجھے دعا نہیں کرانی چاہیے؟"

"باجی اللہ والی سے تو بالکل نہیں کرانی چاہیے۔ پتا ہے پہلے یہ بھی ہمارے ہی گینگ میں شامل تھی۔ ہم نے زیادہ لفٹ نہیں کرائی تو اب اس نے اپنا الگ گروپ بنا لیا ہے۔"

"توبہ کرو جوادی توبہ کرو!" ایسی بے ادبی پر سویرا آنسو بہاتی شہناز کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زیبا کی حالت سویرا سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ وہ اس وقت دادی کے گھر میں تھی۔ زرینہ بیگم نے آج ہی خوش خبری سنائی تھی۔ باجی ایک رات ان کے ہاں قیام پر بھی راضی ہو گئی ہیں۔ سو اب زور و شور سے ان کے لیے کھانے بنائے جا رہے تھے۔ کباب فرائی ہونے تھے۔ مچھلی کو مسالا لگا کر رکھنا تھا۔ زرینہ بتا رہی تھی، اگر گاجر کا حلوہ بھی بنا لیا جائے تو دعا باجی کے دل سے نکلے گی۔ اب زیبا کچن میں موجود تھی اور دل سے دعائیں نکلنے والے تمام ٹوٹکوں پر عمل ہو رہا تھا۔

شبلی بھی کچن کے دروازے کے باہر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ زیبا کا اسے دیکھ دیکھ ڈھیروں خون بڑھ رہا تھا، جبکہ شبلی کا خون گاجر کا حلوہ، کباب اور مچھلی کھا کر بڑھنا تھا۔

"پتا ہے شبلی! میں باجی سے تمہارے لیے دعا کراؤں گی، اللہ تمہیں بھی نیک بنا دے۔ سیدھے راستے پر چلا دے۔"

"اتنی خدمت تم میری کرو نا تو میں ویسے ہی اچھا ہو جاؤں۔ کسی ایری غیری سے دعائیں کرانے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔"

"شبلی! تم صراط مستقیم سے بھٹک چکے ہو۔" زیبا نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اطلاع دی تھی۔ جس پر شبلی نے دل پر ہاتھ رکھ کر دہلنے کی اداکاری کے جوہر دکھائے تھے۔

"باجی جان عورتوں سے بھی پردہ کرتی ہیں۔" اگلی نشست جب زرینہ بیگم کے ساتھ جمی تو سب سے پہلے یہ انوکھا انکشاف کر کے انہوں نے محفل کو گرمایا۔

"ضرور شکل میں عیب ہو گا۔" جوادی نے جھٹ کہا۔

"ہاں! اگر ایسا ہے تو میں ان سے شادی پر راضی ہوں، قسم سے ساری عمر یک چشمی یا بے ناک کان یا بے دانتوں کی ہونے کا طعنہ نہیں دوں گا۔"

"تمہارے منہ میں خاک۔ باجی کا حسن تو چاند کو شرماتا ہے۔" زرینہ نے تپ کر انکشاف کیا۔

"سید نور اپنی آنے والی فلم کے لیے نئی ہیروئن کی تلاش میں ہے۔" شبلی نے زرینہ کو بتایا۔

"تم باجی کے عتاب کو دعوت دے رہے ہو۔" زرینہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔

"دفع کرو ان کو۔ ہم نے بھی ان کو ان کے حال پہ چھوڑ دیا ہے۔ تم یہ بتاؤ باجی صاحبہ تشریف کب لا رہی ہیں؟ میں نے تو اماں جی کی بیٹھک میں اپنے گھر سے لا کے نواں نکور بستر بھی بچھا دیا ہے۔ شنیل کی نرم ملائم رضائی تے سنبل کی روئی والا تکیہ۔" شہناز باجی کے دیدار کو بے تاب بتا رہی تھی۔

"بس جی اب تو ایک ہی دن ہے بیچ میں۔ پھر باجی جلوہ افروز ہو جائیں گی اور ان کے آتے ہی آپ کو نذرانے ضرور جمع کرانے ہوں گے۔"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" سب یک زبان ہو کر چلائی تھیں۔

"اب تم ساری باری باری مجھے اپنی اپنی حاجتیں بھی لکھوا دو۔"

زرینہ کی اس بات پر دونوں چونکے تھے۔ پہلے ایک دوسرے کو پھر گہری نظر سے زرینہ کو دیکھا تھا، وہ کاپی پنسل پکڑے اس وقت سب کی حاجتیں لکھنے میں مصروف تھیں۔

"ویسے آنٹی زرینہ جی! آپ یہ کس سلسلے میں نوٹ فرما رہی ہیں؟" شبلی خاموش نہیں رہ سکا۔

"باجی اللہ والی ان سب کے ناموں کے ساتھ ابھی سے دعا کا سلسلہ شروع فرمائیں گی نا۔" حاضرین ایک بار پھر جھوم اٹھے اور یہ دونوں میڈم زرینہ کی اس بات پر جھوم اٹھے۔

"ویسے فی دعا کتنا نذرانہ لیا جاتا ہے؟"

"پانچ ہزار۔" زرینہ کی بات پہ جوادی گرتے گرتے بچا۔

"شبلی یار! مجھے "بھائی جان اللہ والا" بننے کا خیال کیوں نہیں آیا۔"

"یار! ہم دونوں تو زیبا اور سویرا کی زلفوں کے خوامخواہ اسیر ہو چکے ہیں، اگر نانا، ماموں، باجی اللہ والی کے دل میں اپنی محبت کی شمع روشن کر دیں تو سوچو ذرا دنوں میں امیر ہو سکتے ہیں۔"

"آنے دو باجی صاحبہ کو، پھر سوچتے ہیں کیا کرنا ہے۔" جوادی کی بات پر شبلی نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج کل ساری گلی میں بس یہی چرچا تھا۔ افضل رات بارہ بجے اچانک آن دھمکا۔ آج شبلی بھی جوادی کے گھر میں اور اس کے کمرے میں ہی تھا۔ افضل پہلے تو کمرے میں آیا، پھر ان دونوں کو دیکھ کر ناراض صورت بنا کر خاموش بیٹھ گیا۔ دونوں نے توجہ نہیں دی۔ آخر خود ہی بولنا پڑا۔

"میں تم دونوں سے سخت ناراض ہوں۔"

"اچھا!" دونوں نے کہا، پھر باتوں میں لگ گئے۔

"پوچھو گے نہیں کیوں؟"

"بتانا مناسب سمجھو تو خود ہی بتا دو۔"

افضل بتانے ہی تو آیا تھا، جھٹ بولا۔ "تم لوگوں نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا۔ سارے محلے کو اطلاع دے دی، نہیں بتایا تو ایک مجھے، ایک میری ماں کو۔"

"مگر کیا؟" دونوں حیران تھے۔

"تمہارے گھر میں ایک بزرگ ہستی تشریف لا رہی ہے، تم نے بتایا ہی نہیں۔"

"بزرگ ہستی ہمارے گھر میں کوئی پہلی دفعہ تشریف نہیں لا رہی۔ دو بزرگ ہستیاں آل ریڈی موجود ہیں۔ ان کی بڑی قدر کر لی ہے تم نے، جواب نئی آنے والی کی کر لو گے۔"

"بور نہیں کرو یار! تم کہاں سے بزرگ ہستیاں ہو گئے، یہ بتاؤ باجی جی کب تشریف لا رہی ہیں؟"

"جب نذرانے کی قم پوری ہو جائے گی، آ جائیں گی۔"

"کب پوری ہو گی؟" اشتیاق سے پوچھا۔

"پتا نہیں، ابھی تو پورے دس ہزار کم ہیں۔" جوادی نے آہ بھری۔

"دس ہزار!" مایوسی پھیلی۔

"ہاں تو تم دے دو، دعائیں کرانے کو سب سے آگے، نذرانہ دیتے موت پڑتی ہے۔" شبلی نے خفگی دکھائی۔

"مم... میرے پاس صرف تین ہزار ہیں۔"

"چلو یہی دے دو اور خوش خبری سنو، تمہارا نام دعائیہ لسٹ میں شامل کر لیا گیا۔" روپے جھپٹ کر اپنی جیب میں رکھتے ہوئے جوادی نے خوش خبری سنائی۔

"کیا میں ان کا دیدار کر سکوں گا؟" وفور عقیدت

سے کانپتی آواز میں افضل صاحب آگاہی چاہ رہے تھے۔

"ہاں! کیوں نہیں۔ ان کا ایک رات کا قیام بھی ہماری طرف ہے۔ تم رات کو ایک ڈیڑھ بجے کھڑکی پھلانگ کے ان کے کمرے میں آجانا اور لحاف چہرے سے ہٹا کر نظارہ کرلینا۔" شبلی کی بات ابھی افضل کے پلے نہیں پڑی تھی۔

"پردہ کرتی ہیں نا!" جوادی نے سمجھایا۔

"تم لوگوں کو شرم نہیں آتی؟" افضل نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"تمہارا کہنے کا مطلب ہے، ہمیں بھی پردہ کرنا چاہیے؟" جوادی نے پوچھا۔

"نہیں تم لوگوں سے بات نہیں کررہا، بس اسی وقت آؤں گا جب باجی تشریف لے آئیں گی۔"

"ہاں، ہاں جاؤ، یہاں کون مرا جارہا ہے تمہارے لیے۔"

"یہ نذرانہ تم نے کیوں وصول کیا ہے؟" جاتے جاتے افضل ٹھٹکا۔

"دادی نے یہ ذمہ داری ہمیں سونپی ہے۔ بے شک پوچھ لو جاکر۔"

اب دادی سے کون جاکر پوچھتا اور خوامخواہ میں عزت افزائی کراتا۔ افضل کو نہ چاہتے ہوئے بھی اعتبار کرکے گھر کی راہ لینی پڑی۔

"تین ہزار یار! یہ باجی اللہ والی تو واقعی نیک بخت ہے۔ دیکھ! ابھی قدم ہمارے گھر میں پڑے نہیں، نوٹوں کی برسات شروع ہوگئی۔" جوادی نے نوٹ لہرائے۔

"ہاں یار! میں بھی متاثرین میں شامل ہورہا ہوں۔" شبلی نے عقیدت سے نوٹوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"شبلی! مجھے زرینہ آنٹی کے گھر جانا ہے۔" جوادی نے اچانک کچھ یاد آنے پر انتہائی رازداری سے کہا اور جیب میں رکھا کاغذ تھپتھپایا۔

"کیوں۔۔۔؟"

"تو آتو سہی، راستے میں بتاؤں گا۔"

"کیا خیال ہے تکے کباب نہ کھائے جائیں؟"

"وہ بھی کھالیں گے، شبلی تو میرے ساتھ تو آ۔"

جس وقت یہ زرینہ بیگم کے ہاں پہنچے، وہ سیل فون کان سے لگائے کسی کو باجی کی کرامات بتانے میں مصروف تھیں۔ دونوں نے ادھر ادھر دیکھا، پھر بیٹھ گئے۔

"ہاں اس وقت کیسے آنا ہوا؟" کال سے فارغ ہوکر زرینہ نے خاصی رکھائی سے پوچھا۔

"وہ جی! دادی نے بھیجا ہے، اصل میں کچھ اور عورتیں آئی تھیں کہہ رہی تھیں ہم بھی باجی کی دعائیہ لسٹ میں اپنا نام شامل کرنا چاہتی ہیں۔ دادی نے کہا۔ بھاگ کے جاؤ زرینہ کے پاس جو لسٹ رکھی ہے اس میں ان بے چاریوں کے بھی نام اور ناکام تمنائیں نوٹ کرا آؤ۔"

"اچھے وقت پہ آئے ہو، میں تو بس گھر سے نکلنے والی تھی۔"

"کہیں جارہی ہیں آپ؟"

"ہاں بس ایک ضروری کام ہے۔" ٹالنے کے انداز میں کہہ کر دراز سے لسٹ نکالی۔

"یہ جی پہلا نام تو رشیدہ بی بی کا ہے۔ بے چاری کے پانچ بیٹے ہیں۔ بیٹی ایک بھی نہیں۔ کہتی ہے جے اب بھی بیٹا ہوا تے میں کچھ کھا کے مرجاؤں گی۔"

"رشیدہ بی بی!" زرینہ نے نام نوٹ کیا، اچانک شبلی کو شدید کھانسی آنے لگی۔

"پانی، پانی لے کر آئیں۔" جوادی نے زرینہ سے کہا۔ وہ لسٹ یہیں چھوڑ کر پانی لینے بھاگی۔

یہی تو مناسب موقع تھا، جوادی نے جیب سے اپنی بنائی لسٹ نکالی اور زرینہ کی لسٹ کی جگہ رکھ کر اس کی بنائی لسٹ اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی، جب ایک منٹ کے وقفے سے زرینہ پانی کا گلاس لے کر کمرے میں آئی تو شبلی ہشاش بشاش بیٹھا تھا۔

"اچھا جی! ہم اب چلتے ہیں۔ اصل میں ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔"

زرینہ نے بھی اصرار نہیں کیا، دونوں گھر سے باہر آگئے۔

"ودی آئی باجی اللہ والی۔" باہر آکر دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر قہقہے لگائے۔

☆ ☆ ☆

باجی کے کمرے کی تیاری قریب قریب نئی نویلی دلہن کے کمرے کی تیاری جیسی ہی تھی۔

"نانا، ماموں! اس کمرے کو دیکھ کر آپ کے دل کو کچھ نہیں ہورہا؟" شبلی نے کمرے کے معائنے کے دوران سرگوشی کی تھی۔

"نہیں، ہاں، مگر باجی کے حسن کے بارے میں بہت سنا ہے۔ دیدار کو جی مچل رہا ہے۔ تم تو جانتے ہو، میں ہمیشہ سے ہی حسن پرست رہا ہوں۔"

"میں کیسے جان سکتا ہوں، میں کوئی آپ کے ساتھ کھیل کے جوان تھوڑی ہوا ہوں۔ ویسے اگر آپ باجی اللہ والی کے نام کوئی لو لیٹر لکھنا چاہیں تو لکھ کر مجھے دے دیں، میں پہنچادوں گا۔" نانا، ماموں نے گھور کر دیکھا۔

"اوہ میں تو بھول گیا، یہ لیٹر لکھنے کا زمانہ کہاں ہے۔ میں باجی کا سیل نمبر حاصل کرنے کی کوشش کروں گا، پھر آپ دن رات انہیں دل لبھانے والے میسج کرسکتے ہیں۔"

"کیا تم دونوں نے انہیں میرا جیون ساتھی بنانے کا مصمم ارادہ کرلیا ہے؟"

"نانا، ماموں! بڑی امیر عورت ہے، ایک دعا کے پانچ ہزار وصول کرتی ہے، وارے نیارے ہوجائیں گے آپ کے۔" جوادی نے بھی سمجھایا۔

"لینے کے دینے بھی پڑسکتے ہیں۔ اس بات کو بھی ذہن میں رکھو، اللہ والے ناراض ہوجائیں تو زندگی برباد کرسکتے ہیں۔" نانا، ماموں ان کے اندازوں سے بڑھ کر بے وقوف تھے۔

"باجی رات سونے سے پہلے باداموں والا گرم دودھ پیتی ہیں۔" زرینہ کی طرف سے نیا اعلان ہوا تھا۔

"زرینہ آنٹی! لگے ہاتھوں یہ بھی بتادیں باجی جی ہاضمے کے لیے چورن کون سا استعمال کرتی ہیں۔"

"حلوے، کباب، مچھلی، بادام، دودھ، الابلا سبحان اللہ، سبحان اللہ۔"

☆ ☆ ☆

محلے کی نیک بیبیاں دوپہر کو کھانا بنانا بھول کر کے بچوں کو ٹافیوں، نمکو پہ ٹرخا کے شبلی کے آنگن میں اکٹھی ہونے لگی تھیں۔ زرینہ نے اعلان کیا تھا۔

"باجی صاحبہ کی آمد کسی وقت بھی ہوسکتی ہے۔ آپ سب ذرا خاموشی اختیار کریں۔"

مگر خاموشی اختیار کرنا بس کی بات نہیں تھی۔

"زرینہ! باجی صاحبہ کہیں آنا بھول تو نہیں گئیں؟" آخر دادی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

"گاڑی بھجوائیں گی تو ہی آئیں گی نا!" زرینہ نے کمال بے نیازی سے مطلع کیا۔

"اچھا گاڑی ہم نے بھجوانی تھی۔ وے جوادی! جا اپنے ابا کی گاڑی لے کے آ، جلدی کر پہلے ہی بڑی دیر ہوگئی ہے۔"

گاڑی آئی تو زرینہ بیگم بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوگئیں۔

"آخر کو رستہ تو میں ہی بتاؤں گی نا۔"

باجی اللہ والی کا آستانہ یہاں سے کافی دور تھا... مگر کہاں تھا یہ ان دونوں سے خفیہ رہا کہ زرینہ بیگم نے گاڑی خاصے فاصلے پر رکوالی تھی۔ گلیاں تنگ و تاریک، گندا مندا سا علاقہ تھا۔ کچھ ہی دیر بعد زرینہ کی واپسی ہوئی، مگر اب وہ اکیلی نہیں تھی، ساتھ میں ایک برقعہ پوش وجود بھی تھا۔

"اتنی لمبی چوڑی شبلی! کیا یہ واقعی عورت ہے؟"

"وے منڈیو بے ادبو! بے ہدایتو! آنکھیں نیچی کرو۔" زرینہ نے خفگی دکھائی اور دید کی پیاسی اکھیاں پیاسی ہی رہ گئیں۔

"چلو یہ سامان اٹھا کر گاڑی میں رکھو۔ تھک گئی ہوں میں تو۔" زرینہ گاڑی کی سیٹ پر ڈھے گئی۔

جوادی نے سامان اٹھا کر ڈگی میں رکھا۔

"تو یہ کبوتر... کیا باجی آج بھی صدیوں پرانے ڈاک کے نظام پر قائم ہے۔ ڈھولن یار کو چٹھیاں کبوتر کے ذریعے پہنچائی جاتی ہیں۔"

گاڑی روانہ ہوئی، باجی صاحبہ نے برابر بیٹھی زرینہ کے کان میں کچھ کہا۔

"وہ باجی صاحبہ کو کچھ شاپنگ کرنا ہے۔ گاڑی بازار کے قریب روک دینا۔"

"شاپنگ!" دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اس بازار میں نہیں، اگلے بازار میں روک دوں گا۔" جوادی نے جواب دیا۔

"نہیں، نہیں، اسی بازار میں۔"

"وہ کیا ہے کہ اس بازار میں کچھ دکان داروں کے مقروض ہیں ہم۔ اگر انہوں نے دیکھ لیا تو چھوڑیں گے نہیں۔" شبلی نے وجہ بتائی۔

"مگر اگلے بازار میں کوئی ادھار سودا دینے پہ تیار نہیں ہوگا۔ یہاں تو اکثر باجی کے عقیدت مند ہیں۔"

"ہوں تو اندازہ درست تھا یہاں سے ادھار شاپنگ ہونا تھی اور یقیناً" یہ بل کل پرسوں تک دادی کو ادا کرنا تھا۔"

"آپ کو جو بھی لینا ہے، ہمیں بتا دینا۔ ہم کل سویرے ہی لا دیں گے۔" جوادی نے گاڑی نہیں روکی۔ زرینہ کافی شور ڈالتی رہی۔

باجی نے کان میں پھر کچھ کہا۔ زرینہ نے ترجمانی کی۔

"ادھر اس چکن تکے والے ہوٹل پہ روک دو۔ باجی کا دل چکن تکے کو چاہ رہا ہے۔"

"کیا یہ بھی ادھار لیا جائے گا؟" جوادی نے پوچھا۔

"نہیں، نہیں۔ تمہیں شرم نہیں آئے گی تم تم اپنی طرف سے کھلاؤ نا باجی کو۔" زرینہ نے برا مانا۔

"ہم تو پیسے نہیں لائے۔"

"کیا مطلب! ہزار، دو ہزار بھی نہیں ہیں تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" بغیر کسی شرمندگی کے نفی میں سر ہلائے گئے۔

"اچھا میں تم لوگوں کو ادھار دیتی ہوں۔ گھر جا کے واپس کر دینا۔"

دونوں نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی کو اقرار جان کر زرینہ نے دو ہزار شبلی کی جانب بڑھائے۔

چکن تکہ واقعی بے حد لذیذ تھا۔ باجی صاحبہ نے تو پلیٹوں پر پلیٹیں سیخوں پر سیخیں صاف کی ہی تھیں۔ یہ دونوں بھی پیچھے نہیں تھے۔

پوری طرح انصاف کرنے کے بعد گاڑی آگے بڑھائی۔ باجی، زرینہ کے کان میں پھر منمنائی۔

"باجی! فرما رہی ہیں، ادھر بائیں ہاتھ پر مٹے پہلوان کی کھیر بھی بڑی مزے کی ہوتی ہے۔"

"اچھا گوجی! ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔" شبلی اس اطلاع پر خوش ہو کر چہکا۔

"کھیر سے یاد آیا، پچھلے مہینے ہم نے بھی کھیر پکائی تھی۔ دس کلو دودھ، آدھا کلو چاول۔ بڑے سے پتیلے میں کھیر ساری رات پکتی رہی تھی۔ امی نے سبز الائچیاں بھی پیس کر ڈالی تھیں۔ میں اور شبلی چاندی کے خالص ورق حکیم جی کی دکان سے خرید کر لائے تھے۔ میوہ جات شبلی کی امی جان نے کاٹے تھے۔ ساری رات کتنی رونق، کیسا رت جگا سا رہا تھا مگر جب امی نے میٹھا چکھنے کے لیے ایک چمچہ کھیر کا بھر کر منہ میں ڈالا تو چیخ اٹھیں۔"

"ہیں کیوں؟" باجی اور زرینہ پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

"میٹھے کی جگہ نمک ڈال دیا تھا امی جی نے۔"

اس بات کے دوران کھیر کی دکان پیچھے رہ گئی تھی اور جوادی، شبلی کا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

گاڑی محلے میں داخل ہوئی، پھر گھر کی طرف بڑھی جہاں شبو دروازے سے منہ باہر نکالے یقیناً "اہل خانہ" کی طرف سے مقرر تھی۔

اسے باجی صاحبہ کی آمد کی اطلاع بروقت دینا تھی۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں شبو بیگم کے لمبے دانت دور ہی سے چمکتے واضح دکھائی دے گئے تھے۔

"آپ کا انتظار بے تابی سے ہو رہا ہے باجی!" شبلی نے مڑ کر باجی صاحبہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رومانٹک انداز میں کہا تھا۔

"ساڈے گھر آئی بھرجائی
لکھاں خوشیاں نال لیائی۔"

جوادی عقیدت سے گنگنا رہا تھا۔ باجی نے تیوری چڑھا کر آنکھوں میں غصہ بھر کر زرینہ کی طرف دیکھا اور اس موقع پر ایسے گیت کا مقصد جاننا چاہا۔

☼ ☼ ☼

باجی نقاب گرائے زرینہ بیگم کے ساتھ آنگن میں داخل ہوئی۔ جوادی، شبلی بھی عقیدت مندوں کی طرح ہاتھ باندھے ان دونوں سے دو قدم پیچھے چلے آ رہے تھے۔ خواتین پر باجی کو دیکھ کر رقت، جبکہ شبلی کے خیال میں باجی کا ڈیل ڈول دیکھ کے دہشت طاری تھی۔ اسی لیے ہر سو مکمل خاموشی کا راج تھا۔ ایسے میں جوادی نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

"باجی ساڈی۔"

خواتین اور شبلی جذباتی ہو کر چلّائے۔

"او ہے ہی او ہے۔"

اور پھر جو شور ہوا تو خاموشی خواب ہوئی۔

"شبلی! چپ کراؤ ان بدتمیز عورتوں کو۔ باجی یہاں ووٹ لینے نہیں آئیں، دعائیں دینے آئی ہیں۔" باجی نے زرینہ کے کان میں کچھ کہا تھا، جس کے بعد زرینہ نے اعلان کیا۔ "باجی بہت تھک چکی ہیں۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام فرمانا چاہتی ہیں۔"

"تھکی ہوئی ہیں! وے شبلی، جوادی! کیا گڈی رستے میں خراب ہو گئی تھی۔ پیدل آ رہے ہو؟" شہناز کے سوال پر دونوں نے نفی میں سر ہلائے اور بتایا۔ "باجی کھا کھا کے تھک گئی ہیں۔"

"ویسے باجی! اے کوئی گل تے نا ہوئی، عورتیں نمانیاں دوپہر سے اپنے کاکے اور کاکوں کے ابا بھلائے دیدار کو بیٹھی ہیں اور آپ آتے ہی تھکن کا بہانہ بنا کے کمرے میں بھاگ رہی ہیں۔" شبلی کے اعتراض پر باجی کو کچھ دیر کے لیے صحن میں بچھی دریوں کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔

"باجی! یہ لڈو میں نے..." سامنے والے گھر کی بھابھی نسرین نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ باجی اللہ والی نے پلیٹ میں رکھا لڈو اٹھایا اور نقاب کے اندر سے منہ میں ڈال لیا۔ یہ دیکھ کر بھابھی نسرین کا منہ پہلے کھلا، پھر مزید کھلا اور اس کے بعد زبان بھی کھل گئی۔

"بیڑہ غرق باجی! یہ لڈو تو میں نے اپنی کپتی (تیز مزاج) ساس کے لیے بنایا تھا، دعا کرانی تھی اس پہ کہ اسے کھاتے ہی اس کی زبان بند ہو جائے۔ آپ نے لڈو ہی ہڑپ کر لیا ہے۔"

"یہ وہی لڈو ہے نا بھابھی نسرین! جس میں آپ نے کتے مار زہر بھی ملایا ہوا تھا؟"

جوادی کی بات پر باجی نے چیخیں مارنے کا عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ تب کہیں نسرین نے بتایا۔ "خوش قسمتی سے میں زہر پانا بھول گئی تھی۔"

"باجی! میرا خیال ہے، آرام کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔" زرینہ اس سارے ہنگامے سے آپ بڑی گھبرا گئی تھی۔

"میرے کبوتر... گڈی کی ڈگی میں کہیں دم ہی نہ گھٹ گیا ہو۔" باجی کے کلیجے پہ ہاتھ پڑا تھا۔

"نہ گھبراؤ۔ میں ابھی لے کے آتا ہوں۔" شبلی نے تسلی دی۔ جا کے ڈگی کھولی، کبوتر مزے سے سو رہے تھے۔

"باہر آؤ اوئے! کیا خالہ جی کا گھر سمجھ لیا ہے۔ لعنتیو! کتنے مزے سے سو رہے ہو۔ واہ، واہ! صحت میں یہ بھی باجی سے کم نہیں ہیں۔ گوشت بھی کافی لذیذ ہو گا۔"

"گوشت...!"

کسی خیال سے آنکھیں چمکیں۔ پہلے کبوتر اٹھا کر کچن میں آیا۔ ادھر ادھر دیکھا مناسب جگہ... پھر فریج کھول کر کبوتر اندر ڈال دیے۔

پھر خالی ڈبا ڈگی سے نکال کر باجی اللہ والی کے کمرے میں رکھ دیا۔

"یہ تو بڑے مزے سے سو رہے ہیں جی۔" پیار سے بند ڈبے پر ہاتھ پھیرا۔

"شور نہ ڈالو' نیند کے کچے ہیں۔" باجی نے دھیرے سے کہا۔

گھر میں خوب چہل پہل ابھی تک تھی۔ دادی مدبر بنی سب کو سمجھا رہی تھیں۔

"باجی جیسی عورتیں کہیں صدیوں میں پیدا ہوا کرتی ہیں۔"

"بہن جی! نانا ماموں سے بھی بڑے بڑے ہاتھ پاؤں' جناتی قد و قامت' سبحان اللہ! غالب نے ایسی ہی چنڈال عورتوں کے لیے فرمایا تھا۔

"تیرے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں"

جوادی نے اپنے انداز میں تعریف کی تھی۔ عورتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اثبات میں سر ہلا کے واہ' واہ کہیں یا اس موقع پر الٹے منہ کہنا مناسب رہے گا۔

"یہ چنڈال کس کو کہا ہے؟" دادی کو اعتراض کے لیے ایک نکتہ مل ہی گیا۔

"یہ باجی کا پیار کا نام ہے۔ ادھر ان کے محلے میں سارے انہیں اسی نام سے بلا رہے تھے۔"

بات یقین کرنے والی نہیں تھی' لیکن جوادی کے چہرے پر چھائی سنجیدگی انہیں کچھ کہنے سے بھی روک رہی تھی۔

"باجی نقاب کب اٹھائے گی؟" زیبا کو دیدار کی بڑی آرزو تھی۔

"یقیناً" سہاگ رات کو۔" جوادی نے مسکرا کر حاضرین کو بتایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یار! یہ نقاب والی بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔" رات کے ڈیڑھ بجے بھنے ہوئے مزے دار کبوتر کھاتے جوادی اس گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش کے بعد کہہ رہا تھا۔

"سنا نہیں تم نے؛

"پردے میں رہنے دو' پردہ نہ اٹھا
پردہ جو اٹھ گیا تو بھید کھل جائے گا"

جوادی کو شبلی کے گانے پر ہمیشہ اعتراض ہوتا تھا' آج اعتراض کرنا یاد نہیں رہا۔

"کیا باجی اللہ والی اصل میں پائی جان شیطان کی ہے؟"

"پہلے میرا بھی یہی خیال تھا' مگر اب جب کبوتروں کا بیڈ روم ان کے کمرے میں رکھنے گیا تو نقاب اٹھائے بیٹھی دلوں پر ہیبت طاری کروانے والے موڈ میں بیٹھی تھی۔ ہے خاتون ہی' مگر گڑبڑ ہے ضرور۔"

"ہوں... کڑی نظر رکھنی پڑے گی۔ ویسے کبوتر ہے بہت لذیذ۔"

"یقیناً" اس میں تو شک ہی کوئی نہیں۔"

"مگر مجھے باجی پر شدید شک ہے۔ یار! آج رات سونے کے بجائے جاگتے رہنا اور ان کے کمرے پر نظر رکھنا خاصا ضروری ہے۔"

"ان کے کمرے پر نظر رکھنے کے بجائے اگر انہیں لاؤنج میں بلا کر ایک دلچسپ سی فلم دیکھنے پر لگائیں تو کیسا رہے گا؛" جوادی مسکرایا۔

"اگر مان جائیں تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔"

دونوں نے جا کر ان کے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی مگر اندر سے زرینہ اور باجی کے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ انہیں واپس آنا پڑا۔

☼ ☼ ☼

"جوادی! شبلی! پھر تم نے بتایا نہیں۔" نانا' ماموں خیالوں میں اک نئی دنیا بسائے بیٹھے تھے' جبکہ یہ بھول بھال چکے تھے۔

"کیا نانا' ماموں! کیا پوچھ رہے ہیں آپ؟"

"اوہو بے ہدایتو! باجی اللہ والی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔"

"اسے بھول جائیں نانا' ماموں! وہ آپ کے قابل نہیں ہے۔"

"تو پھر کس کے قابل ہے؟"

"اوہو! ایک تو یقیناً" وہ ہے' مگر شادی کے لیے نیک سے زیادہ خاتون ہونا ضروری ہے اور ان کے ہاتھ پاؤں اتنے فراخ ہیں کہ جن' بھوت بھی دیکھیں تو شرما کر اپنے ہاتھ پشت پر چھپا لیں۔ قد اونٹ سے بھی لمبا ہے' آواز سو مردوں پر بھاری ہے اور کھاتی' سو گھوڑوں کے برابر ہے۔ میرا تو خیال ہے ان ہی خوبیوں نے انہیں باجی اللہ والی بننے پر مجبور کر دیا ہے کیونکہ وہ شوہر والی کبھی نہیں بن سکتی۔"

یہ سب سن کر نانا' ماموں خاصے مایوس ہوئے۔

"تو پھر وہ یہاں کرنے کیا آئی ہے۔ بھیجو واپس اسے اس کے آستانے پر۔ گھر کا سارا نظام ڈسٹرب ہو رہا ہے۔"

"چلی جائے گی بے چاری' دو' ایک دن کی تو بات ہے۔"

"جوادی' شبلی! میرے دو ہزار واپس کرو۔" زرینہ انہیں ڈھونڈتی ڈھانڈتی نانا' ماموں کے کمرے تک چلی آئی۔

"کون سے دو ہزار؟" دونوں نے حیران ہو کر زرینہ کو دیکھا۔

"ارے وہی جو گاڑی میں تم نے مجھ سے ادھار لیے تھے۔"

"کمال ہے آنٹی! ہم بھلا آپ سے ادھار کیوں لینے لگے۔"

"ہا! کتنے فراڈیے ہو تم۔ گاڑی میں باجی صاحبہ کے لیے تکے کباب نہیں خریدے تھے۔"

"وہ تو باجی صاحبہ کی فرمائش پر خریدے تھے۔ جائیے! پیسے بھی ان ہی سے وصول کریں۔"

بڑے چال باز بنتے ہو۔ میں کہتی ہوں باجی کے غضب کو آواز نہ دو' اگر اس نے بددعا دے دی تو کہیں کے نہیں رہو گے۔"

"مجھے تو وہ آپ بددعا لگی ہوئی لگتی ہے۔"

"بڑے بے ہدایت ہو' میں بتاتی ہوں باجی صاحبہ کو۔" زرینہ دھمکیاں دینے پر اتر آئی۔

"صرف اتنی سی بات' ابھی تو اور بہت سے انکشاف باقی ہیں۔ ایک ساتھ ہی بتا دینا۔ اب منٹ منٹ بعد کیا شکایت لگانے بھاگیں گی۔"

"تمہارا کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"وقت آنے پر سارے مطالب روز روشن کی طرح عیاں ہو جائیں گے۔ بس تھوڑا انتظار کرو نوجوان حسینہ!"

ان آخری دو لفظوں نے جادوئی اثر کیا۔ اب آنٹی زرینہ کے چہرے پر نرم نرم سا تاثر پھیلنے لگا تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئیں۔

نانا' ماموں نے بے اختیار امنڈنے والی مسکراہٹ روکی اور دونوں کو ڈانٹا۔

"پکے ڈرامے باز لگتے ہو تم۔" اور پھر ہنسی پر قابو نہیں پا سکے۔

یہ دونوں نانا' ماموں سے داد وصول کر کے دادی کی کمرے میں چلے آئے' جہاں اس وقت گھر کی ساری خواتین موجود تھیں اور فکرمند تھیں۔ کہیں باجی اللہ والی کی خدمت میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔

☼ ☼ ☼

"ویسے اماں جی! ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ایسا بابرکت وجود ہمارے گھر تشریف لایا ہے۔ میرا بس نہیں چل رہا۔ میں اس کے لیے کیا کیا نہ کر ڈالوں۔" یہ اظہار شبلی کی امی حضور فرما رہی تھیں۔

"آہو' دیکھو نا! اک نظر ڈال کے ہی پتا چل جاتا ہے۔ یہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔" شہناز نے جذباتی ہو کر بات آگے بڑھائی تھی۔

"ہاں جی عام عورت نہیں ہے' اس میں بہت سی خصوصیات کھسروں والی بھی پائی جاتی ہیں۔" جوادی کے لہجے کی عقیدت ماں سے کم نہیں تھی۔

"تمہارا کیا مطلب ہے جوادی تیرا؟ انہوں نے ادھر آتے ہی ٹھمکے لگائے۔ او کجرا رے' او کجرا رے' گا کے ڈانس شروع کر دیا تھا۔ یا تجھے دیکھ کے آنکھ ماری تھی؟"

شہناز بیگم غصے میں آئیں تو وہ' وہ بولیں کہ جوادی سے زیادہ گستاخی آپ کر گئیں۔

"چپ کر جا شہناز! بس کر دے۔" دادی کو دہائی دینا پڑی۔

"کیا کروں اماں جی! یہ بے ہدایت غصہ چڑھا دیتا ہے مجھے۔ وے کان کھول کے سن لے جوادی! میں اس نیک معصوم عورت کی شان میں اب کوئی گستاخی برداشت نہیں کروں گی۔"

"میں نے کب ان کی شان میں گستاخی کی؟" جوادی کو سرے سے انکار تھا۔

"دادی! زرینہ آنٹی سے پوچھیں تو سہی' باجی اللہ والی سو رہی ہیں یا جاگ رہی ہیں۔" زیبا نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"وہ اللہ والی ہے۔ ساری رات عبادت کرتی ہوگی۔ کھوتے کی بچی نہیں ہے کہ اندھیرا بڑھتے ہی سو گئی ہوگی۔" شہناز کو زیبا کی بات بھی گستاخی معلوم ہوئی تھی۔ اسی لیے عقیدت کے چند تازہ پھول برسا دیے تھے۔

"نہیں ممانی! میں سوچ رہی تھی' کہیں آنٹی نسرین کے لڈو میں واقعی زہر تو نہیں تھا۔ اگر باجی ادھر ہی فوت ہو گئیں تو پھر کیا ہوگا۔"

"ہائے' ہائے کڑیے!" ساری خواتین کو اختلاج ہونے لگا تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں۔ اس طرح کے لوگ اتنی جلدی نہیں مرا کرتے۔ آپ کی تسلی کے لیے جا کے ابھی پتا کر لیتے ہیں۔" دونوں اپنی جگہ سے اٹھے تھے۔

"وے گل تے سنو' کدھر بھاگے جا رہے ہو۔" شہناز کی آواز پہ قدموں کو بریک لگ گئے۔

"جے زندہ ہے تے پھر سو بسم اللہ' اس کا رہنا سر آنکھوں پہ۔۔۔ تے جے مر مرا گئی ہے تو گڈی میں ڈال کے اسی کے محلے میں پھینک آنا۔ ہماری عقیدت اپنی جگہ پر بندہ پھانسی تو نہیں چڑھ سکدا نا۔"

شہناز کے خیالات پر دونوں نے داد دی اور یقین دلایا کہ فوری عمل کیا جائے گا۔

وہ تو باجی کی قسمت اچھی تھی' زندہ تھی اور اپنے محلے میں پھینکے جانے سے بچ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج شام باجی نے سب کی حاجات کے مطابق دعائیں کرنی تھیں اور کچھ کرامات دکھا کر مریدوں کی تعداد میں اضافہ کرنا تھا۔ وہ صبح ایک بھاری ناشتے کے بعد کمرے میں بند بیٹھی اس لسٹ کو یاد کر رہی تھی جو زرینہ نے انہیں دی تھی۔ پہلا نام حسینہ بی بی' شادی کو پانچ سال ابھی تک بچہ نہیں ہوا۔ دوسرا نام جنت بی بی' شادی پسند سے کرنا چاہتی ہے۔ تیسرا نام زیبا علی۔۔۔ بار بار دہرا رہی تھی کہ اسے شام کو خواتین کو ان کے بتانے سے پہلے ہی ان کی مراد بیان کر کے حیران کرنا تھا۔

"یہ پیری' مریدی آسان کام نہیں ہے۔ ہر ایرا غیرا پیر بن کر لاکھوں عقیدت مندوں سے فراڈ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے بڑی عقل اور ہاتھوں کی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ شام کو کبوتروں سے بھی کام لینا ہے۔ اس لسٹ کے مطابق حاجات بیان کر کے بھی عقیدت مندوں کی عقیدت کو بڑھانا ہے۔ انڈے والا کرتب بھی دکھانا ہے۔

وہ تعویذ بھی دینے ہیں جو بظاہر ایک سادہ کاغذ ہے لیکن موم بتی کی روشنی میں دیکھنے سے اس پر حروف ابھرے نظر آتے ہیں۔

تو آج کا دن بے حد مصروف ہے۔ بہت سے کام باقی ہیں۔ اوہو ایک تو یہ لڑکے پتا نہیں بار بار کیوں دروازے پر آجاتے ہیں۔ اب پھر دستک ہو رہی ہے اٹھنا ہی پڑے گا۔"

دروازہ کھلا۔ سامنے شبلی انار کے جوس سے لبالب بھرا گلاس پکڑے کھڑا تھا۔

باجی نے گھونگھٹ کی اوٹ سے لال لال جوس دیکھا' منہ میں پانی بھر آیا' مگر بولیں تو یہ فرمایا۔

"تم بار بار ہمیں تنگ کرنے کیوں آجاتے ہو' یہ تو عبادت کا وقت ہے۔"

"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔ میں تو خود بھی آنا نہیں چاہتا' مجھے پتا ہے آپ جیسے اللہ والوں کو بار بار یہ کھانا پینا کہاں پسند ہوتا ہے۔"

یہ کہا اور جوس کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ مارے صدمے اور غصے کے باجی کی زبان مبارک سے کئی گالیاں بس برآمد ہوتے ہوتے رہ گئیں۔ پورا گلاس ختم کر کے وہ مسکرایا۔

"آپ عبادت کریں' میں جا کر کہہ دوں گا' جوس آپ نے نوش فرمایا ہے' سب کو تسلی ہو جائے گی۔"

"دادی! آپ کے لیے گلاوٹ کے کباب بنوا رہی ہیں' وہ بھی میں کھا لوں گا' آپ اطمینان سے عبادت کریں۔"

باجی نے کچھ کہنا چاہا' مگر وہ رکا ہی نہیں۔ اپنی کہہ کر یہ جا وہ جا۔

لمبے لمبے سانس لے کر غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور پھر سے یاد کرنے لگی۔

"حسینہ بی بی' بچہ چاہیے' جنت بی بی پسند کی شادی۔"

دروازے پہ پھر دستک ہوئی۔

"اب کون آگیا ہے۔"

جا کر دروازہ کھولا' سامنے جوادی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہاتھ میں ایک بڑا سا پیکٹ پکڑ رکھا تھا۔ باجی کی نظر جوادی سے پہلے اس پیکٹ پر پڑی تھی۔

"کیوں آئے ہو؟"

"ظاہر ہے' آپ کے عشق میں بے قرار ہو کر تو آنے سے رہا۔"

"کیا مطلب ہے' کیا بکواس کر رہے ہو۔"

"باجی! کم از کم آئی بروز ہی بنوا لیں۔ قسم سے یہ اتنی گھنیری' ایسی سیاہ کالی آئی بروز دیکھ کر مجھے چڑیلیں یاد آنے لگتی ہیں۔"

"کیوں آئے ہو؟" برا مان کر پوچھا۔

"یہ خواتین نے آپ کے لیے کچھ خوب صورت کپڑے بھجوائے ہیں۔"

"ہمیں ایسی چیزوں کی حاجت تو نہیں مگر۔۔۔"

"اگر مگر کو چھوڑیں' میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا' ایویں خوامخواہ اتنے مہنگے کپڑے نہ خریدو۔ باجی کو بھلا ان کی کہاں ضرورت ہے۔ آخر وہ آئینہ دیکھتی ہیں۔ انہیں پتا ہے ایسی نحوست ماری صورت کے ساتھ سادہ سادہ اڑے اڑے رنگوں والے کپڑے ہی مناسب لگا کرتے ہیں۔ یہ میں لے جاتا ہوں۔ آپ کی طرف سے اپنی گرل فرینڈ کو دے دوں گا۔"

"او بات تو سنو!" باجی چلائی' مگر بات سننے کی فرصت کسے تھی۔

☆ ☆ ☆

آخر خدا خدا کر کے وہ مبارک گھڑی آگئی تھی' جس کے انتظار میں خواتین نے صحن میں رونق لگا رکھی تھی۔ صحن میں بچھی دریاں خواتین سے کھچا کھچ بھری تھیں اور آوازوں سے صرف گھر ہی نہیں گلی بھی گونج رہی تھی۔

جوادی' شبلی' نانا' ماموں کو کمرے کی تنہا اداس فضا سے نکال کر کھڑکی میں لے آئے تھے۔

"دیکھیے تو کیسے کیسے خوف ناک چہرے بنائے ہیں اللہ نے۔ دیکھتے رہیے اور شکر ادا کرتے رہیے۔ وہ دیکھی ہے' جو پورا منہ کھول کر ہنستی ہے' استغفار! لگتا ہے دانتوں پر ہلدی کی مالش کرتی ہے' کس قدر پیلے ہو رہے ہیں۔" جوادی نے توجہ دلائی۔

شبلی کیوں پیچھے رہتا۔ ایک لمبے ناخنوں والی دکھا دی' جس کے ناخن طوطے اور کوے کے ناخنوں کی طرح خم کھائے ہوئے تھے۔

"کالے کالے ہاتھ' آتشی نیل پالش' یا اللہ! ایسا ذوق تے ایسے شوق۔ انہیں اندھے شوہر عطا فرما تاکہ یہ بھی خوش اور وہ بھی خوش رہیں۔"

"یہ ساری پھٹکار ماریاں ہی آئی ہوئی ہیں۔" نانا' ماموں شدید مایوسی کے عالم میں کہہ رہے تھے۔

"نہیں! وہ دیکھیں وہ کونے میں ایک گوری لڑکی بھی بیٹھی ہے۔"

"کون سی' کہاں؟" اشتیاق سے گردن لمبی کر کے

پوچھا گیا۔

"وہ جو سر سے گنجی ہے۔ یقیناً" یہ باجی اللہ والی سے سر پہ بالوں کے لیے دعا کرانے آئی ہو گی۔"

"تم دونوں انتہائی نامعقول لڑکے ہو۔" اپنی رائے سے نوازا' پھر جا کر بیڈ پر رونق افروز ہو گئے۔

"کمال ہے' ہمارا اس سارے معاملے میں کیا قصور ہے؟"

ابھی نانا' ماموں قصور پر روشنی ڈالنے والے تھے کہ زرینہ بیگم ہانپتی کانپتی تشریف لے آئیں۔

"تم دونوں یہاں ہو' باہر آؤ۔ باجی کے لیے تخت بچھاؤ۔ وہ تشریف لانے ہی والی ہیں اور تم نے وہ کبوتروں والا لکڑی کا ڈبا کدھر رکھا ہے؟"

"وہ اسٹور میں ہے۔ آپ چلیے ہم لا رہے ہیں۔"

"چلو پھر جلدی آجاؤ۔"

صحن میں تخت بچھایا گیا۔ باجی کالی چادر میں مکھڑا چھپائے تشریف لائیں۔

"باجی ساڈی!" جوادی نے لہک کر کہا۔

"آوے ہی آوے۔"

شبلی کے ساتھ تمام خواتین اک جذب سے چلائیں۔

"باجی ساڈی شیر اے۔" جوادی نے نعرہ بلند کیا۔

"دم لگن دی دیر اے۔" شبلی کی آواز وفور عقیدت سے بھرا رہی تھی۔

"خاموش' چپ چپ!" زرینہ نے گھبراہٹ میں اپنے گالوں کو پیٹتے ہوئے انہیں ڈانٹا۔

"دعا کریں۔" باجی نے ہاتھ اٹھائے۔ سب نے تقلید کی۔ دعا کے بعد باجی نے زرینہ سے کچھ کہا۔ زرینہ نے کبوتروں والا باکس ان کے قریب لا کر رکھا۔

"اب باجی کچھ پرندوں کو آزاد کریں گی۔"

باجی نے باکس میں ہاتھ ڈالا' پھر نکالا' پھر ڈالا۔ اس کے بعد سر بھی ڈال دیا مگر وہ بدنصیب پرندے نہ ملنے تھے' نہ ملے۔

گھبرا کر زرینہ کو دیکھا۔

"چلو جی' سب لائن بناؤ۔ باجی کی کرامت دیکھو! یہ کس طرح تمہارے کہے بغیر ہی تمہاری حاجت [illegible] جائیں گی۔"

"نہیں! پہلے پرندوں والا کرتب دکھائیں۔" جوادی ٹھنکا۔

شہناز نے دانت پیس کر گستاخ فرزند کو دیکھا' [illegible] ادھر متوجہ نہیں تھا۔

"اماں جی! سمجھاؤ ان بے ہدایتوں کو [illegible] ادبیاں کر رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے۔ یہ پیر فقیر [illegible] دماغ کے ہوتے ہیں۔ جے ناراض ہو جائیں [illegible] اڑیل کھوتا تے من سکدا اے' اے لوک [illegible] دے۔"

شہناز بیگم کی پریشانیاں عروج پر تھیں اور [illegible] بس نہیں چل رہا تھا۔ دونوں پوتوں کے منہ پر [illegible] دیں۔

باجی نے زرینہ کے کان میں پھر کچھ کہا۔ زرینہ [illegible] اثبات میں سر ہلایا' پھر بولی۔

"یہ پردہ دار بیبیوں کی محفل ہے۔ مردوں کا [illegible] کوئی کام نہیں۔ تم دونوں فوراً" نکل جاؤ۔"

"اچھا جی تخت بچھایا ہم نے۔ کبوتروں کا باکس [illegible] کر لائے ہم اور اب ہماری حاجتیں سنے بغیر ہمیں [illegible] سے نکال رہی ہیں۔ یہ تو کوئی انصاف نہیں [illegible] نعرے لگا کے ویسے بھی ہم بہت تھک گئے ہیں۔" [illegible] ڈٹ کر بیٹھ گیا۔

"اماں جی! سمجھاؤ اپنے پوتوں کو۔ کیوں باجی [illegible] عتاب کو دعوت دے رہے ہیں۔"

"باجی کی شکل دیکھ کے تو لگتا ہے یہ آپ کسی [illegible] عتاب کا شکار ہیں۔"

"باجی! دفع کریں بچے ہیں۔ آپ اپنا کرتب شر[illegible] کر دیں۔" شہناز نے بڑی عقیدت سے کہا تھا مگر [illegible] کرتب باجی کو تیر بن کر لگا۔

زرینہ نے بتایا۔ "باجی کہتی ہے۔ میں کوئی مد[illegible] نہیں ہوں۔ باجی اللہ والی ہوں۔ اب سب خاموش [illegible] ہو جائیں اور باجی کی کرامت دیکھیں۔ ہاں جی' یہ [illegible] بی بی کدھر ہے۔ تمہیں مبارک ہو۔ سب سے [illegible]

باجی تمہاری حاجت تم سے سنے بغیر اپنے منہ سے بیان کریں گی' پھر تمہارے حق میں دعا کریں گی۔"

باجی گھونگھٹ گرائے بیٹھی تھیں۔ حسینہ بی بی مارے عقیدت کے آنسوؤں کے ساتھ رونے کا شغل فرما رہی تھی۔ گھونگھٹ سے باجی کی آواز بلند ہوئی۔

"حسینہ بی بی بچہ چاہیے؟" حسینہ بی بی کو تو کرنٹ لگا ہی تھا' وہاں [illegible] باقی خواتین بھی دو' دو فٹ اچھل کر جب دوبارہ زمین پر گریں تو بے اختیار منہ سے ہائے بھی نکل گئی۔

زرینہ نے کچھ کہنا چاہا' مگر باجی اب موڈ میں آچکی تھیں۔ گھونگھٹ کی اوٹ سے دوسرا نام پکارا۔

"جنت بی بی!" زور سے گرنے کی وجہ سے کولہے پر چوٹ آئی تھی' مگر اپنا نام سن کر کان خرگوش کے کانوں کی طرح کھڑے کر کے آگے آگئی۔

"پسند کی شادی کرنا چاہتی ہو۔" بھنبھناہٹ اور بڑھی۔

"شہناز! زیبا نی سلمٰی! کون ہے یہ فراڈن' بے غیرت!" دادی کا جلال عروج پر تھا۔ ادھر زیبا اور سویرا ہنس ہنس کر دوہری ہو رہی تھیں۔

مگر اسی لمحے زیبا کا نام پکارا گیا۔ چھلانگ لگا کر وہ باجی کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"شوہر جواری اور شرابی ہے۔ چھٹکارا چاہتی ہو۔"

زیبا نے زور کا ہاتھ باجی کے باپردہ سر پر مارا۔

"تیرا شوہر ہو گا جواری' شرابی' فراڈن' دس نمبری!" زیبا کے ابتدا کرنے کی دیر تھی۔ کنواری حسینہ جسے باجی بچہ دینے پر بضد تھی اور ستر سالہ جنت بی بی جسے باجی نے پسند کی شادی کی نوید سنائی تھی۔ میدان میں اتر آئیں۔

"فراڈ ہے یہ عورت فراڈ ہے۔" سب پل پڑیں۔ زرینہ موقع کی نزاکت دیکھ کر فرار ہونا چاہ رہی تھی' مگر ان دونوں نے راستہ روک لیا۔

"اپنی سہیلی کو بھی لے کے جائیں۔ ورنہ یہیں قیمہ ہو جائے گا اس کا۔"

"اچھا' پھر تم ہی نکالو اس کو اس بے قابو ہجوم سے۔"

"اس کے پیسے لگتے ہیں۔"

"پیسے!" زرینہ ہچکچائی۔

"اپنا حصہ رکھ کر باجی کا حصہ ہمیں دے دو۔ آخر ہم جان بچا رہے ہیں اس کی۔"

زرینہ کے پاس سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ ڈر رہی تھی' باجی کے کارنامے تو وہی بیان کیا کرتی تھی' کہیں اس ہجوم کو یاد ہی نہ آجائے' جھٹ باجی کا حصہ پرس سے نکال کر انہیں دے دیا اور انہوں نے سانپ سانپ کا شور ڈال کر ساری عورتوں کو گھر سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

آخر میں بھاگنے والی زرینہ اور باجی تھیں۔

"بچ گئی ہے فراڈن!" شہناز دانت پیس رہی تھی۔ دادی کو دنیا کی ڈرامے بازیوں نے نڈھال کر دیا تھا۔ اس لیے زیبا ان کی ٹانگیں اور سویرا سر دبا رہی تھی۔

"وے تم دونوں کدھر چلے ہو' ماں صدقے' دونوں نے پہلے ہی باجی کے کالے کرتوتوں کو پہچان لیا تھا۔" شبلی کی والدہ صاحبہ سخت متاثر تھیں دونوں سے۔

"ایک کام یاد آگیا ہے۔ ابھی آتے ہیں۔"

دونوں گلی میں آگئے۔ جوادی نے مسرت سے اپنی دونوں جیبیں تھپتھپائیں۔ ایک میں زرینہ سے لی گئی رقم تھی۔ دوسری جیب میں زرینہ کی بنائی وہ لسٹ تھی' جس پر خواتین کے نام اور ان کی حاجت بڑے بڑے حروف میں بڑی محنت سے لکھی گئی تھی۔

ادھر گرتی پڑتی رکشے تک پہنچنے والی زرینہ اور باجی ظالموں کی پہنچ سے باہر ہوتے ہی آپس میں لڑنے لگی تھیں۔ زرینہ کو گالیاں غلط سلط لسٹ بنانے پر پڑ رہی تھیں۔ جبکہ برابر میں بولتی زرینہ سارا الزام باجی کی یادداشت کو دے رہی تھی۔

"اچھا میرے حصے کی رقم تو دے نا!" باجی نے سارے قصے پر مٹی ڈالتے ہوئے نئی فرمائش کی تھی اور زرینہ بیگم کے پیروں تلے سے زمین نہیں' رکشا نکال دیا تھا۔

تیرے میرے درمیان

مہوش افتخار



انابیہ احسان اپنے کالج کے اسٹاف اور اسٹوڈنٹس کے ہمراہ دو دن کے لیے بائے روڈ اسلام آباد کے ٹرپ پر جاتی ہے۔ اپنی اسٹوڈنٹس کی طرف سے مشکوک ہو جاتی ہے۔ نائمہ اور بشریٰ سب سے آنکھ بچا کر دوسری جانب نکل جاتی ہیں۔ انابیہ اپنی پرنسپل کے ہمراہ ان کا پیچھا کرتی ہے۔ وہ دونوں عماد نامی لڑکے کے پاس پہنچتی ہیں تو عماد کی انابیہ پر بھی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ اسے بھی اغوا کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور فیروزہ بائی کے حوالے کر دیتا ہے۔ فیروزہ بائی انابیہ کو حسنی مرتضیٰ کے حوالے کرنے کے لیے خصوصی محفل کا اہتمام کرتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر چونک جاتے ہیں۔ حسنی مرتضیٰ دراصل پولیس آفیسر ہے۔ وہ بہروپ بدل کر لڑکیوں کو اغوا کرنے والے گروہ کے بارے میں شواہد اکٹھے کر رہا ہے۔ اس کا اصل نام تیمور منہاج ہے۔ تیمور انابیہ کو وہاں سے نکال کر فیروزہ بائی کے گھر پر چھاپہ پڑوا دیتا ہے۔ وہ انابیہ کو نیازی صاحب کے گھر بھیج دیتا ہے۔ نیازی صاحب کی بیگم انابیہ کے منگیتر عمر کی خالہ ہوتی ہیں۔ وہ انابیہ کو ایک مغویہ کی حیثیت میں دیکھ کر عمر کے گھر والوں کو اطلاع کر دیتی ہیں۔

تیمور کی والدہ شیریں بیگم اپنی بھتیجی ماہین سے تیمور کی شادی کرنا چاہتی ہیں مگر تیمور راضی نہیں ہے۔ احسان فاروق انابیہ کو لینے اجمل نیازی کے گھر آتے ہیں۔ وہ بھی تیمور کو دیکھ کر چونک جاتے ہیں جبکہ تیمور عمر کے بارے میں جان کر غصہ میں آجاتا ہے۔ تیمور اپنے گھر آکر الماری سے گلابی رنگ کا لفافہ کھول کر پڑھنے لگتا ہے اور اپنے ماضی میں کھو جاتا ہے۔

۲

دوسری اور آخری قسط

منہاج مرتضیٰ اسلام آباد کی ایک جانی مانی کاروباری شخصیت تھے۔ ان کے دو بچے تیمور اور ثمو تھے۔ جبکہ ان کی بیگم شیریں شہر کے ایک مشہور این



مکمل ناول

جی او کی روح رواں تھیں۔

منہاج صاحب کی خواہش تھی کہ تیمور باہر سے ایم بی اے کر کے ان کے ساتھ بزنس سنبھالے۔ لیکن تیمور نے ایم اے، آئی آر کر کے سی ایس ایس کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اسے ہمیشہ سے سول آفیسرز کی آن بان اور شان نے متاثر کیا تھا۔ بزنس سے اس کی دلچسپی صرف اس حد تک تھی کہ وہ کبھی کبھار منہاج صاحب کی غیر موجودگی میں آفس سنبھال لیا کرتا تھا۔

اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے منہاج صاحب نے بھی اسے آزاد چھوڑ دیا تھا۔ لیکن شیریں بیگم کو بیٹے کا یہ فیصلہ کچھ خاص پسند نہیں آیا تھا۔ کروڑوں کا بزنس کل کو یونہی خاک میں مل جاتا، یہ انہیں منظور نہ تھا۔ تیمور کو سمجھاتے ہوئے انہوں نے اسے اس فیصلے سے باز رکھنا چاہا تھا لیکن اس کی ضد کے آگے انہیں بھی خاموشی اختیار کرنی پڑی تھی۔ ماسٹرز سے فراغت کے

بعد وہ سی ایس ایس کی تیاری کے لیے لاہور چلا آیا تھا۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر منہاج مرتضیٰ کے اچھے دوستوں میں سے تھے۔ ان کے توسط سے تیمور کی ملاقات شہر کے بہترین اساتذہ سے ہوئی تھی۔ جن میں ایک پروفیسر احسان فاروق بھی تھے۔ وہ گورنمنٹ کالج میں اکنامکس کے ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ تھے۔

کالج میں ان سے ملنے کے بعد تیمور نے ان سے کچھ عرصے کے لیے گائیڈ لائن دینے کی درخواست کی تھی۔ جسے قبول کرتے ہوئے انہوں نے اسے اپنے گھر آنے کا وقت دیا تھا اور یوں وہ مقررہ دن عشاء کے بعد پروفیسر احسان سے ملنے کے لیے ان کے گھر چلا آیا تھا۔



"امی! پھر آپی کا کیا ہوا' وہ جا رہی ہیں یا نہیں؟" چائے کا کپ عصمت بیگم کے سامنے رکھتے ہوئے انابیہ اپنا مگ لیے ان کے مقابل آ بیٹھی تو عصمت جہاں نے اک گہری سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا کارڈلیس ایک طرف رکھ دیا۔

"نہیں! اس کی ساس نے عادل کو سختی سے منع کر دیا ہے اور عادل کو تو تم جانتی ہو۔ اپنی ماں کی بات ٹال دے' ایسا تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ آزردگی سے بولیں تو انابیہ کی پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے۔

"لیکن امی! یہ بہت زیادتی ہے۔ مصطفیٰ بھائی ہمارے ماموں کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ان کی شادی میں اگر آپی نہ گئیں تو کتنی غلط بات ہو گی۔"

"تو کیا کیا جا سکتا ہے بیٹا! اس کے سسرال والوں کو تو بات کا بتنگڑ بنانے میں صرف ایک لمحہ لگتا ہے جبکہ اب تو معاملہ بھی ان کی بیٹی کا ہے۔" وہ بوجھل لہجے میں بولیں تو انابیہ جھلا اٹھی۔

"فار گاڈ سیک امی! ثنا باجی کی عدت ختم ہوئے ڈیڑھ دو ہفتے ہو چکے ہیں اور آپ کو پتا ہے وہ سارہ تو پچھلے مہینے ہماری کلاس فیلو زنیرہ کی شادی میں پہنچی ہوئی تھی۔ تب زاہدہ آنٹی کو گھر میں ہونے والی فوتگی یاد نہیں تھی؟" وہ عادل کی چھوٹی بہن کا حوالہ دیتے ہوئے جو انابیہ کی کلاس فیلو بھی تھی۔ اس کی بات پہ عصمت محض اک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ زاہدہ بیگم یہ سب صرف مومنہ کو تنگ کرنے کے لیے کر رہی تھیں۔ وہ مومنہ جسے چند سال پہلے وہ خود بڑے چاؤ سے بیاہ کر لے کے گئی تھیں لیکن جس میں اب انہیں کوئی اچھائی دور دور تک نہیں نظر آتی تھی۔

"کیا کہہ سکتی ہوں بیٹا! سوائے اس کے کہ اللہ انہیں نیکی کی ہدایت دے۔ میری مومی نے تو ان کی خدمت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔" لاشعوری دھیانی کے عالم میں سامنے پڑی ٹھنڈی ہوتی چائے تکتے ہوئے بولیں تو ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے انابیہ نے بھی خاموشی اختیار کر لی۔ اس موضوع پہ بات کرنے سے سوائے ٹینشن کے اور کیا ملنے والا تھا اور اپنی ماں کو مزید افسردہ اور پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔

تب ہی احسان صاحب کمرے میں چلے آئے۔

"تم لوگوں نے ابھی تک تیاری نہیں شروع کی؟" انہیں یوں ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا دیکھ کے پوچھے بنا نہ رہ سکے تھے۔ آج چونکہ ان لوگوں کو دلہن کی مہندی لے کے جانی تھی۔ اس لیے احسان صاحب نے اس خاص لیڈیز فنکشن میں شرکت سے معذرت کر لی تھی۔

"بس کرنے ہی لگے تھے۔" عصمت بیگم بے دلی سے گویا ہوئیں تو احسان فاروق چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"خیر تو ہے' اتنی بجھی بجھی سی کیوں ہو؟"

"وہ مومنہ کا فون آیا تھا۔ رو رہی تھی کہ اس کی ساس نے مصطفیٰ کی شادی میں جانے سے منع کر دیا ہے۔" وہ شوہر کی جانب دیکھتے ہوئے بولیں تو ایک پل کے لیے احسان صاحب خاموش ہو گئے۔

"کیوں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے دھیرے سے سوال کیا۔

"حسن کی فوتگی کی وجہ سے۔" وہ مختصراً بولیں تو احسان صاحب ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

"میں مومنہ سے بات کروں گا۔ تم لوگ اٹھ کر تیاری شروع کرو' ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے۔" بیٹی کی تشفی کا سوچتے ہوئے وہ انابیہ کی جانب پلٹے۔ "اور بیٹا! تم تیار ہونے سے پہلے شکور سے کہو کہ چائے کے ساتھ ایک دو لوازمات بھی تیار کر لے۔ کچھ دیر میں میرا ایک اسٹوڈنٹ آنے والا ہے۔" ان کی ہدایت پہ انابیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنے مگ کے ساتھ ساتھ عصمت بیگم کا کپ بھی اٹھا کر ٹرے میں رکھ دیا۔

"میں آپ کے لیے بھی گرم چائے لاتی ہوں۔"

"رہنے دو! دل نہیں کر رہا۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولیں تو انابیہ ایک نظر انہیں دیکھنے کے بعد خاموشی سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔



"بیا! جلدی کرو۔ دیر ہو رہی ہے بیٹا۔"

"آ رہی ہوں امی!" عصمت بیگم کی پکار پہ انابیہ نے ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھے جھمکے اٹھاتے ہوئے دوڑ کر جھمکے پہنے تھے۔ بیڈ پہ پڑا دوپٹا اٹھا کر کندھے پہ ڈالتے ہوئے وہ سرعت سے کمرے سے نکل کر باہر کی جانب بڑھی تھی۔

ایک ہاتھ سے لاؤنج کا داخلی دروازہ کھولتی وہ دوسرے ہاتھ سے کان میں جھمکا اڑسنے کی کوشش کرتے ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھی تھی' جب معاً بائیں جانب موجود اسٹڈی کا دروازہ کھول کے کوئی عجلت میں باہر نکلا تھا اور سیدھا اس سے آ ٹکرایا تھا۔

"اف!" انابیہ کو لگا تھا جیسے اس کا بایاں کندھا کسی دیوار سے ٹکرا گیا ہو۔ ہاتھ میں پکڑا جھمکا بھی چھوٹ کر نیچے جا گرا۔

"آئی ایم سوری۔ رئیلی ویری سوری!" اپنے اردگرد گونجنے والے بوکھلائے ہوئے بھاری لیکن انجان لب و لہجے پہ انابیہ نے بھی چونکتے ہوئے اس دیوار کی جانب دیکھا تھا' جس سے وہ ٹکرائی تھی اور اپنے بائیں جانب ایک بے حد وجیہہ اور دراز قامت اجنبی کو دیکھ کے بری طرح شرمندہ ہو گئی تھی۔

عین اسی لمحے تیمور کی سنہری آنکھیں بھی اس کی طرف اٹھی تھیں اور لحظے بھر کو سامنے موجود صبیح چہرے پہ جم کر رہ گئی تھیں لیکن محض لمحے بھر کو۔ اگلے ہی پل وہ اس بلا کے جاذب چہرے کو دیکھتے ہوئے نارمل لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری! یقیناً" آپ کو چوٹ نہیں آئی ہو گی۔" معذرت خواہانہ انداز میں کہتے ہوئے اس نے نیچے دیکھا تھا۔ اسے لگا تھا کہ کوئی چیز نیچے بھی گری تھی۔ اپنے پیروں کے قریب پڑے ہوئے جھمکے کو دیکھ کے وہ بے اختیار جھک گیا تھا۔

"امید ہے آپ کا ایئر رنگ بھی ٹوٹا نہیں ہو گا۔" جھمکا انابیہ کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ اب کے دھیرے سے مسکرایا تو انابیہ کو لگا جیسے اس کی آنکھوں کا سنہرا پن ایک پل کو بڑھ گیا ہو۔ کتنی شفاف آنکھیں تھیں اس کی۔ دل ہی دل میں مقابل کی آنکھوں کو

سراہتے ہوئے اس نے جھمکا اس کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ چونکہ غیر مردوں سے غیر ضروری اخلاق نبھانے کے قائل نہیں تھی۔ اس لیے سپاٹ لہجے میں کہتی آگے بڑھ گئی تھی۔

لیکن اس کے انداز پہ تیمور کی مسکراہٹ سمٹ گئی تھی۔ اس کے نزدیک انابیہ نے خاصا بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا اور چونکہ اسے بلاوجہ کے نخرے سخت ناپسند تھے اسی لیے اس کا موڈ بری طرح سے خراب ہو گیا تھا۔ سنجیدہ نظروں سے دور جاتی انابیہ کو دیکھتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتے وہ انابیہ سے پہلے گیٹ پار کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے دنوں میں جہاں تیمور کو پتا چلا تھا کہ وہ احسان صاحب کی دو بیٹیوں میں سے چھوٹی بیٹی ہے، وہیں انابیہ کے بھی علم میں آیا تھا کہ وہ بابا کا نیا اسٹوڈنٹ ہے جو سی۔ ایس۔ ایس کی تیاری کی غرض سے اسلام آباد سے لاہور آیا ہوا تھا۔

اپنی ذہانت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے وہ محض چند دنوں میں ہی احسان صاحب کے پسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کا ذکر اب اکثر ان کے گھر میں ہونے لگا تھا۔ جس کی وجہ سے ہی انابیہ یہ جان پائی تھی کہ اس کا تعلق اسلام آباد کی خاصی جانی مانی کاروباری فیملی سے تھا لیکن بقول احسان صاحب کے اس درجہ امارت کے باوجود اس میں غرور اور تکبر نام کو نہیں تھا۔ بلکہ وہ خاصا باادب اور منکسر المزاج واقع ہوا تھا۔

لیکن انابیہ کو ان کی اس بات سے اتفاق نہیں تھا، کیونکہ احسان صاحب کے باقاعدہ تعارف کروانے کے باوجود کئی بار اتنا سامنا ہونے پر وہ اسے مکمل طور پہ نظر انداز کیے آگے بڑھ گیا تھا۔ جو انابیہ کو حیران کرنے کے ساتھ ساتھ خاصا گراں بھی گزرا تھا۔

مگر اب تو عصمت بیگم بھی اس کی تعریف کرنے لگی تھیں۔ جسے سن کر وہ اس کے دوغلے پن سے ... ہو گئی تھی۔ جو بہت سے لڑکوں کی طرح بزرگوں کے سامنے نیکی اور شرافت کا ڈھونگ تو بہت خوبی سے رچاتے تھے، مگر در حقیقت ان کا ان دونوں چیزوں سے دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہوتا تھا۔

☼ ☼ ☼

عادل آج کافی دنوں بعد آفس جاتے ہوئے مومنہ کو بچوں سمیت احسان صاحب کی طرف چھوڑ گیا تھا۔ چونکہ انابیہ کی بھی کالج سے چھٹی تھی، اس لیے گھر میں خاصی رونق ہو گئی تھی۔

"آپی! اب آپ دو چار دن رہ کے جایئے گا۔" چھوٹے طیب کو گود میں بٹھا کر جوس پلاتے ہوئے بولی تو مومنہ کے چہرے پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ در آئی۔

"ہونہہ! تم دو چار دن کی بات کر رہی ہو۔ کل جب میں نے اپنی ساس سے آج صبح کے لیے اجازت چاہی تو انہوں نے مجھے ہر ہفتے ماں کے گھر جانے پہ وہ سنائیں کہ الامان۔"

"لیکن آپ تو ایک مہینے بعد آئی ہیں۔" وہ حیرت سے بہن کی طرف دیکھتے ہوئے بولی تو مومنہ کے چہرے پہ افسردگی پھیل گئی۔

"ان کے نزدیک یہ بھی روز کا آنا جانا ہے۔ بقول ان کے مہینے ڈیڑھ میں ایک آدھ چکر کافی ہوتا ہے۔" مومنہ کی بات پر جہاں عصمت جہاں نے تاسف سے ایک گہری سانس لی تھی وہیں انابیہ کی پیشانی پہ بل نمودار ہو گئے تھے۔

"تو انہیں کہنا تھا ناکہ اپنا یہ فرمان اپنی بیٹیوں کو سنائیں، جو صحیح معنوں میں ہر دوسرے دن آ ... ہیں۔"

"یہ کہہ کے میں نے سب کے ساتھ ساتھ عادل سے بھی اپنی شامت بلوانی تھی کیا۔" وہ مغموم سی مسکرائی تو انابیہ کا دل جل کر رہ گیا۔

"یہ عادل بھائی ناں صرف نام کے عادل ہیں۔ کم از کم اتنا مضبوط تو ضرور ہونا چاہیے کہ وہ صحیح کو

اور غلط کو غلط کہہ سکے۔ ہر رشتے کو اس کے صحیح مقام پہ رکھنا مرد کا ہی فرض بنتا ہے۔"

"لیکن صحیح مقام ہی تو طے نہیں ہو پاتا۔ جب وہ ماں کی سائیڈ لیتا ہے تو بیوی کو لگتا کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور جب وہ بیوی کو جائز قرار دیتا ہے تو ماں کو لگتا ہے کہ بیٹا غلط کر رہا ہے۔ ساری ذمہ داری مرد کی ہی نہیں، کچھ کردار عورتوں کا بھی ہوتا ہے بیٹا! اور مجھے فخر ہے کہ اگر زاہدہ بہن اپنا کردار صحیح طریقے سے نہیں نبھا رہیں تو میری موی اپنی ہمت سے بڑھ کے احسن طریقے سے اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔" احسان صاحب لاؤنج میں داخل ہوئے تو مومنہ بے تابی سے اٹھ کر ان کے سینے سے لگ گئی۔

"السلام علیکم بابا۔"

"وعلیکم السلام! کیسی ہو جان بابا؟" انہوں نے اس کا سر چوما۔ ان کی محبت پہ مومنہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی، جسے بمشکل تمام اپنے حلق میں اتارتے ہوئے وہ ان سے الگ ہو گئی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں؟"

"اللہ کا شکر ہے بیٹا!" وہ اپنے ازلی پر عزم لہجے میں کہتے ہوئے انابیہ کی گود میں موجود طیب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"ارے میرا پیارا بیٹا۔" جھک کر اسے اپنی گود میں لیتے ہوئے انہوں نے اس کے گالوں پہ پیار کیا۔ "میرا ہی مین کہاں ہے بھئی؟" انہوں نے مومنہ کی طرف دیکھتے ہوئے تین سالہ عون کے متعلق پوچھا۔

"آپ کا ہی مین منگور کے ساتھ باہر آئس کریم لینے گیا ہے۔" مومنہ مسکراتے ہوئے بولی تو احسان فاروق بھی مسکراتے ہوئے کاؤچ پہ بیٹھ گئے۔

"بیا! جاؤ کھانا لگاؤ بیٹا!" عصمت بیگم نے انابیہ سے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتی کچن کی جانب چل دی۔ جبکہ عصمت بیگم احسان صاحب کے لیے گلاس میں جوس ڈالتے ہوئے بولیں۔

"میں اور موی شام میں غنی بھائی جان کی طرف جانے کا سوچ رہے ہیں تاکہ یہ مبارک بھی دے آئیں اور مصطفیٰ کی بیوی سے بھی مل لیں۔ آپ چلیں گے ہمارے ساتھ؟" انہوں نے گلاس شوہر کی جانب بڑھایا۔

"چلا تو جاؤں، لیکن تیمور کو آنا ہے۔" وہ گلاس تھامتے ہوئے متذبذب سے بولے۔

"تو آپ منع کر دیں کہ آج نہ آئے۔" وہ رسان سے بولیں تو وہ چند لمحے سوچنے کے بعد اثبات میں سر ہلا گئے۔

"ٹھیک ہے! میں کھانے کے بعد اسے فون کر دوں گا۔" گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے وہ مومنہ سے عادل کا حال چال دریافت کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

شام میں عصر کی نماز کے بعد وہ سب جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ اس دوران احسان صاحب نے دو تین بار تیمور کا نمبر ٹرائی کیا تھا لیکن اس کا نمبر بند پا کے وہ بالآخر اس سے بات کیے بنا نکل گئے تھے۔ انابیہ کو چونکہ اپنا اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا۔ اس لیے وہ گھر پہ رک گئی تھی۔ عون بھی ساری دوپہر شرارتیں کرنے کے بعد تھوڑی دیر پہلے سویا تھا، اس لیے وہ بھی انابیہ کے پاس ہی تھا۔

عون کے اٹھنے پہ اس نے اسے چپس بنا کے ٹی وی کے آگے کارٹون لگا کے بٹھایا تھا اور خود اسٹڈی میں آ کے ایک ضروری کتاب ڈھونڈنے لگی تھی۔

اسے یہاں آئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی، جب دھڑام سے لاؤنج میں کوئی چیز گری اور عون کے زور زور سے رونے کی آواز آئی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی کتابیں ٹیبل پہ پھینکتے ہوئے وہ بھاگتی ہوئی لاؤنج میں آئی تھی، جہاں اندر کے منظر نے اسے ہولا کر رکھ دیا تھا۔ زمین پہ گرے ہوئے عون کے اوپر کارنر میں رکھا بھاری شیشے کا اسٹینڈ گرا ہوا تھا۔ اور اس کے سر سے خون کی دھار اس کے چہرے کو بھگو رہی تھی۔

چیخ مارتی وہ حواس باختہ سی اس کی طرف دوڑی تھی۔ لپک کر اسٹینڈ ہٹاتے ہوئے اس نے عون کو گود

میں اٹھا کر وحشت کے عالم میں اس کا زخم ٹٹولا تھا۔ اور جونہی اس کی نظر پیشانی سے ذرا اوپر بالوں کے درمیان موجود گہرے کٹ پہ پڑی' اس کی اپنی جان ہوا ہو گئی تھی۔

ایسے میں گیٹ پر ہونے والی بیل پہ وہ عون کو خود سے لگائے دیوانہ وار باہر کی جانب بھاگی تھی اور بنا کچھ پوچھے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔

دوسری جانب تیمور جو اپنے دھیان میں کھڑا تھا' روتی بلکتی انابیہ کو چھوٹا بچہ گود میں اٹھائے دیکھ کے حیران پریشان رہ گیا تھا۔

"پ۔۔۔ پلیز اسے ہسپتال لے چلیں۔۔۔ یہ گر گیا ہے۔" وہ آنسو بہاتے ہوئے بولی تو تیمور نے تیزی سے روتے ہوئے عون کو گود میں لے لیا۔ اس کے سر سے خون بہتا دیکھ کے وہ خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔

"باقی سب کہاں ہیں؟" اس نے پریشانی سے ایک نظر پیچھے گھر پہ ڈالی۔

"وہ۔۔۔ وہ گئے ہوئے ہیں۔۔۔ میں اک۔۔۔ اکیلی۔۔۔" آنسوؤں کی شدت سے اس کے لیے بات مکمل کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ تیمور نے ایک نظر اس کے متوحش چہرے' ننگے پیروں اور خون لگے کپڑوں کو دیکھا۔ اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا تھا۔

وہ گاڑی میں تیمور کے برابر آ بیٹھی تھی۔ جس نے عون کو اسے تھمانے کے بعد تیزی سے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ تیزی سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا۔



عون کے سر میں پانچ ٹانکے آئے تھے۔ اس دوران انابیہ تو اس کے قریب بھی نہ پھٹکی تھی۔ تیمور نے ہی ٹانکے لگوانے تک اسے گود میں اٹھائے رکھا تھا۔

ٹریٹمنٹ مکمل ہو جانے کے بعد وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ عون کو لیے روتی ہوئی انابیہ کے پاس چلا آیا تھا۔ اس کی حالت دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب تسلی آمیز لہجے میں بولے۔

"حوصلے سے کام لیں مسز تیمور! آپ کا بیٹا اب بالکل ٹھیک ہے۔" اور انابیہ جو عون کو گود میں لیے آنسو بہا رہی تھی' ایک پل کو رونا بھول کر ڈاکٹر کی شکل دیکھنے لگی تھی۔

اس کے تاثرات پہ نہ چاہتے ہوئے بھی تیمور کے لبوں پہ مسکراہٹ آن ٹھہری تھی' جسے چھپانے کو اس نے چہرہ جھکا گیا تھا۔

"آپ گاڑی میں بیٹھیں۔۔۔ میں جب تک دوائیں لے کے آتا ہوں۔" وہ گاڑی کی چابی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا تو وہ جز بز سی ہوتی' چابی اس کے ہاتھ سے لے کے باہر کی جانب بڑھ گئی۔

گاڑی کا دروازہ یوں استحقاق سے کھولتے ہوئے شرمندگی کی ایک نئی لہر انابیہ کو اپنے اندر اٹھتی محسوس ہوئی تھی۔ اس وقت تو پریشانی کے عالم میں اسے کچھ بجھائی نہیں دیا تھا' لیکن اب اسے رہ رہ کر ہر بات کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے تو اپنا پرس تک اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس خیال کے آتے ہی انابیہ نے مارے شرمندگی کے اپنا نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے بایاں ہاتھ آنکھوں پہ رکھ لیا تھا۔ تب ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کے تیمور اندر بیٹھا۔۔۔ بے اختیار وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" دواؤں کا شاپر ڈیش بورڈ پہ رکھتے ہوئے بولا تو انابیہ نے نگاہیں چراتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اپنے برابر بیٹھے تیمور منہاج کی موجودگی کا احساس اسے اب بخوبی ہو رہا تھا۔ بے اختیار اس نے اپنی نظریں عون کے چہرے پہ جما دیں' جو اس کی گود میں سو گیا تھا۔

"چابی ملے گی؟" مزاج دار محترمہ کو یوں بھیگی بلی بنے دیکھ کے نجانے کیوں تیمور کو خاصا مزا آیا تھا۔ جب ہی اسے تنگ کرنے کو اس نے اس کی جھکی نظروں کے سامنے اپنی چوڑی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے شرارت سے کہا تو انابیہ کا چہرہ مارے خفت کے گلابی پڑ گیا۔ اور تیمور کے لیے زندگی میں پہلی بار کسی چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو گیا تھا۔

"آئی ایم سوری!" اپنی بے دھیانی پہ خود کو کوستے ہوئے اس نے چابی اس کے ہاتھ پہ رکھ دی تو تیمور ایک گہری نظر اس کے چہرے پہ ڈال کر مسکراتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آج اگر آپ وقت پہ نہ آتے تو نجانے میں کیا کرتی۔" انابیہ کی احساس ممنونیت میں ڈوبی آواز تیمور کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مائی پلیژر لیکن یہ چھوٹا ہے کون؟" اس نے ایک نظر سوئے ہوئے عون پہ ڈالی۔

"یہ میرا بھانجا ہے عون۔ آپی' امی اور بابا کے ساتھ ماموں کی طرف گئی ہوئی ہیں۔ مجھے کالج کا کچھ کام تھا اس لیے میں گھر پہ ہی رک گئی تھی۔ یہ بھی اس وقت سو رہا تھا' اس لیے آپی اسے میرے پاس چھوڑ گئیں اور پیچھے سے یہ حادثہ ہو گیا۔ اب جب وہ آئیں گی تو میں انہیں کیا کہوں گی؟" بات کرتے کرتے اسے نئی پریشانی نے آن گھیرا تو تیمور اس کے فکر مند چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔ بچوں کو چوٹیں لگ ہی جاتی ہیں۔ آپ نے کوئی جان بوجھ کر تو اسے نہیں گرایا ناں۔" مگر انابیہ کے اعصاب پہ مومنہ سے زیادہ عادل کی فکر سوار ہو چکی تھی۔

وہ ایک گہری سانس لیتی' کھڑکی سے باہر بھاگتے ہوئے منظر پہ نگاہیں جما گئی۔



تیمور نے ٹھیک کہا تھا۔ مومنہ نے تو اسے حقیقتاً" ایک لفظ تک نہیں کہا تھا لیکن رات میں جب عادل انہیں لینے کے لیے آیا تو گھر میں اچھا خاصا طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مومنہ کو بے نقط سناتے ہوئے' اس نے درپردہ سب ہی پہ اپنی بھڑاس نکالی تھی۔

"امی ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔ یہاں آ کر تو تمہارے رنگ ڈھنگ ہی بدل جاتے ہیں۔ اپنے گھٹیا رشتے داروں سے ملنے کا اتنا ہی شوق چرایا تھا تو اولاد کو بھی ساتھ لے کے جاتیں۔ اسے یہاں کس کے سر پہ پھینک گئی تھیں؟" وہ تیوریاں چڑھائے مومنہ کو غصے سے گھورتا ہوا بولا تو اپنے ماں باپ کے سامنے اس درجہ بدلحاظی پہ روتی ہوئی مومنہ کی سسکی نکل گئی۔ اور انابیہ جسے پہلی بار بہنوئی کے اصل رنگ ڈھنگ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا' دکھ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گئی تھی۔

کیا یہ وہی پڑھا لکھا اور ڈیسنٹ شخص تھا' جسے ان لوگوں نے اس کی آپی کے لیے پسند کیا تھا؟ وہ تو آج تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ آپی کے سسرال والے درحقیقت ان دونوں میاں بیوی کے درمیان اختلاف کا باعث تھے۔ لیکن آج اسے پتا چلا تھا کہ عادل بذات خود کتنے پانی میں تھا۔ بیوی اور اس کے خاندان کی عزت کی دھجیاں اڑاتے ہوئے وہ کہیں سے بھی ایک ویل آف فیملی کا بندہ نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ وہ کسی جاہل سے گھرانے کا ایک سطحی سا انسان لگ رہا تھا' جسے اپنی بیوی اور اپنے سسرالیوں کی بے عزتی کر کے ان پہ رعب ڈال کے بڑے پن کا احساس ہو رہا تھا۔

"اب اگر سیر سپاٹوں سے طبیعت سیر ہو گئی ہو تو گھر چلیں؟" مومنہ کی طرف دیکھتے ہوئے وہ طنزیہ لہجے میں بولا تو خاموش تماشائی کی صورت کھڑی عصمت بیگم آگے بڑھ آئیں۔

"عادل بیٹا! میں تم سے معذرت کرتی ہوں۔ تم یوں ناراض ہو کے مت جاؤ۔ دیکھو میں نے تمہارے لیے اپنے ہاتھوں سے کھانا بنایا ہے۔"

"بہت شکریہ۔ پیٹ بھر گیا ہے میرا۔" ان کی محبت کے جواب میں وہ انتہائی بدتمیزی سے کہتا اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور تم کان کھول کر میری بات سن لو۔" تنبیہی انداز میں انگلی اٹھاتا وہ ایک بار پھر مومنہ کی طرف پلٹا تو عصمت بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ انہوں نے اپنی بیٹی کو کس جہنم میں دھکیل دیا تھا۔

"آئندہ اگر تم میرے بچوں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں آئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اب اپنا سامان سمیٹو اور دس منٹ کے اندر اندر باہر آ جاؤ۔" وہ

ان تینوں پہ ایک تلخ نگاہ ڈالتا تیز قدموں سے لاؤنج عبور کر گیا تو سسکتی ہوئی مومنہ آنسو بہاتی ماں کے سینے سے لگتے ہوئے بلک بلک کے رو پڑی۔

اسے یوں زار و قطار روتا دیکھ کے انابیہ بھی تڑپ کے بہن سے آ لگی۔

"مجھے معاف کر دیں آپی! پلیز مجھے معاف کر دیں۔" شرمندگی اور دکھ کا احساس اسے اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا جبکہ لب بھینچے متاسف سے احسان فاروق کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آج کن الفاظ میں اپنی پیاری بیٹی کی تشفی کروائیں۔



وہ لان میں کتابیں لے کے پڑھنے کے ارادے سے بیٹھی تھی، مگر ذہن کل سے اتنا بوجھل ہو رہا تھا کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ تھک کر اس نے بالآخر کتابیں بند کر دی تھیں اور کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

گیٹ سے اندر آتے تیمور کی نظر اپنے بائیں جانب موجود لان میں بیٹھی انابیہ پہ پڑی تو وہ عون کا حال احوال پوچھنے کی نیت سے اس کی طرف چلا آیا لیکن اسے آنکھیں موندے دیکھ کے وہ بے اختیار کچھ فاصلے پہ رک گیا تھا۔

گہری سوچ کی پرچھائیاں اس کے شفاف چہرے پہ صاف دیکھی جا سکتی تھیں۔ بے اختیار تیمور کو پچھلے ایسے بہت سے موقعے یاد آئے تھے، جب اس کی اجنبیت، اس کی خفگی، اس کی پریشانی اور اس کی خفت کے بے شمار رنگ تیمور نے اس کے چہرے پہ بکھرتے دیکھے تھے۔ اس کا چہرہ تیمور کو ایک آئینہ لگا تھا، جس کے ذریعے دیکھنے والا اس کے اندر کا حال با آسانی پڑھ سکتا تھا اور ایسے بولتے چہروں کے بارے میں عموماً یہی کہا جاتا ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں تضاد نہیں پایا جاتا کیونکہ وہ اپنے خیالات کو منافقت کی چادر نہیں پہنا سکتے۔

اس کے چہرے پہ پھیلے سوچوں کے جال سے نگاہیں چراتے ہوئے وہ خاموشی سے واپس پلٹنے کو تھا جب ایک گہری سانس لیتے ہوئے انابیہ نے آنکھیں کھول دی تھیں اور تیمور کو دیکھ کے سرعت سے سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"تیمور صاحب!" اس کے پکارنے پہ تیمور نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا۔

"السلام علیکم۔" انابیہ نے ایک نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے سلام کیا تو تیمور کا دل نجانے کیوں کھل سا گیا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔"

"عون؟ میں اسی کا پوچھنے کے لیے آپ کی طرف آیا تھا، لیکن پھر آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔" وہ لان میں اپنی موجودگی کی وجہ بیان کرتے ہوئے بولا، مبادا وہ غلط سمجھتے ہوئے برا نہ مان جائے۔

"اللہ کا شکر ہے، رات تک اس کی طبیعت بہتر ہو گئی تھی۔" عون کے ذکر پہ نہ چاہتے ہوئے بھی انابیہ کے لہجے اور چہرے پہ افسردگی در آئی، جسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

"خیر تو ہے؟ آپ مجھے کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں۔" اس کے سوال پہ انابیہ نے قدرے چونکتے ہوئے اپنے مقابل کھڑے تیمور منہاج کی طرف دیکھا اور بے اختیار اسے لڑتا جھگڑتا، طنزیہ باتیں کرتا عادل یاد آیا تھا۔

"نہیں! بس یوں ہی ذرا سر میں درد ہو رہا تھا۔" اک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی تو تیمور اس کے ٹالنے پہ خاموش ہو گیا۔

"میں نے دراصل آپ کو اس لیے روکا تھا کہ آپ کو آپ کے پیسے لوٹا سکوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی تو تیمور الجھ سا گیا۔

"کون سے پیسے؟"

"وہ جو کل آپ نے عون کے...."

"مس انابیہ! مانتا ہوں کہ آپ خاصی خود دار واقع ہوئی ہیں لیکن کل میں نے جو بھی کیا، احسان صاحب

کی فیملی کے لیے کیا۔ کیونکہ میں آپ لوگوں کو کسی طور غیر نہیں سمجھتا۔ ہاں اگر آپ سمجھتی ہوں تو اور بات ہے۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ سنجیدہ لہجے میں بولا تو انابیہ سٹپٹا سی گئی۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ کہنا۔۔۔"

"آپ کا جو بھی مطلب تھا' لیکن میں آپ کو بتا دوں مجھے آپ کی بات سے دکھ پہنچا ہے۔" اس کی بات کاٹ کر ایک بار پھر سختی سے بولا۔

"آئی ایم سوری۔"

"اٹس آل رائٹ۔" نرم لہجے میں کہتا وہ پلٹ کر آگے بڑھ گیا تو انابیہ کی آنکھیں نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی چوڑی پشت پہ جم گئیں۔ اچانک تیمور نے پلٹ کر انابیہ کی جانب دیکھا۔

"اس اپنائیت کے لیے شکریہ!" مسکرا کر کہتے ہوئے وہ پلٹ کر اندر کی جانب بڑھ گیا انابیہ بھی دھیرے سے مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

اس واقعے کے بعد انابیہ اور تیمور کے درمیان حائل تکلف کی دیوار گر گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کے لیے دونوں کی رائے میں بھی واضح تبدیلی آئی تھی۔

انابیہ یہ جان گئی تھی کہ تیمور صرف دکھاوے کی حد تک اچھا نہیں' بلکہ حقیقتاً" ایک سلجھا ہوا انسان ہے جبکہ تیمور بھی یہ سمجھ گیا تھا کہ جسے وہ انابیہ کی بد تہذیبی سمجھ رہا تھا' وہ دراصل اس کا گریز تھا' کیونکہ ان کے درمیان استوار ہونے والی بے تکلفی کے باوجود وہ تاحال تیمور سے ایک فاصلہ رکھ کے بات کرتی تھی۔

اس کا یوں خود کو سنبھال کر سلیقے اور اعتماد سے بات کرنا تیمور کو بے حد اچھا لگا تھا۔ وہ خود بھی بے حد پر اعتماد اور نفیس شخصیت کا مالک تھا' اتنی امارت اور وجاہت کے باوجود اس میں غرور یا بدلحاظی نام کو نہیں تھی' لیکن وہ ہر کام حد میں رہ کر کرنا پسند کرتا تھا اور دوسروں کو بھی اپنی حد میں دیکھنا چاہتا تھا' مگر اس کا تعلق جس کلاس سے تھا' وہاں صنف نازک ہر حد پار کرنے پہ تلی رہتی تھی' جو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ ایسے میں انابیہ کی ذات اپنے انفرادی انداز کے ساتھ اسے سب سے الگ لگی تھی۔ اس کے گرد موجود بھیڑ چال سے یکسر مختلف۔

ایک عجیب سی کشش تھی جو تیمور کو انابیہ کے لیے محسوس ہونے لگی تھی۔ اسے دیکھنا' اس سے بات کرنا اسے اچھا لگنے لگا تھا۔ کیوں؟ ابھی یہ سوال اس نے خود سے نہیں کیا تھا۔

لیکن جب ویک اینڈ پہ وہ اسلام آباد گیا اور شیریں بیگم نے اپنی بھتیجی ماہین کے حوالے سے اس سے سوال کیا تو وہ ایک لمحے کے لیے چپ سا ہو گیا۔

"ماہین؟" اس نے اچنبھے سے ماں کی طرف دیکھا۔ یک لخت اسے ماہین کے بدلے ہوئے انداز یاد آنے لگے جو وہ پچھلے کئی ماہ سے نوٹ کر رہا تھا۔

مسلسل خاموشی نے ان کے لبوں پہ موجود مسکراہٹ غائب کر دی۔

"میں نے ایسا کب کہا؟" اس نے بے بسی سے ماں کا چہرہ دیکھا۔ "لیکن میرے ذہن میں جو تصور لائف پارٹنر کا ہے' ماہین اس سے دور دور تک میچ نہیں کرتی۔" وہ صاف گوئی سے بولا تو شیریں بیگم کی بھنویں تن گئیں۔

"اور تمہارے ذہن میں لائف پارٹنر کا کیا تصور ہے؟" انہوں نے استہزائیہ انداز میں سوال کیا تو چھم سے انابیہ احسان کا سراپا اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تیمور؟" اس کی خاموشی پہ انہوں نے ناگواری سے کہا تو وہ اس انکشاف سے ملنے والے جھٹکے سے بمشکل تمام خود کو سنبھالتے ہوئے جھلا اٹھا۔

"پلیز ممی! کیا آپ کے لیے یہ کافی نہیں کہ مجھے ماہین اس لحاظ سے پسند نہیں؟"

"نہیں! اور تمہارے لیے بھی یہی بہتر ہو گا کہ تم اپنی اس تصوراتی دنیا سے باہر نکل کے پریکٹیکل انداز میں سوچنے لگو۔" وہ سخت لہجے میں اپنی بات کہہ کر

کمرے سے باہر نکل گئیں تو تیمور مارے غصے کے لب بھینچ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"انابیہ بیٹا! میں نے تیمور کو رات کے کھانے پہ روک لیا ہے۔ اس لیے تھوڑا بہت اہتمام کر لینا۔" وہ کمپیوٹر کے آگے بیٹھی کچھ کام کر رہی تھی۔ جب احسان صاحب نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اسے مطلع کیا۔

عون والے واقعے کے بعد احسان فاروق اور عصمت جہاں دل سے تیمور کی اچھائی کے معترف ہو گئے تھے اور اچھی بات یہ تھی کہ اب انابیہ کو بھی اپنے والدین کی اس پسندیدگی سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب ہی احسان صاحب کی اس اچانک فرمائش پہ وہ بنا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتی کچن میں چلی آئی تھی۔ جہاں عصمت بیگم پہلے سے موجود تھیں۔

ان سے پوچھنے کے بعد کہ اتنی جلدی کن ڈشز کا اضافہ کیا جائے وہ فوراً" کام میں لگ گئی تھی۔

تقریباً" ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے کھانا ڈائننگ ٹیبل پہ لگا دیا تھا۔

"آنٹی! اتنے اہتمام کی کیا ضرورت تھی؟ جو بھی بنا ہوا تھا کھا لیتا۔" تیمور نے کرسی کھینچتے ہوئے ٹیبل پہ نگاہ دوڑائی۔ جہاں تین چار ڈشز کے ساتھ رائتہ اور سلاد بھی سجا ہوا تھا۔

"کہاں اہتمام کیا ہے بیٹا! بلکہ بیا تو کہہ رہی تھی کہ ہمیں تیمور کی صحیح طرح سے دعوت کرنی چاہیے۔" عصمت جہاں نے اپنی دھن میں کچن میں ہونے والی گفتگو کا حوالہ دیا تو انابیہ گڑبڑا گئی۔

بے اختیار اس کی نظریں تیمور کی جانب اٹھی تھیں جو مسکراتے ہوئے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

"کیوں نہیں' لیکن پھر ساری کوکنگ انابیہ کریں گی۔" اس کے ہاتھ سے ڈش لیتے ہوئے تیمور نے خوش دلی سے کہا تو عصمت بیگم مسکرا دیں۔

"بیٹا! آج بھی کوکنگ انابیہ نے ہی کی ہے۔"

"اچھا!" اس نے خوشگوار حیرت کے ساتھ انابیہ کی جانب دیکھا۔ بے اختیار اس کا دھیان ماہین کی جانب گیا تھا' جو کم و بیش انابیہ کی ہی ہم عمر تھی' لیکن اسے ڈھنگ کا ایک کپ چائے کا بھی بنانا نہیں آتا تھا۔

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ تیمور نے خوب سیر ہو کے کھایا تھا۔ اوپر سے گھر جیسا اپنائیت بھرا ماحول۔ تیمور نے بہت دنوں بعد اتنا اچھا وقت گزارا تھا۔

کھانے کے بعد احسان صاحب کے کوئی ملنے والے آ گئے تو وہ انہیں اور تیمور کو لیے ڈرائنگ روم میں چلے گئے تھے جبکہ عصمت جہاں عشاء کی نماز ادا کرنے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

انابیہ نے ٹیبل سمیٹنے کے بعد فٹافٹ کافی بنا کر ڈرائنگ روم میں بھجوائی اور اپنا کپ اٹھا کر لان میں آ گئی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" اپنا کپ تھامے تیمور پیچھے کھڑا تھا۔

"ضرور۔" تیمور زیر لب مسکراتا ہوا مقابل رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

"بہت اچھی کوکنگ کر لیتی ہیں آپ لیکن میں کافی بغیر شکر اور دودھ کے پسند کرتا ہوں۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرایا۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا یوں کھلی فضا میں چاندنی کے سائے تلے انابیہ کے مقابل بیٹھنا۔ اسے دیکھنا۔ اس سے باتیں کرنا۔

"تھینک یو۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔" وہ مدھم سی مسکراہٹ لیے نرمی سے بولی تو تیمور کو لگا جیسے اردگرد بکھری چاندنی مزید چمک اٹھی ہو۔

"کیا مجھے آج' اس پل انابیہ کے سامنے اپنے دل کی سچائی بیان کر دینی چاہیے؟" اس کے روشنی بکھیرتے چہرے سے نظریں ہٹاتے ہوئے تیمور نے ہاتھ میں پکڑا کپ لبوں سے لگاتے ہوئے سوچا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟" اسے اچانک خاموش ہوتا دیکھ کے انابیہ نے ایک نظر اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ جہاں پھیلا تذبذب صاف نظر آ رہا تھا۔

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کبھی کبھی انسان کا پہلا اندازہ کتنا غلط ثابت ہوتا ہے۔" دل ہی دل میں جیسے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے اس نے انابیہ کی طرف دیکھا۔

"کیا مطلب؟" انابیہ نے ناسمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا تو تیمور دھیرے سے مسکرا دیا۔

"مطلب یہ کہ پہلی ملاقات میں آپ کی شخصیت کا جو تاثر مجھ پہ پڑا تھا' وہ بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ آپ اس انابیہ سے بالکل مختلف ہیں جیسا میں نے آپ کو سمجھا تھا۔"

"اور آپ نے مجھے کیسا سمجھا تھا؟" اس کی بات سن کے انابیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"سچ سننا چاہیں گی یا جھوٹ؟" تیمور نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کافی کا آخری گھونٹ لے کے کپ میز پہ رکھ دیا۔

"ظاہر سی بات ہے سچ۔" انابیہ نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر سچ یہ ہے کہ مجھ پہ آپ کا پہلا امپریشن خاصی روڈ اور خود پسند قسم کی لڑکی کا پڑا تھا اور چونکہ مجھے بلاوجہ کے نخرے بالکل پسند نہیں اس لیے میں نے بھی آپ کو مکمل طور پہ نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔" وہ مزے سے اپنے اولین احساسات سے لے کر اپنی حکمت عملی تک بتاتے ہوئے بولا تو انابیہ کی ہنسی چھوٹ گئی اور تیمور جس نے پہلی بار اسے یوں کھل کر ہنستے ہوئے دیکھا تھا' ایک پل کو مبہوت سا ہو گیا۔

"اچھا! تو آپ اس لیے اتنے اکڑے ہوئے رہتے تھے اور میں سمجھی تھی کہ آپ ہیں ہی ایسے۔" وہ اپنی ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے شرارت سے بولی تو تیمور نے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کیسا؟"

"ارو گینٹ' مغرور اور بدتمیز۔" وہ بنا کسی ہچکچاہٹ کے بولی تو تیمور کا بھاری قہقہہ اردگرد گونج اٹھا۔

"تو یہ طے ہوا کہ فرسٹ امپریشن از "ناٹ" دا لاسٹ امپریشن۔" وہ اسے چمکتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا تو انابیہ بھی مسکرا دی۔

"ہمارے کیس میں تو یہی ہوا ہے۔" وہ کندھوں کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولی تو تیمور ایک پل کو اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میرے کیس میں صرف یہی نہیں ہوا۔"

"اچھا!" انابیہ نے تجسس سے اس کی طرف دیکھا۔ "آپ کے کیس میں بھلا اور کیا کیا ہوا ہے؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دیکھیں انابیہ! میں بہت پریکٹیکل اور صاف گو قسم کا بندہ ہوں۔ لفظوں سے کھیلنا' باتوں میں الجھانا مجھے نہیں آتا۔ شروع سے ہی میری زندگی کے کچھ اصول رہے ہیں۔ جن پہ دولت کی فراوانی اور ہر طرح کی آزادی بھی اثر انداز نہیں ہو سکی۔ صرف اسی لیے کہ مجھے ہر چیز اپنی حد میں پسند ہے۔ میں نہ صرف خود اپنی حد میں رہنا پسند کرتا ہوں' بلکہ مجھے وہی لوگ اچھے لگتے ہیں جو پر اعتماد اور باوقار ہوں۔ جن میں اتنا سینس ہو کہ وہ اچھے برے میں تمیز کر کے اپنے لیے حدود مقرر کر سکیں۔ اور آپ میں ماشاءاللہ یہ خوبی موجود ہے۔" بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولتا وہ ایک لمحے کے لیے رکا تو انابیہ کی پلکیں بے اختیار جھک گئیں۔

"میں نہیں جانتا کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچتی ہیں اور نہ ہی میری طرف سے آپ پہ کسی قسم کا کوئی دباؤ ہے۔ آپ اپنی رائے میں مکمل طور پہ آزاد ہیں لیکن میں اپنے دل کی بات آپ تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں۔ صرف اس لیے کہ اگر آپ کو میری ذات قابل اعتبار لگے تو میں بخوشی آپ کو اپنی زندگی میں ہمیشہ کے لیے شامل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اور اگر نہیں' تو یقین جانیں' مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ میں محبت سے پہلے آپ کی عزت کرتا ہوں انابیہ۔ اور جن لوگوں کی عزت کی جاتی ہے ان کے لیے کبھی برا نہیں سوچا جاتا۔ اس لیے پلیز! آپ بے فکر ہو کر اس بارے میں سوچیے گا۔ آئی ہوپ! آپ نے میری بات کا برا نہیں مانا ہوگا۔" اس کی لرزتی پلکوں پہ نگاہیں جمائے وہ دھیرے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

انابیہ کی حیران آنکھیں بے اختیار دور جاتے تیمور منہاج کی چوڑی پشت پہ جا ٹھہریں۔

چاندنی کے عکس میں اس کا لحظہ بہ لحظہ آگے بڑھتا وجود بے حد روشن اور منفرد لگ رہا تھا۔ بالکل ویسے جیسے اس کی سوچ تھی۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ جتنا خوب صورت اس کا ظاہر تھا' اتنی ہی خوب صورت اس کی سوچ تھی۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس سے اپنے دل کا رشتہ "عزت" کی بنیاد پہ استوار کرنے کا خواہش مند تھا۔

انابیہ ساری رات سوچنے کے بعد بالآخر اس فیصلے پہ پہنچی تھی کہ اسے عزت کی ردا میں لپٹی اس محبت کو ٹھکرا کے کفران نعمت نہیں کرنا چاہیے۔

☼ ☼ ☼

تیمور کی ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ وہ انابیہ احسان کے سامنے اپنا دل تو کھول کے رکھ آیا تھا مگر اب وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔ لیکن انتظار کے یہ لمحے جہاں بڑے جاں گسل تھے' وہیں پر کیف بھی تھے۔ اسی امید اور ناامیدی کا دامن تھامے وہ اگلی شام وہاں پہنچا۔

تو انابیہ کو گھر میں نہ پا کے اس کا مضطرب دل یک لخت ساکت ہو گیا تھا۔

"تو یہ ہے تمہارا فیصلہ انابیہ احسان! لیکن اگر تم اپنا یہ فیصلہ میرے روبرو مجھے سناتیں تو شاید مجھے اتنا برا نہ لگتا جتنا کہ تمہارے اس پہلو تہی کے بعد محسوس ہوا ہے۔" لب بھینچے وہ دل ہی دل میں اس سے مخاطب ہوا تھا۔

شدید طیش کے عالم میں وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ پار کرنے ہی والا تھا' جب شکور کے پکارنے پہ اس نے بے اختیار پلٹ کے دیکھا تھا۔

"صاحب جی! یہ انابیہ بی بی نے آپ کے لیے دیا تھا۔" بھاگ کر اس کے پیچھے آتے شکور نے ہاتھ میں پکڑا ایک گلابی لفافہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو تیمور نے چونکتے ہوئے اس لفافے کی جانب دیکھا اور پھر تیزی سے اسے تھام لیا۔

شکور کو جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے وہیں کھڑے کھڑے بے تابی سے لفافہ کھول کر اندر موجود پرچا نکال لیا۔

"سورج پر دستک دینا... آسان نہیں
اپنا ہاتھ جلا لینا... آسان نہیں
چل کر اپنے پاؤں سے
کھیلنا گرم شعلوں سے... آسان نہیں
جیون کے اک ایسے دوراہے پر گم صم سی کھڑی ہوں میں
ادھر مڑوں یا ادھر کو جاؤں' اس الجھن میں پڑی ہوں میں
نئی ڈگر کو مڑ جانا... آسان نہیں
ٹوٹ کے پھر سے جڑ جانا... آسان نہیں!

میرے لیے یہ فیصلہ حقیقتاً" آسان نہیں' لیکن چونکہ آپ کا پہلا حوالہ "عزت" ہے اس لیے نجانے کیوں دل آپ پہ اعتبار کرنے کو کہتا ہے۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ کبھی میرے اعتبار کو بے امان نہیں ہونے دیں گے۔"

الفاظ تھے یا کوئی خزانہ۔ تیمور کو لگا تھا کہ جیسے سارے جہان کی خوشیاں کسی نے ایک پل میں اس کے دامن میں ڈال دی ہوں۔ چند لمحے پیشتر کی اذیت اور جلن آن واحد میں دھواں بن کے ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیمور کے ہاتھ میں پکڑی تحریر پہ چند آنسو بے اختیاری کے عالم میں آ گرے تو وہ جیسے ماضی سے ہاتھ چھڑاتا حال میں لوٹ آیا۔

"وہ رو رہا تھا؟" کاغذ پہ گرنے والے قطروں کو چونک کر دیکھتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنی آنکھوں کو چھوا تو پلکوں کی نمی اس کی انگلیوں پہ آن ٹھہری۔ جنہیں دیکھتے ہوئے اس کے لب بے اختیار بھینچ گئے۔

خالی نظروں سے اپنی انگلیوں کو تکتے ہوئے اس کی نگاہیں دوسرے ہاتھ میں تھمی تحریر پہ پڑیں تو دل میں جیسے اک ہوک سی اٹھنے لگی۔

بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا پرچا بے دلی سے سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا کھڑکی میں آکھڑا ہوا' جہاں دور تک سوائے تاریکی اور سناٹے کے اور کچھ نہ تھا۔

یہ جو تیرے میرے درمیاں
ہے عجیب سا اک رابطہ
اسے توڑ دوں
اسے چھوڑ دوں
اسے کون سا میں موڑ دوں؟
یہ سلسلہ عجیب ہے
رگ و جاں کے یہ قریب ہے
لفظوں میں یہ نہ ڈھل سکے
رشتے میں یہ نہ بدل سکے
اسے کون سا میں نام دوں
اسے کون سا انجام دوں؟؟

اس نے تھک کر اپنا سر کھڑکی سے ٹکاتے ہوئے جلتی ہوئی آنکھیں موند لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

تجھ سے بچھڑ کے بس اتنا ہوا وصیؔ
تیرا کچھ گیا نہیں' میرا کچھ بچا نہیں

"ممی! آپ ماموں سے بات کریں۔ میں ماہین سے شادی کے لیے تیار ہوں۔" جوس کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے تیمور نے بنا کسی کی طرف دیکھے انتہائی نارمل لہجے میں کہا تو ایک پل کو ڈائننگ ٹیبل کے گرد بیٹھے تینوں افراد کو سانپ سونگھ گیا۔

"کیا؟" اپنی تمام تر خفگی بھلائے شیریں بیگم نے بے یقین نظروں سے بیٹے کو تکتے ہوئے بے اختیار سامنے بیٹھے شوہر کی جانب دیکھا' جو خود بھی حیران سے تیمور کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ کل صبح جو کچھ ہوا تھا وہ ان کے سامنے ہی تو تھا۔

"مگر ایک بات! مجھے شادی میں کسی قسم کا ہنگامہ نہیں چاہیے۔" ان کی حیرت اور سوال دونوں نظر انداز کیے وہ یک لخت ہاتھ میں پکڑا گلاس ٹیبل پہ رکھتے ہوئے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ مکمل طور پہ بے تاثر تھا۔ یوں جیسے وہ اپنی نہیں بلکہ کسی اور کی شادی کی بات کر رہا ہو۔

کچھ غلط ہونے کا احساس ثمو کے اندر بڑی شدت سے جاگا تھا جسے محسوس کرتے ہوئے وہ الجھنے کے ساتھ ساتھ خاصی پریشان بھی ہو گئی تھی۔ جبکہ شیریں بیگم کی بے یقینی تیمور کا اگلا جملہ سن کے خوشگوار حیرت میں تبدیل ہو گئی تھی۔

"آپ ایک دو دن میں ماموں سے مل کے ساری بات طے کرلیں۔ میں اب اس معاملے میں مزید تاخیر نہیں چاہتا۔" اپنی بات مکمل کرتا وہ بنا کچھ سنے اٹھ کر ڈائننگ روم سے باہر نکل گیا تو پیچھے چھایا طلسم جیسے ٹوٹ گیا۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ تیمور' ماہین سے شادی کے لیے تیار ہو گیا ہے۔" پرجوش سی شیریں بیگم "ماہین" پہ زور دیتے ہوئے بولیں تو ثمو ماں کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے بھی یقین نہیں آرہا۔ اس لیے پلیز! آپ ابھی ماموں سے بات کرنے کی غلطی مت کیجیے گا۔"

"کیا مطلب؟" شیریں بیگم نے الجھ کر بیٹی کی جانب دیکھا۔ منہاج صاحب کی نظریں بھی ثمو کی طرف اٹھ گئیں۔

"مطلب یہ ممی کہ کل تک وہ جس لڑکی کا نام نہیں سننا چاہتے تھے آج وہ اچانک کیسے اس سے شادی کے لیے تیار ہو گئے ہیں؟ کچھ تو ہوا ہے ورنہ...."

"ہو سکتا ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔" شیریں بیٹی کی بات کاٹتے ہوئے بولیں تو ثمو دل گرفتگی سے بولی۔

"فار گاڈ سیک ممی! کون سی غلطی؟ انابیہ کو پسند کرنا یا ماہین کو ناپسند کرنا؟ آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ ان دونوں میں سے کچھ بھی غلط نہیں۔ اپنا لائف پارٹنر

چننے کا انہیں پورا پورا حق ہے۔"

"ہاں! تو اب جب اس نے خود ہی ماہین کو چن لیا تو تم کیوں مجھے منع کر رہی ہو؟" ثمو کے لبوں سے بے اختیار اک گہری سانس برآمد ہوئی۔

اس کی نظریں بے اختیار منہاج صاحب کی طرف اٹھی تھیں' جو اسے سر کی خفیف جنبش سے تسلی دیتے ہوئے شیریں بیگم سے مخاطب ہوئے۔

"ثمو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تیمور کے دماغ میں کیا چل رہا ہے' اسے جانے بغیر تمہیں کوئی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ چند دن رک کر تیمور سے اس بارے میں دوبارہ بات کرو اور اگر وہ اپنے فیصلے پہ قائم رہے تو بے شک اسی دن جا کے بات پکی کر آنا۔" وہ سنجیدہ لہجے میں گویا ہوئے تو شیریں بیگم دل مسوس کر رہ گئیں لیکن چونکہ بات ان کی بھی غلط نہیں تھی' اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں اثبات میں سر ہلانا پڑ گیا۔

ان کے خاموشی اختیار کرنے پہ ثمو کا بے چین دل جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ انابیہ احسان کی اس کے بھائی کی زندگی میں کیا اہمیت تھی' یہ اس نے ان گزرے چار سالوں میں بخوبی جان لیا تھا۔ تیمور کی بے رنگ زندگی نے اسے پہروں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا تھا۔ اور اب اس کی صرف یہی خواہش تھی کہ اس کا پیارا بھائی زندگی کی طرف لوٹ آئے' لیکن پوری آمادگی اور دل کی خوشی کے ساتھ۔

☆ ☆ ☆

انابیہ کی بے ہوشی پہ اسے فوراً" اسپتال لے جایا گیا تھا۔ جہاں ڈاکٹرز نے نروس بریک ڈاؤن کی اطلاع دیتے ہوئے اسے داخل کر لیا تھا۔ اس کی حالت خاصی نازک تھی۔

ابھی بھی مومنہ عشاء کی نماز کے بعد حاجت کے نوافل ادا کر کے اس کے پاس آکر بیٹھی تھی۔ مختلف آیات اس پہ پڑھ کر پھونکتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کے اپنی چھوٹی بہن کی پیشانی چومی تھی' جس کا پھول سا نازک چہرہ بالکل کملا کر رہ گیا تھا۔ اس کی بند آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے حلقے دیکھ کے مومنہ کا دل بے اختیار کٹنے لگا تھا اور آنکھیں نئے سرے سے جلنے لگی تھیں۔

کتنی مشکل سے انابیہ کی زندگی میں سب کچھ ٹھیک ہونے چلا تھا کہ تقدیر نے ایک بار پھر سب کچھ تہس نہس کر ڈالا تھا۔ ان کے بابا محض چند ہی دنوں میں برسوں کے مریض لگنے لگے تھے۔ ان کے جھکے شانے' تھکا ہوا چہرہ مومنہ کو اندر ہی اندر مارے دے رہا تھا لیکن وہ ان کے سامنے ہمت سے کام لینے پہ مجبور تھی' مگر تنہائی میں اس کا صبر یونہی جواب دے جایا کرتا تھا۔ جیسے اس وقت وہ بے حوصلہ ہو کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ اپنی پیاری ماں کو یاد کرتے ہوئے اس کے دل پہ لگا ہر زخم نئے سرے سے رسنے لگا تھا اور ذہن میں اس تکلیف دہ وقت کی جیسے ایک فلم سی چلنے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

عون کو لگنے والی چوٹ کو مہینے سے اوپر ہو گیا تھا۔ اس دوران احسان صاحب اور عصمت بیگم انابیہ کو لیے فقط ایک ہی بار نواسے کا حال احوال پوچھنے مومنہ کی طرف گئے تھے اور وہاں جس سرد مہری سے سب ان کے ساتھ پیش آئے تھے' اسے دیکھتے ہوئے مومنہ نے خود ہی انہیں دوبارہ وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ گو کہ ان کے دوبارہ نہ آنے پہ بھی مومنہ کو ڈھیروں ڈھیر باتیں سنائی گئی تھیں مگر اس نے بھی جیسے اپنے لب سی لیے تھے۔ اس دوران گھر والوں سے اس کا رابطہ صرف فون تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ عصمت بیگم نے اسے عادل کی ناراضی دور ہونے تک میکے نہ آنے کی ہدایت کی تھی۔ مومنہ بچوں کے بنا' شوہر کی خفگی مول لے کر ان کی طرف آتی' یہ انہیں منظور نہ تھا۔

بیٹی کی پریشانی اور اس کے سسرال والوں کے رویے دیکھتے ہوئے احسان صاحب نے عصمت جہاں کے مشورے سے ان سب کے لیے' نواسے کی صحت

یابی کا بہانہ کرتے ہوئے دعوت کا اہتمام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

انابیہ کو بھی تناؤ دور کرنے کا یہ خاصا مناسب طریقہ لگا تھا۔ مومنہ کے علم میں یہ سب آیا تو اس نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی۔

اس کے منع کرنے کے باوجود احسان صاحب خود دعوت کا پیغام لے کر اس کے سسرال آئے تھے۔ انہیں امید تھی کہ ان لوگوں کی یہ پیش رفت ایک مثبت قدم ثابت ہوگی مگر۔



"عون کی صحت یابی کی خوشی میں کھانا؟" زاہدہ بیگم نے طنزیہ نظروں سے مقابل بیٹھے احسان صاحب کی طرف دیکھا تو مومنہ کا خون کھول اٹھا۔

"ویسے آپ لوگ بھی کمال ہیں۔ نواسے کو دوبارہ دیکھنے کی زحمت تو کی نہیں گئی اور اب اس کی صحت یابی کی خوشی میں کھانا کرنے چلے ہیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں بھنویں سکیڑتے ہوئے بولیں تو ایک لمحے کے لیے احسان فاروق کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی سمدھن کو کیا جواب دیں۔

"خیر! وہ آپ کی مرضی ہے کہ آپ اپنے نواسے کو پوچھیں یا نہ پوچھیں۔ لیکن ہماری طرف سے تو آپ معذرت قبول کریں۔ ہم لوگ آپ کی طرف نہیں آسکیں گے۔"

"کیوں بہن! خیر تو ہے؟ ایسی کیا بات ہوگئی جو آپ لوگ ہماری طرف نہیں آسکتے؟" احسان صاحب نے پریشانی سے کہا۔

"دیکھیں بھائی صاحب! میں صاف بات کرنے کی عادی ہوں۔ آپ کی بیٹی نے ہمیں ایسا کوئی سکھ نہیں دیا جو ہم دوڑ دوڑ کر آپ کی طرف آئیں۔ رہا عادل تو اب تو اسے بھی بہت کچھ سمجھ میں آگیا ہے۔" وہ معنی خیز مسکراہٹ لبوں پہ سجائے گویا ہوئیں تو احسان صاحب کی پیشانی پہ بہت کوشش کے باوجود بل آن ٹھہرے۔ جبکہ مومنہ مارے ضبط کے اپنا نچلا لب کاٹ کر رہ گئی۔

"مثلاً" کیا کچھ میں آگیا ہے؟" انہوں نے بے حد تحمل سے استفسار کیا۔ حالانکہ ان کی بات انہیں بے حد بری لگی تھی۔

"یہ تو اب آپ اپنے داماد سے پوچھیے گا۔ میں کچھ کہہ دوں گی تو خواہ مخواہ باتیں بنیں گی پہلے ہی خاصی بری مشہور ہوں میں۔" انہوں نے دروازے سے اندر داخل ہوتے عادل کو دیکھا۔

عادل کے لٹھ مار انداز میں کیے گئے سلام کے باوجود وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو ناچار عادل کو بھی آگے بڑھنا پڑا۔

"کیسے ہو بیٹا؟" انہوں نے دھیرے سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

"ٹھیک۔" وہ ایک لفظ میں جواب دیتا ان کے مقابل رکھے صوفے پہ ماں کے برابر جا بیٹھا۔ اس کے چہرے کے تنے ہوئے نقوش دیکھ کر ہی مومنہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ "اندر" سے ہی خاصی فارم میں بھیجا گیا تھا۔

"بیٹا! تمہارے سسر ہم سب کو کھانے پہ انوائٹ کرنے کے لیے آئے ہیں۔" اس سے پہلے کہ احسان فاروق کچھ کہتے' زاہدہ بیگم اسی میٹھے لہجے میں بول اٹھیں۔

"کیوں؟" وہ بجائے احسان صاحب کی طرف دیکھنے کے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو مومنہ کی درد میں ڈوبی نظریں بے اختیار باپ کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کی کیفیت سمجھتے ہوئے وہ بے اختیار اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تھپکنے لگے۔ لیکن آنسو اس تیزی سے اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے کہ سارا منظر دھندلا گیا۔

"عون ماشاء اللہ سے صحت یاب ہو گیا ہے نا اس لیے۔" وہ مسکرا کر بولیں۔

"عون کی صحت یابی سے ان لوگوں کا کیا تعلق؟" وہ اب بھی انہیں نظر انداز کیے ماں سے بولا تو فوراً ہی زاہدہ طنزیہ لہجے میں بولیں۔

"یہ تو تم اب ان ہی سے پوچھو۔" اور ان کے جواب پہ مومنہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"فرعون اولاد ہے میری اور یہ میرے ماں باپ ہیں۔ میں چونکہ غلطی سے آپ کی بیوی ہوں' اس لیے "ان لوگوں" کا مجھ سے اور میرے بچوں سے وہی تعلق ہے جو آپ کے گھر والوں کا ہے۔" وہ "ان لوگوں" پہ زور دیتی غصے سے بولی تو عادل کی بھنویں تن گئیں۔

"دیکھی آپ نے اپنی بیٹی کی زبان؟ اسے اتنی تمیز تو ہے نہیں کہ شوہر سے کیسے بات کی جاتی ہے۔" وہ انتہائی تیز لہجے میں بولا۔

"مومی! تم خاموش ہو جاؤ بیٹا۔" احسان صاحب اتنا ہی کہہ سکے۔

"کیسے خاموش ہو جاؤں بابا! میں اپنی بے عزتی تو برداشت کر سکتی ہوں۔ مگر کوئی۔۔۔ کوئی آپ کو۔۔۔" آنسوؤں کی شدت نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی تو احسان صاحب نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے شانے سے لگا لیا۔

"ارے! تو ہم نے کیا کہہ دیا تمہارے باپ کو جو تم یوں چھکوں پھکوں رونے بیٹھ گئی ہو؟" زاہدہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

"ہونہہ! باپ کے لیے تو ایک لفظ سننا گوارا نہیں اور شوہر کو جو پہلے دن سے کبھی کسی نے ڈھنگ سے پوچھا نہیں' اس پہ تو آج تک سوال نہیں کیا۔" اس کی اتنی بڑی بات پہ مقابل بیٹھے احسان فاروق کے لیے مزید خاموش رہنا ناممکن ہو گیا۔

"عادل بیٹا! یہ "ڈھنگ سے پوچھنا" کیا ہوتا ہے؟ ہم نے تو تمہاری عزت میں کبھی کمی نہیں کی بلکہ تمہیں تو ہمیشہ داماد کے بجائے اپنا بیٹا مانا ہے۔" وہ دکھ سے اس کا چہرہ تکتے ہوئے بولے۔ تو وہ گردن کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

"ہونہہ! صرف منہ زبانی۔ ورنہ آپ میری بات یوں رد نہ کرتے۔"

"کون سی بات؟" انہوں نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تو ان کے شانے سے لگی مومنہ خود کو سنبھالتی تیزی سے سیدھی ہوئی۔

"بابا! یہ آپ کی جائیداد میں سے میرا حصہ اپنے نام کروانا چاہتے ہیں۔ جو میں مر کے بھی نہیں ہونے دوں گی۔" اس کی بات پہ جہاں احسان فاروق ہکا بکا رہ گئے' وہیں عادل کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"کمینی' گھٹیا عورت! تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ تمہارا باپ نہیں مان رہا؟"

"ہاں! میں نے جھوٹ بولا۔ میرے باپ کی محنت کی کمائی آپ جیسے لالچی اور کم ظرف لوگوں کے لیے نہیں۔۔۔" مومنہ کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوپائی تھی کہ عادل چیل کی طرح اڑ کر اس کی جانب لپکا تھا مگر اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ مومنہ کو چھو پاتے' احسان صاحب سرعت سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"بہت ہو گیا تماشا عادل! میں ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا کہ تم میری بیٹی پہ میرے سامنے ہاتھ اٹھاؤ اور میں چپ چاپ برداشت کر جاؤں۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ اپنی طبیعت کے برخلاف انتہائی غضب ناک لہجے میں بولے۔

"تو اٹھائیں اپنی اس بیٹی کو اور نکل جائیں میرے گھر سے۔ میں اب اس کی شکل تک دیکھنا نہیں چاہتا۔" وہ ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے بدتمیزی کی سب حدیں پار کر گیا تھا۔ اس کی بات پہ احسان صاحب کا چہرہ مارے طیش کے سرخ پڑ گیا تھا۔ شور شرابے کی وجہ سے گھر کے سب ہی افراد ڈرائنگ روم کے دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے۔

"میں اگر جاؤں گی تو اپنے بچوں کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔" روتی ہوئی مومنہ ایک جھٹکے سے آگے بڑھی تو عادل نے تیزی سے اس کا بازو تھامتے ہوئے پیچھے کو دھکیلا۔

"وہ میرے بچے ہیں۔ تم اس گھر سے اکیلی ہی دفع ہو گی۔"

"عادل!" اس کی اس حرکت پہ احسان فاروق کا ضبط جواب دے گیا تو وہ بے اختیار تنبیہی انداز میں

اسے پکار اٹھے۔ "اتنے چھوٹے بچوں کو تم تو کیا دنیا کا کوئی قانون ماں سے دور نہیں کر سکتا۔ اس لیے بہتری اسی میں ہے کہ تم بچوں کو مومنہ کے ساتھ جانے دو۔"

"جانے دو بیٹا! ہمیں کیا پڑی اس ناگن کی اولاد کو اپنے پاس رکھنے کی۔" زاہدہ نے لپک کر بیٹے کے کندھے پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ ان جیسی چالاک عورت یہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اتنے چھوٹے بچوں کو سنبھالنا آسان نہ تھا۔ دن میں تارے نظر آجانے تھے۔

"مگر امی۔۔۔" وہ جھنجلایا ساماں کی طرف پلٹا تو انہوں نے اس کے شانے کو تسلی آمیز لہجے میں دبایا۔

"جانے دو ذرا اسے اور اس کے گھر والوں کو بھی تو آٹے دال کا بھاؤ پتا چلے۔" وہ ایک طنزیہ نظر احسان صاحب اور مومنہ پہ ڈالتے ہوئے ہوشیاری سے بولیں۔

اسے جھاگ کی طرح بیٹھتا دیکھ کے سسکتی ہوئی مومنہ دیوانہ وار اندر کی جانب بھاگی اور اپنے دونوں بچوں کو متاع جاں کی طرح خود میں سموئے' عادل حسن کی خواہش پوری کر گئی۔



بلکتی ہوئی مومنہ نے باپ کے ساتھ ہی گھر کے اندر قدم رکھا تو گویا کہرام مچ گیا۔ عصمت بیگم تو کتنی ہی دیر اسے خود سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر روتی رہیں لیکن جب تھوڑا سنبھلنے پہ احسان صاحب نے انہیں پوری بات بتائی تو وہ بھی بہت کچھ سوچنے پہ مجبور ہو گئیں۔ جو لوگ اس کے باپ کے سامنے اس کا یہ حال کر رہے تھے وہ تنہائی میں اس کا کیا حال کرتے ہوں گے؟ یہ سوچ کر ہی ان کا کلیجہ منہ کو آنے لگا تھا۔

بہت سوچ بچار کے بعد بالآخر وہ دونوں اس نتیجے پہ پہنچے تھے کہ دو تین دن بعد عصمت بیگم اور احسان صاحب خود عادل سے کہیں باہر جا کے ملیں گے اور علیحدہ گھر کی تجویز رکھنے کے ساتھ ساتھ جائیداد میں سے مومنہ کا حصہ بھی ان دونوں کے نام کرنے کا فیصلہ کیا۔

ان کی بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اپنے گھر میں خوش اور آباد رہے' انہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے تھا۔



مومنہ کو اپنے میکے آئے آج چھٹا دن تھا۔ اس دوران احسان صاحب نے تین چار بار عادل کو فون کیا تھا۔ مگر دوسری جانب سے ان کی کال ہر بار کاٹ دی گئی تھی۔

اس کی اس بدتمیزی پہ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے تھے۔ مگر چونکہ بیٹی کا معاملہ تھا' اس لیے حوصلے اور صبر سے کام لیتے ہوئے انہوں نے ایک دو روز مزید انتظار کرنے کے بعد اس کے آفس جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

اسی سوچ میں مستغرق وہ ناشتے میں مصروف تھے جب کال بیل کی آواز پہ مشکور باہر کی جانب گیا تھا۔

چند لمحوں بعد وہ واپس آیا تو ہاتھ میں مومنہ کے لیے ایک مہربند لفافہ تھا' جسے دستخط کرنے کے بعد مومنہ نے وصول کر لیا تھا۔

مومنہ نے لفافہ کھول کر اندر موجود کاغذ نکالا۔

جیسے جیسے مومنہ کی نگاہیں سطروں پہ سے پھسلتی گئیں' ویسے ویسے اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں بے یقینی سے پھٹتی چلی گئیں۔

"امی۔۔۔ بابا۔۔۔ عادل نے مجھے طلاق۔۔۔" وحشت زدہ سی مومنہ نے مختل ہوتے حواس کے ساتھ ماں باپ کی جانب دیکھا۔ بے جان ہوتے ہاتھوں سے کاغذ نکل کر ٹیبل پہ گر گیا تھا۔

"ہائے! ہائے میرے اللہ!" عصمت جہاں نے بے اختیار اپنا دل تھاما تھا۔ جبکہ احسان فاروق دیوانہ وار اٹھ کر اس کاغذ کی جانب لپکے تھے' جو ان سب کے لیے بربادی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ انابیہ منہ پہ ہاتھ رکھے ہکا بکا بیٹھی تھی۔

"بابا! بابا! یہ۔۔۔ یہ سچ نہیں ہے نا بابا! میں۔۔۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ کچھ بھی نہیں کہا۔" پاگلوں کی طرح

ان کا بازو ہلاتے ہوئے مومنہ بے قراری سے بولی تو ساکت کھڑے احسان فاروقی جیسے ہوش میں آگئے۔ کھینچ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے وہ تڑپ کر رو دیے تھے۔

باپ کے آنسوؤں نے مومنہ کی ہر خوش فہمی بکھیر دی تھی۔ اس کی بے یقینی نے یقین کی سرحد کو چھوا تو گھر کے درودیوار اس کی چیخوں سے لرز اٹھے تھے اور وہ وہیں باپ کے بازوؤں میں کسی ماہی بے آب کی طرح تڑپتے ہوئے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی نے صحیح کہا ہے انسان جب کسی دکھ میں مبتلا ہوتا ہے تو صرف اسی دکھ کا احساس اسے نہیں رلاتا بلکہ خود پہ بیتی ہر تکلیف' ہر برا وقت نئے سرے سے یاد آکر آنسوؤں میں اضافہ کر جاتا ہے۔ مومنہ بھی بہن کی تکلیف پہ روتے روتے اپنے غموں کو یاد کرنے بیٹھ گئی تھی۔

کوئی شخص اتنا بھی کم عقل اور بے حس کیسے ہو سکتا ہے کہ محض دوسروں کے کہنے پہ ایک انتہائی معمولی بات پہ نہ صرف اپنا گھر تباہ کرلے بلکہ اپنے بچوں کو بھی دنیا کے سرد و گرم جھیلنے کے لیے تنہا چھوڑ دے۔

☆ ☆ ☆

آنے والی صبح احسان صاحب اور مومنہ کے لیے خوشیوں کی نوید لے کر آئی تھی۔ انابیہ کو ہوش آگیا تھا بے اختیار سجدہ شکر ادا کرتے ہوئے وہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ گئے تھے۔

ڈاکٹرز چند ضروری ٹیسٹ لینے کے بعد ہی انابیہ کو روم میں شفٹ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔

☆ ☆ ☆

شادی کے پانچ سال بعد ثمو کی نند انعم کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش پر ثمو اس سے ملنے اسپتال پہنچی۔ انعم اور اس کے بچوں سے ملنے کے بعد ثمو باقی سب کے ساتھ باہر نکلی تو دھیان بے اختیار محب کی کھانسی کی طرف چلا گیا۔

وہ احمر کے ساتھ محب کو لے کر چائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس جانے کے لیے مڑی تو بائیں طرف کے بجائے دائیں طرف مڑ گئی۔ وہاں آئی سی یو سے کسی مریض کو اسٹریچر پہ لایا جا رہا تھا۔

ایک طرف ہٹتے ہوئے اس کی نظر پیچھے آتے ڈاکٹرز کے ساتھ چلتے افراد کی جانب اٹھی اور وہ ایک پل کے لیے بری طرح الجھ گئی تھی۔ سامنے موجود تین' چار چہروں کے درمیان دو چہرے اسے نہ جانے کیوں جانے پہچانے سے لگے تھے۔

بغور ان کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی پرسوچ نگاہیں یوں ہی وارڈ بوائز کے درمیان موجود اسٹریچر پہ دراز وجود سے ٹکرائیں تو وہ پوری جان سے کانپ گئی تھی۔

"یہ۔ یہ تو انابیہ ہے!" اسٹریچر پہ دراز کمزور اور زرد چہرے کو پہچاننا' وہ بھی چار سال بعد گو کہ اتنا آسان نہ تھا۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے یہ مرحلہ محض ایک لمحے میں طے کر لیا تھا۔ اسے وہیں بت بنا دیکھ کے قدرے آگے کو کھڑا احمر واپس پلٹا تھا۔

"احمر! یہ۔ یہ وہی لڑکی ہے' جسے تیمور بھائی پسند کرتے تھے۔" وہ آگے جاتے اسٹریچر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے بولی تو احمر بھی چونک گیا۔

"آپ پلیز پتا کروائیں اسے کیا ہوا ہے؟" وہ احمر کا بازو تھامتے ہوئے مضطرب سی بولی تو وہ حیران سا اس کا چہرہ تکنے لگا۔ پھر گہری سانس لے کر بولا۔

"اچھا' معلوم کرتے ہیں۔" وہ ثمو کا ہاتھ تھام کر آن ڈیوٹی اسٹاف کی طرف بڑھا۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ انابیہ کو نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور اب وہ روم نمبر 105 میں شفٹ کر دی گئی ہیں۔ ثمرہ کا بوجھل دل بے اختیار چھلک اٹھا۔

"میں نہیں جانتی کہ انابیہ کو کیا پریشانی ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ دونوں خوش نہیں احمر! خوش نہیں۔" اس کے بازو سے پیشانی ٹکائے وہ بے اختیاری کے عالم میں رو پڑی۔

☆ ☆ ☆

روم نمبر 105 کے باہر کھڑے اسے نہ جانے کتنی دیر ہو گئی تھی مگر اندر جانے کی ہمت مجتمع نہیں ہو پا رہی تھی۔ انابیہ اور اس کے گھر والوں کے رد عمل کا سوچ کر اسے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ لب چباتے وہ شدید ذہنی دباؤ کے عالم میں دروازے کو کھڑی دیکھ رہی تھی' جب اچانک دروازہ کھلا اور اپنے دھیان میں باہر نکلتی مومنہ ٹھٹک کر اس کے مقابل رک گئی تھی۔

مقابل نے اسے پہچان لیا تھا اور پہچان کا احساس ہوتے ہی اس کی ہتھیلیاں پسیج گئی تھیں۔

"السلام علیکم۔" تھوک نگلتے ہوئے اس نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

"وعلیکم السلام۔" مومنہ نے جواب دیا اور ایک طرف ہو کر ثمو کو اندر جانے کا رستہ دیا۔ وہ جھجکتی ہوئی کمرے میں چلی آئی۔ جہاں سامنے بیڈ پہ آنکھیں بند کیے انابیہ کو دیکھ کے اس کے بوجھل قدم بے اختیار رک گئے تھے اور نظریں اس کے کمزور چہرے پہ جیسے جم سی گئی تھیں۔

"انابیہ کو کچھ دیر پہلے دوا دی تھی' اس لیے وہ سو رہی ہے۔" چند لمحے یوں ہی گزر گئے تو مومنہ نے دھیمے لہجے میں اسے مطلع کیا۔

اس کی بات پہ جہاں ثمو کی محویت ٹوٹی تھی' وہیں اس کے منتشر اعصاب اور گھبرائے ہوئے دل کو تھوڑی سی تسلی ہوئی تھی۔ وہ اب قدرے حوصلے سے مومنہ سے بات کرنے کی ہمت کر سکتی تھی' ورنہ انابیہ کا سامنا کرنے کی سوچ نے تو اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔

"انہیں۔ انہیں ہوا کیا ہے؟" وہ جھجکتے ہوئے مومنہ سے مخاطب ہوئی تو وہ اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"نیا کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔" اس کے جواب پہ ثمو نے ایک نگاہ انابیہ کے چہرے پر ڈالتے ہوئے بے چینی سے اپنی انگلیاں چٹخائی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس نروس بریک ڈاؤن کی وجہ کیسے پوچھے۔

"ایسا کیا ہوا تھا جو وہ۔" وہ ایک لحظے کو مناسب الفاظ کی تلاش کے لیے رکی تھی کہ مومنہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تمہارے بھائی نے تمہیں نہیں بتایا؟"

"بھائی؟" اس نے الجھ کر مومنہ کی جانب دیکھا۔

"تیمور بھائی کا اس سب سے کیا تعلق ہے؟" اس کے چہرے اور آنکھوں سے چھلکتی الجھن اور حیرت نے مومنہ کو ایک لمحے کے لیے خاموش کر دیا۔

"تم یہاں اسپتال کس سلسلے میں آئی ہو؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"میں۔ میں تو یہاں اپنے ہزبینڈ اور سسرال والوں کے ساتھ آئی ہوں۔ میری نند ایڈمٹ ہے یہاں۔" وہ الجھ کر گویا ہوئی تو مومنہ بے اختیار خاموش ہو گئی۔ وہ تو سمجھی تھی کہ تیمور نے انابیہ کا پتا لگوا کر ثمو کو یہاں بھیجا تھا۔ جب ہی تو اس نے بنا کوئی سوال کیے اسے کمرے میں آنے دیا تھا۔ بہر کیف وہ ان کا محسن تھا' لیکن اب بھلا وہ اپنی کہی بات کو کیسے سنبھالے گی؟

"لیکن آپ نے یہ کیوں سمجھا کہ میں یہاں تیمور بھائی کے کہنے پہ آئی ہوں؟ کیا وہ انابیہ کی حالت کے بارے میں جانتے ہیں؟ کیا وہ آپ لوگوں سے رابطے میں ہیں؟" مضطرب سی وہ مومنہ کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مومنہ کے منہ سے تیمور کا ذکر سن کے اس کی تو حیرت ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔

"نہیں! اس کا ہم سے کوئی رابطہ نہیں۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

"پھر آپ نے تیمور بھائی کا نام کیوں لیا؟"

"میرے پاس تمہاری اس کیوں کا کوئی جواب نہیں اور پلیز! مجھے ڈاکٹر سے ملنے جانا ہے۔ اس لیے مزید تمہارے پاس نہیں ٹھہر سکتی۔" وہ اپنی بات مکمل کر کے تیز قدموں سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

مومنہ کا یوں کنی کترا کے نکل جانا اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ تیمور کی ذات کہیں نہ کہیں اس سارے معاملے میں شامل ضرور تھی۔

اس نے اچانک ماہین کے لیے ہاں کر کے ان سب

کو حیران کر دیا تھا۔ یہ کیا گورکھ دھندا تھا اور یہ کیسے سلجھنے والا تھا' وہ حقیقتاً "بری طرح الجھ گئی تھی۔

اسپتال سے ثمو کی واپسی انتہائی اضطراب کے عالم میں ہوئی تھی۔ جس کو دور کرنے کا واحد حل اس کے پاس صرف یہی تھا کہ وہ فوراً" تیمور سے اس بارے میں بات کرے۔ گو کہ اس بات کا قوی امکان تھا کہ وہ بھی مومنہ کی طرح اسے کچھ بھی بتانے سے انکاری ہو جاتا۔ مگر پھر بھی وہ ہر حال میں سچ جاننا چاہتی تھی اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اب کی بار اس موضوع کو کس رخ اور کس انداز سے زیر بحث لائے گی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم بھائی! کیسے ہیں آپ؟" مناسب موقع ملتے ہی ثمو نے تیمور کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس کے اندازے کے مطابق تیمور کو بھی اس وقت فارغ ہونا چاہیے تھا اور وہی ہوا تھا' وہ نہ صرف فارغ تھا بلکہ خاصی تسلی سے اس نے ثمو کا بھی حال احوال دریافت کیا تھا۔

"بھائی! مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔" ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ثمو نے اپنے سوچے گئے طریقے کے مطابق موضوع کی جانب پیش قدمی کی تھی۔

"ہاں! پوچھو۔" دوسری طرف سے تیمور کی ٹھہری ہوئی آواز آئی تھی۔

"آپ حال ہی میں اتابیہ سے کیوں ملے تھے؟ اور پلیز! بھائی مجھے سچ بتائیے گا۔"

اس کی توقع کے عین مطابق دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میں اتابیہ سے ملا ہوں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد دوسری جانب سے پوچھا گیا تو وہ تیمور کے فرار کی ساری راہیں مسدود کرنے کو مضبوط لہجے میں بولی۔

"اتابیہ کی بہن نے۔" اس کے جواب پہ تیمور سوچ میں پڑ گیا۔ یہ مومنہ' ثمو کو کہاں مل گئی' اور مومنہ اتنے سنگین حادثے کے بارے میں اور وہ بھی ثمو کے سامنے' اتنی غیر ذمہ داری کا ثبوت کیسے دے سکتی تھی؟

"تو پھر تم نے اسی سے کیوں نہ یہ سوال کر لیا؟" وہ بغیر کسی گھبراہٹ کے نارمل لہجے میں بولا تو ثمو جو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ شاید وہ مومنہ کا نام سن کے پریشان ہو جائے گا۔ بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"پوچھا تھا لیکن۔۔۔" وہ بے بسی سے ابھی اتنا ہی بولی تھی کہ تیمور کو اپنا جواب مل گیا تھا۔ اگلے ہی پل اس نے پرسکون انداز میں اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"لیکن اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ ویسے وہ تمہیں ملی کہاں تھی؟"

"میں آپ کے سوال کا جواب تب ہی دوں گی جب آپ میری بات کا جواب دیں گے۔" وہ قطعی لہجے میں بولی تو تیمور اک گہری سانس کھینچ کر رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑے گا۔

"اتابیہ اپنی کولیگز اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ ٹرپ پہ اسلام آباد آئی تھی۔ یہاں ان کے ساتھ حادثہ پیش آگیا تھا۔ جس کی خفیہ انکوائری مجھے سونپی گئی تھی۔ اسی سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔"

وہ چونکہ یہ بھی جان چکا تھا کہ مومنہ نے اسے کچھ بھی بتانے سے احتراز کیا تھا۔ اس لیے اس نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس بات کی حفاظت ویسے بھی وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا۔

لیکن اس کے جواب پہ ثمو کی الجھن کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی۔ بھلا ایسا کون سا حادثہ پیش آگیا تھا جو اتابیہ کے اعصاب ہی جواب دے گئے تھے؟ یا پھر اس نروس بریک ڈاؤن کی وجہ کچھ اور تھی اور اس کا اس حادثے سے کوئی تعلق نہیں تھا؟ لیکن پھر اتابیہ کی بہن نے تیمور کا حوالہ کیوں دیا تھا' جبکہ اس کے علم میں تو اتابیہ کا ہاسپٹلائزڈ ہونا تھا ہی نہیں؟ معاملہ بہرکیف اتنا سیدھا نہیں تھا جتنا وہ سمجھے ہوئے تھی۔

"اتابیہ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ اسی لیے وہ سب اسپتال میں تھے۔" اس کو اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملے کی تہہ تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں' اسی لیے اس نے تیمور کو ساری بات بتانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"کیا؟ تمہیں کیسے پتا چلا؟" اس کی تڑپ پہ ثمو کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے اس کی؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس کی متفکر آواز ثمو کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

"آپ خود کیوں نہیں آکر دیکھ لیتے۔"

"میرا وہاں کیا کام۔" عمر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گیا تو ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ نمودار ہو کے غائب ہو گئی۔

"پلیز بھائی! کیوں اپنے دل کا امتحان لے کر خود کو اذیت دے رہے ہیں۔ کیا پتا یہ حادثہ' آپ دونوں کو ملانے کا کوئی بہانہ ہو۔"

"کوئی بہانہ نہیں۔ وہ اپنی زندگی کا فیصلہ کر چکی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا تو ثمو کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا۔۔۔ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی تیمور کی آواز میں در آئی تھی۔ جبکہ ثمو کے سارے الفاظ اس کے اندر ہی کہیں کھو کر اسے سناٹے کی سی کیفیت میں دھکیل گئے تھے۔

"آئی ایم سوری بھائی!" بنا سوچے سمجھے وہ آنسوؤں کے درمیان بولی تو تیمور کا دل بہن کی اس درجہ محبت پہ کٹ کر رہ گیا۔

"تم کیوں افسردہ ہوتی ہو۔ جدائی کا یہ فیصلہ کل بھی اس کا تھا اور آج بھی اس نے ہی اس فیصلے پہ آخری مہر لگائی ہے۔ وہ شاید میری اس درجہ پرخلوص اور شدید محبت کے قابل ہی نہیں تھی۔" اس کے زخموں سے چور شکایتی لہجے پہ روتی ہوئی ثمو بے اختیار تڑپ اٹھی۔ اس کے لیے مزید چپ رہنا ناممکن ہو گیا تھا۔

"نہیں بھائی! وہ آپ سے بہت محبت کرتی تھی اور مجھے یقین ہے وہ آج بھی آپ کو اتنا ہی چاہتی ہو گی۔ سچی محبت کو بھلانا اتنا آسان نہیں ہوتا بھائی!"

"جو اتابیہ احسان کو کبھی مجھ سے تھی ہی نہیں لیکن میں پھر بھی پچھلے چار سالوں سے اس پہ یہ انمول خزانہ لٹاتا رہا۔ بنا کسی غرض' کسی صلے کے اسے چاہتا رہا مگر اب اور نہیں۔ میں اب اس کی یاد میں مزید ایک لمحہ ضائع نہیں کروں گا' اسی لیے میں نے ماہین سے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔" تنفر سے بولتے ہوئے اس کا لہجہ آخر میں حتمی رنگ اختیار کر گیا۔

"تو آپ۔۔۔ آپ اس لیے ماہین سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں کہ اتابیہ۔۔۔"

"ہاں! جب وہ مجھے فراموش کر کے آگے بڑھ گئی ہے تو میں کیوں اپنا وقت ضائع کروں اس کے پیچھے؟ میرے لیے میرا پندار' میری عزت' میری محبت سے بھی بڑھ کر ہے ثمو۔ مجھے جب تک اس کے راہیں جدا کرنے کا علم نہیں ہوا تھا میں اپنے حصے کی محبت نبھاتا رہا مگر اس کے فیصلے کے بعد اب سب ختم۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ تند لہجے میں بولا تو ثمو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ کے اپنے بھائی کو اس انتہائی قدم سے روکے۔

"پلیز بھائی! یہ نہ کریں۔ ابھی اس کی صرف منگنی ہی تو ہوئی ہے۔ آپ اس سے ایک بار ملیں تو سہی۔ اس سے بات تو کریں۔ بلکہ میں۔۔۔ میں خود اس سے بات کروں گی۔ اسے سمجھاؤں۔۔۔"

"خبردار! جو تم نے اس سے کچھ کہا یا سمجھایا۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے تیمور غضب ناک لہجے میں غرایا۔

"میں اب اس موضوع پہ مزید کچھ نہیں سننا چاہتا' نہ آج اور نہ آئندہ کبھی اور مجھے امید ہے کہ تم میری اس خواہش کا احترام کرو گی۔" حتمی لہجے میں کہتے ہوئے تیمور نے رابطہ منقطع کر ڈالا۔

کاش کہ اس کا بھائی جو سمجھ رہا تھا کہ وہ اس سے بہت محبت کرتی ہے اور یہ سب اس کی محبت میں کر رہی ہے' سچ ہوتا اور وہ اتنی ہی پرخلوص اور اچھی بہن ثابت ہوئی ہوتی۔ جتنی کہ وہ سمجھ رہا تھا' اسے

کاش!



فون بند کر کے وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔ ڈوبتے سورج کی کمزور کرنیں بے بسی سی بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔ بالکل اس کے دل کی طرح۔ جس میں موجود امید کی آخری کرن بجھنے کے بعد اب سوائے اندھیرے اور گھٹن کے اور کچھ نہ بچا تھا۔

اس نے ثمو کو تو دو ٹوک الفاظ میں منع کر دیا تھا لیکن اب اس سے اپنے دل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ جو اس کے اس کٹھور فیصلے کے خلاف سراپا احتجاج بن گیا تھا۔ وہ انابیہ کو دیکھنے اس سے ملنے کے لیے بری طرح بے چین ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی زندگی میں موجود نئے خیال رکھنے والوں کا احساس اسے اندر تک جلا گیا تھا اور یہ جلن اتنی شدید تھی کہ وہ آنکھوں میں پھیلتی نمی کو نہ روک سکا۔ اس کے سامنے پھیلا تاریک منظر آنسوؤں میں ڈولنے لگا تھا اور اس ڈولتے ہوئے منظر میں یکایک پرانے چہرے اور پرانی یادیں ابھرنے لگی تھیں۔ جو بڑی دلفریب، بڑی مسحور کن تھیں۔



"انابیہ! تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔ میرے جذبوں پہ اعتبار کر کے تم نے مجھے میری ہی نظروں میں معتبر کر دیا ہے۔ میں کتنا خوش ہوں، میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

انابیہ، احسان کے روبرو کھڑا وہ اپنی پرشوق نگاہیں اس کے گلابی شرمگیں چہرے پہ جمائے ہوئے تھا جبکہ انابیہ کے لیے اس کی وارفتگی اور اپنے اقرار کے بعد اس کا سامنا کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ وہ چاہ کر بھی اس کی جانب دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ جو بڑے آرام سے آپ سے تم تک کا سفر طے کرتا، اس کے پاس کھڑا تھا۔

"میں نے تم سے اپنی فیلنگز شیئر کی ہیں۔ تم کچھ نہیں کہو گی؟" اس کی جھکی پلکوں کو شرارت سے تکتے ہوئے وہ شوخ لہجے میں بولا۔

"کیا۔ کیا کہوں؟" وہ اٹکتے ہوئے بولی تو تیمور اپنی مسکراہٹ دبا گیا۔

"بڑھتی ہوئی مہنگائی کے بارے میں ہی اظہار خیال کر دو۔" اپنی شرارت چھپائے اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

اس درجہ بے تکے اور اچانک مشورے پہ انابیہ نے ہونقوں کی طرح منہ اٹھا کر تیمور کی طرف دیکھا۔ وہ شرارت سے ہنسا تو انابیہ کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہو گیا۔ بے اختیار ہی اس کے ہونٹ بھی کھل اٹھے۔

"یہ ہوئی نا بات۔ ورنہ اس سے پہلے تو یوں لگ رہا تھا جیسے تم سے اظہار محبت نہیں، بلکہ اقرار جرم کروایا جا رہا ہے۔" تیمور محبت پاش نظروں سے اسے تکتے ہوئے بولا تو وہ دھیرے سے ہنس دی۔

میری نیت اور میرے جذبوں میں تمہارے لیے سوائے پاکیزگی کے دوسرا کوئی تاثر نہیں اور اگر اللہ نے چاہا تو میں بہت جلد اپنی محبت کی اس پاکیزگی کو نہ صرف تم پہ بلکہ سب پہ واضح کر دوں گا۔" مضبوط لہجے میں کہتے ہوئے اس نے وہیں کیاری سے ایک سفید گلاب توڑ کر انابیہ کی جانب بڑھا دیا۔ اس کا دل یقین کی اس درجہ خوب صورت نشانی پہ کھل اٹھا۔

اپنی لرزتی پلکیں اٹھاتے ہوئے اس نے ایک نظر تیمور کے وجیہہ چہرے پہ ڈالی جہاں اس کے کہے ہر لفظ کی سچائی پوری آب و تاب کے ساتھ روشن تھی۔ اگلے ہی پل اس نے نگاہیں جھکاتے ہوئے پھول تھام لیا تو تیمور کا ہاتھ نرمی سے اس کے ہاتھ پہ آن ٹھہرا۔

"تھینک یو انابیہ! تھینک یو فار ایوری تھنگ۔!" اس کے چمکتے چہرے پہ نگاہیں جمائے تیمور نے ایک جذب سے کہا تو انابیہ دھیرے سے مسکراتی اس کی سنہری آنکھوں سے چھلکتی روشنی دیکھ کر رہ گئی تھی۔



انابیہ نے تیمور پر یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ وہ اس سے شادی صرف اسی صورت میں کرے گی، جب اس کی فیملی بھی اسے پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرے گی کیونکہ وہ اپنی بہن جیسی ڈری سہمی زندگی نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ نہ ہی وہ خود پہ ان چاہی کا ٹیگ لگوا کر نفرتوں کے سائے تلے زندہ رہنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔

اس کی بات پہ تیمور کو ایک بار پھر اپنے انتخاب کی درستگی کا بہت شدت سے احساس ہوا تھا اس نے دل ہی دل میں بہت جلد شیریں بیگم سے اپنی پسند کا ذکر کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر دوسری جانب حالات نے بہت تیزی سے پلٹا کھایا تھا۔

مومنہ کے سسرال میں ہونے والی تلخ کلامی کے نتیجے میں احسان صاحب اسے اپنے ساتھ گھر لے آئے تھے۔

مگر جب چھٹے روز مومنہ کو طلاق ہونے جیسی بری خبر اسے ملی تھی تب وہ بھی شاکڈ کھڑا رہ گیا تھا۔ کوئی شخص اتنا بے حس اور گھٹیا بھی ہو سکتا ہے، اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

سارے خاندان میں یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی، جس کے بعد ہر ایک کا ردعمل اس کے اپنے ظرف اور سوچ کے مطابق تھا۔ ان طرح طرح کے رویوں نے احسان صاحب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ خاصے گم صم سے ہو گئے۔ مگر پھر بھی کالج سے واپسی کے بعد ان کا زیادہ وقت مومنہ اور بچوں کے ساتھ یا پھر عصمت جہاں کی دل جوئی میں گزرتا تھا، جنہیں اس ناگہانی کے بعد دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔

تیمور چونکہ ان کی ذہنی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لیے اس نے ان سے پڑھنے کا سلسلہ کچھ عرصے کے لیے موقوف کر دیا تھا مگر روز ان کے ساتھ کچھ وقت ضرور گزارتا تھا۔ ان کی ہمت اور ان کا حوصلہ بے مثال تھا۔ اتنی سخت آزمائش جھیلنے کے بعد بھی تیمور نے ان کے لبوں سے شکوے کا ایک لفظ تک نہ سنا تھا۔ ان کی یہ بردباری تیمور کو ان کا قائل کر گئی تھی۔ وہ اس کڑے وقت میں اس کی فیملی کے ساتھ کھڑا تھا۔

اس احساس نے دل سے جڑے اس رشتے کی ایک ڈور روح سے بھی باندھ دی تھی۔



وہ رات کا کھانا کھا کے تقریباً ساڑھے دس بجے کے قریب گھر لوٹا تو پورچ میں شیریں بیگم کی گاڑی دیکھ کے خوش گوار حیرت کے زیر اثر تیز قدموں سے چلتا ہوا اندر چلا آیا۔ جہاں لاؤنج میں ماں کے ساتھ بہن کو بھی دیکھ کے اس کی خوشی دوچند ہو گئی۔

وہ ان کی طرف بڑھا تو شیریں نے بھی اٹھ کر بیٹے کو سینے سے لگایا، مگر خاصی سرد مہری سے۔ جسے تیمور اپنے دھیان میں محسوس کیے بنا ثمو کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"تم اتنی دیر تک کہاں تھے؟" اس کے برابر بیٹھتے ہوئے انہوں نے جانچتی نظروں سے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"میں۔ میں ایک دوست کی طرف تھا۔" وہ لمحے بھر کو رکتے ہوئے بولا تو شیریں بیگم کی آنکھیں بے اختیار ثمو کی آنکھوں سے جا ٹکرائیں۔ انہیں بیٹے کے منہ سے جھوٹ سن کے دکھ کے ساتھ ساتھ غصے نے بھی آن گھیرا تھا۔ جسے انہوں نے بمشکل تمام قابو کیا تھا۔ جبکہ تیمور اپنی دھن میں مسکراتا ہوا بولا تھا۔

"اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ میں آپ لوگوں کے بغیر بہت اداس ہو گیا تھا۔"

"اچھا! لگ تو نہیں رہا۔" شیریں بیگم استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولیں، تو اب کے ان کے انداز نے اسے چونکا دیا۔

"کیا مطلب؟" اس نے ماند پڑتی مسکراہٹ کے ساتھ ماں کی جانب دیکھا۔

"آئی مین! اگر ایسی بات تھی تو تم دو ہفتوں سے آئے کیوں نہیں؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولیں تو تیمور کی مسکراہٹ بھی بحال ہو گئی۔

"میں بہت مصروف تھا ممی۔" اس نے سادگی سے

جواب دیا۔

"ایسی بھی کیا مصروفیت کہ انسان ماں، باپ، بہن، بھائی کو ہی بھول جائے۔ آج بھی اگر میں نہ آتی تو نہ جانے تم کتنے دن تک شکل نہ دکھاتے۔" وہ خفگی سے گویا ہوئیں تو تیمور نے ہنستے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

"اوکے مدر! آئی ایم سوری۔" اس نے چہرہ آگے کر کے ان کا رخسار چوما تو شیریں بھی مسکرا دیں۔

"چلو! معاف کیا۔ لیکن اب کل تم ہمارے ساتھ اسلام آباد چلو گے۔" وہ اپنے سوچے گئے لائحہ عمل کے مطابق بولیں۔

"تو وے... میں نہ ابھی خود اسلام آباد جاؤں گا اور نہ آپ دونوں کو جانے دوں گا۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا تو شیریں بیگم کی بھنویں تن گئیں۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نے آپ دونوں کو کسی سے ملوانا ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا تو اس غیر متوقع بات پہ شیریں بیگم کے گرد خطرے کی گھنٹی زور و شور سے بجنے لگی۔ تو بات یہاں تک آ پہنچی تھی۔ بے اختیار ان کی پریشان نظریں ثمو کی جانب اٹھی تھیں جو انہیں آنکھوں سے تسلی دیتی بھائی کی جانب پلٹی۔

"لیکن کس سے بھائی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اپنی... اپنی پسند سے۔" اس نے ایک لمحے کو رک کر ماں کا چہرہ دیکھتے ہوئے بات مکمل کی تو شیریں بیگم کے لب بھینچ گئے جبکہ ثمو بے اختیار خاموش ہو گئی۔

"جب میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تم کسی کو پسند کرتے ہو۔ تب تو تم نے انکار کر دیا تھا۔" اس کی طرف دیکھتے ہوئے خفگی سے بولیں۔

"تب ایسا کچھ بھی نہیں تھا اور پھر میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کی۔ کسی کو پسند کرنا کوئی معیوب بات تو نہیں۔"

"غلط نہ سہی، لیکن اچھی بات بھی نہیں کی۔ تم جانتے ہو کہ میں ماہین..."

"لیکن میں ماہین سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔ پلیز ممی! کیا آپ میرے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتیں؟" ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے التجائیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولا تو شیریں بیگم کی نگاہیں بیٹے کے چہرے پہ ٹھہر سی گئیں۔

وہ آج کل جس جذباتی دور سے گزر رہا تھا، وہاں سمجھانا یا نصیحت کرنا بالکل بے معنی تھا۔ اس سے کسی بھی قسم کی بحث یا زور زبردستی اسے ہاتھ سے گنوانے والی بات تھی اور وہ اتنی بے وقوف نہ تھیں کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو خود سے بدظن کر کے اسے ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی لڑکی کے حوالے کر دیتیں۔ انہیں جو بھی کرنا تھا بہت سوچ سمجھ کے کرنا تھا۔

"کون ہے وہ؟" ان کے سوال پہ تیمور دھیرے دھیرے انہیں احسان صاحب اور انابیہ کے بارے میں بتانے لگا تھا۔

ساری تفصیل سن کے ان کا فشار خون مزید بلند ہو گیا تھا۔ ایک معمولی پروفیسر کی بیٹی اور ان کے اکلوتے نور نظر کی بیوی؟ منہاج مرتضیٰ اور شیریں منہاج کی بہو... ہرگز نہیں۔ اندر ہی اندر ان کا دل جل اٹھا تھا مگر چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"ٹھیک ہے! تم اپنے باپ سے بات کر لو۔ اگر وہ مان گئے تو میں تمہارا رشتہ لے جاؤں گی۔" اس کی بات کے اختتام پہ وہ بے تاثر لہجے میں بولیں، تو جہاں ثمو ہکا بکا رہ گئی، وہیں تیمور پہ خوش گوار سی بے یقینی چھا گئی۔

"یعنی آپ کو کوئی اعتراض نہیں؟" اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں..."

"یو آر گریٹ ماما! آئی لو یو۔" ہاتھ بلند کر کے نعرہ لگاتا وہ ماں کے گلے سے جا لگا تو شیریں نے بھی اسے خود سے لگا لیا۔

"آئی لو یو ٹو۔" ان کی آواز ان کے چہرے کی طرح جذبات سے عاری تھی۔

☼ ☼ ☼

تیمور جس وقت ڈائننگ ٹیبل پہ آیا، ثمو اور شیریں بیگم ناشتا شروع کر چکی تھیں۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" انہوں نے مقابل رکھی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"میں پاپا سے بات کر رہا تھا۔" وہ الجھا الجھا سا بولا تو شیریں ہاتھ میں پکڑا کپ نیچے رکھتے ہوئے بولیں۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"انہیں کوئی اعتراض نہیں۔" وہ ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تو شیریں ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔

"ٹھیک ہے! پھر آج شام کو ان کے گھر چلتے ہیں۔" وہ اک گہری سانس لیتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولیں تو تیمور ایک نظر ماں کے اترے ہوئے چہرے کو دیکھ کے رہ گیا۔ جو اس کی محبت میں کتنی خاموشی سے اپنی پسند سے دستبردار ہو گئی تھیں۔ بے اختیار اسے ان پہ ڈھیروں پیار آیا تھا۔ وہ واقعی ایک بے مثال ماں تھیں۔

"لیکن ایک پرابلم ہو گئی ہے۔" وہ بے دلی سے بولا۔

"کیا؟" شیریں نے فکرمندی سے اس کی طرف دیکھا۔

"پاپا کو آج ایک ڈیل کے لیے ایمرجنسی میں دو دن کے لیے کوئٹہ جانا پڑ رہا ہے۔ زاہد صاحب بھی ان کے ساتھ جا رہے ہیں۔ اپنی غیر موجودگی میں آفس سنبھالنے کے لیے وہ مجھے فوراً" اسلام آباد بلا رہے ہیں۔" اس نے منہاج صاحب کے مینیجر کا حوالہ دیا تو شیریں بیگم کے دل میں سکون ہی سکون اتر آیا۔

"پھر اب؟" انہوں نے مصنوعی تفکر سے پوچھا۔

"اب یہ کہ اسلام آباد تو مجھے جانا ہی پڑے گا۔" تیمور نے اک بوجھل سانس فضا کے سپرد کی۔

"تو پھر ہم بھی تمہارے پیچھے ہی نکلتے ہیں۔ یہ کام تو تمہارے بغیر نہیں ہو سکتا۔" اگر اسلام آباد جا کے اس کی ممی کے سر پہ ان کی بھتیجی کا بھوت نئے سرے سے سوار ہو جاتا تو؟... وہ کسی طور اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ویسے بھی رشتہ لے جانے کے لیے اس کی موجودگی لازمی نہیں تھی۔

احسان صاحب اور عصمت بیگم بھی شاید اس بات کو زیادہ پسند کرتے۔

"میرے خیال میں ممی! آپ چلی جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔" ہر پہلو پہ غور کرنے کے بعد وہ پر سوچ انداز میں بولا تو شیریں بیگم کی رکی ہوئی سانس بحال ہو گئی۔

ثمو اس دوران خاموش تماشائی بنی کبھی ماں اور کبھی بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اسے فی الحال شیریں بیگم نے کچھ نہیں بتایا تھا۔

"لیکن تم نے ان لوگوں کو تو اطلاع کر دی ہے نا!" وہ چہرے پہ مصنوعی فکر طاری کرتے ہوئے بولیں۔ یوں جیسے انہیں یہ سب گھبراہٹ میں مبتلا کر گیا ہو۔

"نہیں! میں صرف انابیہ کو بتاؤں گا اور آپ بھی وہاں یہ بات مت کیجیے گا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ آپ صرف یہی کہیے گا کہ میرے منہ سے آپ نے ان لوگوں کی اتنی تعریفیں سنیں کہ ملنے چلی آئیں۔" اس نے ماں کو صورت حال سمجھائی۔

"تو کیا تم دونوں کی پسندیدگی کے بارے میں وہ لوگ نہیں جانتے؟" شیریں بیگم کے ہاتھ ترپ کارڈ لگ گیا۔

"نہیں اور آپ بھی اس بارے میں خیال رکھیے گا۔" وہ سنجیدگی سے کہتا سامنے رکھے جوس کی جانب متوجہ ہوا تو شیریں منہاج اثبات میں سر ہلاتی، ایک نئی سوچ میں ڈوب گئیں۔

☼ ☼ ☼

تیمور کی سیٹ کنفرم ہوئی تو شیریں بیگم نے نوکر کے سر پہ کھڑے ہو کے اس کی ہلکی پھلکی پیکنگ مکمل کروائی۔ وہ انابیہ کو فون پہ شام میں اپنی ممی اور بہن کی آمد کے متعلق بتا چکا تھا۔ اس کی اچانک اسلام آباد روانگی کا سن کے وہ تھوڑا پریشان ہوئی تھی مگر تیمور کے تسلی دینے پہ اس کا بے چین دل قدرے مطمئن ہو گیا تھا۔

نکلنے سے پہلے اس نے شیریں بیگم کے ڈرائیور کو

اچھے طریقے سے پتا سمجھانے کے ساتھ ساتھ مکمل ایڈریس بھی لکھ کرہاں کو دے دیا تھا۔ ان کے کہنے پہ اس نے انابیہ کا موبائل نمبر بھی انہیں دے دیا تھا' تاکہ گھر نہ ملنے کی صورت میں وہ اس سے رابطہ کر سکیں۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کے وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ایرپورٹ کے لیے نکلا تھا۔ اسے اتنا تو یقین تھا کہ احسان صاحب اس کا پروپوزل کبھی بھی رد نہیں کریں گے لیکن پھر بھی اس کے اعصاب پہ ہلکی ہلکی سی گھبراہٹ سوار تھی۔ دل میں ہوتی خوش گوار سی ہلچل اور آنکھوں میں خوش رنگ خواب لیے وہ لاہور کی فضاؤں کو خیرباد کہہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ مطلوبہ کالونی تک پہنچنے میں ڈرائیور کو کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس سے پہلے کہ ان کی گاڑی کالونی کا بڑا سا گیٹ عبور کرتی شیریں بیگم نے ڈرائیور کو روک دیا۔

"ایک منٹ! میں ذرا کنفرم کرلوں۔"

انہوں نے موبائل میں فیڈ انابیہ کا نمبر ملاتے ہوئے فون کان سے لگایا ثمو کی آنکھیں ماں پہ جمی تھیں۔ جن کے چہرے پہ پھیلا تنفر اس کی نظروں سے چھپا نہیں تھا۔

"ہیلو!" تین بیلوں کے بعد دوسری طرف سے ایک شائستہ سی آواز سنائی دی تو شیریں بیگم کے چہرے کے تاثرات سرعت سے تبدیل ہوگئے۔

"ہیلو! انابیہ بول رہی ہو؟" انہوں نے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

"جی۔" انابیہ نے انجان آواز کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میں تیمور کی ممی بات کررہی ہوں۔" وہ حلاوت سے بولیں تو انابیہ کا دل دھڑک اٹھا۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام بیٹا! ہمیں تمہارا گھر نہیں مل رہا تھا۔ اس لیے پلیز ذرا راستہ سمجھا دو۔"

"ضرور.... آپ اس وقت کہاں ہیں؟" اس نے رسان سے پوچھا تو شیریں بیگم نے پانچ' چھ منٹ پہلے گزرنے والے چوک کا نام بتایا۔ ان کے جواب پہ انابیہ تو انہیں آگے کا راستہ سمجھانے لگی تھی لیکن گاڑی میں موجود ثمو نے چونک کر ماں کو دیکھا تھا' جبکہ آگے بیٹھے ڈرائیور نے بیک ویو مرر سے انہیں دیکھا تھا' جو نہ جانے کیوں غلط بیانی کررہی تھیں۔

چند منٹ اس سے بات کرنے کے بعد انہوں نے فون بند کردیا تھا۔ "پانچ' دس منٹ یہیں رکو' پھر آگے چلنا۔" انہوں نے موبائل پرس میں رکھتے ہوئے ڈرائیور کو ہدایت جاری کی تو وہ اپنی حیرت کو دبائے اثبات میں سرہلا گیا۔

تقریباً "سات' آٹھ" منٹ گزرنے کے بعد ان کی ہدایت پہ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی اور اگلے چند ہی لمحوں میں وہ پروفیسر احسان فاروق کے بیلوں سے ڈھکے چھوٹے سے بنگلے کے باہر کھڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تو آپ کا گھر کبھی نہ ملتا۔ اگر تیمور نے مجھے انابیہ کا نمبر نہ دیا ہوتا۔" ڈرائنگ روم میں سب کے درمیان بیٹھی شیریں بیگم نے مسکراتے ہوئے سادہ سے لہجے میں کہا تو جہاں ایک لحظے کو سب خاموش ہوگئے۔ وہیں انابیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے تیمور پہ جی بھر کے غصہ آیا تھا۔

"تیمور نے؟" احسان صاحب نے الجھی الجھی مسکراہٹ لیے ایک نظر انابیہ کو دیکھتے ہوئے بیگم منہاج کی جانب دیکھا۔

"جی تیمور نے جب انابیہ کو میری آمد کے متعلق بتایا تھا' میں نے تب ہی اس سے کہا تھا کہ مجھے انابیہ کا نمبر دے دو تاکہ اگر مجھے ایڈریس کے معاملے میں کوئی مسئلہ ہو تو میں پوچھ سکوں۔ اور دیکھیں وہی ہوا۔" اپنے سابقہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولیں تو احسان صاحب کے ساتھ ساتھ مومنہ اور عصمت جہاں کو بھی سانپ سونگھ گیا۔ جبکہ انابیہ کی اوپر کی سانس اوپر

اور نیچے کی سانس نیچے رہ گئی تھی۔

بے اختیار ان سب کی نگاہیں ایک جانب بیٹھی انابیہ کی طرف اٹھی تھیں جو متوحش سی انگلیاں چٹخاتی نظریں جھکا گئی تھی۔

"اور بیٹا آپ کے ہزبینڈ کیا کرتے ہیں؟" شیریں بیگم نے ہوشیاری سے اگلا پتا پھینکا' حالانکہ تیمور انہیں مومنہ کی طلاق کے بارے میں بتا چکا تھا۔ اس کے سوال پہ احسان صاحب اور عصمت بیگم سمیت انابیہ نے بھی چونک کر مومنہ کی جانب دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ یک لخت پھیکا پڑ گیا تھا۔

"آنٹی! میری حال ہی میں اپنے ہزبینڈ سے علیحدگی ہوگئی ہے۔" وہ بوجھل لہجے میں گویا ہوئی تو شیریں بیگم نے جھٹ چہرے پہ افسردگی طاری کرلی۔

"اوہ' آئی ایم سوری سو سوری بیٹا! آپ کی شادی اپنوں میں ہوئی تھی یا غیروں میں؟" انہوں نے بات کو اپنے مقصد کی طرف موڑا۔ "غیروں میں آنٹی۔" وہ گلوگیر لہجے میں دھیرے سے بولی تو شیریں بیگم تاسف سے سر ہلاتے ہوئے عصمت جہاں سے مخاطب ہوئیں۔

"یہی تو فرق ہوتا ہے اپنوں میں اور غیروں میں۔ میری تو خود بڑی خواہش تھی کہ میں اپنے بچوں کی شادی اپنوں میں کرتی مگر۔" انہوں نے قصداً" بات کو ادھورا چھوڑا تو عصمت بیگم ناسمجھی سے بولیں۔

"مگر کیا؟ آپ اب بھی تو اپنی خواہش پوری کرسکتی ہیں۔"

"کہاں' جب بچے اپنی من مانیوں پہ اتر آئیں تو ماں باپ کو مجبوراً" ان کی خواہشات کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے۔" وہ ایک نظر انابیہ پہ ڈالتے ہوئے بولیں تو مسلسل خاموش بیٹھے احسان فاروق سے ان کی یہ شکایتی نظر چھپی نہ رہ سکی۔ جس نے نہ صرف ان پہ بیگم منہاج کے جملے کا مفہوم بلکہ وہ سب بھی واضح کردیا جو نجانے کب سے ان کی ناک کے نیچے چل رہا تھا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی اطلاع انہیں ایک تیسرے بندے کے ذریعے مل رہی تھی۔

کسی کو پسند کرنا ان کے نزدیک معیوب نہ تھا لیکن اس طرح کہ ماں باپ کو لاعلم رکھ کر بات اتنی بڑھالی جائے کہ اگلے رشتہ لینے چلے آئیں اور ماں باپ ہونقوں کی طرح ان کے منہ سے اپنے بچوں کے کارنامے سنیں۔ یہ ان کے نزدیک ناقابل برداشت ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد دکھ اور شرمندگی کا باعث بھی تھا۔ ان کی تلخ نگاہیں عصمت جہاں کی حیران پریشان آنکھوں سے ٹکرائیں تو وہ بے اختیار لب کاٹ کر رہ گئیں۔ دوسری طرف انابیہ شرمندگی کے مارے سر نہیں اٹھا پا رہی تھی۔

تیمور نے تو کہا تھا کہ اس کی فیملی کو اس کی پسند پہ کوئی اعتراض نہیں' پھر اس کی ممی یہ کیا کہہ رہی تھیں؟ کیا وہ محض بیٹے کی خواہش میں مجبور ہو کے یہاں تک آئی تھیں؟ کیا اس پہ بھی مومنہ کی طرح ناپسندیدہ بہو کا لیبل لگنے والا تھا اور وہ بھی شادی سے پہلے ہی؟ تو کیا تیمور نے اس سے جھوٹ بولا تھا؟

"خیر! اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔" شیریں بیگم نے ایک بوجھل سانس لی۔ "اب تو ویسے بھی صرف ایک فارمیلٹی ہے جو ہمیں نبھانی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے احسان صاحب کی طرف دیکھنے لگیں۔ جو ان کی بات پہ سختی سے لب بھینچ گئے۔

ان کے تیور اور آنکھوں سے جھلکتی خفگی انابیہ کا حلق خشک کرگئی تھی۔ بے قراری سے پہلو بدلتے ہوئے اس نے مومنہ کی جانب دیکھا تھا۔ مگر اسے انتہائی خشمگیں نظروں سے اپنی جانب تکتا پا کے وہ غلط نہ ہوتے ہوئے بھی آنکھیں چرانے پہ مجبور ہوگئی تھی۔

"آپ کس فارمیلٹی کی بات کررہی ہیں؟" احسان صاحب کی سپاٹ آواز انابیہ کی سماعتوں سے ٹکرائی تو اس کے ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے۔

"میں تیمور اور انابیہ کی بات کررہی ہوں۔ میں آپ سے انابیہ کا رشتہ مانگنے آئی ہوں اپنے بیٹے تیمور کے لیے۔" انہوں نے اچھی خاصی بنیاد بنانے کے بعد اب کے واضح الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا تو کمرے میں عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ جسے محسوس کرتے ہوئے

ان کا دل خوشی سے کھل اٹھا۔ جبکہ تماشائی بنی بیٹھی ثمو ماں کی بچھائی گئی بساط کو دیکھتے ہوئے عش عش کر اٹھی۔

"اگر میں یہ کہوں کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں تو؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد احسان فاروق کا حسب توقع جواب موصول ہوا تو شیریں بیگم کے لبوں پہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"تو میں یہ کہوں گی کہ آپ اپنی بیٹی اور بیوی سے پوچھ لیں جو تمام معاملات طے کیے بیٹھی ہیں۔" ان کی بات پہ جہاں احسان فاروق نے بے یقینی سے عصمت بیگم کی جانب دیکھا تھا' وہیں انابیہ اور عصمت جہاں نے اس الزام پہ تڑپ کر شیریں بیگم کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" عصمت جہاں کا تو چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"پلیز بہن! شیریں بیگم نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے انہیں ٹوکا۔ "تیمور نے مجھے خود بتایا ہے کہ آپ کو نہ صرف اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ آپ تو ان دونوں کی ملاقاتیں بھی کرواتی رہی ہیں۔ سیر سپاٹے کراتی رہی ہیں ان دونوں کے۔"

"کیا؟" عصمت جہاں کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ جبکہ انابیہ کی تو "کاٹو بدن میں لہو نہیں" والی کیفیت ہو چلی تھی۔ اس نے بھلا کب تیمور کے ساتھ باہر ملاقاتیں کی تھیں؟

"یہ۔۔۔ یہ۔۔۔ جھوٹ ہے۔ تہمت ہے۔ تیمور میرے بارے میں" انہوں نے ایک روز قبل اتفاقی طور پر عصمت بیگم' انابیہ اور تیمور کو ڈاکٹر کے پاس سے آتے ہوئے دیکھ لینے پر صورت حال کو اپنے حق میں استعمال کیا مگر انابیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ "اتنی غلط بیانی نہیں کر سکتا۔" اس کی آنکھیں لبالب بھر آئی تھیں۔

"تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ یہ سب میں اپنی طرف سے کہہ رہی ہوں؟" انہوں نے یک لخت تیوریاں چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "چلو اچھا! تو پھر مجھے ایک بات بتاؤ۔ مجھے یہ کیسے پتا چلا کہ کل شام تم اس کے ساتھ آئس کریم کھانے گئی تھیں؟" ... انداز میں بولیں۔

"یہ بات انہیں کیسے پتا چلی؟" سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ اس نے خود سے سوال ... اور جو جواب آیا تھا اس نے اس کے مان اور ... کرچیاں بکھیر ڈالی تھیں۔ جبکہ عصمت جہاں کا ... بے اختیار ان کے سینے پہ آ ٹھہرا تھا۔

"مگر آنٹی! کل شام تو وہ مجبوراً" امی اور انابیہ ... کے پاس لے کر گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ تنہا کہیں ... پھرنے نہیں گئی تھیں۔" ان دونوں کو بت بنا دیکھ ... مومنہ تیزی سے بولی تو شیریں بیگم تلخی ... مسکرا دیں۔

"اب یہ تو آپ لوگ جانیں یا آپ لوگوں کا ... اس نے تو مجھے صرف آئس کریم پارلر جانے ... بارے میں بتایا تھا۔ اور معذرت کے ساتھ ... سب آپ کے نزدیک اتنا ہی معیوب ہے جتنا کہ ... اس وقت ظاہر کر رہی ہیں تو آپ اس کے ساتھ ... کیوں تھیں؟ بلکہ آپ لوگ مجھے یہ بتائیں کہ ... رشتے سے آپ لوگوں نے اسے اپنا نوکر ... ہے؟ کیا آپ ماں بیٹیاں اپنے گھر میں آنے والے ... کو یونہی اپنی انگلیوں پہ نچاتی ہیں؟ کیا شریفوں کے ... طور طریقے ہوتے ہیں؟" عصمت بیگم کی پتھرائی ... آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ خوش اخلاقی ... پھینک کے اپنے اصل پہ اتر آئیں تو ساکت بیٹھی ... سکتہ جیسے ٹوٹ گیا۔

"مسز منہاج! بہت ہو گیا۔ آپ کو کسی نے ... نہیں دیا کہ آپ میرے ماں' باپ کی اس درجہ ... کریں۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کی اور اپنی ... فرق کو بھول جاؤں۔ آپ ابھی اسی وقت ہمارے ... سے تشریف لے جائیں۔" غصے سے کانپتی ہوئی ... جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تو شیریں بیگم کا چہرہ ... غضب کے سرخ ہو گیا۔ وہ ایک جھٹکے ... ہوئیں تو وہاں موجود سب ہی' نفوس بھی ...

... ہو گئے۔

"تم دو ٹکے کی آوارہ لڑکی! تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ اتنا ... پارسائی کا دعوا ہے تو اپنی جوانی اور اپنی نیت کو سنبھال کر رکھو نا۔ ارے! یہ تو میری اپنے بیٹے سے محبت تھی جو میں ہر بات نظر انداز کیے تم جیسے گھٹیا لوگوں سے رشتہ جوڑنے چلی آئی تھی۔ ورنہ تم جیسی راہ چلتی تو اس قابل بھی نہیں کہ ہم میں سے کوئی تم پہ اک نگاہ غلط بھی ڈالے' سمجھیں!" وہ اپنا پرس اٹھائے ثمو کے ساتھ ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئیں اور پیچھے کھڑے نفوس پہ موت کا سا سناٹا چھا گیا۔

"موی! موی بیٹا۔" یک لخت عصمت جہاں کی کراہ نے کمرے کی ساکت فضا میں ارتعاش سا برپا کیا تو تینوں نے بیک وقت گھبرا کے ان کی جانب دیکھا جو سینہ ملتے ہوئے صوفے پہ گرتی چلی گئی تھیں۔



"کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" فون کان سے لگائے تیمور کے لیے اپنی سماعتوں پہ یقین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔

"بھائی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ انابیہ نے ممی کی ... انسلٹ کی اور ہمیں صاف لفظوں میں اپنے گھر سے نکل جانے کے لیے کہا۔" ثمو نے لہجے میں رقت ... طاری کرتے ہوئے ماں کے بتائے ہوئے ڈائیلاگز ... دہرائے۔ تیمور کے لیے اس بات کو ماننا ناممکن ہو گیا تھا۔

"مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟" وہ مضطرب سا بولا تو ... ثمو اپنا سابقہ لہجہ قائم رکھتے ہوئے بولی۔

"بھائی! جب ممی نے احسان انکل سے آپ دونوں کے رشتے کی بات کی تو انہوں نے فوراً" معذرت کر لی کہ وہ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد انابیہ کا رشتہ غیروں میں نہیں کرنا چاہتے۔ اس پہ ممی نے انہیں سمجھانے کے لیے کہا کہ آپ یوں فوری انکار نہ کریں اور ایک بار اپنی بیٹی سے بھی پوچھ لیں۔ اس پہ انکل کہنے لگے کہ آپ کا کیا مطلب ہے' میری بیٹی آپ کے بیٹے کے ساتھ انوالو ہے؟ ممی نے کہا کہ خدا نخواستہ میں نے ایسا کب کہا۔ مگر یہ بچوں کی زندگی کا معاملہ ہے۔ آپ اگر فیصلہ کرنے سے پہلے اس سے بھی پوچھ لیں گے تو کوئی بری بات نہیں ہو گی۔ اس پہ انکل کہنے لگے کہ میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی کا فیصلہ بھی مجھ سے الگ نہیں ہو گا اور جب انابیہ کو بلا کر انکل نے پوچھا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ جیسی آپ کی مرضی۔" ثمو سانس لینے کو رکی تو تیمور جو انابیہ کی تابعداری سے بخوبی واقف تھا' بے اختیار لب بھینچ گیا۔

"پھر ممی کو بھی غصہ آ گیا۔ انہوں نے کہا کہ تم سوچ سمجھ کر تو کہہ رہی ہو نا؟ تو انابیہ بولی کہ میری زندگی کا فیصلہ میرے ماں' باپ کریں گے۔ پھر ممی نے بھی کہہ دیا کہ میرے بیٹے کو جھوٹی آس کیوں دلائی تھی؟ یہ بات سن کے تو انابیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا' کہنے لگی کہ آپ اتنی بڑی تہمت مجھ پہ کیوں لگا رہی ہیں۔ آپ کو کسی نے یہ حق نہیں دیا۔ اب اگر آپ نے میرے کردار کے متعلق ایک لفظ بھی کہا تو میں آپ کی اور اپنی عمر کے فرق کو بھول جاؤں گی۔ اس لیے پلیز آپ ابھی اسی وقت ہمارے گھر سے تشریف لے جائیں۔ ثمو نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بات ختم کی تو دوسری طرف موجود تیمور پہ سناٹا چھا گیا۔

"اپنے ماں' باپ کا اتنا خیال کہ ان کی عزت پہ ایک حرف نہیں آنے دیا اور اس کی محبت؟ اس کی ماں کی عزت؟" وہ درد کے طوفان میں گھرا تلخ سوچوں میں ڈوبتا چلا گیا۔

"ہیلو۔۔۔ ہیلو بھائی!" ثمو کے پکارنے پہ وہ اک بوجھل سانس لیتا جیسے خود میں لوٹ آیا تھا۔

"ممی کہاں ہیں؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"میں نے سلیپنگ پلز دے کر سلا دیا ہے۔" وہ بوجھل لہجے میں بولی تو شیریں بیگم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

"ٹھیک ہے' میں تم لوگوں کی کل کی ٹکٹس کروا رہا ہوں۔ اصغر سے کہو کہ وہ تم لوگوں کو ایئرپورٹ ڈراپ

کر کے خود بائے روڈ اسلام آباد پہنچ جائے۔" اس نے آن واحد میں فیصلہ کرتے ہوئے کہا تو ثمو نے ماں کو دیکھتے ہوئے انگلیوں سے وکٹری کا نشان بنایا۔

"ٹھیک ہے بھائی! اپنا خیال رکھیے گا' اللہ حافظ۔" اس نے دھیرے سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تو شیریں نے قہقہہ لگاتے ہوئے بیٹی کو سینے سے لگالیا۔ انہیں اب اتنی سی بھی پروانہ تھی کہ تیمور' اناںبیہ کو فون کرتا یا نہیں' کیونکہ انہوں نے بدگمانی کے ایک نہیں' بہت سے بیج بوئے تھے۔



ثمو کا فون بند کرتے ہی تیمور نے کھولتے دماغ کے ساتھ اناںبیہ کا نمبر ملایا تھا مگر تین' چار بیلوں کے بعد ہی اس کا فون کاٹ دیا گیا تھا۔ اگر ثمو جھوٹی ہوتی تو اناںبیہ ضرور اس کا فون اٹینڈ کرتی۔

لب بھینچے اس نے نمبر ری ڈائل کیا تو اب پہلی بیل پر ہی اس کی کال منقطع کر دی گئی تھی۔

کنپٹی میں ٹھوکریں مارتے خون کے ساتھ اس نے جیسے جنون کی کیفیت میں اناںبیہ کا نمبر تیسری بار ملایا تھا۔ مگر اب کی بار پاور آف کی ریکارڈنگ نے اس کا دماغ حقیقتاً" گھما ڈالا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ میں پکڑا موبائل پوری طاقت سے دیوار پہ دے مارا۔



تیمور اور شیریں بیگم کا سامنا اگلے روز کہیں رات کے وقت جا کے ہوا تھا۔ وہ سارا دن آفس میں گزار کر آیا تھا اور شیریں سارا دن ذہن میں مختلف جملے ترتیب دیتی رہی تھیں۔ مگر آمنا سامنا ہونے پہ اس نے ماں سے سوائے رسمی بات چیت کے ایک لفظ تک نہیں کہا اور اس دوران بھی وہ مسلسل ان سے نظریں چرائے ہوئے تھا۔ وہ حقیقتاً" ان سے بے حد شرمندہ تھا اور شیریں اس کی یہ کیفیت بخوبی سمجھ رہی تھیں۔ اناںبیہ نے انہیں ازخود گھر سے جانے کا کہہ کے ان کی پوزیشن ان کے بیٹے کے سامنے اور بھی مضبوط کر دی تھی۔

"تیمور! ادھر دیکھو میری طرف۔" اسے اٹھ لینے پر تو لتا دیکھ کے وہ بے حد نرمی سے بولیں تو نظریں جھکائے بے اختیار اپنا نچلا لب دانتوں تلے دبا گیا۔

"تمہیں اگر مجھ سے کوئی گلہ ہے تو بیٹا! کہو' میں تمہارے ہر سوال کا جواب دوں گی میری جان!" اس کا ہاتھ تھامے وہ محبت سے گویا ہوئیں تو تیمور کی نظریں اپنے ہاتھ پہ جمے ان کے مشفق ہاتھ پہ ٹھہر گئیں۔

اگلے ہی لمحے اس نے ان کا ہاتھ تھام کے لبوں سے لگالیا۔

"مجھے آپ سے کوئی گلہ نہیں۔ ان فیکٹ آئی ایم رئیلی ویری سوری۔" دھیرے سے کہتا وہ کمرے سے نکل گیا۔

منہاج مرتضیٰ کے آنے پر بھی اس کی خاموشی نہیں ٹوٹی تھی۔ سب کا اب یہی اصرار تھا کہ وہ اناںبیہ ایس ایس کی ضد چھوڑ کے یہاں اپنا بزنس سنبھالے۔ اس نے کسی کی بھی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ واپس لاہور چلا آیا۔ اس کے لاہور جانے پہ شیریں کو تھوڑی پریشانی ہوئی تھی۔ لیکن چونکہ قوی امکان اس بات کا تھا کہ اب احسان فاروق شاید ہی کبھی اسے اپنے گھر میں آنے دیں۔

لاہور پہنچ کر وہ ایئرپورٹ سے سیدھا احسان صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا تھا۔

لیکن جوں ہی اس کی نظر سامنے موجود منظر پہ پڑی وہ اپنا تمام تر غصہ بھلائے کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

کھلے ہوئے گیٹ سے اندر لگی قناتیں اور آتے جاتے لوگ صاف نظر آ رہے تھے۔ پورچ میں ایک طرف رکھی دیگیں اور برتنوں کے ڈھیر بھی وہ با آسانی دیکھ سکتا تھا۔ کچھ غلط ہونے کا احساس اس کے اندر بڑی تیزی سے جاگا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ بڑی عجلت اور بے قراری سے کھلے گیٹ سے اندر چلا آیا تھا۔

پریشانی سے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے اس نے احسان صاحب کو تلاشنا چاہا تھا مگر انہیں کہیں نہ پا کے اس نے پاس سے گزرتے ایک لڑکے کو آواز دے کر روک لیا تھا۔

"یہ یہاں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آیا تو وہ بے اختیار خاموش ہو گیا۔ لیکن مقابل اس کی بات سمجھ گیا تھا۔

"پرسوں احسان انکل کی وائف کا انتقال ہو گیا ہے' آج ان کا قل ہے۔"

"کیا' لیکن کیسے؟" وہ حیرت زدہ سا بولا۔ دکھ اور بے یقینی اس کے چہرے سے ہویدا تھی۔

"نہیں ہارٹ پرابلم تھی۔ اچانک ہارٹ اٹیک ہوا تو گھر والے انہیں اسپتال لے گئے۔ اگلی صبح ان کا انتقال ہو گیا۔"

"احسان صاحب کہاں ہیں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے بوجھل لہجے میں پوچھا۔

"وہاں لان میں۔۔۔ مردوں کے بیٹھنے کا وہیں انتظام ہے۔" وہ اسے بتا کے آگے بڑھ گیا۔

دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا وہ ان کے قریب چلا آیا۔ احسان صاحب اس پہ نظر پڑتے ہی بالکل خاموش ہو گئے۔ اسے اپنے سامنے بیٹھنے کے لیے جھکتا دیکھ کے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تو تیمور بھی ان کے چہرے پہ نگاہیں جمائے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا' وہ اس کے قریب سے گزر کے لان سے باہر نکل گئے۔

"سر! پلیز میری بات سنیں۔" وہ جوتے پہنے بغیر ان کے پیچھے لپکا تھا۔ "سر پلیز۔۔۔"

"کیوں آئے ہو یہاں؟" وہ یک لخت پلٹ کر اس پہ برسے تو تیمور لمحے بھر کو خاموش ہو گیا۔ "بولتے کیوں نہیں؟" سرخ آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے وہ دبے دبے سے غرائے تو شکور کو ساتھ لیے باہر آتی اناںبیہ ان کی آواز سن کے متعجب سی ان کی سمت بڑھی۔ لیکن جوں ہی اس کی نگاہ ان کے مقابل کھڑے تیمور سے ٹکرائی وہ اپنی جگہ پہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"آیا تو آپ لوگوں سے بہت سے شکوے' شکایات کرنے کے لیے تھا۔ لیکن یہاں آ کر پتا چلا کہ۔۔۔" وہ قصداً" بات ادھوری چھوڑ کے نظریں جھکا گیا تو احسان صاحب تلخ لہجے میں بولے۔

"پتا چل گیا نا! اب یہاں سے جاؤ اور جا کر اپنی ماں کو مبارک باد دو' جس کی بدولت آج ہمیں یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔"

"آپ زیادتی کر رہے ہیں سر! میری ماں کا بھلا آنٹی کے انتقال سے کیا تعلق؟" وہ ناگواری سے بولا تو احسان فاروق کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔

"کاش! کہ یہ گھر لوگوں سے بھرا نہ ہوتا تو میں تمہیں بتاتا کہ تمہاری ماں کا عصمت کے انتقال سے کیا تعلق ہے۔"

"پلیز بابا! ہمیں ان سے کوئی بات نہیں کرنی۔" دفعتاً" اناںبیہ نے پیچھے سے آ کے ان کے بازو پہ ہاتھ رکھا تو وہ دونوں چونک گئے۔ بے اختیار تیمور کی نظریں اناںبیہ کی جانب اٹھی تھیں۔

"سن لیا تم نے۔ اب جاؤ یہاں سے اور دوبارہ کبھی یہاں قدم مت رکھنا۔" انہوں نے انگلی اٹھائے اسے تنبیہہ کی تو اناںبیہ کی بیگانگی پہ اس کا ضبط بھی جواب دے گیا۔

"ٹھیک ہے! میں دوبارہ نہ تو آپ لوگوں کو اپنی صورت دکھاؤں گا اور نہ ہی آپ سے کوئی تعلق رکھوں گا لیکن اسے میری ریکویسٹ سمجھیں یا ضد کہ میں اس وقت اناںبیہ سے بات کر کے جاؤں گا۔" وہ ایک سرد نظر اناںبیہ کے جھکے چہرے پہ ڈال کر قطعی لہجے میں احسان صاحب سے بولا۔

"آؤ۔" وہ اناںبیہ کا ہاتھ تھامے اپنی اسٹڈی کی جانب بڑھ گئے۔ تیمور بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔

"کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"میں ہر بات بھلا کر نئے سرے سے ٹوٹا تعلق جوڑنا

چاہتا ہوں۔"

"مگر مجھے یہ غلطی دوبارہ نہیں کرنی۔" انابیہ کی سرد آواز اسٹڈی کی خاموشی میں گونجی تو تیمور بے یقینی سے اس کی طرف پلٹا۔

"تم اپنے اور میرے رشتے کو غلطی کہہ رہی ہو؟" اس کی آنکھوں میں دکھ کی کیفیت بڑی واضح تھی۔

"نہیں! میں اپنی پرکھ' اپنے فیصلے کو غلطی کہہ رہی ہوں۔ رشتہ تو ہمارے درمیان کبھی کوئی تھا ہی نہیں۔"

"اور وہ رشتہ کیا ہوا جس کی بنیاد ہم نے عزت اور اعتبار پہ رکھی تھی؟"

"وہ اسی روز اپنی موت آپ مر گیا تھا' جس دن اس عزت اور اعتبار کی دھجیاں بکھیریں تھیں آپ نے۔"

"اپنی جان سے بھی بڑھ کے حفاظت کی ہے میں نے تمہارے اعتبار کی۔ ہاں لیکن تم نے میرے مان کو میری ماں کے آگے شرمندہ کردیا۔ تم ایک اچھی بیٹی تو بن گئیں' لیکن تم نے میری محبت کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے انابیہ!" وہ اسے انتہائی دکھ سے دیکھتے ہوئے بولا تو انابیہ کے چہرے پہ پچھتاوے کے رنگ پھیل گئے۔

"کاش! کہ میں ایک اچھی بیٹی ثابت ہوئی ہوتی تو آج میرے دل پہ اتنا بوجھ نہ ہوتا لیکن شاید یہ میرے کیے کی سزا ہے۔ اس کیے کی جو میں نے ایک جھوٹے مرد کی کھوکھلی باتوں پہ یقین کرکے کیا۔ جو اتنا خود غرض ہے کہ اسے آج بھی درد ہے تو صرف اپنی ماں کا' اپنی محبت کا۔" وہ اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے بولی۔

تیمور اس کے شفاف چہرے پہ اپنے لیے اس درجہ بے اعتباری دیکھ کے ساکت کھڑا رہ گیا۔ جبکہ اس کے احساسات سے بے خبر انابیہ اسی زہرخند لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"کتنا مختلف سمجھا تھا میں نے عادل حسن سے آپ کو۔ مگر آپ تو اس سے بھی بڑھ کے کمزور نکلے۔ اس نے اور اس کے خاندان نے جو کچھ بھی کیا' سب کے سامنے کیا۔ لیکن آپ نے تو عزت کا دعوے دار بن کے ہمیں بے عزت کیا۔ جان لے لی میری ماں کی۔ اس سب کے بعد آپ نے سوچا بھی کیسے کہ میں ان میں سے کسی کو معاف کردوں گی؟ آپ کی ماں کی باتیں میرے دل پہ لکھی ہیں۔"

"کون سی باتیں؟ کیا کہہ دیا تھا انہوں نے تمہیں؟ یہی نا کہ میرے بیٹے کو جھوٹی آس کیوں دلائی تھی؟ اور تم نے ہم نے کیا کہا؟"

خشمگیں نظروں سے اسے دیکھتا وہ اس کے مقابل کھڑا ہوا تھا۔ "تم نے انہیں کہا کہ اگر آپ نے ایک لفظ بھی کہا تو میں آپ کی اور اپنی عمر کے فرق بھول جاؤں گی۔ تم نے میری ماں اور بہن کو اپنے گھر سے نکال دیا۔"

"بالکل ٹھیک کیا۔ وہ اسی قابل تھیں۔" اور تیمور جو اس کے منہ سے کسی بھی قسم کی تردید یا صفائی سننے کا خواہشمند تھا۔ اس درجہ ڈھٹائی پہ شاکڈ کھڑا رہ گیا۔ یہ انابیہ احسان کا کون سا روپ تھا۔

"اپنے ماں' باپ کا اتنا خیال کہ ان کے سامنے میرا حوالہ تمہیں سننا تک منظور نہیں۔ کیونکہ ان کی عزت' عزت ہے اور میری ماں' میری بہن کی کوئی عزت نہیں؟ تمہیں معلوم بھی ہے میں نے انہیں کتنی مشکل سے اس رشتے کے لیے راضی کیا تھا؟" تیمور نے اسے دکھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہونہہ! جانتی ہوں آپ کی جھوٹی سچی داستانیں۔ جو آپ نے اپنا مقصد پانے کے لیے گھڑی تھیں۔"

"اتنی نفرت' اتنی بے یقینی۔" حیرت کی زیادتی کے باعث وہ پل بھر کو خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ مزید اس سے کیا کہے۔ "مجھے واقعی تم سے کوئی بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ کم از کم میری خوش فہمی تو قائم رہتی۔" اپنے دل میں اٹھتی ٹیس کو دباتے ہوئے تیمور نے اس دشمن جاں کی طرف دیکھا تھا۔

"لیکن ایک بات یاد رکھنا انابیہ! جدائی کا یہ فیصلہ تمہارا ہے' میرا نہیں۔ چونکہ میں نے تمہیں زبان دی تھی کہ تمہارا ہر فیصلہ میں بخوشی قبول کروں گا۔ اس لیے میں تمہاری خواہش پہ اپنی خواہش سے دستبردار ہوتا ہوں۔ میں ہمیشہ کے لیے خود کو تمہاری زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔" ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی بات مکمل کرتا وہ ایک آخری نظر اس کے اجنبی وجود پہ ڈالتا وہ دروازے سے باہر نکل گیا۔



شیریں بیگم کا سارا دن شدید اضطراب کے عالم میں گزرا تھا۔ ایک لمحے کو بھی ان کا دھیان تیمور کی جانب سے نہیں ہٹا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد اسے کال کیا تھا اور تیمور جو آج سارا دن شدید ڈپریشن کے عالم میں رہا تھا' ماں کی آواز سن کے بری طرح بے چین ہو گیا تھا۔

"تیمور! کیا بات ہے بیٹا۔ تم اتنے الجھے ہوئے کیوں ہو؟"

"میں... میں آج انابیہ کی طرف گیا تھا۔" وہ لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد دھیرے سے بولا تو شیریں کا دل دھک سے رہ گیا۔ جبکہ دوسری طرف وہ ان کی کیفیت سے انجان بوجھل لہجے میں گویا ہوا تھا۔

"اس کی امی کا انتقال ہو گیا ہے۔ آج ان کا سوئم تھا۔" اور شیریں کو لگا تھا جیسے کسی نے ان کی اتنی محنت پہ پانی پھیرنے کی اطلاع دے دی ہو۔ "تیمور تو یقیناً جذباتی ہو کے ہر بات بھلانے کو تیار ہو گیا ہوگا۔"

"اوہو... تمہاری ملاقات ہوئی ان لوگوں سے؟" انہوں نے ہوشیاری سے مطلب کی بات پوچھی۔ تو تیمور کے لبوں سے اک سرد آہ نکل گئی۔

"جی... لیکن اب سوچتا ہوں کہ نہ ہی ملا ہوتا تو اچھا تھا۔"

"کیوں؟" اس کی بات پہ شیریں کا سارا جسم کان بن گیا تھا۔ جبکہ تیمور انہیں بوجھل لہجے میں ساری بات بتاتا چلا گیا تھا۔ جس کے اختتام پہ شیریں بیگم پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔

"کیا؟ وہ اپنی ماں کی موت کے لیے ہمیں ذمے دار ٹھہرا رہی ہے؟ اسے اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے شرم نہیں آئی؟" وہ مکاری سے بولیں تو تیمور اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اچھا امی! پھر بات کروں گا' اللہ حافظ۔" وہ دھیرے سے بولا۔

"اللہ حافظ میری جان' اپنا خیال رکھنا!" انہوں نے دل گرفتی سے کہتے ہوئے رابطہ منقطع کرتے ہوئے فون ایک جانب پٹخا تھا اور لپک جھپک ثمرہ کے کمرے کی جانب بڑھی تھیں۔

مسکراتے لہجے میں انہوں نے پوری بات اس کے گوش گزار کی تھی۔ لیکن اپنی کامیابی کی دھن میں وہ ثمرہ کی خاموشی اور اس کے چہرے پہ پھیلا ملال نہیں دیکھ سکی تھیں۔



دن' مہینوں میں اور مہینے' سالوں میں تبدیل ہوتے چلے گئے تھے۔ اس دوران ثمرہ کی شادی ہو گئی تھی۔ مگر شیریں بیگم' تیمور کو ماہین کے لیے قائل نہ کر سکی تھیں۔ اس کی ذات ہر گزرتے دن کے ساتھ ویرانی کے ایک ایسے خول میں بند ہوتی چلی گئی تھی۔ جسے توڑنا ان میں سے کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔

اس کی یہ تنہائی' یہ اداسی ثمرہ کے احساس جرم میں ہر لحہ اضافے کا باعث تھی۔ وہ خود کو تیمور اور انابیہ کا مجرم سمجھنے لگی تھی۔

ادھر انابیہ کی زبان پہ دوبارہ کبھی تیمور منہاج کا نام نہیں آیا تھا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس نے لاہور کے ایک بہترین کالج میں جاب کرلی تھی۔ مومنہ نے فیشن ڈیزائننگ کا کورس کرنے کے بعد اپنا بوتیک کھول لیا تھا۔ انابیہ کے نزدیک زندگی مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن احسان فاروق کو اس کی جانب سے سخت تشویش تھی۔ مومنہ نے تو اپنی زندگی اپنے بچوں کے نام کردی تھی۔ اس نے دوبارہ شادی کے لیے سختی سے منع کردیا تھا' مگر انابیہ کو وہ ہر حال میں اپنے گھر کا دیکھنے کے خواہش مند

تھے۔

ان کی یہ خواہش جلد ہی ڈاکٹر عمر کی صورت میں پوری ہوئی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی فیملی کا خوبرو نوجوان تھا۔ انابیہ کو اس کی والدہ نے ایک فنکشن میں دیکھا تھا۔ انابیہ نے ان دونوں کی پسند پہ خاموشی سے سر جھکا دیا تھا۔ وہ اپنی تابعداری سے 'ماضی میں اپنے گھر والوں کو ملنے والی اذیت کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلی صبح اتوار تھا۔ تیمور ساری رات جاگنے کے بعد اب کہیں بارہ بجے کے قریب جا کے اٹھا تھا۔

شاور لینے کے بعد بھی طبیعت پہ چھائی کسل مندی دور نہ ہوئی تو وہ اٹھ کے نیچے لاؤنج میں چلا آیا تھا۔ جہاں شیریں بیگم کے ساتھ منہاج صاحب بھی بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اس کے آنے پہ ملازمہ اس کی روٹین کا ناشتا یعنی جوس لے آئی تھی۔

"ممی آپ ماموں کی طرف گئی تھیں؟" اس نے جوس گلاس میں ڈالتے ہوئے ماں کی طرف دیکھا۔

"نہیں وہ میں۔۔" انہوں نے گڑبڑا۔۔ کر شوہر کی جانب دیکھا تو تیمور کی بھنویں تن گئیں۔ وہ بے اختیار سیدھا ہو بیٹھا۔

"جب میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ جتنی جلدی ہو سکے، جا کے سارے معاملات طے کرلیں تو آپ گئی کیوں نہیں؟" ان کی طرف دیکھتا وہ تند لہجے میں بولا۔ تو شیریں بیگم بھی قدرے ناگواری سے بولیں۔

"میں ثمو کی منتظر ہوں۔ وہ آئے گی تو ہم جائیں گے نا۔" ثمو کے نام پہ تیمور بے اختیار اک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اوفو ممی! آپ سمجھتی کیوں نہیں، میں کون سا بارات لے جانے کے لیے کہہ رہا ہوں جو آپ۔۔۔" وہ جھنجلا کر تیز لہجے میں بولا تو منہاج مرتضیٰ نے اسے تنبیہی لہجے میں ٹوک دیا۔

"تیمور! کنٹرول یور سیلف۔" ان کے ٹوکنے پہ وہ بے اختیار خاموش ہو گیا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ وائٹ از رانگ ود یو؟ وائے یو آر بی ہیونگ سو اسٹرینجلی" اس کی طرف دیکھتے ہوئے وہ غصے سے بولے۔

"آپ صحیح کہتے ہیں پاپا! پتا نہیں مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔" ان کی طرف دیکھتا وہ تھکے تھکے سے لہجے میں کہتا اٹھ کھڑا ہوا تھا اور پھر پلٹ کر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

شیریں فون پہ تمام روداد ثمو کے گوش گزار کر رہی تھیں۔ تیمور کے ناقابل فہم رویے نے انہیں واقعی بہت اپ سیٹ کر دیا تھا۔

ان کی بات سن کے ثمو بے اختیار اک بوجھل سانس کھینچ کر رہ گئی تھی۔ تیمور اپنے دل سے لڑ کر خود پہ ایک ان چاہا رشتہ مسلط کر رہا تھا۔ ایسے میں جھنجلاہٹ اور غصہ آنا تو فطری سی بات تھی۔

تو کیا تیمور ساری زندگی اسی طرح ناخوش رہے گا؟ اور کیا اس کے لیے اپنے اکلوتے بھائی کو اس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی گزارتے دیکھنا آسان ہو گا؟ کیا انہوں نے جو کیا وہ اس کے لیے خود کو معاف کر پائے گی؟ ان کے جھوٹ اور الزاموں نے ایک نیک عورت کی جان لے لی تھی۔ دو محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے بدگمان کر دیا تھا۔ وہ خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

"ممی! میں آپ کو بعد میں فون کرتی ہوں۔ ابھی مجھے احمر کے ساتھ کہیں جانا ہے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

ساری زندگی کے لیے پچھتاوؤں میں گھرنے سے بہتر تھا کہ وہ ایک آخری کوشش ضرور کرتی۔ پھر چاہے تیمور اسے کتنی بڑی سزا کیوں نہ دے لیتا۔ کم از کم اسے یہ اطمینان تو ہوتا کہ اگر ان کی جدائی میں کچھ ہاتھ اس کا تھا تو انہیں ملانے کے لیے بھی اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

"انکل! میں تیمور منہاج کی بہن ہوں' ثمو۔ اور آپ سے بہت ضروری بات کرنے آئی ہوں۔"

احسان فاروقی ایک لمحے کے لیے ساکت کھڑے رہ گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے یہاں سے بھیج دیں یا اپنے محسن کی بہن سمجھتے ہوئے اس کا استقبال کریں؟

"آؤ بیٹھو! تیمور کیسا ہے؟" انہوں نے اپنے مخصوص شفیق لہجے میں کہا۔

ثمو ان کی مشکور ہوتی صوفے پر بیٹھ گئی۔

"وہ ٹھیک نہیں ہیں۔" ثمو نے دھیرے سے کہا تو کمرے میں موجود تینوں نفوس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ لیکن جس تیزی سے انابیہ کے چہرے کا رنگ بدلا تھا وہ ثمو کی گہری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟ خیر تو ہے؟" احسان صاحب نے پریشانی سے پوچھا تو ثمو دل ہی دل میں ان کی اچھائی کی قائل ہو گئی۔

"سچ سن کے شاید آپ کو اچھا نہ لگے انکل' اور جھوٹ میں کہنا نہیں چاہتی۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا مطلب؟" انہوں نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔

"مطلب یہ کہ انہیں جب سے انابیہ کی منگنی کا پتا چلا ہے' وہ بے حد اپ سیٹ ہو گئے ہیں۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے انابیہ کی جانب دیکھا تو وہ نچلا لب دانتوں تلے دبائے بے اختیار نظریں جھکا گئی۔

"آپ یہ مت سمجھیے گا کہ مجھے یہاں تیمور بھائی نے بھیجا ہے۔ انہیں تو میرے یہاں آنے کے بارے میں پتا بھی نہیں۔ میں تو خود یہاں آئی ہوں' انابیہ سے صرف ایک سوال پوچھنے اور اسے ایک سچائی بتانے۔" اس نے اپنے سابقہ لہجے میں کہا تو انابیہ کی آنکھیں الجھتے ہوئے بے ساختہ ثمو کی جانب اٹھ گئیں۔

"کیسی سچائی؟" مومنہ نے الجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے بھائی کی محبت کی سچائی۔ ان کی بے گناہی کی سچائی اور یہ سچائی کہ چار سال پہلے آپ کے گھر میں جو کچھ بھی ہوا تھا' میری ماں کا رچایا ہوا ایک کھیل تھا' جس میں بعد میں' میں بھی شامل ہو گئی تھی اور جس کی آج تک تیمور بھائی کو خبر نہیں۔" بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بے اختیار بھرّا گیا تھا۔ جبکہ وہ تینوں مارے حیرت کے گنگ بیٹھے اس کا چہرہ تکتے رہ گئے تھے۔

"میں نہیں جانتی کہ اس حقیقت کے کھلنے کے بعد میرا بھائی پھر کبھی رشتوں پہ اعتبار کر پائے گا یا نہیں۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اگر آج میں نے حقیقت نہ بیان کی تو شاید میں اپنے بھائی کی بے رنگ زندگی کے لیے خود کو کبھی نہ معاف کر سکوں۔" وہ بہتے اشکوں کے درمیان بولی۔

انابیہ نے مضبوطی سے صوفے کے بازو کو تھام لیا۔

"میں نے جب ممی کے کہنے پر ان کا ساتھ دیا تھا' تب مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ہمارا یہ جھوٹ آپ لوگوں کی زندگیوں میں کتنا بڑا طوفان لے آئے گا لیکن جب مجھے آپ کی والدہ کے انتقال کے بارے میں پتا چلا' اس دن مجھے احساس ہوا کہ ہم کیا کر بیٹھے تھے۔ ہماری غلط بیانی سے ایک شریف النفس ماں کی جان چلی گئی تھی۔ کئی ہنستے بستے دل اجڑ گئے تھے۔ میرا اپنا بھائی اپنی بے اعتباری کو دل سے لگائے بالکل گم صم سا ہو گیا تھا۔ میرے لیے اتنے بوجھ کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ان کی اجاڑ زندگی اور انابیہ سے ان کی محبت دیکھ کے میرا ضمیر مجھے ہر لمحہ ملامت کرتا تھا۔ چار سال گزر گئے تھے مجھے اس خلش کے ساتھ زندہ رہتے ہوئے۔ جب کچھ دن پہلے اچانک ہمارا لاہور آنا ہوا تھا اور یہاں اسپتال میں انابیہ کو داخل دیکھ کے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔"

انابیہ کو اس حال میں دیکھ کے میں خود کو اس کے پاس آنے سے روک نہ سکی تھی۔ وہاں روم میں میری ملاقات انابیہ کی بڑی بہن سے ہوئی تھی۔" اس نے ایک نظر مومنہ کی طرف دیکھا۔

"وہ سمجھی تھیں کہ میں وہاں تیمور بھائی کے کہنے پر آئی تھی۔ میرے پوچھنے پر انہیں بھی شاید میری لاعلمی کا اندازہ ہو گیا تھا' اس لیے وہ مزید کچھ کہے سنے بغیر کرے

سے نکل گئی تھیں۔ ان کے انداز پہ میری الجھن بڑھ گئی تھی۔ میں نے گھر پہنچ کر تیمور بھائی کو فون کر کے اس بارے میں سوال کیا تھا اور تب انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ انابیہ اپنی کولیگز کے ساتھ ٹرپ پہ اسلام آباد آئی تھی۔ یہاں ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ جس کی خفیہ انکوائری انہیں سونپی گئی تھی۔" وہ لمحے بھر کو خاموش ہوئی تو مومنہ نے دھیرے سے پوچھا۔

"تیمور نے تمہیں بتایا نہیں کہ کیا حادثہ پیش آیا تھا؟"

"نہیں! انہوں نے مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔" وہ ٹشو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولی تو انابیہ نے بے اختیار اپنی آنکھیں سختی سے میچ لیں۔

"اپنی جان سے بھی بڑھ کے حفاظت کی ہے میں نے تمہارے اعتبار کی۔"

"میں ہر بات بھلا کر نئے سرے سے ٹوٹا تعلق جوڑنا چاہتا ہوں۔"

"صاحب نے آپ کو اس وقت دفتر لے جانے سے منع کیا ہے۔"

"اور وہ رشتہ کیا ہوا جس کی بنیاد ہم نے عزت اور اعتبار پر رکھی تھی؟" کتنی آوازیں ماضی اور حال سے نکل کر اس کے اردگرد بکھر گئیں تو انابیہ نے زور زور سے روتے ہوئے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اگر اسے بدگمان کیا گیا تھا تو تیمور کو بھی اس سے بدگمان کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ اسے یوں بے حال ہوتا دیکھ کے مومنہ اور احسان صاحب نے سرعت سے اٹھ کر اسے تھام لیا تھا۔

"بابا! بابا مجھے تیمور کے پاس لے چلیں۔ مجھے اس سے معافی مانگنی ہے۔" احسان فاروق کا ہاتھ تھامے وہ دیوانہ وار روتے ہوئے بولی۔

"لے چلوں گا بیٹا! لے چلوں گا۔ تم حوصلہ تو رکھو۔" احسان صاحب نے اس کے سر کو جھک کر چومتے ہوئے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ کیا کچھ نہ کہا تھا انہوں نے اس لڑکے کو۔ مگر وہ پھر بھی ان کی عزت کا محافظ بن گیا تھا۔ ہر بات بھلا کر اس نے صرف اور صرف اپنے فرض پہ توجہ دی تھی۔ وہ تو حقیقتاً اس کا بدلہ نہیں دے سکتے تھے۔

اور یہ لڑکی جس نے اپنے ماں، بیٹی اور بھائی، بہن کے رشتے کو داؤ پہ لگا کے انہیں ساری سچائی سے آگاہ کیا تھا اس کا بھی تو کوئی کم احسان نہ تھا ان پر۔

ان کی نم آنکھیں ثمو کی طرف اٹھیں تو وہ دھیرے دھیرے چلتے اس کے مقابل آکھڑے ہوئے۔

"انکل! مجھے معاف کردیں۔ میں واقعی اپنی غلطی پہ بہت شرمندہ ہوں۔" وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولی تو احسان صاحب کا ہاتھ مشفق انداز میں اس کے سر پہ آٹھہرا۔

"نہیں بیٹا! اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تم نا سمجھ تھیں۔ تم نے جو کیا ماں کی محبت میں کیا۔ خدا تمہاری غلطی معاف کرے اور تمہیں تمہاری اس سچائی کا اجر دے۔" انہوں نے نرم لہجے میں کہا تو ثمو کے آنسوؤں میں شدت در آئی۔

"بہت شکریہ انکل! بہت شکریہ! میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گی۔ آپ سے اب بس میری آخری التجا ہے 'پلیز! اسے رد نہ کیجیے گا۔" وہ روتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان بولی۔

"آپ پلیز... پلیز انابیہ کی موجودہ منگنی ختم کر کے اسے میرے بھائی کی زندگی میں شامل کردیں۔ پلیز انکل! آئی ریکویسٹ یو۔" ملتجی لہجے میں کہتے ہوئے اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ احسان فاروق کے آگے جوڑ دیے تو وہ اک گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"تمہیں شاید یہ سن کر عجیب لگے، لیکن قدرت یہ کام پہلے ہی کر چکی ہے۔ انابیہ کا رشتہ ابھی چند دن پہلے ہی ختم ہوگیا ہے۔" وہ دھیرے سے بولے تو روتی ہوئی ثمو حیرت سے ان کا چہرہ تکنے لگی۔

"کیا؟ آپ... آپ سچ کہہ رہے ہیں انکل؟" اس کے لیے تو اپنے کانوں پر یقین کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے انابیہ کو اپنے سینے سے لگایا تھا۔

"ل... لیکن تمہاری والدہ" مومنہ نے پریشانی سے کہا؟

"ان کی آپ فکر مت کریں۔ یہ مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔" وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اچھا انکل میں اب چلتی ہوں۔ آپ بس اب میرے بھائی کا انتظار کیجیے گا۔ خدا آپ لوگوں کو ہمیشہ خوش رکھے... اللہ حافظ!"

وہ جس طرح اچانک آئی تھی اسی طرح اچانک اٹھ کر واپس چلی گئی تھی۔



وہ سب ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے ناشتے میں مصروف تھے جب ثمو کو اندر داخل ہوتا دیکھ کے وہ سب چونک گئے تھے۔

وہ ماں سے مل کر باپ کو پیار کرنے کے بعد تیمور کی جانب آئی تو اس نے اٹھ کر اسے خود سے لگالیا۔

"آپ کیسے ہیں بھائی؟" نجانے کیوں اس کے سینے سے لگتے ہی ثمو کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔

"میں ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ؟"

ثمو نے ایک گہری نظر بھائی کے چہرے پر ڈالتے ہوئے سامنے بیٹھے ماں باپ کی جانب دیکھا اور پھر جیسے کسی نتیجے پہ پہنچتے ہوئے تیمور کے برابر کرسی سنبھال لی۔

"اکیلے رات میں سفر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آج صبح نکلتیں۔" شیریں نے خفگی سے کہا تو ثمو سپاٹ نظروں سے ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟" اسے ایک ٹک اپنی جانب تکتا پاکے شیریں نے الجھ کر پوچھا تو منہاج صاحب کے ساتھ ساتھ تیمور کی نظریں بھی ثمو کی جانب اٹھ گئیں۔

"آپ اتنی مطمئن کیسے ہوسکتی ہیں؟" ان کی طرف دیکھتی وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو ٹیبل پہ بیٹھے تینوں افراد اس عجیب و غریب بات پہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"کیا مطلب؟" شیریں نے حیرت سے بیٹی کی جانب دیکھا۔

"مطلب یہ کہ آپ نے جو کچھ بھی تیمور بھائی، انابیہ اور اس کی فیملی کے ساتھ کیا اس کے بعد آپ اتنی مطمئن کیسے ہوسکتی ہیں؟" وہ بنا کسی جھجک کے دوٹوک لہجے میں بولی تو شیریں بیگم کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جبکہ تیمور حیرت زدہ سا دونوں کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔

"کیا... کیا بک رہی ہو؟" شیریں نے گھبرا کر ایک نظر بیٹے کو دیکھتے ہوئے کھا جانے والی نظروں سے ثمو کو گھورا تھا۔

"آپ مجرم ہیں تیمور بھائی کی۔ گناہ گار ہیں انابیہ اور اس کے گھر والوں کی۔" ٹیبل پہ ہاتھ مارتی ثمو ایک جھٹکے سے کرسی دھکیلتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی بات پہ جہاں تیمور کی پھٹی پھٹی سی بے یقین آنکھیں ماں کی جانب اٹھی تھیں، وہیں منہاج مرتضیٰ بھی گھبرا کے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

ثمو کے تیور انہیں سمجھا گئے تھے کہ آج وہ رکنے والی نہ تھی۔ اور شاید یہ اندازہ شیریں بیگم کو بھی ہوگیا۔ تب ہی تو وہ اٹھ کر دندناتی ہوئی اس کے سر پہ جا پہنچی تھیں۔

"کیا بتاؤ گی ہاں! کیا بتاؤ گی؟" انہوں نے ایک جھٹکے سے اس کا رخ اپنی جانب کیا تھا۔

"یہ کہ آپ نے نہ صرف تیمور بھائی سے جھوٹ بولا تھا بلکہ ان شریف لوگوں پر بھی۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنا جملہ مکمل کرپاتی شیریں بیگم کا ہاتھ پوری طاقت سے ثمو کے گال پر پڑا تھا۔

"بکواس کرتی ہو۔ جھوٹ بولتی ہو۔" وہ دیوانہ وار اس پہ جھپٹی تھیں۔

اس کے ارادوں کو بھانپ کر وہ غصے سے پاگل ہو اٹھی تھیں۔ جب منزل دو گام پہ رہ گئی تھی تو یہ بے وقوف لڑکی انہیں شکست سے دوچار کرنے چلی تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس کا سر توڑ کے رکھ دیں۔

"تہمت یہ نہیں، وہ تھی جو آپ نے انابیہ اور اس کی ماں پہ لگائی تھی۔ جب آپ نے ان کی تذلیل کی تھی، انہیں آوارہ اور بدچلن کہا تھا۔" روتی ہوئی ثمو

بھائی سے الگ ہو کے چلائی تو تیمور کی دھواں دھواں آنکھیں ماں کے چہرے پہ جم سی گئیں۔
اور پھر تمو ہر وہ جھوٹ' ہر وہ دھوکا اسے بتاتی چلی گئی تھی' جو ان سب نے اسے دیا تھا۔ اور جسے سن کر تیمور نڈھال سا کرسی پہ گر سا گیا تھا۔ اس دوران شیریں کی بھی ساری مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔
"مجھے معاف کردیں بھائی! مجھے معاف کردیں۔ مجھے نہیں پتا تھا ہمارے یہ جھوٹ' یہ الزام انابیہ کی امی جان لے لیں گے۔ ان کا غصہ بجا تھا۔ انابیہ کی ماں کو ہارٹ اٹیک ممی کی باتوں سے ہوا تھا۔ اس نے آپ سے راہیں جدا کرنے کا فیصلہ اپنی ماں کی موت کے بعد کیا تھا۔ اور وہ اس فیصلے میں حق بجانب تھی۔ بلکہ وہ کیا اس کی جگہ اگر کوئی بھی لڑکی ہوتی تو شاید محبت کی خاطر اپنی تذلیل کو بھلا دیتی مگر ایسے کسی بھی شخص کا ہاتھ تھامنے سے یقیناً" صاف انکار کردیتی جس کی ذات اور جس کا خاندان اس کی ماں کی موت کا سبب ہوتا۔" اس کے سامنے دوزانو بیٹھے وہ اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے زاروقطار روتے ہوئے بولی تو تیمور نے اپنی آنکھیں سختی سے بند کرلیں۔
"کاش! کہ یہ سب جھوٹ ہوتا' غلط ہوتا' فریب ہوتا۔"
دونوں ہاتھوں میں سر تھامے اس نے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے تھے۔ ماں' باپ' بہن وہ بھلا اب کس کو اپنا کہہ سکتا تھا؟ کس پہ دوبارہ اعتبار کرسکتا تھا اس کے حصے میں تو ہر طرف سے خسارہ ہی خسارہ آیا تھا۔
"میں آپ کی گناہ گار ضرور ہوں۔ بھائی! مگر میں آپ کو دکھ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ میں یہاں آنے سے پہلے انابیہ اور اس کی فیملی کو ساری سچائی بتا کر آئی ہوں۔ آپ کی بے گناہی کی گواہی دے کر آئی ہوں۔"
"کوئی فائدہ نہیں۔ سب ختم ہوگیا سب۔" سر اٹھاتے ہوئے اس نے تمو کا ہاتھ جھٹکا۔
"کچھ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کوئی بھی آپ لوگوں کے درمیان جدائی کی لکیر نہیں کھینچ سکا نہ ممی' نہ وقت اور نہ خود انابیہ۔ میں نہیں جانتی کیسے ہوا۔ لیکن انابیہ کی منگنی ٹوٹ چکی ہے۔ اس کا رشتہ ختم ہوچکا ہے بھائی!" اس کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے تمو نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو تیمور کے بہتے اشک بے یقینی سے تھم سے گئے۔
اس کے چہرے پہ نگاہیں جمائے تمو نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا تو ساکت بیٹھا تیمور کتنی ہی دیر خالی نظریں جمائے خاموش بیٹھا رہا۔
اس کی حالت پہ منہاج صاحب کا دل کٹنے لگا تھا۔ بے اختیار اس کے قریب چلے آئے تھے۔
"ہمیں معاف کردو بیٹا! ہم نے تمہیں واقعی بہت دکھ بہت تکلیف پہنچائی ہے۔" اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے وہ دل گرفتی سے بولے تو تیمور ان کی طرف دیکھے بنا آہستگی سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں تو خود خالی ہاتھ ہوں۔ میں بھلا آپ کو کیا معاف کروں گا؟" غیر مرئی نقطے پہ نگاہیں جمائے وہ آہستگی سے اپنے شانے سے ان کا ہاتھ ہٹا کر دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کا بکھرا ہوا لہجہ' ویران آنکھیں اور تھکے ہوئے قدم شیریں منہاج کے دل پہ ثبت ہوگئے تھے۔
"یہ کیا کردیا میں نے۔ کیا کردیا؟" اپنے بیٹے کے وجود پہ چھائی شکستگی دیکھ کے انہیں چار سالوں میں پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔



"مجھے معاف کردو بیٹا! میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی ذات کے زعم میں کیا۔ اپنا مقصد پانے کے لیے میں نے کسی بات کی پروا نہیں کی' حتیٰ کہ اپنے بیٹے کے دل کی بھی۔ اپنی ذات' اپنی دولت اور اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا مجھے کہ اس ایک احساس نے میرے باقی تمام احساسات کو ختم کرڈالا تھا لیکن میرے بیٹے کی دو دن کی بھوک پیاس اور خاموشی نے مجھے تمہاری ماں کی اذیت اور اس کی موت کی وجہ سمجھادی۔ مجھے اس حقیقت کا احساس دلادیا کہ میں کتنی بری ماں ہوں۔ کتنی بری۔

انابیہ کے ہاتھ کو آخری سہارے کی مانند دونوں ہاتھوں سے تھامے شیریں منہاج پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئیں۔
انابیہ اپنا لب دانتوں تلے دبا گئی۔ اسے اپنے رب کے انصاف پہ یقین آگیا تھا۔
"مجھے اعتراف ہے کہ میں نے تیمور سے منسوب کرکے جو کچھ بھی بولا سب جھوٹ تھا۔ وہ تم سے کل بھی محبت کرتا تھا اور آج بھی تمہیں اتنا ہی چاہتا ہے۔ تم اس کی اس بے لوث محبت کی خاطر مجھے معاف کردو اور میرے بیٹے کی زندگی میں واپس آکر میرے اس ملال کو کم کردو۔ پلیز بیٹا! میرے تیمور کو سمیٹ لو۔ نہیں تو وہ ہمیشہ کے لیے بکھر جائے گا۔"
بہتے اشکوں کے ساتھ وہ التجائیہ انداز میں بولیں تو انابیہ کی بھیگی آنکھیں احسان فاروق کی جانب اٹھ گئیں۔ جنہوں نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کے اس کی مشکل آسان کردی تھی۔
"میں نے آپ کو معاف کیا آنٹی! اور میری دعا ہے کہ میرا اللہ بھی آپ کی غلطیوں کو معاف فرمائے۔" شیریں نے چند لمحے اسے بے یقینی سے تکنے کے بعد خود سے لگالیا۔



تیمور کا شکستہ وجود ہولے ہولے راکنگ چیئر پہ جھول رہا تھا۔ شکن زدہ ملگجا لباس' بڑھی ہوئی شیو اور سرخ متورم آنکھیں اس کی ذہنی پراگندگی کا ثبوت تھے۔ ان دو دنوں میں نہ تو اسے بھوک کا احساس تھا اور نہ ہی نیند کا۔ اگر کسی بات کا ہوش تھا تو اپنے ماں باپ کے دیے دھوکے کا' اپنے رشتوں کے بکھرنے اور اپنے دل کا۔ جہاں بہت درد تھا۔ بہت زیادہ درد۔
گھر والے اس کی منتیں کرتے اور دروازہ پیٹتے پیٹتے تھک چکے تھے۔ لیکن وہ بے حس بنا بیٹھا رہا تھا۔ اور آج چونکہ صبح سے اب تک کسی نے بھی اس کا دروازہ نہ کھٹکھٹایا تھا' اس لیے اس اس دھیمی سی دستک نے بھی سوچوں کے تانے بانے کو بکھیر کے تیمور کو

دروازے کی جانب دیکھنے پہ مجبور کردیا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی سابقہ بے نیازی سے نگاہیں پھیر لیتا۔ وہلیز کے نیچے سے ایک گلابی لفافہ کمرے کے اندر سرک آیا تھا۔

دھیرے سے سیدھے ہوتے ہوئے تیمور نے اب کے گہری نظروں سے آف وائٹ کارپٹ پہ پڑے اس ہلکے گلابی لفافے کو دیکھا تھا۔ اور پھر جیسے بے اختیاری کے عالم میں اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا تھا۔

اگلے ہی لمحے اس نے جھک کر اپنے پیروں کے قریب پڑا وہ لفافہ اٹھالیا تھا۔

بے چینی سے لفافہ کھولتے ہوئے اس نے اندر موجود پرچا نکال کر دھیرے سے کھولا تھا اور اس کی آنکھیں اپنے سامنے بکھری موتیوں کی سی تحریر پہ حیرت سے جم کے رہ گئی تھیں۔

"سورج پر دستک دینا... آسان نہیں
اپنا ہاتھ جلالینا... آسان نہیں
چل کر اپنے پاؤں سے
کھیلنا گرم شعاعوں سے... آسان نہیں
جیون کے ایک ایسے دوراہے پر گم صم سی کھڑی ہوں میں
ادھر مڑوں یا ادھر کو جاؤں اس الجھن میں پڑی ہوں میں
نئی ڈگر کو مڑ جانا... آسان نہیں
ٹوٹ کے پھر سے جڑ جانا... آسان نہیں۔"

واقعی ٹوٹ کے پھر سے 'جڑ جانا آسان نہیں' لیکن مجھے یہ ہمت 'یہ حوصلہ آپ کی بے مثال محبت اور وفا نے دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی گزری ہربات بھلا کے مجھے میری بدگمانی پہ معاف کردیں گے... کردیں گے نا...؟"

تیمور کو لگا جیسے کسی نے اس کے درد سے تڑپتے ہوئے نڈھال دل کی ساری جلن' ساری تکلیف اپنی نرم پوروں پہ سمیٹ لی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا تھا اور اپنے سامنے انابیہ احسان کو دیکھ کے مبہوت سا رہ گیا۔

"تم؟ یہاں؟" اس کی بے یقینی اسے فقط اتنا ہی کہنے دے پائی تھی۔

"جی! اور پوری عزت اور مان کے ساتھ لائی گئی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولتی ایک قدم بڑھا کے اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ تیمور منہاج کی پیاسی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم سی گئیں' جبکہ اسے وارفتگی سے تکتی انابیہ کی اپنی آنکھوں میں یک لخت ڈھیروں آنسو اتر آئے تھے۔

"یہ اگر خواب ہے انابیہ! تو میری دعا ہے کہ میں ساری عمر اسی خواب میں گزار دوں۔" اس قاتل کے قاتل خدوخال کو تکتے ہوئے وہ نمناک لہجے میں بولا تو انابیہ نے آگے بڑھ کے اس کا مضبوط ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"نہیں تیمور! اب یہ خواب نہیں ہے۔" برستی آنکھوں کے ساتھ انابیہ کے لب دھیرے سے مسکرائے تو تیمور نے بھی نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ اٹھا کر اپنے لبوں سے لگا لیے۔

"اب چلیں' نیچے سب آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" اپنے ہاتھوں میں دبے اس کے ہاتھ کو انابیہ نے دھیرے سے کھینچا تو تیمور کے پورے وجود میں ایک تناؤ سا آگیا۔ جسے محسوس کرتے ہوئے انابیہ نرمی سے بولی۔

"کس نے کیا کہا تھا اور کیا نہیں' ہمیں کچھ نہیں سننا۔ ہمیں ہربات بھلا کر نئے سرے سے بس ٹوٹا تعلق جوڑنا ہے۔"

اور تیمور انابیہ کے منہ سے اپنا جملہ سن کے بے اختیار مسکرا دیا تھا۔ جس نے "میں" کی جگہ "ہم" کا لفظ استعمال کرکے اس کی چار سالہ ہر اذیت مٹا دی تھی۔

اگلے ہی لمحے وہ انابیہ کا ہاتھ تھامے آگے بڑھا' جہاں ان کے سارے اپنے ان کے منتظر تھے۔





سائرہ رضا

آنے والی سحر تک ہم

اس نے کب گزاری تھی زندگی سیر و سیاحت میں گھومنے پھرنے کی عیاشی۔ وہ کب گزری ایسے کسی تجربے سے مگر۔۔۔

اپنی اب تک کی زندگی میں اس نے کل تین اسٹیشن دیکھ رکھے تھے۔ لاہور اسٹیشن اسے یاد آیا۔ سب گاڑی سے اترا اپنے اپنے سامان کی فکر میں تھے اور وہ گردن اٹھائے گول گھومتے ہوئے چھت کی اونچائی کھوج رہی تھی۔ اتنے بہت سے لوگ گونجتی آوازیں اور ایک عجیب سی پراسراریت۔۔۔ ملگجا نیم تاریک ماحول، مدقوق بلبوں کی شرمسار روشنی اندھیروں پر حاوی ہونے سے قاصر۔۔۔

اور کراچی اسٹیشن، شور، لوگوں کا ہجوم وہ پیڈسٹرین برج پر کھڑی اپنی نگاہوں کی حد کو جانچ رہی تھی۔ سورج گرمی، ہوا، آلودگی، بدبو اور سرخ چوغے میں قلی۔۔۔ چہروں کے تاثرات آنسوؤں کی وجہ بتاتے تھے خوشی کے۔۔۔ اور نہوں غم کے۔

ایک بار وہ ابو کے ساتھ ان کے کسی عزیز سے ملنے گئی تھی۔ وہ باپ بیٹی اس ویران غیر آباد اسٹیشن پر اترنے والے واحد تھے۔ تاحد نگاہ کھیت۔ خاموشی، ایک قلی، ایک اسٹیشن ماسٹر اور ایک تانگے والا اور اس کے قریب اپنے چھابے سے مکھیاں اڑاتا امرود بیچنے والا۔

وہ حیران تھی۔ اس کی حیرت پر ابو مسکرائے تھے۔ اس کا گا! ، تھیتھپایا تھا۔

مکمل ناول



"زندگی کے سفر میں گاڑی ہر اسٹیشن سے گزرتی ہے۔ پرہجوم شور ہنگامے سے بھرپور ویران خاموش تنہا پھر آپ کی جو منزل ہے وہاں اتر جائیے۔ اگر آپ کی منزل ایک ویرانہ ہے تب بھی آپ کو وہیں اترنا ہے ـــ اپنا راستہ اور منزل ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے۔"

اور ابو کاش آپ دیکھ رہے ہوں کہ میں منزل کا تعین کرکے نکلی اور اس ہولناک سناٹے سے گھبرا کر واپس نہیں پلٹی۔۔۔۔

رجا کے ماموں کے ڈرائیور کا خالہ زاد بھائی اپنی پک اَپ میں اسے اسی موڑ پر اتار گیا تھا۔

"وبس یہی ہے آپ کی منزل ـــ" وہ حیران رہ گئی۔ کیسی منزل کہاں کی منزل کہاں ہے منزل ـــ؟

گہری کھائیوں ـــ کے اوپر پہاڑ کاٹ کے بنائی گئی سڑک جس پر سفر کرتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اور سارا راستہ آنکھیں سختی سے میچے وہ کبوتر برادری کا حصہ لگ رہی تھی۔ اس نے حیرت سے راستے کو اور اسے دیکھا۔

بل کھاتی سڑک پر وہ کھڑی تھی۔ دائیں جانب آسمان کو چھوتے پہاڑ اور بائیں جانب گہری کھائیاں اور آڑی ترچھی ندی جو اتنی بلندی سے دیکھنے پر ایک لکیر کی صورت دکھائی پڑتی تھی۔

"ارے!" وہ چیخی "تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میرا سارا بچپن انہی گلیوں میں کھیلتا گزرا ہے۔ تم نے تو کہا تھا تم آخر تک چھوڑ کر آؤ گے اور اب ـــ"

"تو چھوڑ تو دیا آخر تک ـــ بی بی! آگے گاڑی نہیں جاتی۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ آپ اپنا یہ چھوٹا بیگ پکڑ لیں ـــ بڑا بکسا میں واپسی پر چھوڑ جاؤں گا اور۔"

"تو تم مجھے بھی واپسی میں اتار دینا۔ میں نہیں جاؤں گی اکیلے ـــ" وہ ضدی لہجے میں بولی۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ اتنے آسان راستے میں، آنکھیں بند کرکے بیٹھی تھیں۔ آگے تو اصل مشکل شروع ہو گی اس لیے آپ کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا ـــ"

وہ متزلزل تھی۔

"میں آپ کو موڑ تک چھوڑ دیتا ہوں۔" اس نے فوری فیصلہ کیا پھر پک اپ کے پیچھے بیٹھی سواریوں کو مقامی زبان میں سمجھا کر وہ اس تک آیا۔

"اس راستے کے آخر میں آپ کو اسپتال کی عمارت نظر آجائے گی۔"

"تو ابو! آپ کی بیٹی آج ایک ایسے ویرانے میں اتری ہے جہاں خوش آمدیدی مسکراہٹ سے دیکھنے کو کوئی نہیں ـــ کسی کی متوقع نگاہیں اسے کھوج نہیں رہیں۔"

اس نے اس راستے کو دیکھا جہاں ڈرائیور غائب ہوا تھا۔ سامنے سیدھا راستہ اور اوپر دور عورتیں جو ایک جگہ جمع ہو کر اب اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

سیدھے راستے کے اختتام پر منزل ـــ کیا منزل مقصود ـــ

وہ بتدریج چڑھائی چڑھ رہی تھی۔ مگر اس ڈھلوانی راستے سے وہ دوسری جانب کا قیاس نہیں لگا پا رہی تھی۔ اسے آگے ہی بڑھنا تھا۔

سردی جما دینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبیے اور گالوں کا کپا بنا کر گرم ہوا خارج کی فوں ـــ فـــ ووو ـــ

اس نے شعوری کوشش سے خیالات کی یلغار کو روکا تو اردگرد کی خوب صورتی اور فسوں نروٹھے پن سے سامنے آگیا۔ "تم نے اب تک ایک لفظ بھی کہا ہماری مدح میں ـــ جبکہ ہماری خوب صورتی اور سحر۔"

اس کے لبوں پر مسکراہٹ آنکھوں میں چمک اور خوشی ابھر آئی۔

کتنی خواہش تھی اسے شمالی علاقوں کی خوب صورتی کو دیکھنے کی۔ چھونے کی۔ آنکھوں کے راستے دل میں سمونے کی ـــ

اگر وہ ہندومت سے تعلق رکھتی تو پچھلے جنم کا نتیجہ مانتی کہ وہ پہاڑوں، آبشاروں، ندیوں، گھاٹیوں کے کسی علاقے سے تعلق رکھتی ہو گی اس کے تصور میں ہریالی رہتی تھی اور برف کے گالے روح کو ٹھنڈک دیتے تھے۔

مگر وہ الحمد اللہ مسلمان تھی اور اس کے پاس یہی ایک زندگی تھی۔

تصور کو جلا بخشنے کو اس کے پاس کیا تھا۔ چند وڈیوز جو شمالی علاقہ جات کے حسن کے حوالے سے ٹورازم والے سالوں پہلے بنا کر فرض نبٹا چکے۔ ہر سال خریدے جانے والے قدرتی مناظر کے کیلنڈر یا پھر سفر نامے بس ـــ

مگر یہ علاقے اسے فیسی نیٹ کرتے تھے اپنی طرف بلاتے تھے۔

"سمندر اچھا ہے ابو ـــ مگر شور کرتا ہے مجھے ندیاں دیکھنی ہیں نہریں ـــ اور ریت کا گھروندہ اچھا نہیں لگتا ـــ یا تو پیر گندے ہو جاتے ہیں ـــ اور پھر یہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مجھے سنو مین بنانا ہے ابو ـــ اس کے گلے میں ریڈ مفلر ـــ اور سر پر ٹوپا ـــ واہ۔"

"چلو پھر تم تھوڑی سی اور بڑی ہو جاؤ تو میں تمہیں لے چلوں گا۔"

(میں اتنی بڑی ہو گئی ابو ـــ کہ خود ہی آگئی اکیلے ـــ اکیلے ـــ) اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ گرم گرم سیال گالوں سے گزر ٹھوڑی کے پاس سیاہ مفلر میں جذب ہو رہا تھا۔ خود کلامی نے اس کے دل کو نیزہ مارا تھا شاید ـــ

اور خود اپنے آپ کو اپنا رونا اس قدر تکلیف دے رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

چھوٹی چڑیوں کا ایک غول اس کی حالت سے بے نیاز اس کے سر سے گزرا تو وہ چونکی۔

چوں ـــ چوں ـــ چوں ـــ چیں۔

آسمان نیلا تھا چمکیلا ـــ بلور جیسا ـــ مگر گھنے درخت اس کے اجالے کی راہ میں حائل تھے کہ وہ اپنی روشنی زمین تک پہنچا سکتا۔ اس کے اردگرد بادلوں جیسی تاریکی تھی۔ کہیں کوئی ڈھیٹ کرن پتوں پر ناچ رہی تھی۔ سبزے کی باس اور جنگلی پھولوں کی مہک مشام جان کو معطر کرتی تھی۔ یہاں سبزے کا رنگ اور ہی تھا اور عجیب پھول جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بلکہ رنگ۔ پھولوں کے رنگ بھی نئے تھے۔ سرخ تھا مگر اس قدر جوشیلا، پیلا اتنا امید بھرا سکون آمیز گلابی خوشی دیتا اور سفید نور جیسا پاکیزہ ـــ

مگر یہ دل خوش کیوں نہیں ہے؟؟؟ اب اسے اور کیا چاہیے اس نے ڈپٹا کہیں یہ خوشی کے آنسو تو نہیں ـــ اس کی خود کلامی دراصل خود اذیتی کی شکل تھی۔

"ٹونٹی کہاں ہے کہ فوراً" بند کی جاسکے۔ اتنا ضیاع۔"

وہ ایک بے حد بے تکلفی بھری مطمئن آواز ـــ وہ گھبرائی اور خوف زدہ ہو کر بیٹھے بیٹھے ہی جیسے لڑھک گئی۔

چیخنے کے لیے منہ کھولا تھا۔ مگر پھر سامنے موجود بندے پر یقین آگیا وہ انسان ہی تھا۔

چہرے کی جانب دیکھ کر چیخ نکلی تھی۔ سو اس بار اس نے پیروں سے بتدریج نگاہ اوپر بڑھائی۔ بہت مضبوط جاگرز جینز اور موٹا شاید ریچھ کی کھال سے بنا سوئیٹر ہاتھوں میں دستانے تھے اور بائیں ہاتھ میں ایک ناتراشیدہ چھڑی بلکہ چھڑی ہی کیا وہ کوئی لمبی تازہ ٹہنی تھی جس کے پتے نوچ کر اسے بطور لاٹھی استعمال کیا جا رہا تھا اور چہرہ ـــ ہائے اف اللہ۔

اس نے گردن گھما کر اوپر موجود عورتوں، بچوں اور بکریوں کی توثیق چاہی وہ سب ہاتھ ہلا رہے تھے۔ اس کا رہا سہا خوف جاتا رہا (اب اللہ جانے وہ اسے تسلی دینے کو اچھل رہے تھے یا اردگرد کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کر رہے تھے)

سر پر چڑھی گہری کتھئی ٹوپی گردن کو چھپائے شانوں پر رکھی تھی۔ ٹوپے میں منہ کی جگہ پر سوراخ تھے اور دو سوراخ آنکھوں کے لیے، جن میں اس وقت کچھ دلچسپی، کچھ حیرت اور خیر مقدمی پہچان سی تھی۔ وہ الجھ

گئی اپنے چہرے کو پونچھ لیا اور اوپر موجود عورتوں کو دیکھ ہاتھ ہلانے لگی۔ نو وارد اسے تنہا نہ سمجھے۔ وہ سب کو جانتی ہے یہ اس کی جانب سے پہلی بار رسپانس تھا سو اوپر بچے شور کرتے اچھلنے لگے۔ مگر اسے حیرانی کا جھٹکا لگا جب موصوف نے بھی ہاتھ ہلایا۔ "ارے!"

اسے جلد از جلد ہاسپٹل تک جانا ہو گا۔ اس نے ایک بار پھر فاصلے کو کھوجا۔

"ایسے ایڑیاں اٹھا کر ہاسپٹل کبھی نظر نہیں آئے گا آپ کو ابھی بہت چلنا ہو گا۔"

"آپ کو کیسے... پتا چلا کہ... کہ۔"

"یہ سڑک اسپتال تک ہی جاتی ہے۔"

"کیا پتا مجھے کہیں اور... اور جانا ہو۔"

"لو مخواہ مخواہ... پہاڑ پر چڑھ کر بکریاں چرائیں گی تو بی بی بکریاں کہاں ہیں یا اسکائی ڈرائیونگ کرتی یہاں سے بھاگیں گی اور نیچے کھائیوں میں جمپ لگائیں گی اور یہ نانگا پربت، آپ کے ہاتھ میں آپ کا روٹ تو بالکل غلط ہے۔ ارادہ کیا ہے؟"

مقابل کی آواز بارعب، خوب صورت اور لہجہ مہذب تھا۔ وہ عمر کا اندازہ نہیں کر سکی۔ اس نے اپنے بیگ کا منہ پلٹ دیا جس کے ٹرانس پیرنٹ حصے سے نانگا پربت کا چمک دار سرورق نمایاں ہو رہا تھا۔

وہ چل پڑی تھی اور اس کا ٹائروں والا بیگ اونچے نیچے رستے پر ڈھب کھڑب مکروہ آواز سے اچھلتا تھا۔

"یہ ہیتھرو ایئرپورٹ نہیں تھا کہ آپ اتنے اسٹائلش بیگز کے ہمراہ آئیں۔ یہاں لوگ گٹھڑ لے کر آتے ہیں یا تو اسے کمر سے باندھتے ہیں یا پھر... سر پر رکھتے ہیں ایسے۔"

جملہ مکمل کرتے ہی اس کے ہاتھ سے ہینڈل جھپٹ بیگ ان کے سر پر تھا۔

"ارے۔"

"چلیے اب مگر یہ لاٹھی پکڑ لیں... راستے میں کبھی کبھار بندر اچھل کر سامنے آتے ہیں تو انہیں بھگایا جا سکتا ہے۔ بھگا دیں گی ناں...."

"بب... ب... بندر؟"

"بب ب نہیں... صرف بندر۔" جناب کی آنکھوں میں ہنسی کا عکس نمایاں تھا۔

"آپ چھوڑیے... میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

"ہاں تو آپ کو خود ہی چلنا پڑے گا... میں نے کب کہا کہ بیگ کے بعد میں آپ کو بھی سر پر بیٹھا لوں گا۔" آنکھوں کی ہنسی اب لہجے میں بول پڑی۔

وہ بری طرح جھینپ گئی۔ موٹے کپڑوں کی تہہ اپنی جگہ مگر سامنے موجود شخصیت کا تاثر بہتر ہوتا جا رہا تھا۔ دراز قد چوڑے شانے اور یقیناً" تعلیم یافتہ، مہذب عمر... ؟ ہاں عمر... ینگ مین ہی ہو گا۔ پہاڑوں پر لاٹھی لے کر مزے سے چلتا۔ سر پر بیگ۔

اب ڈھلوان پر فاصلہ یقیناً" زیادہ تھا مگر اترنا آسان تھا۔ نیلا آسمان، سفید و سرخ عمارت اور اردگرد پھیلی گھاس، روشنی نے منظر واضح کر دیے تھے۔ اسے بہت دور پہاڑ دکھائی دیے جو آسمان کے سروں سے ہم آغوش تھے۔ وہ مسحور سی رہ گئی۔ پہلی بار سفر کی تمام تکلیفیں، سوچوں کی اذیتیں جیسے فراموش کر دی تھیں۔ وہ ڈھیلے ہاتھوں سے بیگ زمین پر چھوڑ چہار جانب گھوم گئی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی کرنیں نمایاں ہو گئی تھیں۔

"پہلی نظر میں یہ مناظر اسی طرح مسحور کر دیتے ہیں مگر اللہ نے اتنا حسن نوازنے کے بعد بھی ان کے اندر "باندھ لینے" کی صلاحیت نہیں رکھی۔ لوگ اکتا جاتے ہیں بھاگ جاتے ہیں اور خاص طور پر شہروں کے لوگ فیسی نیٹ تو ہوتے ہیں مگر جڑ نہیں پاتے۔"

"شہر یا گاؤں کی بات کب ہے... یہ تو دل کی بات ہے۔ جسم دل کے تابع ہوتا ہے۔ ورنہ قدموں کی کیا بساط... دل ٹھہر جائے تو ویرانہ، بے آب و گیاہ... دھرتی بھی گلستان بن جاتی ہے... سارے دکھ سارے درد دل کے ہیں۔ دل سے ہیں۔ بات دل کے خوش ہونے کی ہے۔"

اس نے یقیناً" جواب نہیں دیا تھا، یہ شاید خود کلامی تھی۔ مگر مقابل کو یکدم اس میں بے پناہ دلچسپی محسوس ہوئی۔

بڑبڑاتی... خود سے ہم کلام اردگرد سے ناآشنا لڑکی

پھر پتھر پر بیٹھ کر بے آواز اور پھر ہچکیوں سے روتی لڑکی۔

خفا، خوف زدہ، بہادر، خود کو کمپوز کرتی... خوب صورت لڑکی...

اور پھر بچوں کی طرح گول گھومتی... پھر اچانک فلسفی بن جانے والی لڑکی...

اتنا زیادہ چلنے سے جسم میں گرمی بھر گئی۔ ٹوپا اتارتے ہاتھ ایک فوری خیال کے تحت رک گئے۔ "نہیں ابھی نہیں... بلاوجہ ہی۔"

"جب دل جی بھر کے خوش ہو لیں تو سامنے آ جائیے گا ویسے اب جب آپ کو یہاں رہنا ہے تو ہر روز ایک نیا اسرار کھلتا جائے گا۔ میں کسی کو بھیجتا ہوں سامان اٹھانے کے لیے۔"

وہ چونک کر اور پھر خجل ہو کر واپس پلٹی تھی۔

"ویسے آپ بہت ہی کم سامان لے کر نہیں آئیں ڈاکٹر اِتباع فاطمہ...."

وہ فوری جواب دینا چاہتی تھی کہ وہ ڈرائیور پر اٹرنگ مگر... ہائیں....

"مم... میرا نام... میرا نام... کیسے؟ ہیلو آپ کون؟" وہ تیزی سے آگے بڑھی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسے اسپتال کی عمارت تو فوراً" ہی پسند آ گئی تھی۔ بلکہ تصور سے زیادہ اچھی لگی تھی۔ آتے وقت اسے ڈرانے والے بہت تھے۔

"بے وقوفی مت کرو... کراچی جیسے بڑے شہر کو چھوڑ تم دور پسماندہ علاقے میں کیا کرنے جا رہی ہو۔

خدمت خلق ' انسانیت ' مدد ' پکار۔۔۔ سارے دعوے اپنی جگہ مگر کیوں ایسا کام کیا جائے ' یہ تو اپنے ہاتھوں مرنے والی بات ہوئی ناں۔ کیے کرائے پر پانی۔۔۔ ہونہہ۔"

"سب فنڈز اکٹھا کرنے کے بہانے ہیں۔ ہوں گے چار کمرے اور آٹھ بیڈ۔۔۔ ماہر ڈاکٹر ایکسرے آنکھوں ہی سے کرتے ہوں گے اور الٹرا ساؤنڈ قیافے سے۔۔۔ اول تو مشین ہوتی نہیں اور ہو تو استعمال نہیں کرتے۔"

"پتا نہیں ڈاکٹر اتباع آپ کیا سوچ کر جا رہی ہیں۔ بجلی کے مسائل ' گیس ' آمدورفت۔۔۔"

"آپ غلط کر رہی ہیں۔ سراسر بے وقوفی۔" اور وہ متزلزل ہو گئی تھی۔ مگر اس کے پروفیسر ڈاکٹر نعیمی نے ڈھارس دی۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر عثمان غنی کو ذاتی طور پر۔ وہ صاف گو ' با اصول اور محنتی مخلص ہیں۔ بہت پرانا خواب تھا ان کا اپنے آبائی علاقے میں رہائش رکھنا تھبی سہولیات فراہم کرنا۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے تو خیر نہیں دیکھا مگر مجھے یقین ہے۔ سب کی رائے اپنی جگہ۔۔۔ لیکن میرے اپنے خیال میں اگر تم چند سال بھی ایسے کسی علاقے میں پریکٹس کر لو گی تو تمہارے لیے بہترین رہے گا۔ معاوضہ یقیناً کم ہو گا لیکن تجربہ بہت اعلا۔۔۔ اور پھر موسم وماحول کی تبدیلی اگر تم انٹرسٹڈ ہو تو چھوڑو سی وی کا جھنجٹ میں ایک کال کر دیتا ہوں۔"

"نہیں سر! وہ جوان کا حرف حرف دل سے سن اور سمجھ رہی تھی۔ جملے کے اختتام پر پژمردہ ہو گئی۔

"معاوضہ۔۔۔ تبدیلی ' تجربہ۔۔۔ ہاں تبدیلی سے حاصل تجربہ۔۔۔ یوں ہی سہی۔ تھرو پراپر چینل ٹھیک رہتا ہے۔" وہ بولی۔

پروفیسر صاحب خوش ہوئے۔

"ویری ویری گڈ بٹ میں کال ضرور کروں گا۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"انہیں اچھی ڈاکٹر چاہیے۔" اس نے اپنی دلی حالت پر لعنت بھیج شگفتگی ظاہر کی۔

"اچھے ڈاکٹر تو بہت ملتے ہیں۔ اچھا انسان ہونا اہم ہے۔"

اب پتا نہیں اسے یہاں کیا خطاب ملتا۔

اندرونی عمارت اور ماحول بالکل ویسا تھا جیسا کسی بڑے شہر کے اسپتال کا ہو سکتا تھا ہاں باہر جھانکتے تو ہریالی نیلا امبر اور آسمان سے ہمکلام پہاڑ دیکھ کر یاد آتا "کہاں ہیں۔"

"آپ کو موسم جھیلنا ہو گا۔"

"میں جھیل لوں گی۔" اس نے پہلی تنبیہہ پر خوش دلی سے کہا۔

"شروع شروع میں لینگویج پرابلم ہو سکتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہاں پشتو ' ہزارہ ' ہند کو اور پہاڑی۔۔۔"

"میں ہزارہ اور ہند کو بلکہ کسی حد تک پشتو بھی سمجھ لیتی ہوں۔" اس نے کہا تھا۔

"ارے۔۔۔ یہ تو بہت اچھا ہے۔ مگر کیسے۔۔۔؟"

"کالج۔۔۔ میں میری کچھ دوست تھیں۔ وہ آپس میں گفتگو کرتی تھیں تو۔۔۔"

"آپ کی ساری ڈگریوں پر حاوی آپ کی یہ لینگویج والی ڈگری رہی۔۔۔ اشتہار دیتے وقت یہ چیز سب کے مد نظر تھی کیونکہ مریض اپنی کیفیت سمجھا نہیں پاتا اور ڈاکٹر الگ مصیبت میں۔ سو اکثر ڈاکٹر اس لیے بھی بھاگ جاتے ہیں۔"

وہ مسکرا دی۔

"جنریٹر ہے سولائٹ پرابلم تو نہیں ہو گی۔"

"ہو بھی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ روشنی اور اندھیرا زندگی کا حصہ ہیں۔" وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔ "اندھیرا کوئی مسئلہ نہیں۔"

"کھانا آپ خود بھی پکا سکتی ہیں۔ ورنہ پانزا بی بی جو پکائیں ' کھانا پڑے گا ہم سب تو عادی ہیں۔ اب آپ۔۔۔"

"میں بھی عادی ہو جاؤں گی۔ پیٹ ہی تو بھرنا ہوتا ہے۔"

وہ تسلیم کی پتلی بنی کھڑی تھی سب کچھ مانتی بلا چوں

چراں حاضر جی ہاں مگر نہیں۔

آخری کمرہ یقیناً "اس کا کمرہ تھا۔ دیوار جتنی بڑی کھڑکی نے اس کی توجہ کھینچ لی وہ بے ساختہ کھڑکی کے پاس جا پہنچی اور پٹ وا کر دیے خوب صورتی نظروں کو خیرہ کر گئی وہ اس سحر میں غرق ہی رہتی جو سردی ' کپکپی طاری نہ کر دیتی دانت بجے تو احساس ہوا۔

"یا اللہ!" اس نے ہاتھ بغلوں میں دیے ' ہوا بال اڑائے دے رہی تھی۔

ڈاکٹر شاہان نے تیزی سے آگے بڑھ کر پٹ بند کر دیے تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

"بند شیشوں کے ساتھ بھی نظارے کیے جا سکتے ہیں کبھی ہوا تو کبھی بارش اور کبھی برف اور دوسری منزل پر تو ہوا کی شدت بھی زیادہ ہوتی ہے۔"

اس نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے پہلی بار کمرے کا جائزہ لیا۔ پہلے تو دیوانہ وار کھڑکی کی جانب لپکی تھی اب ارد گرد دیکھا تو۔۔۔

یہاں دو بیڈ تھے اور چھت سے لگی دیوار گیر الماریاں۔۔۔ کمرہ خاص بڑا تھا اٹیچ باتھ۔۔۔ اور بائیں جانب ماربل سلیب پر چائے بنانے کا سامان اور کچھ ڈبے اور برتن۔۔۔ الیکٹرک کیٹل۔

اس کمرے کا دوسرا مکین۔۔۔ کون تھا؟

"میں بھی اسی کمرے میں رہوں گی آپ کے ساتھ۔۔۔ ہم روم میٹ ہیں۔ سمجھیں۔"

ڈاکٹر شاہان نے اس کی الجھن سلجھائی تھی مگر وہ بے ساختہ کھڑی ہو گئی۔

"پپ۔۔۔ پپ۔۔۔ پلیز۔۔۔ کیا میرے لیے۔۔۔ میرا مطلب ہے۔ مجھے علیحدہ کمرہ نہیں دیا جائے گا؟"

"کیا آپ کو علیحدہ کمرہ چاہیے۔ یہ تو پہلے دن سے طے تھا کہ نئی ڈاکٹر یہاں اس روم میں۔۔۔"

"کس نے کیا تھا طے۔۔۔؟" اس کے منہ سے نکلا

ڈاکٹر شاہان گڑبڑائیں "کسی نے نہیں مگر۔۔۔ اچھا آپ آج یہاں رہیے کل صبح بات کریں گے۔ دراصل کنسٹرکشن تو ہو رہی ہے اسپتال میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ مگر ابھی۔"

"پلیز مجھے علیحدہ روم ہی چاہیے ہو گا۔ مجھے عادت نہیں رہی۔۔۔ میرا مطلب عادت نہیں ہے۔" وہ ہتھیلیاں ملتی بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے کی الجھن۔۔۔ اضطراب۔

"یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے ڈاکٹر اتباع۔۔۔ کل ہی حل کر دیں گے۔ ویسے میرے ساتھ رہنا اتنا پریشان کن ہرگز نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے۔ میں خراٹے نہیں لیتی ہوں۔"

ڈاکٹر شاہان کا لہجہ شریر ہوا۔

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ وہ یکدم خاموش ہو گئی تھی۔

ڈاکٹر شاہان نے نیا کمبل نکال کر اس کے بیڈ پر رکھتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کے مضطرب چہرے کو دیکھا۔

وہ بہت کم عمر ' معصوم چہرے والی راضی برضا معصوم لگی تھی۔ پھر اتنی الجھن اور شدت وہ شانے اچکا کر رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

تین دن تک شدید بخار میں مبتلا رہنے کے بعد آج طبیعت بہتری کی جانب مائل تھی۔ منہ کا ذائقہ خراب تھا اور پانزا کے ہاتھ کے کھانے بہت بد ذائقہ۔ وہ کچن میں موجود ہر شے گھی کے ساتھ گھول کر خوب صورت کراکری میں سجا کر فخریہ پیش کش دیتی تھی۔

"لوگ کیا کہیں گے یہ کہاں کی ڈاکٹر۔ آتے ہی خود بیڈ سنبھال لیا۔" اس نے بہت شرمندگی سے ٹرے اٹھا کر اندر داخل ہوتی ڈاکٹر شاہان کو دیکھا جو شانے سے ٹھوکر مار دروازہ بھیڑتی مسکرا رہی تھیں۔

"لوگوں نے ڈاکٹر انسانوں ہی میں سے چنا تھا نا کہ جن بھوت یا روبوٹ ڈاکٹر۔۔۔"

"آپ یہ کیا اٹھا لائیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔ کچھ بھی کھانے کو۔"

"بالکل دل نہیں چاہتا ہو گا۔۔۔ مگر وہ پانزا بی بی کے

پکوان تھے اور یہ میں اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی ہوں سوپ اور سینڈوچز۔۔۔ ہمراہ کیچ اپ۔۔۔"
اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔
"میں تو ڈاکٹر غنی سے مل ہی نہ سکی۔ وہ بھی کیا سوچتے ہوں گے۔"
"وہ کچھ بھی نہیں سوچ رہے بلکہ وہ تو یہاں تھے ہی نہیں۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے ہی لوٹے ہیں۔ اُدھر بس لڑھک گئی تھی۔ راستے اتنے مشکل تھے کہ بس . . .
اب دیکھو شام میں
یا کل صبح ملاقات ہو گی۔" ہاں میں نے انہیں بتا دیا تھا کہ تم الگ روم چاہتی ہو اب کل۔۔۔"
"میں نے اپنا سامان اس الماری میں سیٹ کر دیا ہے۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔
"لیکن! یہ کیوں؟ اگر تمہیں سپریٹ روم چاہیے تو پروائیڈ کیا جائے گا نو پرابلم۔۔۔"
"تھینکس او کے ڈاکٹر۔۔۔!" وہ بدقت مسکرائی۔
"ایک بات کہوں ڈاکٹر اتباع۔۔۔! آپ نہایت غیر مناسب کپڑے لائی ہیں۔ لان اور کاٹن۔۔۔ نہیں چلے گا۔" وہ اس کے کپڑے دیکھتے ہوئے بولیں۔
"میں نے جان لیا ہے۔ میں خرید لوں گی۔۔۔"
"تین دن سے تو تم کمبل میں ہو۔ باہر موسم رنگ دکھا رہا ہے۔ تم موسم برداشت کر لو گی ناں۔۔۔؟"
"برداشت۔۔۔!" وہ فرماں برداری سے سر جھکا گئی۔
موسم برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے کہ۔۔۔ رویے؟ رویوں کی سرد مہری، لہجوں کی تپش روح کو جھلسا دیتی ہے اور لہجوں کی ٹھنڈک۔۔۔ انسان اکڑ جاتا ہے برف میں لگی لاش کی مانند۔
"اور اتنا ڈھیر کتابوں کا اور رسائل کا۔۔۔ اتنا بڑا ٹرنک دیکھ مجھے تسلی ہوئی تھی بلکہ سب ہی کہہ رہے تھے یہ ڈاکٹر صاحب بھاگنے والی نہیں ہیں۔"
وہ مسکرا دی۔
"نئی جگہ کی وجہ سے خاموش ہو۔ بیماری کی نقاہت ہے یا ایسے ہی خاموشی پسند ہو، کم گو۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہان بیڈ پر ٹک گئیں۔

"میں نے کبھی۔۔۔ اس بارے میں سوچا نہیں۔"
اب اسے کوئی جواب تو دینا تھا۔
"ویسے میرا ذاتی خیال ہے۔۔۔ کتابوں میں گم رہنے والے لوگ انسانوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ انسانوں سے بچنا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے آپ میں گم۔۔۔ بہت بڑے ہجوم میں بھی ایک کتاب کے سہارے اکیلے۔ تنہا۔۔۔
مجھے انسان کے یہ بھونڈے سہارے پسند نہیں۔ انسان کو انسان کا درماں ہونا چاہیے۔۔۔ گفتگو، باہم ملاقات ہنسی، رونا لفظوں کی گہرائیاں انسان کی دوستی آنسوؤں کو بہنے کا راستہ دیتی ہے۔۔۔ اور پھر پونچھنے کے لیے ہاتھ بھی بڑھاتی ہے۔۔۔ مجھے کتب بینی پسند نہیں۔۔۔ میں ہمکلام ہونے کو ترجیح دیتی ہوں۔"
اتباع فاطمہ کو ڈاکٹر شاہان کے جملوں پر بہت سے اعتراض تھے وہ کتاب دوستی پر ایک گھنٹے کی تقریر کر سکتی تھی۔ مگر ان کے چند جملے بہت سچے لگے تھے۔ آپ بیتی جیسے۔۔۔
"کتاب پڑھنا تو بہت اچھا ہے اور۔۔۔"
"میں کتاب پڑھنے کو کب برا کہہ رہی ہوں۔" وہ جان چھڑانے والے انداز میں یکدم بولی تھیں۔
"میں تو ان لوگوں کی بات کر رہی ہوں، جو کھلی کتاب چہرے پر ڈال ارد گرد سے بے گانہ ہو جاتے ہیں۔" ان کے لہجے میں چونکانے والا اتار چڑھاؤ تھا۔
اس نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بس میں خدمت خلق کے لیے یہاں رہتی ہوں سالوں سے۔۔۔ اور رہتی رہوں گی۔" نرم روی سے مقابل کو ہمت دیتا لہجہ یکدم کٹھور ہو گیا۔
اتباع خاموش رہ گئی۔ وہ بلاوجہ سوال پوچھنا پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ دونوں دنوں بعد نکلی گھاس سے کپٹی دھوپ کو سینکنے ہریالی کے میدان میں بیٹھی تھیں۔
"اور یہی میرا سچ ہے۔۔۔ اور یہی جھوٹ بھی۔۔۔"
"یہ کیا بات ہوئی!" وہ چونکی۔

"اور تمہارے لیے بھی ضروری نہیں کہ تم سچ بتاؤ کہ تم اتنا بڑا شہر بہترین تعلیمی ریکارڈ اور بہت سارے مواقع کو چھوڑ یہاں سطح سمندر سے اتنے اونچے علاقے میں کیا کرنے آ گئی ہو۔۔۔ جو بھی بتاؤ گی ہم یقین کریں گے۔"
اس نے جملے کی تلخی پر چونک کر ڈاکٹر شاہان کا چہرہ دیکھا اور پھر کھوجنے کی کوشش کی۔
وہ سفید رنگت کے ساتھ بے حد تیکھے نقوش کی مالک تھیں ہری آنکھیں یا نیلی یا کوئی درمیانی حالت کا رنگ۔ بال گہرے سیاہ۔۔۔ مگر انہیں سیدھا سیدھا بنا کر گردن پر جوڑے کی صورت کس دیا جاتا تھا۔ ان کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ مگر اپنے ظاہری حلیے سے انہیں دیکھ پہلا گمان ایک سنجیدہ و متین خاتون کا آتا تھا۔ سوبر ہلکے رنگ، سوبر ڈیسنٹ کٹ کے شلوار قمیص۔۔۔ بے آواز جوتے۔۔۔
اس نے بہت سنجیدگی سے سوچا کہ اگر وہ اپنے ظاہری حلیے میں ذرا سی تبدیلی کر لیں تو بہت کم عمر اور حسین ترین معلوم ہوں۔۔۔ حسین تو خیر اب بھی تھیں۔
"اب کس سوچ میں گم ہو گئیں۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہان نے چائے کی پیالی پر اپنی انگوٹھی بجا کر متوجہ کیا۔
آں۔۔۔ ناں۔۔۔ نہیں کہیں نہیں۔۔۔، بہت سے سارے جملے، حالات رویے جو اس کے فیصلے کا باعث تھے فلم کی طرح نگاہوں سے گزر گئے تھے۔
"دراصل ڈاکٹر شاہان۔۔۔ میرا جھوٹ جان دار نہیں ہو گا اور سچ شاندار نہیں ہو گا لیکن بس اتنا جان لیجیے کہ فیصلے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ مجھے لگا کہ اب شاید مجھے لولے لنگڑے سہارے کی ضرورت نہیں۔۔۔ میرے قدموں میں اتنی سکت آ گئی ہے کہ میں خود سے کھڑی رہ سکتی ہوں۔
اور میں نے زندگی سے یہ بھی سیکھا کہ اگر آپ پورے قد سے کھڑا رہنا چاہتے ہیں تو پھر قدموں تلے زمین اپنی ہونی چاہیے۔ آپ سمجھ لیں۔ میں اپنے حصے کی جگہ ڈھونڈنے نکل کھڑی ہوئی ہوں۔۔۔ بس۔

آئی ایم سوری ڈاکٹر شاہان۔۔۔!" وہ چونکی تھی اور واپس پلٹی۔
"ہر جگہ دکھڑے کھول کر بیٹھ جائیں، غم کو رونا شروع کر دیں تو ہمدردیاں سمیٹنے کی عادت پڑ جاتی ہے خوشی، خود اعتمادی اور توکل کے لیے دامن تنگ پڑ جاتا ہے۔۔۔"
وہ پھیکی مسکراہٹ
سے ڈاکٹر شاہان کو دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کو یہاں آئے پانچ روز ہوئے اور ہماری ملاقات اب ہو رہی ہے۔ امید کرتے ہیں۔ آپ کو کوئی پرابلم نہیں ہوتی ہو گی۔ ویسے اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔"
"میں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں شاید سفر کی تھکان تھی۔ بٹ ناؤ ایوری تھنگ از آل رائٹ۔" وہ اسپتال کے مالک سینئر ڈاکٹر سرجن عثمان غنی کے کمرے میں براجمان تھی۔ گہرے بالوں کے ساتھ بے حد طلسماتی شخصیت والے ڈاکٹر غنی اسے پہلی ہی نگاہ میں بے حد پسند آ گئے۔ وہ غیر محسوس مسکراہٹ سے آنکھوں میں نرمی کا تاثر لیے اسے خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کی شخصیت کا تاثر سارے کمرے پر حاوی تھا۔ حالانکہ وہ اب تک سلام کا جواب دینے کے علاوہ ایک لفظ بھی نہ بولے تھے۔ اس کی گفتگو ڈاکٹر غنی کے بیٹے ڈاکٹر غازی سے ہو رہی تھی۔
"تو آپ نے راستہ بھی تو اس قدر خطرناک چنا تھا۔"
"میں نے کچھ نہیں چنا تھا نہ چننے کا موقع دیا گیا۔ سیدھے راستے پر لینڈ سلائیڈنگ کا معاملہ تھا سو میری فرینڈ کا ڈرائیور مجھے اس راستے سے چھوڑ گیا۔"
"تو اسپتال کے گیٹ تک چھوڑ کر جانا چاہیے تھا یہ کیا کہ ایک موڑ پر چھوڑ کر کہہ دیا۔ سیدھے چلے جاؤ آخر میں منزل ہے۔ دس از ناٹ فیئر۔۔۔"
ڈاکٹر غازی کے چہرے پر ناپسندیدگی تھی۔

"بہرحال، ہمیں خوشی ہے کہ آپ بخیریت پہنچی ہیں اور اب ٹھیک ٹھاک ہیں۔"

"چائے لیجئے۔" ڈاکٹر غازی نے چائے کا کپ بڑھایا۔

ڈاکٹر عثمان غنی نے چائے نہیں لی۔ وہ گرم پانی میں کچھ جڑی بوٹیوں کو بھاپ دینے کے غرض سے ڈال رہے تھے، یہ شاید نزلے کا علاج تھا۔

"کوئی بھی الجھن یا پرابلم ہو تو آپ بلا جھجک بات کر سکتی ہیں۔ باقی آپ کل سے ڈیوٹی جوائن کریں اور۔"

"سر! آج سے کیوں نہیں..... بلکہ ابھی سے۔" وہ جو دھیان سے سن رہی تھی۔ یکدم ٹوک گئی۔

دونوں باپ بیٹا کی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی۔

"آپ کی طبیعت؟"

"میں ٹھیک ہوں سر.....!"

"لیکن ڈاکٹر شاہان کہہ رہی تھیں۔ آپ بازار وغیرہ جانا چاہتی ہیں۔ کچھ مناسب کپڑے وغیرہ تو اگر آج یہ کام نبٹالیں تو۔" ڈاکٹر غازی کی یقیناً ڈاکٹر شاہان سے گفتگو ہوئی تھی۔

اس نے زور سے سر ہلایا۔ "جی سر! مجھے..... خریداری کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر..... اکیلے ہی اکیلے ہی مت نکل جایئے گا' سیدھی سڑک کا گمان کر کے۔" ڈاکٹر غازی نے دوستانہ مسکراہٹ سے تنبیہہ کی۔

"اس دن آپ اکیلے کامیابی سے یہاں تک آ گئیں۔ مگر عام طور پر ایسے تھرل کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اونچے نیچے راستوں پر چلنا بھی ایک آرٹ ہے اور کرتے کرتے یہ کام آئے گا پھر کچھ جنگلی جانور بھی کبھی کبھار ٹکرا جاتے ہیں۔"

ڈاکٹر غازی کے لہجے میں چھپی فکرمندی اور احساس نے اسے شرمندہ کر دیا تھا پھر اچانک یاد آیا۔

"نہیں میں بالکل اکیلی بھی نہیں تھی' وہاں اوپر عورتیں بچے تھے اور نیچے..... نیچے وہاں مجھے ایک صاحب مل گئے تھے۔ میرا بیگ بھی اٹھا لیا تھا سر..... انہیں پتا تھا اسپتال کا' وہی ساتھ آ گئے۔"

"آپ جانتی تھیں انہیں' کون تھے وہ؟"

ڈاکٹر غازی نے اچنبھے سے انہیں اور پھر کپ میں چمچ گھماتے اپنے والد صاحب ڈاکٹر عثمان غنی کو دیکھا' وہ شانے اچکا کر دل جمعی سے دائرے بناتے رہے کپ میں.....

"اتنی جلدی بھروسا کر لیا آپ نے..... اتنا جلدی بھروسا کر لیتے ہیں کیا؟" وہ استعجاب سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا۔

اس کا اعتماد ہوا ہو گیا۔ اس کی فطرت میں گندھی غلطیاں..... عادت چھوڑی جا سکتی ہے فطرت سے منہ کیسے موڑا جا سکتا ہے۔

"کرتے تو نہیں ہیں۔ کرنا چاہیے بھی نہیں..... مگر میں دنیا کو اچھائی کی آنکھ سے دیکھنے کی عادی ہوں۔ بس دل مان گیا تھا۔ حالانکہ میں اسے نصیحتیں کر کے ہار گئی۔ اپنے آپ کو درست کرنا آسان نہیں ہوتا سر.....!"

اس کے لہجے میں ملال گھل گیا۔ وہ بڑی بااعتماد بنی بیٹھی تھی۔ اب گڑبڑا گئی۔ یکدم اس کا ہر شے سے جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ باہر نکلنے کو بے تاب ہو گئی۔

"کون ہو سکتا ہے بابا.....؟" اس نے ڈاکٹر غنی سے معلوم کرنا چاہا۔ "کیا کوئی دیہاتی..... یا۔" وہ اس کی جانب مڑا۔

"دیہاتی تو خیر نہیں تھا۔ جینز جیکٹ..... مگر یہاں کا جانا مانا باسی تھا۔ دراصل اس کے چہرے پر سوراخوں والا ٹوپا تھا تو....."

"اں..... ہاں۔" ڈاکٹر کا منہ کھلا پھر جیسے ہڑبڑا کر اس نے تاثرات مٹائے۔

"ٹھیک ہے جانے دیں..... اصل بات یہ ہے کہ آپ بخیریت یہاں ہیں۔" ڈاکٹر غازی نے قصہ یکدم سمیٹ دیا۔ وہ اپنا کپ اٹھائے کھڑکی تک آئے اور بلائنڈ کی ڈوری کھینچی.....

"آ گڈ سنی ڈے (ایک اچھا دھوپ بھرا دن)" اس کی ستائش سے بھرپور آواز اور سینہ تان کر کمرے میں گھسی روشنی نے اسے چونکایا۔

"آپ آج شاپنگ کا کام نبٹالیں۔ موسم بدلنے والا ہے اور یہ دھوپ بس آخری بار کی ہے..... پھر مارچ اپریل تک اسے ترسیں گے۔" ڈاکٹر غازی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ وہ سر ہلا گئی۔



مانوس ہونا' مدغم ہونا' رنگ میں رنگ جانا انسانی جبلت کا ہی پہلو ہے۔ سو وہ خود حیران رہتی کہ اسے یہ کیوں لگتا کہ وہ صدیوں سے ان ہی پہاڑوں میدانوں کی باسی ہے۔ اسے سردی پسند تھی اور یہاں خوب پیارے رنگوں کے ٹوپوں مفلروں کوٹوں میں خود کو چھپائے وہ مزے سے گھومتی.....

اسے ماحول سے کوئی اکتاہٹ نہیں ہوئی تھی چہار اطراف کا منظر اسے ازبر ہو چکا تھا۔ پیچھے سیاہ سڑک جو شہر تک جاتی تھی۔ سامنے گھاس کے میدان اور ان کے اختتام پر آسمان سے ہم کلام پہاڑ۔ دائیں جانب وہی راستہ تھا۔ پگڈنڈی پہاڑ اور نیم تاریکی' خوشبو..... سبزے کی باس انجان پھولوں کی اجنبی دل کو لبھاتی مہک' خوفناک دریا ایک گمان کی صورت دکھائی پڑتا ہے۔

اور اکتاہٹ ہوتی بھی تو کیسے..... تیز دھوپ ہو تو آسمان کا رنگ شفاف نیلم کی طرح لگتا۔ دھوپ کم ہو تو منظر سناٹے کی چادر اوڑھ لیتا۔ ہر شے رنگ بدل لیتی۔ گھاس کے اتنے شیڈ تو کسی کلر کیٹ لاگ میں بھی نہیں دکھائے گئے ہوں گے۔

ہر نئی صبح گردونواح کے نئے روپ کو پیش کرتی تھی۔

اور باہر کے رنگوں کے رنگ بدلنے پر حیرت کرتی یا اندر آتے مریضوں کی آنکھوں کے رنگ پوروں پر گنتی۔ ہلکی ہری' گہری ہری آنکھیں' براؤن شہد رنگ' سنہری نیلی آنکھیں' سرمئی آنکھیں۔

کسی جوہری کی دکان پر نیلم و زمرد و یاقوت کی اتنی ورائٹی نہ ہو گی۔ جتنی اس نے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس انسانوں کے چہروں پر سجی دیکھ لی تھی۔

دو نگینے شفاف' بے ریا۔ حیران معصوم آنکھیں.....

ہر صبح جیسے ایک نیا تجربہ تھی۔ ہر پل انکشاف کا..... خوب صورتی' تراوٹ' خوشبو۔

وہ ذرا سا بھی موقع ملتے ہی باہر نکل آتی۔ کبھی ڈاکٹر شاہان ہمراہ ہوتیں یا پلوشے مگر اسے اچھا لگتا تھا۔ ایک کتاب سینے سے لگائے وہ تنہا نکلے اور پھر کسی پتھر پر ٹک کر مطالعہ کرے اور جب ذرا سستانے کا دل ہو تو..... ان پھولوں کو کھوجے اور چھو کر دیکھے جو اس نے زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھے۔

اس دن بھی وہ اسپتال میں کام نہ دیکھ کر باہر نکل آئی۔ اکیلی..... ہاں چوکیدار کو بتا دیا۔ کچے راستے پر جا رہی ہوں..... راستہ اب انجان نہیں تھا اور دوسرے ڈاکٹر صاحب بہت مشہور ہو چکی تھیں۔ اتنی کم عمری قطعاً "ڈاکٹر" نہ دکھائی دینے والی ڈاکٹر موسم ماحول بے فکری اور اپنی ذات پر دن بدن بڑھتا اعتماد ایک خوشی بن گیا تھا۔ طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ وہ ایک چکنے پتھر پر براجمان ہو گئی۔ پانی کی بوتل ساتھ لگا دی اور گھٹنوں پر رکھی کتاب کھول لی۔

یہ ایک مضمون تھا نصراللہ خان کے قلم سے لکھا جناب انشاء جی کی یاد میں.....

"انشاء جی سے مل کر سارے دکھ دلدر دور ہو جاتے تھے اور دل ہلکا ہو جاتا تھا۔ انشاء جی بہت کم کسی پر کھلتے تھے۔ بہت لیے دیے رہتے اور جب کھلتے تو یوں لگتا جیسے بہار آ گئی۔ وہ لطیفے سنا کر یا گدگدیاں کر کے ہنسانے والوں میں نہیں تھے۔ ان کی باتیں سن کر دل کی گہرائیوں سے ہنسی کے فوارے چھوٹتے۔

ایک دن میں ان کے دفتر آیا تو کہنے لگے۔

"اچھا ہوا تم آ گئے۔ اب میں تمہارے ساتھ عید کا چاند دیکھوں گا۔"

شام کو میں اور انشاء جی فٹ پاتھ پر آ کر چاند دیکھنے لگے۔ وہ مجھ سے کہنے لگے تم چاند دیکھو میں نے کہا "تم کیوں نہیں دیکھتے؟" تو کہنے لگے۔

"یار آج تو مجھے سورج تک نظر نہیں آ رہا اور

تمہیں جو میں نے روکا ہے وہ چاند دیکھنے کے غرض سے تو روکا ہے۔ اس سے پہلے میں خود چاند دیکھا کرتا تھا۔ لیکن آج میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔"

خیر سے چاند دیکھنے کا اعلان ہو گیا تو میں نے انشاجی سے پوچھا اب میں گھر جاؤں ؟ تو کہا۔

"اور مجھے میرے گھر کون پہنچائے گا؟" چنانچہ میں انہیں ان کے گھر چھوڑ آیا۔" ہی ہی ہی..... ہی ہی ..... وہ سر اٹھا کر زور سے ہنس دی ہی ہی ۔اس کا انہماک دیدنی تھا (اس لیے کوئی دیکھ بھی رہا تھا) اس نے ورق پلٹا۔

"ایک دن میں انشاجی شہاب صاحب اور محمود ریاض انشاجی کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ محمود ریاض کی طبیعت ٹھیک نہ تھی۔ اس نے پانی مانگا ملازم پانی لے آیا۔ انشاجی نے جلدی جلدی اس میں گلوکوز گھولا اور پی گئے محمود ریاض نے کہا "بھائی جان پانی تو میں نے مانگا تھا۔" انشاجی نے کہا۔

"جب ہی میں یہ سوچ رہا تھا کہ بغیر پیاس کے یہ پانی کیوں پیا.....؟"

وہ کتاب سینے سے بھینچ گردن پیچھے ڈھلکا کھلے دل سے ہنس دی دو تین گہری سانسیں بھر کے موسم کی تازگی کو اندر ہی اتار لیا۔

"ویسے انشاجی بدحواس بھی غضب کے تھے۔ جو خط مختار صدیقی کو لکھتے' اسے قدرت اللہ شہاب کے لفافے میں ڈال دیتے۔ اپنے چشمے کی جگہ میرا چشمہ لگا کر یہ سوچتے کہ انہیں اس چشمے سے نظر کیوں نہیں آ رہا ان کے مزاج....."

"یا اللہ !" اس نے کتاب دھپ سے بند کی اور پیٹ پر ہاتھ باندھ کر دوہری ہو گئی۔ ہی ہی..... اردگرد کے خاموش ماحول میں پرندوں کی چہچہاہٹیں تھیں۔ اس کی ہنسی کا جلترنگ خود اس کی سماعت کے لیے گویا اللہ کی رحمت تھی۔ عطیہ خداوندی ۔اس نے ہنسی روکنے کی کوشش نہ کی بلکہ سطور پر دوبارہ نظر ڈال کر ہنسی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا۔ مگر..... یکدم "ہاہاہا....." بھرپور مردانہ قہقہہ...

"ہاہ.....!" وہ کرنٹ کھائے انداز میں اچھلی پلٹی اور کھڑی ہو گئی۔

"میرے اللہ....."

براؤن سوراخ والے ٹوپے کا مالک اپنے اس دن کے حلیے میں تھا اور اس کی پشت پر جھک کر اس کے ساتھ ساتھ پڑھ رہا تھا۔ تو پھر ہنسی میں بھی ساتھ ساتھ تھا۔

"یہ آخری والی بات تو بڑے مزے کی ہے۔" اس نے پکی سہیلیوں کی طرح رائے سے نوازا۔

"ارے!" وہ اچھلی "تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جیسے تم ان مناظر سے لطف اندوز ہو رہی ہو..... میں بھی۔"

"میرے پیچھے چھپ کے کھڑے تھے اور..... اور میری کتاب پڑھ رہے تھے۔"

"بی بی! آپ نے سنا نہیں علم حاصل کرو' چاہے چین جانا پڑے اب اگر رستے میں کوئی علم ملے تو چھوڑ دیں کہ ہم تو بھئی چین جا کر ہی پڑھیں گے..... کیوں؟"

"فالتو باتیں نہیں کرو..... منہ چھپا کر کیوں آتے ہو..... اور تم ہو کون..... میں نے تو نہ دیکھا تمہیں اتنے دنوں میں..... اور اب مجھے انجان نہ سمجھنا۔ میں چوکیدار کو بتا کر آئی ہوں اور سب جانتے ہیں میں اسی جگہ پر بیٹھتی ہوں اگر تم نے کوئی....."

"آپ بلاوجہ دھمکیاں دے رہی ہیں۔ میں نے کیا ہی کیا ہے۔ اپنی دھن میں جا رہا تھا۔ پھر اچانک خیال آیا' کہیں آج بھی بیٹھی رو نہ رہی ہوں۔ ذرا چیک کر لیتا ہوں..... مگر یہاں آکر پتا چلا' موصوفہ ڈاکٹر صاحب ہنس رہی ہیں۔ ہم لوگوں کو تو جب جہاں ہنسی آتی ہے ہم ہنس پڑتے ہیں جب رونا آئے رو لیتے ہیں آپ کیا یوں کرتی ہیں۔ آج ہنسنے کا موڈ ہے چلو باہر جاتی ہوں اور آج رونے کا ارادہ ہے تو فلاں جگہ....."

"تم کتنا بولتے ہو..... مائی گاڈ..... اور ہاں تمہیں اس دن میرا نام کیسے پتا تھا؟" وہ سختی سے گویا ہوئی۔

وہ جارحانہ عزائم لیے آگے بڑھی "ڈاٹارو اسے اپنے

پرے..... شرافت سے اپنا چہرہ دکھاؤ۔"

"جانے دیں ڈاکٹر صاحب..... میں آج کے بعد آپ کے راستے میں نہیں آؤں گا۔ وہ تو مجھے لگا' آپ شاید پھر رو رہی ہیں..... تو۔"

"یا پھر اس دن سے یہیں بیٹھی ہوں راستہ بھٹک کر۔" اس نے دانت پیس کر جملہ کاٹا۔

"نہیں خیر۔" وہ ہنس دیا "وہ تو مجھے معلوم ہے' آپ پنچ ہی تھیں۔"

"تم آخر ہو کون.....؟" غصہ اور جھلاہٹ عود کر آئی اس نے یکدم اچھل کر ٹوپا جھپٹا اور پھر اگلے پل..... ایک ہاتھ ہونٹوں پر..... دوسرے میں ٹوپا..... وہ بھی تحیر کے باعث انگلیاں ڈھیلی ہوئیں تو زمین بوس ہو گیا۔

"تت..... تت..... تم میرا مطلب..... آ..... آ..... پ"

"میرے خیال میں کوئی مسئلہ ضرور..... تت' تت..... آ' آ..... ویسے تو میں نے آپ کو ٹھیک ٹھاک بولتے دیکھا ہے بلکہ آپ اچھا بولتی ہے گہرا معنی آفرین مگر....."

ڈاکٹر عثمان غنی نے اپنا ٹوپا اٹھایا اور جھاڑا۔

"اجازت ہے۔" سر پر چڑھانے سے پہلے اس کی جانب دیکھا۔ بت کی طرح ایستادہ تھی۔

"دراصل میں نزلے زکام کا بڑا پرانا مریض ہوں ۔اس لیے ناک اور سر ڈھانپ کر نکلتا ہوں۔ ان راستوں پر سیر گشت کی عادت نہیں چھوڑ سکتا یہ جو کچھ ہوا محض اتفاق ہی کہیے۔ آپ کوئی گمان نہ کیجئے گا..... مجھے واقعی لگا شاید آپ رو رہی ہیں مگر نزدیک آکر دیکھا تو اتنی بے ساختہ ہنسی..... دل نے کہا ڈاکٹر غنی ذرا دیکھو کس قصے نے بی بی کو اتنا دل سے ہنسایا ہے۔ برا نہ لگے تو کتاب پڑھنے کے لیے دینا۔ میں نے دنیا کی ڈھیر کی کتابیں پڑھ رکھی ہیں مگر یہ قصہ نہیں پڑھا..... دیں گی مجھے آپ؟" انہوں نے کسی معمول کی طرح ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"ویسے یہ تمام ایریا محفوظ ہے مگر احتیاط اچھی ہے۔

کسی کو ہمراہ لے آیا کیجئے۔" وہ فکرمندی سے کہہ رہے تھے اس کا سر ہلا۔

"آئی ایم سوری..... سر!"

"سوری.....!" ڈاکٹر عثمان غنی نے پرسوچ انداز میں سر کو دائیں بائیں کیا۔

"پھر تو سوری مجھے بھی کہنا چاہیے' آپ انجان تھیں لیکن جو ہوا بس یکدم ہی ہو گیا نو پلاننگ....."

کتاب بغل میں دبا وہ ٹوپا دوبارہ چڑھا چکے تھے۔ ان کی آنکھوں سے چھلکتی سادگی' فکرمندی اور شرمندگی۔

مگر اتباع سے کچھ بولا نہ گیا۔ "آپ بیٹھیں گی یا پھر چلیں.....؟"

"نہیں چلیے..... چلتے ہیں۔" وہ یہی کہہ سکی۔

وہ پورے قد کے ساتھ تازہ تیار کردہ ٹہنی کی لاٹھی کو ہوا میں اٹھائے آگے چلتے تھے۔ ان کی چال' قد ایک نوجوان جیسا تھا۔

اتباع شرمندہ' پریشان اور اپنی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر..... سر جھکائے پیچھے..... اسے پتا ہی نہ چلا' کب آنکھوں سے آنسوؤں کی لکیر بہنا شروع ہو گئی۔ اس نے بے خیالی میں سسکی لی تو ڈاکٹر صاحب چونک کر مڑے۔

"کیا بات ہے..... کیا ہوا؟"

"کک..... کچھ نہیں۔" اس نے ناک پونچھی "میں بہت شرمندہ ہو رہی ہوں..... سر!" اس نے اٹک اٹک کر کہا۔

"زیادہ شرمندگی کا مقام میرے لیے ہے..... رونے کا دل میرا بھی ہے مگر میں جانتا ہوں' روتے ہوئے بہت ہی برا لگتا ہوں..... آپ برا نہ مانیں تو وقت ہے جان لیں..... آپ روتے ہوئے مجھ سے بھی زیادہ بر..... ی۔"

اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔

"جب ہنستے ہوئے اتنی پیاری لگ سکتی ہیں..... تو ہچکیوں سے روتی کیوں پائی گئیں پیاری بٹیا.....!"

وہ اس کے شانے کو ہلکا سا چھو کر بولے۔

اتباع نے کرنٹ کھائے انداز میں آنسوؤں سے لدی پلکیں اٹھائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اپنے اترے چہرے کو چھپانے اور ٹوٹتے اعصاب کی چیخ چیخ سے پریشان وہ سر شام ہی منہ سر لپیٹ بستر میں چھپ گئی تھی۔ اس نے رات کا کھانا کھانے سے بھی انکار کردیا تھا۔

ڈاکٹر غنی کا انداز تخاطب..... اسے ماضی میں دھکیل گیا تھا۔ اتنے میٹھے لہجے میں اسے زندگی میں ایک ہی بار..... ایک شخص نے پکارا تھا۔ اس کی ماں نے..... نہیں اس کے ابو نے۔ نہیں نہیں کسی اور نے..... اور روح کی گہرائیوں سے دل کے نہاں خانوں میں چھپی بے اندازہ محبت سے پکارنے والا وہ شخص..... اگلے روز ..... اگلے روز اس دنیا ہی سے چلا گیا۔

اور اس نے بھی کون سا اپنے کانوں سے اس لفظ کو سنا تھا یا اس سے ٹپکتی شیرینی کو محسوس کیا تھا۔ نہیں اس نے تو فقط اس لفظ کو پڑھا تھا اور فقط پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ۔

اتنی مٹھاس..... اتنی لگاوٹ' اتنی اپنائیت۔ فکر' دردمندی کا مظہر..... پچھتاوے قیافے' چھتنا..... کاش وہ اپنے کانوں سے سن بھی لیتی۔

ڈاکٹر غنی نے اسے کیا کہا تھا..... "پیاری بٹیا" اس نے بارہا سوچا تھا کہ اگر وہ اس تخاطب کو اپنے کانوں سے سن لیتی تو تو اس پر کیا اثر ہوتا۔

وہ سن کر..... حق دق رہ گئی تھی۔ اسے لگا زمین و آسمان کی گردش رک گئی ہو۔ اسے لگا تھا وہ زندگی بھر اندازے لگاتی رہے گی اسے اچھا لگا تھا اس کے بے چین دل کو قرار ملا تھا۔ وہ خوف زدہ ہوگئی تھی۔ وہ حیران رہ گئی۔

زندگی بہت اچھی تھی' وہ امی اور ابو کے درمیان سونے والی اکلوتی بیٹی تھی۔ دائیں کروٹ امی' بائیں کروٹ ابو اور اگر چت تو دونوں کے بازو اس کے اوپر ہوتے۔

چار سال کی بچی کو دائیں کروٹ پر جب امی نہ ملیں تو وہ بہت شدت سے بائیں جانب ابو سے لپٹ گئی۔ اس کا باپ زندہ تھا اور وہ وہی طوطا تھی' جس میں اس کی جان بند تھی۔ وہ اتنی چھوٹی سی تھی کہ اسے بہلا لیا گیا کہ ماں مٹی اوڑھ چکی اور زندگی میں اب ایک خلا ہے کھلونوں کپڑوں' کہانیوں اور باپ کی بے پناہ توجہ بس ٹھیک ہے..... ایسی زندگی بھی ہوتی ہے۔

اسے کسی دوسرے کی چاہ نہیں تھی۔ ابو تھے نال وہ ہر پل اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ بس اسکول کے پانچ گھنٹے وہ ان سے جدا ہوتی تھی۔ ابو اپنا چھوٹا سا کاروبار چلاتے تھے۔ وہ اسے لنچ ٹائم میں لے لیتے اور پھر رات گئے تک وہ ان کے ساتھ ان کے دفتر میں رہتی۔ وہی اسے ہوم ورک کرواتے ..... سیپارہ پڑھانے کو مولوی صاحب بھی دفتر ہی آتے۔

مگر ایک روز ایک ایسا دن بھی چڑھا جب ابو پٹیوں میں جکڑے بستر نشین تھے۔ اور وہ نا سمجھی کے عالم میں ان کے پیروں کے پاس بیٹھی تھی۔ پھر پٹیاں اتر گئیں پلاستر کھل گئے مگر نہ جانے ریڑھ کی ہڈی میں کون سا نقص رہ گیا کہ وہ حوائج ضروریہ کے بھی محتاج سے ہونے لگے۔ اس کی عمر اتنی نہیں تھی کہ وہ انہیں اس حد تک مدد دے سکتی۔ وہ اپنے ابو کا بہت بڑا جذباتی سہارا تھی۔ مگر ابو کو جسمانی مدد کی ضرورت تھی۔ بڑے اور چھوٹے بھائیوں نے ایک میل نرس کا بندوبست کردیا۔

وہ چھوٹی تھی' وہ سمجھتی نہیں تھی۔ مگر سنتی سب تھی۔

تائی اور چاچی کے جملے۔

وہ پہلے کمرے کی گندگی' بدبو' دواخانہ ہونے کی شکایت کرتی تھیں۔ پھر کہنے لگیں۔

"غیر بندہ گھر میں گھسا لیا ہے۔ اپنے گھر میں الرٹ رہنا پڑتا ہے۔ عجیب بے سکونی کردی ہے۔ پہلے مریض کے کھانے پینے کا بندوبست' پرہیز' ناشتہ' یخنیاں پھر بچی تو سال کی ہونے کو ہے مگر باوا نے نو ماہ کی بنا کر رکھی ہے۔ جیم بریڈ' سینڈوچ' جوس..... اور اب تین نئے بندے کا کھانا چاہئے۔ ہونہہ....."

اور وہ جو سوچتی تھی کہ اب گھر میں سکون ہوگا وہ نئی صورت حال سے پریشان ہوگئی۔

اس کا تلخ سچ ہے کہ وہ ان ہی چیزوں کو کھانا پسند کرتی تھی۔ امی کے بعد ابو نے اسے ایسے کھانے کھلائے تھے جو بنانے آسان ہوں مگر وہ کہہ نہ سکی کہ کتنے دن سے دن گزرے وہ کھانا لگنے پر برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ سنتے ہی بنا کسی پکار کے خود ہی دستر خوان کے سرے پر آکر ٹک جاتی۔

تائی' چاچی اپنے بچوں کے نخرے اٹھاتیں اس کی آمد سے بے خبر' وہ خود ہی اپنے لیے چپاتی پکڑ اس پر سالن کی مانند سالن لگا کر حلق سے اتارتی۔

وہ تو نجانے کب سے فرمائشوں' خواہشوں سے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ وہ اپنی عمر سے بڑی تو نہیں ہوئی۔ مگر خاموش ہوگئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھ کر ابو کو دیکھتی رہتی وہ باریک بین نہیں تھی۔ نہ زمانہ شناس..... مگر اسے لگتا..... اسے لگتا کہ.....

وہ انہیں اخبار پڑھ کر سناتی۔ اس کا قرآن پاک مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ انہیں آیات سناتی۔ ترجمہ پڑھتی۔ وہ خاموش طبع تھی۔ مگر ابو کی خاموشی سے گھبرا کر بہت زیادہ بولتی تھی۔

وہ ابو کو بولنے پر اکساتی تھی مگر وہ بہت خاموش ہو گئے تھے۔ وہ خود ہی سوال و جواب کرتی۔

اسکول کے قصے سناتی۔ بے معنی' بے مقصد باتیں وہ اس کا دل رکھنے کو مسکراتے مگر ایسی مسکراہٹ..... نہ ہی مسکرائیں تو اچھا۔

وہ باپ کی معصوم گود کی بچی تھی۔ دنیا سے ناآشنا' تجربہ' تحقیق قیافہ' قیاس آرائیاں..... مگر اسے لگتا۔

ابو زمین پر اوندھی پڑی بوتل کی طرح ہیں۔ جس کا ڈھکن لگا ہے مگر غیر محسوس سی لیکیج..... ٹپ ٹپ۔ بوتل سے ٹپکتے نہ دکھائی دینے والے قطرے..... ایک دن وہ اٹھے گی تو خالی بے وزن بوتل لڑھکتی..... سرکتی کمرے سے باہر نکل چکی ہوگی۔

اور ایک صبح اس کے خدشات حقیقت کا روپ دھار گئے۔

بوتل خالی ہوگئی تھی۔

زندگی اب ٹھوکروں پر تھی۔ اسے کبھی کسی نے ہاتھ سے دھکا نہیں دیا تھا۔ مگر وہ اوندھے منہ گری تھی۔ کسی نے منہ سے نوالہ نہیں چھینا..... مگر وہ بھوک سے بلبلاتی تھی۔ اس گھر کی ہر شے میں وہ برابر کی حصے دار تھی۔ مگر اس کے حصے میں صرف ٹھوکریں تھی۔

وہ منہ سے کچھ نہیں کہتی تھی مگر سب اسی کو سناتے تھے۔

ہر جرم اس کے خانے میں بیٹھتا تھا۔ ہر خطا اسی سے سرزد ہوتی تھی۔ زندگی گویا رک گئی تھی۔ وہ باپ کے تکیے سے لپٹ کر سوتی تھی۔ اس سے باپ کا کمرہ لے لیا گیا۔ "اتنی ننھی سی بچی' اتنا بڑا کمرہ..... اکیلے' اسے ڈر لگے گا۔

وہ کہہ نہ سکی۔ وہ اس کمرے سے جدا ہو کر زیادہ ڈرے گی۔ زندگی بھر ڈرتی رہے گی اس کا سائبان' پناہ گاہ نہ چھننی جائے۔

اسے لڑکیوں کے کمرے میں گدا ڈال دیا گیا۔ وہ مہینوں سو نہیں پائی اس کمرے کا حق ملکیت اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ پنکھا چلانے' بند کرنے' بتی جلانے بجھانے تک کی محتاج تھی۔ وہ دیوار پر اپنی ڈرائنگز تک نہیں لگا سکتی تھی۔ کوئی اس سے گفتگو نہیں کرتا تھا' اسے پکارتا نہیں تھا۔ وہ خود کلامیاں کرتی۔

ہاں اس کے نام کی پکاریں تب پڑتیں جب دستر خوان لگانا ہوتا' اٹھانا ہوتا۔ بچے سنبھالنے ہوتے۔ گھر میں سب سے بدسلیقہ وہ تھی' اسی لیے اسے ہی سب سے پہلے سلیقہ سکھانے کا بیڑا اٹھایا گیا۔

وہ بھرے برات آٹے سے کشتی کرتی۔ برتن دھونے کا تار اس کی ہتھیلیوں میں دھنستا۔ برتن مانجھ مانجھ کر ناخن گھس گئے اور پوروں کی کھال اتری اتری رہتی۔ اس کی فکر کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ خود رو پودے کی طرح پروان چڑھ رہی تھی۔

ذہانت خداداد تھی۔ کتابیں پڑھنا۔ ابو کو سنا سنا کر وہ خود بھی رسیا ہو چکی تھی۔ تندور سے لائی روٹی جس اخباری ٹکڑے میں لپٹی ہوتی، وہ ادھوری کٹی پھٹی خبروں کو ہی ازبر کر لیتی۔

واحد سہارا کتابیں تھیں۔ نصابی یا غیر نصابی۔

وہ گھر میں دوسرے درجے کے شہری سے بھی خراب حال میں رہتی تھی۔ مگر کلاس میں وہ واحد اول درجہ تھی۔

ڈیسک پر سب سے آگے براجمان رہتی۔ یہاں اسے کوئی پچھاڑ نہیں سکتا تھا۔ وہ ذہین و فطین تھی۔ محنتی اور قابل۔

مگر قابلیت کے چراغ کو جلانے کے لیے تیل کی ضرورت ہوتی ہے اور تیل پیسوں سے آتا ہے۔ اس گھر میں اس کے لیے علیحدہ سے کوئی پیسہ نہیں تھا۔ تمام بچوں کی فیس، کتابیں، یونی فارم، جوتے اور دوسری ضروریات اکٹھے پوری کی جاتی تھیں۔ اسے کبھی منہ سے تو کچھ کہنا نہ پڑا۔۔۔ مگر جب اسے اپنی راہ الگ سے منتخب کرنا پڑی۔ تب۔

تایا کی دونوں بڑی بیٹیاں صرف اور صرف بناؤ سنگھار سے دلچسپی رکھتی تھیں۔ انٹر کے بعد تائی انہیں خود ایک نامی گرامی پارلر میں منہ مانگی فیس کے ساتھ داخل کروا آئیں۔ چاچی کی بیٹی انڈس جانا چاہتی تھی۔ چاچی۔۔۔ بڑے فخر سے منہ بنا بنا کر بیٹی کی اچیومنٹس پر آئے گئے کے آگے بکھان کرتیں۔ مصوری کا شوق۔ واہ۔

لڑکے سارے دھکا اسٹارٹ تھے۔ پڑھنے میں حسب معمول دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر انہیں ڈگریاں لانی تھیں۔ جیسے مرضی لائیں۔ سو ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا۔ نتیجہ وہی۔۔۔ ڈھاک کے تین پات۔

ایسے میں اس کا ایف ایس سی میں شروع کے پانچ میں ہونا۔

"ہاں! ارے! کیسے؟ کب؟ اور آخر میں کیوں کے بعد قطعیت سے "نہیں۔"

"پتا ہے ڈاکٹری کی پڑھائی کتنی مہنگی ہوتی ہے۔"

"اور لڑکی ہو، اول تو اتنا ہی کافی ہے۔ چلو شوق ہے تو بی ایس سی کر لو۔"

"بلکہ اتنا ہی کافی ہے۔ گھر رہ کر کچھ سلیقہ سیکھو۔ سال چھ ماہ میں بیاہ کا سوچو۔ آخر ہماری ذمہ داری ہے کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو۔"

"میں۔۔۔ میں پڑھنا چاہتی ہوں میرے نمبر۔ تائی جی۔۔۔"

"ارے نمبر۔۔۔" تائی نے ٹھٹھا اڑایا، چاچی نے ساتھ دیا۔

"گھر میں رہ رہ کر نمبروں کا ہی تو بوجھ بڑھایا تم نے۔ کام نہ کاج بس چوبیس گھنٹے کتابیں۔ کسی اور طرف تو دھیان ہے نہیں۔۔۔ نہ بال نہ کپڑے نہ جوتے۔ نہ ٹی وی ڈرامہ۔ بس وہ موئی ردی کا ڈھیر اور اس میں گم بیٹھا رانی۔ رنگ بھی کالا سا۔۔۔ آنے والیاں سوگن پورے مانگتی ہیں۔ ماں باپ ہیں نہیں۔ یتیم سن کر پہلے ہی ٹھٹک جاتی ہیں کہ خالی کھیسا ہو نہ۔"

وہ کہہ نہ سکی "یتیم کیوں چاچے تائے کیا ہوئے؟"

"پیچھے نہ ہٹنا اتباع۔۔۔!" رجا دانت پیستی۔

"بیٹا! تمہارا حق ہے، حق مانگنا سیکھو۔" آنٹی نے دھیان کروایا۔

وہ اپنے دل کی سنتی۔ رجا کے بڑھاوے دیکھتی آنٹی کے حقوق و فرائض کے لیکچر یا سب گھر والوں کو جنہیں وہ بہت بچپن سے جانتی تھی۔ اندر تک سے اس کے ساتھ کی سب لڑکیاں آگے بڑھ گئیں اور وہ گھر میں رہ گئی۔

خاموش، اداس، بے یقین، مایوس اس کے لیے کوئی راہ نہیں تھی۔

وہ سوال کرتی نگاہوں سے تایا کا چہرہ تکتی کہ وہ پوچھ لیں۔ "سب اپنے اپنے اسکول کالج روانہ ہیں۔ تم کیوں گھر میں ہو؟"

وہ چچا کے چہرے پر نظر کرتی وہ پوچھ لیں اس کے چہرے پر کیسی ہچکچاہٹ ہے۔ وہ کیا کہتے کہتے رک سی جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہمہ وقت یہ کس چیز کی

"اور پھر ایک دن رجا نے تایا کو پکڑ لیا۔

"... خوشی، کامیاب، ذہین اتباع فاطمہ۔ حق دار، ... بھیک تو نہیں مانگ رہی۔ اس کے ابو کا کاروبار ... مرنے کے بعد تایا چچا کی زیر نگرانی چلا گیا اور آج تک قائم و دائم تھا۔

اور اس بڑے سے گھر میں بھی تو اس کا حصہ تھا۔ ... احمد کی ایک بیٹی کی جگہ پانچ بچے بھی یتیم ہوتے ... ڈاکٹر، انجینئر، یا ... بن سکتے تھے۔

رجا با اعتماد تھی۔ صاف گو۔ بے لاگ کہنے والی۔ اسے حق بات کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا ...

وہ اپنے دل کے سارے ارمان نکال دروازہ پار کر گئی۔

اس نے تایا جی کی عمر، رعب، دبدبے کا ذرا لحاظ نہ کیا۔

وہ جو جو سوچتی تھی۔ اور اتباع کو سمجھانے بھڑکانے کے لیے استعمال کرتی تھی۔ وہ سب سنا کر گئی۔

"نکمے بیٹوں پر خرچ کر رہے ہیں۔ وہ اگلا سارا دن ... کالج کے باہر چورن بیچتا ہے، اتنا ہی شوق ہے ناں انکل! آپ اسے کسی کالج کینٹین کا ویٹر لگا دیں۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں۔ کم از کم "کام کرتا ہے" کا مونو گرام تو لگا ہو گا۔ ابھی تو صرف نام خراب کر رہا ہے صرف آپ کو لگا کہ وہ دوستوں سے لڑ کر آیا ہے۔ اصل کہانی یہ ہے کہ وہ لونڈیا کے بھائیوں سے پٹ کر آیا تھا۔ اور ... سے مہنگی کوچنگ اسی کو دلوا رکھی ہے ناں آپ نے۔

دونوں بیٹیوں کا بھی سن لیں۔ اتنی زیادہ فیس کے بعد بس اپنا ہی سنگھار کرتی ہیں۔ انڈا ابالنا تک تو آیا نہیں۔ انہوں نے کیا اگلے گھر نہیں جانا۔

اور چاچی، آپ کی بیٹی بڑی صادقین کی جانشین اور گل جی کی پیروکار وہ جو کل بھوسی ٹکڑے والے کو ... بیچے آپ نے پورے تین سو کی ردی۔ وہ ردی گئی ہو گی کم از کم تیس ہزار کی۔

اور پتا ہے وہ آرٹ کے نمونے جن پر آپ لوگ فخر کرتے ہیں۔ بھوسی ٹکڑے والے نے کہا۔ "کسی بچے نے کاغذ پر رنگ ضائع کر دیے ہی ہی ہی۔"

اور جو صحیح قابل اور حق دار ہے کہ آپ اس پر خرچ کریں اور فخر کریں۔ دنیا میں بھی داد۔۔۔"

تائی اچھل کر کھڑی ہو چکی تھیں۔ سب ہی حق دق تھے۔ اتباع پسینے پسینے کاش وہ رجا کو روک پاتی۔ اب کیا ہو گا۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ وہ باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔

"بس لڑکی!" بہت دیر سے پھٹی آنکھوں کے ساتھ تایا جی کھڑے ہو گئے۔ "بہت ہو گیا اب ایک لفظ نہیں،" وہ دھاڑے تھے۔

"میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی انکل!" رجا کی آواز ان سے زیادہ بلند تھی۔ اس نے زمین پر زور سے پاؤں بھی مارا۔

"ہاں تو میں کیا کہہ رہی تھی۔" وہ حاضرین کی جانب مڑی۔

"ہاں۔۔۔ دنیا میں بھی داد ملے گی اور آخرت میں ثواب بھی۔۔۔ اور جنت کی پکی گارنٹی لکھوالیں آپ۔۔۔" وہ بکی تھی۔

"بکواس بند کرو بدتمیز لڑکی!" چاچی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا۔

"چاچی! مجھے بدتمیز مت کہیے گا۔" رجا نے بھڑک کر تادیبی انگلی اٹھائی۔ "یہ میں اکیلی نہیں بول رہی تمام محلہ یہی باتیں کرتا ہے۔ ہوتا ناں اس ڈرپوک نکمی کی جگہ کوئی بیٹا بنت سلطان کی جگہ بن سلطان تو ڈال دیتا حلق میں انگوٹھا۔" اس نے اپنا ہاتھ اور مکے سے نکلا انگوٹھا چاچی کی گردن کے سامنے یکدم یوں لہرایا جیسے کہ بس۔۔۔ اندر۔

"نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔" تایا صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھے تھے۔

تائی جی شاید رجا کو دھکے دینے کے لیے اٹھی تھیں۔

رجا نے بھانپ لیا۔ "آپ تکلیف نہ کریں۔ میں جا

ہی رہی ہوں۔" رجا بے حد بدتمیزی سے بولی۔ "ہونہہ ۔۔۔ مجھے بدتمیز کہہ رہے ہیں۔"

"بدتمیز ہونے میں کوئی برائی نہیں۔" رجا کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔

"بدتمیز سہی لیکن بدنیت نہیں ہونا چاہیے۔" وہ یکدم باہر کی جانب لپکی۔ جاتے جاتے ایک زوردار ہاتھ اتباع کے شانے پر دھر گئی۔ غصے سے بھرپور دھکا سا۔

"بزدل، بے وقوف۔"

اتباع رجا کی حق گوئی سے واقف تھی۔ وہ آئینہ دکھانے والے اس کے عزائم سن کر مسکرا دیتی تھی۔ رجا کی فطرت سے بخوبی واقف ہو جانے کے باوجود اسے کبھی خواب بھی نہ آیا تھا کہ وہ ایسا کر ہی گزرے گی

چٹاخ۔۔۔ پٹاخ۔

تایا جی کا سیدھا ہاتھ اس کے سیدھے گال پر پڑا اور وہی ہاتھ واپس ہو کر الٹا۔ الٹے گال پر۔۔۔

اور اس کے بعد۔۔۔

اتباع نے جھرجھری لی۔ تایا کے طمانچہ کی گونج۔۔۔ تپش، تکلیف آج بھی اس کے گال کو جلاتی تھی۔

وہ اس وقت چولہے کے نزدیک بیٹھی تھی۔ آگ کی حدت سے گال گرم ہو گئے تھے۔ اس نے دھیرے سے انہیں تھپتھپایا اور پھر بھیگی انگلیوں کو دیکھ کر زہرخندی سے مسکرا دی۔ اگلے پل وہ گھٹنوں میں منہ دے کر سسک رہی تھی۔

"ہماری بے عزتی، ذلت، تماشا، حرام خور آستین کا سانپ۔" وہ آج تک اندازہ نہ لگا پائی اسے جملوں سے تکلیف ہوئی یا دو تھپڑوں سے۔

زندگی پہلے کون سی پھولوں کی سیج تھی۔ مگر اس کے بعد تو۔۔۔

"ایسا کون سا دکھ ہے لڑکی، جو تمہیں خون رلاتا ہے۔" ڈاکٹر عثمان غنی کی زچ آواز۔ وہ اچھل پڑی۔

"اور میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رونے سے حاصل کیا ہوتا ہے؟" تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ تمہارا رونا مجھے کتنی۔۔۔ شدید تکلیف دے رہا ہے۔" وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے نزدیک بیٹھ چکے تھے۔

"میں نہیں جانتا۔ کون سا بھالا دل میں گڑا ہے مگر ہمت کر کے ایک بار اسے کھینچ لو بس۔

اللہ کی دی اتنی بہت ساری نعمتوں میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو تمہیں پل بھر کو خوش کر سکے دکھ یقیناً "پہاڑ کی طرح ہوتے ہیں سینے پر دھرے۔ خشک بے آب گیاہ۔ ان کے اندر نمی نہیں ہوتی تو کسی چیز کا نمو بھی نہیں ہو پاتا اور خوشیاں بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ دریا کی ریت کے اندر پنہاں سنہرے ذرات جیسی۔ ریت کے باریک ذروں میں سے سونا ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔۔۔ بہت مشکل کام ہے۔ دل گردے کا صبر، تحمل ٹھہراؤ۔۔۔ انتظار۔ خوشیاں بہت مشکل سے ملنے والے سونے کے ذرے کی طرح ہیں۔ مگر بیٹا سونا پھر سونا ہی ہوتا ہے۔ میری بات سمجھ میں آئی؟" وہ بہت محبت سے اس کی سوجی سرخ آنکھوں اور بھیگے چہرے پر نگاہیں جمائے ٹھہر ٹھہر کر بولے تھے۔

اتباع کا سر اثبات میں ہلا۔

"اور تم تو پھر مسیحا ہو۔ مسیحائی کا نتیجہ۔ دعائیں بے حد و بے حساب اور اگر کسی کی ایک دعا بھی لگ گئی تو حاصل فقط خوشیاں۔ اتنی کہ سنبھالے نہ سنبھلیں۔ میں اب تمہیں دوبارہ کبھی ایسے روتا نہ دیکھوں۔ ٹھیک ہے۔"

اتباع نے کوئی حرکت نہ کی۔

"اس بار بھی سر کو ہلانا تھا۔" ڈاکٹر غنی نے اپنا پنجہ اس کے سر پر رکھ کر سر کو ہلایا۔ اتباع کے چہرے پر پہلی بار شرمندگی آ رکی۔ وہ جیسے چونکی تھی کہیں اور ہی تھی۔ جیسے واپس پلٹی تھی۔

"چولہا جلتا دیکھ کر پانزائی بی کو کوسنے آیا تھا تو حیران رہ گیا یہاں تو گویا آگ اور پانی کا ملن ہو رہا تھا۔ ہاہاہا۔" ان کا اشارہ اس کے رونے پر تھا۔ اتباع کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ آئی۔ اس نے چادر سے چہرہ پونچھا۔

"جو شاندہ پیو گی۔۔۔ بناؤں؟" ڈاکٹر عثمان غنی نے کیتلی اٹھاتے ہوئے چٹخارا سا لیا۔ انداز یوں تھا ۔۔۔وقت شیرازدی ہو۔

۔۔۔ کی ہنسی نکل گئی۔

ایک رشتے کا آغاز۔۔۔ اعتبار۔ دوستی۔

☼ ☼ ☼

اسپتال ایریا میں سگنلز پرابلم گمبھیر تھی اور رجا نے ۔۔۔ میں بات کرنے کی تاکید کی۔ سو جب اسے خبر ۔۔۔ کہ ڈاکٹر عثمان غنی اسپتال کی کچھ دوائیوں اور دیگر ۔۔۔ کی خریداری کے لیے ایبٹ آباد تک سفر کرنے ۔۔۔ لے ہیں۔ تو اس نے مدعا ڈاکٹر شاہان کے سامنے پیش ۔۔۔

"آئیڈیا اچھا ہے مگر تم پیش کرو گی۔۔۔" وہ بڑے ۔۔۔ش سے بولی تھیں۔

"میں کبھی نہیں کہہ سکتی۔" اس نے منہ بنایا۔ ڈاکٹر عثمان غنی کی نقاب کشائی کے بعد اور اس جوشاندے والی رات کے بعد وہ تو جیسے ان کے سائے سے بھی بھاگتی تھی۔ وہ اتنی شرمندہ تھی کہ اس نے باوجود کوشش کے یہ قصہ ڈاکٹر شاہان سے بھی نہ کہا یہاں تک کہ رجا سے بھی نہیں۔۔۔ البتہ ڈاکٹر عثمان نے اپنے چہیتے سے ضرور ذکر کر دیا تھا جب ہی۔۔۔

وہ ایک عورت اور بچے کا چیک اپ کر رہی تھی۔ بچے کی پسلی میں زوردار چوٹ تھی اور ماں کی کنپٹی آنکھ کے پاس جامنی سیاہ نیل اور باقی جسم میں مکوں کی مار سے شدید درد۔۔۔

اسے مقامی زبان کی شدبد تھی مگر اتنی گاڑھی اور روانی سے چلتی مجروح عورت کی زبان۔۔۔ سو وہ درد مندی سے سنتی، بار بار سر اٹھا کر سسٹر پلوشے کو دیکھتی ۔۔۔یہ کیا کہہ رہی ہے؟ وہ سر ہلا کر تسلی کرواتی کہ پہلے ۔۔۔ قصہ سمجھے۔

"یہ اپنے شوہر کی پہلی بیوی ہے۔ پانچ بچے بھی ہیں مگر اس کے شوہر نے چند سال پہلے ایک عورت کے عشق میں مبتلا ہو کر دوسری شادی کر لی اس کے بچے بھی نہیں ہوئے۔ دبلی پتلی ہے اور بہت خوب صورت ہے۔ یہ اپنے ماں ہونے پر غرور کرتی ہے۔ مگر اگلی کو اس کی پرواہ نہیں۔ وہ کہتی ہے، جو مرضی کر لے شوہر زیادہ وقت بلکہ سارا وقت اسی کے ساتھ گزارتا ہے تو اپنے بچے لے کر بیٹھی رہ۔۔۔ تیری طرف تو دیکھتا بھی نہیں۔۔۔ اب بات بچی ہے اس کو لگتی ہے آگ ۔۔۔

تو کل اس کے منہ سے یکدم نکلا۔۔۔ غرور کس بات کا کرتی ہے پندرہ سال تک وہ اکیلی بیوی رہی ہے تو۔۔۔ تو یہ کل کی عورت۔ نخرے کس بات کے۔ ملا تو تجھے ہی مرد ہے۔ جملہ مار کے اس کو ٹھنڈ پڑ گئی اور اس کو آگ لگ گئی۔ اس کے میاں نے مکے پہ مکے مارے کہ مجھے جھوٹا کہا۔۔۔ تیری اتنی ہمت۔ رستے میں بچہ آیا تو اس کی پسلی میں بھی پاؤں مار کے نکل گیا۔"

"اللہ اتنا ظالم آدمی۔۔۔ چچ چچ چچ۔" وہ نسخہ لکھنا بھول، قلم منہ میں دابے تاسف سے روتی عورت کو دیکھ رہی تھی۔

"ارے تو کوئی جا کر اس کے شوہر کو پکڑے۔ ایسے مارتے ہیں عورت کو بھلا۔۔۔ بلکہ مارتے ہی کیوں ہیں ۔۔۔ کیا کرتا ہے تمہارا شوہر؟"

"اوس کی کرنا۔۔۔ ڈاکٹر ساب دی ڈریوری کردا اے۔"

"ارے۔۔۔ کون۔۔۔ کون سا والا۔"

"وہ عباسی۔۔۔" ڈاکٹر صاحبہ۔۔۔ پلوشے نے لاپروائی سے کہا۔

"لیاقت عباسی۔ اللہ۔۔۔" اس نے کھینچ کر کہا۔ "وہ۔۔۔ وہ وہ۔۔۔ وہ تو اتنا خاموش، شریف سا کام سے کام رکھتا ہے اور تم۔۔۔"

"اس نے کام گھر پر رکھا ہے ڈاکٹر جی۔۔۔" پلوشے کو گدگدی ہوئی۔

"بدتمیز فالتو کیوں بولیں۔۔۔ ارے دیکھنے میں کتنا سیدھا سادہ وہ دو دو بیویاں۔" وہ تو اچھل ہی پڑی تھی۔ "اتنا دھیما بولتا ہے، اتنی عزت کرتا ہے۔ میں نے تو سوچا ہی نہیں کہ ایسے۔۔۔ ایسا ہوگا۔۔۔ اللہ لوگ اپنے

چہروں پر کیسے نقاب لگا کر گھومتے ہیں۔" اس کی حیرت اسے چین ہی نہ لینے دے رہی تھی۔

ڈاکٹر کی ہمدردی اور حیرت پر مریضہ کے آنسوؤں میں شدت آگئی اور پلوشے کی مسکراہٹ بڑھ گئی۔

"یہاں سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"ہونے دیں سسٹر پلوشے سب ایک جیسے۔۔۔ مگر ڈاکٹر اتباع کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بڑی جی دار ہیں، بڑے بڑوں کے منہ سے نقاب نوچ سکتی ہیں، کسی سے نہیں ڈرتیں۔"

اتباع کے منہ میں دبا قلم نیچے گر کے لڑھک گیا اور میز پر ٹکی کہنی پھسل گئی۔

"ہیں ڈاکٹر صاحب۔۔۔ سچی!" پلوشے نے فوراً متاثر ہو کر پوچھا۔

اتباع نے تحیر سے پاس سے گزرتے اور دوائیوں کی الماری کا پٹ کھولتے ڈاکٹر غازی کو دیکھا۔

وہ لکڑی کے پارٹیشن کے دوسری جانب مرد مریضوں کی او پی ڈی میں تھے۔ کب فارغ ہوئے اور کب ان کی گفتگو سے بہرہ ور ہوئے۔۔۔ سبھرہ کرنے تک پہنچے۔

تحیر، شرمندگی، ناگواری۔ نتیجہ غصہ۔۔۔ اس نے تیز تیز ہاتھوں سے کاغذ پر نسخہ گھسیٹ کر مریضہ کو دیا اور پلوشے سے کہا کہ وہ ٹیوبز خود سے لگا دے۔

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر شاہان۔۔۔ ڈاکٹر غازی کہتے ہیں۔ آپ ایبٹ آباد تک چلیں گی۔ شام تک واپسی۔" ماسی نے آکر پوچھا۔۔۔ "بڑے ڈاکٹر صاحب بھی کھڑے ہیں۔"

"ارے واہ۔۔۔ وہ مارا۔" اتباع اچھل پڑی۔

"کہنا، سوچ کر بتاتے ہیں۔" شاہان نے سنجیدگی کا چولا پہنا۔

"آپ نے یہ کیوں کہا؟" اتباع نے پوچھا۔

"تیاری پکڑو۔۔۔ لڑکی۔۔۔ جواب تو مجھے ایسا ہی دینا تھا۔ تم نہیں سمجھو گی۔" وہ الماری کے پٹ کھول اندر گھس گئیں۔

اتباع نے آئینے میں اپنا ناقدانہ جائزہ لیا۔

جاگرز بلو جینز پر آتشی گلابی گرم لانگ کوٹ، سر پر گلابی اور سیاہ ڈاٹس کا گرم ٹوپا۔۔۔ گردن پر سیاہ مفلر دوبارہ کس لیا۔ سردی اتنی شدید نہیں تھی مگر اسے زیادہ لگتی تھی۔ دستانے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیے۔

اپنا بیگ از سر نو چیک کرتی وہ ڈاکٹر شاہان کی منتظر تھی۔ جو خود تیار ہو رہی تھیں، ساتھ ساتھ فرمودات بھی۔۔۔

"یار کبھی کبھار تو ایسی تفریح ملتی ہے ورنہ وہی ڈل لائف۔ تنکچر کی بو۔۔۔ فینائل کے بھبکے اور ڈیٹول کا پرفیوم۔۔۔ دفع۔"

☼ ☼ ☼

"آپ نے کچھ زیادہ پرفیوم نہیں لگا لیا۔ اتنی تیز اسمیل۔۔۔" گاڑی میں گھستے ہی اس کے منہ سے بے ساختہ پہلا جملہ یہی نکلا، ڈاکٹر شاہان کے پسندیدہ پرفیوم کی خوشبو گاڑی کے ہر کونے میں جا بسی تھی۔

"اچھا۔۔۔!" شاہان نے حیرت سے اپنے گریبان میں گردن گرا کر کہا۔ "لیکن میں تو بہت لائٹ خوشبو استعمال کرتی ہوں۔"

اتباع کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "لیکن آپ بہت زیادہ اینڈ ہل چکی ہیں۔"

"کیا بری لگ رہی ہے۔" وہ فوراً" فکر مندی سے پوچھنے لگیں۔

"نہیں بالکل نہیں۔۔۔ بھلا خوشبو بھی کسی کو بری لگ سکتی ہے اور آپ تو آج یوں بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو ناں؟"

"بالکل سچ۔ آپ نے کب جھوٹ پر انعام رکھا؟" وہ مسکرا دی۔

دھیرے، دھیرے مچل اے دل بے قرار۔۔۔ کوئی آتا ہے
یوں تڑپ کر نہ تڑپا مجھے بار بار۔۔۔ کوئی آتا ہے

دھیرے۔۔۔

"آپ کی آواز بہت اچھی ہے ڈاکٹر شاہان۔۔۔ اور گیت بہت ہی پیارا، شاعری بھی اور لے بھی یونہی ذہنی دیتا ہوا۔" یہ موسم، ماحول، اردگرد کے رنگ اور آپ کا گیت۔ دل جیسے خوشی سے بھر گیا۔" اس کی آنکھوں میں جگمگاہٹ سی اتر آئی۔

"تم بھی خوش ہو۔۔۔؟" ڈاکٹر شاہان نے چونک کر اس کی صورت دیکھی۔ "کیوں خوش ہو؟"

"پتا نہیں۔۔۔" اس کی جگمگاہٹ دھیمی ہو گئی۔ "دراصل"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا ڈاکٹر غازی ہمراہ ڈرائیور اور ساتھ ڈاکٹر عثمان غنی۔۔۔ وہ تھکی اور غیر محسوس طور پر سیٹ پر نیچے کی جانب سرک گئی مگر ڈاکٹر عثمان غنی کے ہاتھ میں ایک لمبی لسٹ تھی۔ جس پر قلم سے کسی چیز کا اضافہ کرتے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ اس نے چند لمحے گزارنے کے بعد طمانیت کا سانس لیا۔ وہ اس وقت باس ہی بنے ہوئے تھے اور جب وہ باس ہوتے تھے تو اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ ہاں جب وہ مسکراہٹ سے کبھی اس کی جانب بغور دیکھتے تب وہ بغلیں جھانکنے لگتی۔

اپنا بیگ کھول اس کے اندر منہ دے کر بیٹھ گئی۔

وہ جیسے اندر، باہر سے بالکل کٹ کر اپنے کام میں مگن تھی۔ مگر نہیں وین کا بل کھاتا لڑکھڑاتا سب اسے بخوبی محسوس ہو رہا تھا۔ بعض دفعہ تو اسے لگتا وہ دروازے سے اس بری طرح چپک جاتی تھی کہ ذرا سا اور دباؤ پڑا اور وہ۔۔۔ ٹھاہ سے باہر مگر خدشے دم توڑ گئے۔ وہ باحفاظت ایک سیدھے روڈ پر پہنچ گئے۔ اور یہاں دھوپ تھی اور سیدھی آنکھوں میں پڑتی تھی۔ اس نے سب کی پیروی کرتے ہوئے سیاہ گاگلز ناک پر لگا لیے۔

ایبٹ آباد مانسہرہ روڈ پر وین رکی تو سب کے پاس اپنے اپنے کاموں کی فہرست تھی۔ کس کو کہاں جانا ہے کیا کرنا ہے کیا کیا خریدنا ہے۔ صرف وہی تھی جو قطعاً" انجان اردگرد کے مناظر سے آشنائی پیدا کرنے کی کوشش میں گردن گھما گھما کر چہار اطراف کو کھوج رہی تھی۔

"مجھے ایوب میڈیکل کالج کے پاس سے کچھ بکس کے نئے ایڈیشن معلوم کرنے ہیں اور میڈیکل اسٹور سے دوائیوں کا نیا اسٹاک۔۔۔"

ڈرائیور خانو نے اسپتال کے کچن کا تین ماہ کا سامان اکٹھا کرنا ہے، سب سے زیادہ ٹائم یہ لے گا۔ اگر کوئی خاص چیز جس کا کچن میں اضافہ چاہیے یا کوئی کمی ذہن میں ہے تو ڈاکٹر شاہان لسٹ پر نظر ڈال لیں۔"

وہ سب وین سے اتر کر دائرے کی شکل میں کھڑے تھے ڈاکٹر عثمان غنی پروگرام سیٹ کر رہے تھے۔

"خانو! تم ڈاکٹر صاحب کو لسٹ فوراً" چیک کروالو۔ پھر یہ جھگیاں بازار میں گھس گئیں تو شام سے پہلے ہاتھ نہ آئیں گی۔"

"آپ جھگیوں میں کیا کرنے جائیں گی؟" اتباع نے ڈاکٹر شاہان سے سرگوشی کی۔

"بازار کا نام ہے ڈیر۔۔۔ باڑے کا کپڑا، ایک دم زبردست۔۔۔ تم بھی ساتھ چلنا۔" ڈاکٹر عثمان غنی کھنکھار کر متوجہ کیا۔

آپ کیا لینا چاہتی ہیں اور کس طرف جانا چاہیں گی؟" وہ اتباع سے مخاطب تھے۔

"مجھے تو بس فونز کرنے ہیں اور کچھ بکس لینی ہیں اور بس۔۔۔ ہاں اگر ٹائم رہا تو۔۔۔ باڑہ بھی دیکھ لوں گی۔۔۔"

"ہوں۔۔۔" تمام صاحبان سوچ میں گم ہو گئے۔

"آپ پھر میرے ساتھ چلیے۔" ڈاکٹر عثمان غنی نے کہا۔

(ارے لو خوامخواہ۔۔۔) اس نے بدک کر دوسری راہ تلاشنی چاہی۔

"اور وڈی ڈاکٹر تساں مارے نال چلو۔ پچھلی بار کی طرح ختم تریخ دا سیان لے وے ساں۔" خانو نے یاد آنے پر ترنت کہا تھا۔

(بڑی ڈاکٹر آپ میرے ساتھ چلیں پچھلی دفعہ کی طرح ایکسپائرڈ ڈیٹ کا سامان خرید لوں گا)

"لیکن مجھے تو۔۔۔" ڈاکٹر شاہان نے انکار کرنے کے

لیے جواز گھڑنا چاہا۔

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے شاہان! آپ اس کے ساتھ جائیے کینٹ بازار پھر اس طرح جلد فارغ ہوں گی تو ڈاکٹر اتباع کے ساتھ باڑہ دیکھ لیجئے گا۔" "ہم فارغ ہو کر "الیاسی مسجد" کے پاس ہوں گے۔ میں کال کر لوں گا۔"

"میں پھر الٹرا ساؤنڈ مشین والے کے پاس جاتا ہوں۔" ڈاکٹر عثمان غازی نے خود ہی فیصلہ دیا۔

"چلو ٹھیک ہے پھر یہ بھی حل ہوا "اینی پرابلم؟"

"نو سر۔۔۔" تقریباً "سب کی آواز ساتھ نکلی اور پھر مشترکہ ہنسی۔

تھوڑا ساتھ چلنے کے بعد سب کے راستے بٹنے لگے تو وہ ڈاکٹر عثمان غنی کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ اس نے کاگلز گریبان میں اٹکا لیے اکتوبر کی آخری تاریخ تھی مگر سردی نے اس کے پیچ ڈھیلے کر دیے تھے۔

سو اس پگھلی دھوپ کی چمک اور نرم سی حدت بے حد خوشگوار تھی۔

اس نے اپنے سے چند قدم آگے چلتے ڈاکٹر عثمان غنی کو بغور دیکھا۔ دراز قامت 'سر بالوں سے بھرا ہوا۔ ان کی کمر سیدھی اور چال توانا تھی۔

"پہلے بکس لیں یا فونز کرنے ہیں؟" ڈاکٹر غنی یکدم مڑے۔

"آں۔۔۔ ہاں۔" وہ چونکی "میں پہلے فون کروں گی۔"

"تو یوں کریں 'یہاں اس طرف بینچ پر بیٹھیں اور میرا انتظار کریں ورنہ پھر بات مکمل ہو جائے تو یہاں اس شاپ میں آجائیے گا۔ رائٹ۔" اس کے چہرے کو بغور دیکھتے وہ پوچھ رہے تھے۔

اس نے سر ہلا دیا۔

اس نے لاہور نمبر ملایا اور کولیگ سے والد کے انتقال پر افسوس کرتی رہی۔ اسے دلاسا دیتی رہی۔

پھر کراچی کا نمبر ملا کر کتنے ہی پل فون کی ننھی اسکرین کو گھورتی رہی اس میں ہمت نہیں تھی کہ اوکے کا بٹن دبا تی۔

گیارہ ہندسوں کے پیچھے گیارہ لوگ تھے۔ گیارہ پل ۔۔۔ گیارہ دکھ۔۔۔ اور نہیں۔ دکھ گننے کے لیے انگلیوں کی پوروں پر گنتی کے خانے کم تھے اور یادداشت اتنی وسعت کب رکھتی۔۔۔

اور اگر وہ نمبر ملا دے تو بھلا کون اٹھائے گا۔ گھر کے گیارہ افراد۔۔۔ اور ان میں سے کون بھلا۔۔۔

لیکن کتنے دکھ کی بات ہے "گیارہ کے گیارہ افراد میں سے ایک کو بھی بارہویں کی آواز سن کر خوشی نہ ہوتی۔ مسرت نہ ہوتی۔

دیکھی خوشی کی کھمبی۔۔۔ اتنی نازک چھوٹی موٹی ۔۔۔ پل بھر میں گل سڑ کر فنا۔۔۔

اُف۔۔۔

اس کا جی ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اس پر ڈپریشن کا شدید ترین حملہ ہونے کو تھا۔ وہ اس روشن چمکدار دن سے نگاہیں چرائے تلخ یادوں کی تاریکی میں کھونے کو تھی۔ مگر نہیں۔۔۔ اس کے اندر سے کسی نے اسے لتاڑا۔

"اٹھو اتباع۔۔۔! تم خوشی میں خوشی ہی کو یاد کیوں نہیں رکھتی ہو۔ بلاوجہ کا تماشا۔۔۔ سب سے بہترین عقل 'وہ ہوتی ہے۔ جو انسان کے اندر سے اٹھتی ہے۔"

اس نے خود کو صحیح وقت پر سرزنش کی تھی۔ اس نے تیزی سے سرخ بٹن دبا کر اسکرین سے نمبر غائب کر دیے سورج مکھی کے پھولوں سے سجا وال پیپر۔۔۔ جیسے اس کے اندر سے اٹھتی یاسیت کو ہڑپ کر گیا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور کتابیں دیکھنے کے لیے اسی بک شاپ سے اگلی شاپ میں گھس گئی۔ جہاں ڈاکٹر غنی تھے۔

اگلا پون گھنٹہ بے حد خوش کن اور اردگرد کو بھلا دینے والا تھا۔ رنگ برنگی چادر والی چمکیلے سر والی خوب صورت عنوان سے سجی کتابیں۔

اسے سب پسند آ رہی تھیں۔ وہ بہت طمانیت سے اوراق پلٹ رہی تھی۔

مضمحل ہوتے اعصاب کے لیے کتب بینی بہترین نسخہ بن کر آئی تھی۔ اس کا ٹوٹتا دل ٹھہر سا گیا۔ اس کی بے سکونی کو قرار آ گیا۔

☼ ☼ ☼

"دخل اندازی نہ سمجھیں تو کچھ کہوں۔" ڈاکٹر غنی بک شاپ سے نکل کر اس کے ساتھ بینچ پر براجمان ہوتے ہوئے بولے۔

وہ بری طرح چونکی "ناں۔۔۔ ناں۔۔۔ نہیں۔۔۔ پلیز ۔"

"یہ تمام بکس آپ صرف دیکھ رہی ہیں یا خریدیں گی۔" ان کا اشارہ اس کی گود میں پڑے ڈھیر کی جانب تھا کچھ کتابیں بینچ پر دونوں کے درمیان بھی پڑی تھیں۔

"نہیں سر۔۔۔ سب تو نہیں خریدوں گی۔ مگر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔"

"تو کون سی لیں گی فیصلہ ہوا یا۔۔۔؟"

"سر! مشکل فیصلہ ہے سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔۔۔ بہرحال چند ایک تو ضرور لوں گی ان میں کچھ میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں مگر دوبارہ لینے کی خواہش ہے۔

پڑھی ہوئی کتاب کو دوبارہ پڑھنا ایسے ہی ہے جیسے پرانے دوست سے عرصہ بعد ملاقات کرنا اور اسٹوڈنٹ لائف میں ہمارے پاس پرچیزنگ پاور نہیں ہوتی تھی۔" وہ کھو سی گئی۔ "کرائے پر لیتے تھے یا اولڈ بک ہاؤس سے چھانٹی کرتے تین سو کی کتاب خریدی جی بھر پڑھتے اور واپسی پر ڈھائی سو واپس مل جاتے۔ شاذ ہی کوئی نیو بک خریدی ہو۔"

وہ جیسے خود کلامی کر رہی ہو۔ اس نے بعد میں رات کو سوتے وقت جب اس سارے دن کو سوچنا تھا تو لازمی خود کو لتاڑتی کہ یوں کیوں کھل جاتی ہے۔

اور ڈاکٹر عثمان غنی میں ایسی کیا بات ہے، جو ہمیشہ وہ ان کے سامنے عیاں ہو جاتی ہے۔

مگر اس وقت تو۔۔۔ بولنا اچھا لگ رہا تھا۔

"بہت افسوس کی بات اور لمحہ فکریہ ہے ہمارے ہاں گھٹیا گندی سی ڈیز دس بیس روپے میں جگہ جگہ ملتی ہیں اور بکس کی جگہ چند ایک اور قیمتیں بساط سے باہر ۔۔۔ اب تو کراچی جیسے شہر میں بھی لائبریری ڈھونڈنا بھس کے ڈھیر سے سوئی ڈھونڈنا ہے۔ پرائیوٹ لائبریریوں تک عوام کی رسائی نہیں۔"

"بہت دکھ ہوتا ہے سر اب تو بچے عمران سیریز اور فریدی 'حمید کو ہی نہیں پڑھتے بلکہ وہ تو ان کے نام بھی نہیں جانتے ہوں گے میں اور رجا۔۔۔ رجا میری دوست سر۔۔۔ آسٹریلیا میں رہتی ہے اس کو فون کرنا ہے مجھے ۔۔۔ ارے۔" وہ جملہ ادھورا چھوڑ گھڑی کی جانب متوجہ ہوئی۔

"سوری سر! میرا دیا ہوا ٹائم ہو گیا سر۔۔۔" وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"اٹس اوکے ڈاکٹر اتباع۔۔۔ آپ ریلیکس ہو کر بات کریں۔ میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا یہ جتنی کتابیں آپ کے ہاتھ میں ہیں 'یہ تمام کی تمام میری لائبریری ہے۔۔۔ میرا مطلب ہمارے اسپتال میں میری ایک چھوٹی سی لائبریری ہے۔ وہاں یہ سب موجود ہیں اور آپ ان سے مستفید ہو سکتی ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔ میرے علاوہ کوئی انہیں دیکھتا بھی نہیں۔۔۔ نہ ڈاکٹر غازی۔۔۔ اور نہ ڈاکٹر شاہان۔۔۔ ہاں پلوشے کبھی کبھار کوئی ناول وغیرہ مانگ لے تو مانگ لے ۔۔۔"

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ سچ کہہ رہے ہیں۔"

"آپ آ کر دیکھئے گا بی بی!" ان کی آنکھوں میں مخصوص شرارتی مسکراتا رنگ ابھر آیا۔

"اور مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ ہماری بہت اچھی دوستی ہو سکتی ہے۔ آپ بھی کتابوں سے محبت کرتی ہیں اگر فون کرنے میں کچھ دیر ہے تو کچھ کھانے پینے چلیں۔"

"کہاں جائیں گے سر۔۔۔"

"دیکھیے ایبٹ آباد آئیں اور الیاسی مسجد کے پکوڑے نہ کھائیں تو بات کچھ بنتی نہیں۔۔۔ پکوڑے کھا لیتی ہیں ناں آپ۔"

اس نے فقط سر ہلایا۔ "مگر سر! یہ بکس۔۔۔؟"

"میں بلاتا ہوں کسی کو۔۔۔ ٹھہریے۔"

"مجھے شرمندگی ہو رہی ہے سر! اتنی بکس اتنی دیر سے لیے بیٹھی ہوں اور بکی ایک بھی نہیں۔۔۔"

"ارے بی بی۔۔۔!" وہ ہنسے "آپ میرے ساتھ تھیں اور میں اندر ہزاروں روپے دے کر آیا ہوں۔ آپ ذرا ذرا سی بات پر ٹینشن کیوں پالتی ہیں۔"

دیکھیے یہ الیاسی مسجد ہے یہاں بہت عرصے سے قدرتی چشمہ پھوٹتا تھا۔ پھر یہاں مسجد بنا دی گئی۔ ساتھ مدرسہ جہاں بچے قرآن حفظ کرتے ہیں۔ بلکہ اب یہ ایک سیر و تفریح کا مقام سا بن گیا ہے۔ جا بجا چھوٹے موٹے ہوٹل ہیں۔ اور ہم یہیں کے پکوڑے کھائیں گے۔ اس ٹرپ کا سب سے لازمی کام۔۔۔ کام سے فارغ ہو گئے تو پھر آپ کو "سرینا ہوٹل" سے شان دار کھانا کھلایا جائے گا۔ بس سب کو آنے دیجیے۔"

وہ ان کے ہمراہ چلتے ہوئے انہیں بغور سن رہی تھی۔

"آپ اپنی کالز کرنا۔ میں تب تک نماز ادا کر لوں۔ "کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا ناں؟ بس جگہ مت چھوڑیے گا۔"

اس نے سر زور زور سے نفی میں ہلایا منہ سے کچھ نہ بولی۔

☼ ☼ ☼

سفید ماربل کی مغلیہ طرز تعمیر سے متاثر الیاسی مسجد اس کی نگاہوں کا مرکز تھی۔ مسجد کے گنبد اور مینار دل میں عقیدت اور محبت پیدا کرتے تھے۔ آتے جاتے لوگ، مگن تیز رو۔۔۔ دھیمے۔ سر پر گرم ٹوپیاں گرم چادر سے خود کو چھپائے۔۔۔ لکڑی کی گاڑی میں آگ جلائے مکئی کے دانے بھونتا پٹھان۔۔۔ اس کے پاس رش تھا۔ یہ لوگ مکئی کے دانوں کے شائق تھے یا آگ کی لپٹوں سے گرمائش سینکنے کے لیے نزدیک تھے؟ ایک اخبار والا اخبار کی سرخی زور زور سے پڑھتا بھاگتا جا رہا تھا اور وہ اس سب ہجوم اور شور سے ذرا پرے پر سکون گوشہ چن کر آسٹریلیا رجا سے ہمکلام تھی۔

اس کے چہرے پر آسودگی تھی۔ مسرت اور جوش

اس کی آواز کبھی مدہم ہو جاتی اور کبھی وہ جوش کے انداز میں فون کو ایک کان سے دوسرے کان پر منتقل کرتے سلسلہ جوڑے رکھتی۔

ایک ہاتھ سے فون تھامے دوسرے سے اپنے بیگ کی لیس سے کھیلتی وہ اس وقت اس اتباع سے بہت مختلف نظر آ رہی تھی جس کی آنکھوں میں خالی پن ہوتا تھا۔ جو اکثر بے حد اداس اور چپ نظر آتی تھی۔ خفا خفا۔۔۔ گلہ کرتی نگاہیں۔۔۔ انجان۔۔۔ بے یقین۔۔۔ کھوئی سی خود سے ہمکلام۔۔۔

وہ ویسے ہی اپنی عمر سے کم دکھائی دیتی تھی اور ڈاکٹر صاحب تو بالکل نہیں مگر اس وقت بے ساختہ ہنستے ہوئے وہ کھلنڈری کالج گرل دکھائی دے رہی تھی۔

اپنے ابا کے بند موبائل پر بیل مار مار کے عاجز ڈاکٹر غازی انہیں تلاشتے مسجد تک آ گئے تھے۔ غالب گمان تھا کہ وہ نماز کی ادائی کے لیے اندر ہوں گے اس لیے فون بند ہو گا مگر وہ ان کی مرید کہاں گئی؟

وہ ایک درخت کے تنے پر ٹکی دکھائی دے گئی۔ سکھ کا سانس لیتے وہ چائے لینے مڑے۔۔۔ بھوک اور تکان۔۔۔

تام چینی کی نیلے رنگ کی چینک اور چھوٹی سی پیالیاں۔۔۔

"ہاں۔ زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ زندگی پر سکون ندی کی طرح ہو گئی ہے سبک خراماں خراماں۔۔۔"

"یار! خون کی کشش بہت معنی رکھتی ہے۔ رات کو جب نرم گرم بستر میں چھپ کر آنکھیں موندتی ہوں تو سب کے چہرے چھم سے آگے آ جاتے ہیں۔ دکھ بس تب ہوتا ہے جب اچھے رویے دیکھ کر دل دکھاتے روپ یاد آ جاتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر مدہم ہو چکی تھی۔ لہجہ پژمردہ اور انداز مایوس سا۔۔۔

"نہیں نہیں رجا۔۔۔!" اس نے تیزی سے صفائی دینے کے لیے منہ کھولا تھا۔ "اب بھی کہیں پھنسوں تو فوراً "سوچتی ہوں، رجا ہوتی تو کیا کرتی۔" وہ ہنسی۔ بس پھر وہی کرتی ہوں۔" "اس وقت بھی تمہارا بھیجا پنک کوٹ پہن رکھا ہے۔ پتا نہیں اچھی لگ ہی رہی ہوں کہ نہیں۔"

اس نے لاپروائی سے ایک کنکر اٹھا کر دور پھینکا۔ ڈاکٹر غازی نے اسے سر تا پا گہری نگاہ سے دیکھا اور اس کے قیاس کی دل و جان سے تائید کی، وہ بے حد پیاری اور منفرد لگ رہی تھی۔

"پاگل ہو تم۔۔۔ میں کوئی پڑوسن پڑوسن کھیل رہی ہوں کہ جی تایا ابوا! چائے کی پتی ختم ہے دے دیں۔" وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

اور تمہارے مشورے کے مطابق منہ ٹیڑھا بھی کروں تو کیا۔۔۔ کہوں۔۔۔ جی اپنا لیپ ٹاپ ادھار دے دیں مجھے اپنی بھانجی دیکھنی ہے۔ واہ ارے لو خوامخواہ کا شوق کیوں نہیں۔ میں تو مری جا رہی ہوں۔۔۔ اس کا پیارا چھا منہ دیکھنے کو۔"

اس نے تلملا کر گویا نادیدہ طور پر بلائیں لیں۔

"لے لے۔۔۔ مہلا یارا ابلی۔۔۔ سوہنا۔"

ڈاکٹر غازی نے بہت مشکل سے اپنا قہقہہ ضبط کیا وہ ہو بہو ویٹر کی طرح بیٹھے تھے۔ کب گفتگو کا خاتمہ ہو اور وہ چائے پیش کریں مگر خاتمہ۔۔۔؟ ابھی تو شاید وقفہ بھی دور تھا۔

ڈاکٹر اتباع فاطمہ اردگرد سے بے گانہ تھیں۔

ڈاکٹر غازی نے پیالی میں چائے انڈیلی اور بصد احترام ذرا سا آگے ہو اپنا منہ دکھاتے ہوئے پیش کی۔ موصوفہ گفتگو نجانے کب سمیٹتیں ٹھنڈے موسم میں ٹھنڈی چائے؟ اونہوں۔

اتباع کا سارا دھیان رجا کے جملوں کی جانب تھا۔ دھواں اڑاتی چائے کی پیالی متشکرانہ نگاہوں سے دیکھ کر تھام لی۔

لب کس بات پر دل کھول کر ہنسا جا رہا تھا۔ اس بات سے قطعی بے فکر کہ۔۔۔ ڈاکٹر غازی یک طرفہ گفتگو سے جی بھر مستفید ہو چکے تھے اور ہو رہے تھے۔ بڑی فرصت سے ساتھ ہی تو بیٹھے چائے حلق سے اتار رہے تھے۔

ساتھ ہی دل کو دھڑکا لگا۔ کنکر اچھال اچھال کر گفتگو کی تو اتباع صاحبہ نے اگر پیالی بھی اچھال دی تو۔۔۔

☼ ☼ ☼

"تم نے درست کہا تھا رجا۔۔۔ انسان کوئلہ نہیں ہوتا اور نہ ریت کہ رڑکے۔۔۔ انسان نمک سے بنا ہے۔ حل ہو جانا، ضم ہو جانا اس کی فطرت ہے۔ تمہیں پتا ہے چینی ٹھنڈے پانی میں دیر سے گھلتی ہے اور گرم میں جلدی۔۔۔ یہاں بہت زیادہ ٹھنڈ ہے۔ دیر ہی سے سہی مگر میں بھی گھل گئی۔"

اس کا جملہ کسی حد تک شریر ہوا اور پھر کچھ خود اذیتی سے بھر گیا۔

"تم یہ فلسفیانہ جملے بہت خوشی سے بھی کہہ سکتی تھیں کہ رجا میں خوش ہوں مطمئن ہوں۔ زندگی کا مقصد ہے۔ کوئی ناقدری نہیں۔۔۔ مگر تم کو بھی عادت ہو چکی ہے اپنے دکھوں کا ماتم ہر گزرتی سانس کے ساتھ کرنا۔"

"ایسا نہیں رجا۔۔۔ مگر میں ان سب کو بھول نہیں پاتی رویوں کو، لوگوں کو اپنے شہر کو اپنے گھر کو۔۔۔ میں۔۔۔"

"انسانوں کو کیٹ گرائز کیا جائے ناں تو تم۔۔۔ نوازی ہوئی مخلوق ہو گی اور اگر احمقوں کو درے لگائے جائیں تو تیل میں بھیگے ڈیڑھ سو۔۔۔ تمہارے لیے ناشکروں کی فہرست تیار ہو تو پانچ سو پکے۔۔۔ چھ سات کی فرمائش میں بھی شامل کر دوں۔۔۔ ہونہہ۔"

رجا کا موڈ واقعی خراب ہو گیا تھا۔

"یتیمی کے باوجود۔۔۔ رشتے والوں کے ناروا سلوک کے باوجود۔۔۔ مالی پریشانیوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے بھی۔۔۔ تم ڈاکٹر بن گئیں اتباع! ورنہ یتیم ٹھوکروں پر ہوتے ہیں، یتیم خانوں میں رہتے ہیں اور جمعرات کے جمعرات چار خانہ رومال کندھوں پر سجا تنکوں کی ٹوپی سر پر رکھے۔۔۔ چندہ مانگنے جاتے ہیں۔

رشتے داروں کے غیر انسانی رویوں سے خبطی، پاگل نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں مفت کا نوکر بن کر گالیاں، کوسنے، مکے سہتے ہیں۔ ان کی اپنی سوچ، اپنی خواہش اور اک فہم سب منجمد ہو جاتا ہے حکم کے غلام عاجز

بندے...."

"تو کیا میرے ساتھ یہ سب نہیں ہوا۔" اس نے بہتی آنکھوں سے بھرائی آواز کے ساتھ اسے اچھل کر ٹوکا تھا۔

"میرے ساتھ بھی تو.... میں بھی سردی سے کپکپاتی.... وائل کی ملگجی قمیص میں کوئٹہ کی یخ بستہ ہواؤں کو سہتی تھی۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے دعوتوں کے بڑے بڑے پتیلے مانجھتی تھی جب سب تکان مٹانے کو آڑے ترچھے لڑھکے چائے کے سپ لیتے تھے۔ مجھے بھی تو میرے گھر سے، کمرے سے، کھلونوں سے دور کیا گیا۔ میرے پاس۔" وہ جیسے پھٹ پڑی۔

"تم تو ہر چیز کی گواہ ہو رجا.... اس کا لہجہ دکھ سے بوجھل ہو گیا۔ "تمہاری امی نے مجھے سوئیٹر بن کر دیا تھا۔ تمہارے لنچ بکس میں میرے لیے پراٹھا ہوتا تھا۔ میں بریک میں کلاس روم میں بیٹھتی تھی کہ میرے پاس....

میرے سگے چچا، تایا.... میں نہیں بھول سکتی.... کہ۔"

"اور پھر وہی چچا تمہارے لیے نجات دہندہ بنے۔ تم یہ کیوں بھول جاتی ہو۔"

رجا چلائی تھی۔

"تم رلی نہیں برباد نہیں ہوئیں۔ والدین کی موجودگی عیش و آرام توجہ، محبت ہر شے حاصل ہونے والے بچے نکمے، نکھٹو نکلتے ہیں۔ ناکام، اچھے رزلٹ نہیں دیتے۔ اپنی تربیت پر حرف لگاتے ہیں۔ بدنامی ذلت کا موجب بن جاتے ہیں مگر تم۔ اللہ نے کچھ چیزیں لے کر.... تمہیں کتنا نواز دیا محفوظ مستقبل، عزت دار پروفیشن محبت سب دی.... اور میری جیسی ناصح۔

تائی، چاچی پراٹھے بنا کر نہیں دیتی تھیں تو کیا، اللہ نے میری امی کو یہ کام سونپ دیا اور پھر چچا کی محبت.... اظہار کرنے کے لیے چوما چاٹی نہیں تھی مگر ثابت ہوا ان کا ان کنڈیشنل لو (بے غرض محبت)

تم ان کی نگاہ میں ہمہ وقت نہیں رہیں۔ مگر جو وہ تمہارے لیے کر گئے جو سب سے "بہترین عمل" اور تم۔"

"وہ بہترین عمل.... سزا بن گیا۔ میں گھر سے بے گھر ہو گئی۔ نفرت، اکتاہٹ، بیزاری نے۔"

اس نے رجا کی بات بے صبری سے کاٹی تھی۔ بہتے آنسوؤں کو سختی سے رگڑتے وہ بولنا شروع ہو چکی تھی۔

"ارے.... سوری اتباع.... رانیہ جاگ گئی شاید اس نے کپڑے گندے کر دیے۔ سوری یار.... میں ذرا اسے دیکھوں۔"

اتباع نے اچانک سیاہ ہو جانے والی سکرین کو گھورا اسے بھڑاس نکالنے اور اتنے دنوں بعد بولنے سے بہت سکھ مل رہا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اسے نیم جان کر دیا تھا۔ اس نے چند لمبی سانسیں کھینچ کر خود کو وارم اپ کرنا چاہا۔ مگر وہ ہار گئی۔ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اتنے دنوں بعد رجا کو سننے سے ملنے والی خوشی۔

سب بھاڑ میں گئی۔

رجا، رجا، رجا مقصود۔

اس کا واحد مخلص زندہ رشتہ جس کی محبت اور بے غرضی پر اسے کوئی شک نہ تھا۔ مایوس زندگی کے دلدل میں دھنستے ہوئے اسے مل جانے والا ہاتھ رجا۔ رجا اور اس کی امی۔

رجا اس کی زندگی میں فیصلہ کا ٹھپہ بن کر داخل ہوئی اور اس کی امی بزرگ دوست، ناصح اس کی فکر کرتیں۔ اسے پچکارتیں۔ دلاسا دیتیں۔

ہاں گلاس آدھا خالی ہی نہیں ہوتا۔ وہ آدھا بھرا ہوا بھی ہوتا ہے۔

وہ جیسے ماضی کو یاد کر کر اور رو رو کر تھک گئی۔ نڈھال ہو گئی اب رونے میں وہ شدت نہیں تھی۔ مگر وقفے وقفے سے ابھرتی سسکیاں بڑے امتحان کی بات تھی۔

سو ڈاکٹر غازی "جاؤں نہ جاؤں" کی تکرار سے پریشان اس کے سامنے آ گئے۔ وہ حسب عادت گرد و

بے خبر خود ہی میں مگن تھی۔ ڈاکٹر غازی کرسی کر بیٹھ بھی گئے۔

ہلکا کرتی رہی۔

پ کی دوست صحیح کہہ رہی تھیں۔ ڈاکٹر اتباع

یں....!" وہ بری طرح چونکی اور آنسوؤں سے اٹھا کر سرخ آنکھیں ان پر ٹکا دیں۔ بے تکلیف کے احساس پر شرمندگی۔ شرمندگی اور ہو جانے کا غم....

دن الیاسی مسجد کے سامنے چائے کا کپ مزے چڑھا لیا۔ یہ نہ دھیان دیا موصوف ساتھ ہی تو ہیں۔ ہوش اس وقت آیا۔ جب ڈاکٹر غازی نے آفر کی کہ وہ اپنی بھانجی دیکھنے اور بہن سے بات کے لیے ان کا لیپ ٹاپ لے سکتی ہیں۔

وہ لیپ ٹاپ ہاتھ میں لیے بڑھائے کھڑے تھے۔ اقرار، شکریہ سے پہلے تو اسے تھامنا پڑا۔

مگر نہیں.... یہ باپ بیٹا.... انہیں ذرا شرم نہیں چھپ کر باتیں سننے۔

"یقین کریں جب آپ اندر داخل ہوئیں۔ میں اس کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا بلکہ میں نے آپ کو مسکرا کر بھی دیکھا.... مگر آپ.... آپ شاید بہت زیادہ ایکسائیٹڈ تھیں۔ آپ کو خبر ہی نہ ہوئی۔"

"ہیں....!" وہ بے حد شرمندہ ہو گئی "ایسا ہی ہوا ہوگا۔"

"میں آپ سے زیادہ امپریس ہوں نہ نکلنے کے بیٹھنے کی ہمت.... یقیناً نہ جائے رفتن نہ پائے.... مگر بہر حال۔

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہی تھیں ماضی یاد رکھنے کی چیز اور پھر ماضی بھی وہ جو تکلیف دہ ہو.... آپ حال لیے اور مستقبل کے خوب اچھے خواب بنیے آپ کے دل کا حال نہیں جانتا.... مگر آپ اتنی ڈاکٹر ہیں اپنے پیشے سے مخلص.... قابلیت درمندی، فکرمندی.... احساس ذمہ داری اور

اس سے بڑھ کر ایک ڈاکٹر کے لیے کیا ضروری ہو سکتا ہے۔

آپ آج یہاں ہیں کل کہیں اور ہوں گی اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی۔ آپ کے لیے ہر راستہ روشن ہی ہے۔"

"کیوں.... کیوں؟" اس نے تیزی سے اس کی بات کاٹی.... گویا کرنٹ کھایا۔ "کیوں میں کل کہیں اور کیوں ہوں گی۔" وہ بے حد دکھ سے چلائی تھی۔ "کیا ٹکنا میرا نصیب نہیں.... میں کہیں جم نہیں سکتی میرے حصے کی زمین کہیں نہیں.... میں جب دل لگانے لگتی ہوں.... در و دیوار سے محبت کرنے لگتی ہوں، مجھے کہہ دیا جاتا ہے کوچ کرو تیاری پکڑو.... آپ بھی یہی کہتے ہیں کہ کل...."

غم کی شدت نے آواز حلق میں گھونٹ دی۔ اس کے رونے اور پھٹ پڑنے سے حواس باختہ.... ڈاکٹر غازی عجلت سے اس کے لیے پانی کا گلاس بھرنے لگے کچھ پانی بھی چھلک گیا۔

"آئی ایم سوری ڈاکٹر! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا آپ کے لیے دنیا بہت روشن.... آپ اور ترقی کریں گی مزید پڑھائی.... تجربہ.... آپ کے تو راستے روشن ہیں پلیز...."

اس نے گلاس بڑھایا۔

اتباع نے ڈبڈبائی سیاہ گھنی پلکوں والی سیاہ آنکھیں اٹھا کر انہیں دیکھا۔

شکوہ کناں نگاہیں۔ پھر سر جھکا کر پانی کے گھونٹ اتارنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آپ لوگ سچ کہہ رہے تھے۔ باڑہ کے کپڑے واقعی بہت شاندار ہیں۔" اس نے ستائشی نگاہوں سے ڈاکٹر شاہان کو دیکھا۔ وہ ہلکے نیلے اور براؤن گرم نئے سلے سوٹ میں بے حد پیاری لگ رہی تھیں۔

"تم نے اس دن انٹرسٹ ہی نہیں لیا۔ ورنہ چلتیں

میرے ساتھ تو۔۔۔"

"تو پھر اب چلتے ہیں کسی روز۔۔۔" اس نے کہا۔

"بھول جاؤ کسی روز کو۔۔۔ نومبر کا آغاز ہے اور ڈاکٹر عثمان غنی۔۔۔ یہ جو ہم اس دن پورا دن ایبٹ آباد کے چپے چپے میں گھومے ہیں' ہم نے دراصل سردیوں کا اسٹاک اکٹھا کیا ہے۔ خوراک' راشن' ادویات' کپڑے۔۔۔ اور ہر وہ چیز جس کی ضرورت یہاں اسپتال میں سردیوں میں پڑے گی۔ شدید سردی اور اگر برف باری ہو جائے تو جا نو پائپوں میں پانی جم جاتا ہے اور گاڑیوں میں پٹرول۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک ڈھیر اس دن خرید آگیا ہے' ایک چھوٹی لسٹ ابھی اور تیار کرلی گئی ہے اور وہ بھی اسی ہفتے نبٹا دی جائے گی۔

جیسے جانور' پرندے سردیوں کی تیاری کرتے ہیں خوراک ذخیرہ کرتے ہیں۔ اور بعض اپنی اپنی کمین گاہوں میں چھ چھ ماہ کے لیے غائب ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی مانو یونہی کرتے ہیں۔ بس یہ کہ انسان ہیں تو خوراک کے علاوہ سو اور لوازمات۔۔۔ ڈاکٹر صاحب نے تو دوائیاں کا بہت بڑا اسٹاک اکٹھا کرلیا۔ کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ہم تو اب مارچ ہی کے بعد نکلیں گے بہار کے ساتھ۔۔۔ اگر تمہیں جلدی ہے تو معلوم کرلو۔۔۔ ایک چکر اور۔۔۔" ڈاکٹر شاہان نے اسے طویل تفصیل سے آگاہ کیا۔

"میں نے تمہارے لیے بھی کچھ چیزیں لی تھیں۔ سوٹ' شال اور ایک ٹوپا۔۔۔ تین روز سے مسلسل کیس آتے رہے۔ آج ہی تو شاپنگ بیگز کھلے ہیں۔۔۔ پلوشے ڈاکٹر صاحب کو ان کا بیگ دو۔"

"مگر اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔

"لو کیوں۔ ضرورت کی کیا بات۔۔۔ تم صرف کہو پسند آیا کہ نہیں۔۔۔"

اتباع جھونہی سی کھڑی رہی۔ پلوشہ ہی نے بیگ پلٹا۔

مہندی اور گاجری رنگ کا گرم سوٹ۔۔۔ بے حد خوب صورت تھا۔ ٹوپا بہت ملائم چیتا پرنٹ' جبکہ شال سیاہ تھی مگر۔۔۔

"میں یہ رکھ لیتی ہوں۔" اس نے سوٹ اور ٹوپا اٹھا لیا "میرے پاس آل ریڈی دو بلیک شال ہیں۔"

"ارے تو کوئی بات نہیں پلوشہ! وہ سفید شاپر دو۔ اتباع دوسری شال لے لیں گی۔"

پلوشے نے شاپر بیڈ پر پلٹ دیا۔

"یہ میں نے اپنے گھر والوں کے لیے خریدی ہیں۔ میرے بھانجے آتے ہیں برف باری دیکھنے تو لے جائیں گے' کوئی مسئلہ نہیں۔ ڈاکٹر شاہان اسے ہمت دلائی۔

رنگ ہی رنگ۔۔۔ مشکل مرحلہ۔۔۔ مگر اس نے یکدم ہاتھ بڑھا کر ایک شال اچک لی۔

گہرے نیلے رنگ پر۔ سفید اور گلابی ریشم شیشے کا کام تھا۔ پسندیدگی نے چہرے پر مسکراہٹ دوڑا دی۔ وہ بجھ کر اس کی ملائمت کو محسوس کر رہی تھی۔

ڈاکٹر شاہان کے پھیکے پڑتے چہرے اور پلوشے کے چونکنے کو محسوس ہی نہ کر سکی۔

"ویسے تم نے اس دن کون سی کتابیں خریدیں۔ دکھائی نہیں۔۔۔؟"

"کہاں خریدیں۔۔۔ خریدنی تو بہت سی تھیں۔ مگر۔۔۔" وہ اپنی الماری کی جانب بڑھی اور تین کتابیں ڈاکٹر شاہان کو تھمائیں۔

"صرف تین کتابیں۔۔۔ جبکہ تم تو اتنا شور کر رہی تھیں کہ بکس اور رسائل لینے ہیں۔ دنیا سے کٹ کر بیٹھے ہیں۔ ملی نہیں کیا کتابیں۔۔۔؟"

ارے نہیں۔ کتابیں تو بہت ملیں۔ نیو بکس بھی۔۔۔ مگر سر کہنے لگے کہ ان تین نیو بکس کو چھوڑ کر باقی کی تمام ان کی لائبریری میں ہیں میں وہاں سے لے کر پڑھ سکتی ہوں۔۔۔ بلکہ انہوں نے مجھے فاضل چابی بھی دی۔ پرسوں رجا سے بات کرنے میں لائبریری ہی گئی تو تھی۔"

"ڈاکٹر غنی۔۔۔ نے آپ کو۔۔۔ بکس کو پڑھنے کا کہا؟" پلوشہ حیرت سے رک رک کر بولی۔ "اور چابی بھی دی؟"

اتباع نے حیرانی سے سر اثبات میں ہلایا۔ وہ ان دونوں کے حق دق چہرے دیکھ رہی تھی۔



"بس اللہ جانے کون ایسی بے پر کی اڑا دیا کرتا ہے۔ آئیوڈین والا نمک استعمال نہ کریں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے لیے اس میں کچھ ملایا ہوتا ہے۔

پولیو کے قطرے نہ پلائے جائیں۔ یہ بھی آنے والی نسلوں کی بار آوری کو ختم کرنے کا قطرہ قطرہ زہر ہے۔ خوامخواہ کی بکواس ہونہہ!" ڈاکٹر شاہان ناگواری سے بولتے ہوئے سامان اٹھا رہی تھیں' رکھ رہی تھیں۔ وہ بھی تیار تھی۔ دراصل آج انہیں دو گروپوں کی صورت دور اوپر پہاڑی علاقوں کی جانب جانا تھا۔ جہاں پردے کی بے پناہ پابندی تھی۔ اور وہم و خدشات پر یقین مرتے رہتے رہتے۔ مگر انگریزی علاج سے دور بھاگتے انہیں قائل کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ خود تین ماہ بعد یا چھ ماہ بعد اپنے علاج معالجے کے لیے اسپتال تک چل کر آئیں۔ وہ لوگ خود جاتے۔

اس بار اسے بھی جانا تھا۔

لیڈی ڈاکٹرز اور پلوشہ کا جانا یوں ضروری تھا کہ عورتیں عورتوں میں گھس جایا کرتی تھیں۔

جیپوں میں سوار ہونے سے پہلے ڈاکٹر غنی نے سب کو پلان دیا۔ وہ سب دائرے میں کھڑے ہمہ تن گوش تھے۔ سر اثبات میں ہلا رہے تھے۔

ڈاکٹر شاہان اور پلوشے دونوں میرے ساتھ۔"

"اور آپ ڈاکٹر اتباع ڈاکٹر غازی کے ساتھ۔۔۔"

اتباع ٹھٹکی۔

"وہ۔۔۔ اور ڈاکٹر غازی۔۔۔ اکیلے؟" چند منٹوں تک اس کا ذہن ہر چیز سے خالی ہو گیا۔ وہ اب صرف ملتے

لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ قوت سماعت دماغ تک پیغام نہیں پہنچا رہی تھی۔ دماغ کو کچھ اور ہی سگنل مل رہے تھے۔ جو بینائی اور زبان پر حاوی ہو گئے۔

مہندی رنگ شلوار قمیص پر پشاوری ٹوپی پہنے ڈاکٹر غازی اور آتشی گلابی گرم سوٹ میں وہ۔

اسے سامنے کے منظر کے بجائے کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا۔

ڈاکٹر غازی کے ہمراہ وہ..... نہیں ماموں کے سالے کے ہمراہ وہ..... ہاں ایسا ہی منظر تھا۔

وہ کراچی بدر ہونے کے بعد لاہور چلی آئی تھی لاہور ماموں کے گھر۔ وہ مرحومہ ماں کے بھائی تھے۔ اسے ان سے خوشبو آئی۔ ماں کی خلوص کی محبت کی..... وہ ددھیال سے بہت محبت کرتی۔ جب اسے وہاں سے نکل جانے کا کہا گیا تب اس کے پاس دوسرا ٹھکانہ کون سا تھا بھلا۔ ہاں وہ مالی طور پر مضبوط ہو چکی تھی۔ مگر پیسہ ہر مسئلے کا حل ہوتے ہوئے بھی بعض جگہ بے کار ہوتا ہے۔

وہ کہاں جائے گی..... وہ کہاں جائے؟؟ یا اللہ۔

اور پھر ماموں نجانے کیسے آ گئے اور لمحوں میں فیصلہ ہو گیا۔ وہ ان کے ساتھ جائے گی۔ وہ وہاں اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی کرے گی۔ اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

تو کوئی بات نہیں۔ سب ٹھیک تھا اور وہی اس کی اعتبار کرنے والی فطرت..... اسے اپنے اردگرد پھیلی معنی خیز خاموش نگاہوں کی گفتگو پتا بھی نہ چلتی۔ سمجھنا تو دور کی بات۔

وہ ماموں زاد بہن بھائیوں کے اکلوتے ماموں کو ماموں ہی کہتی تھی اور اس کے علاوہ ۔ کہنا بھی کیا چاہیے تھا۔

مگر پلاننگ کیا تھی۔ اس کے اپنے ماموں زاد بہت چھوٹے تھے۔ اسے بہلایا گیا، بتایا گیا۔ سمجھایا گیا کہ اس کا مستقبل بہت شان دار ہو گا ماموں کے سالے کے ساتھ لیکن اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی اس رشتے کے لیے۔ اس کے عزائم سیدھے سادے تھے۔ پڑھائی کیریر واپسی۔

اس نے صاف انکار کر دیا اور رویے بدلنے پر ہاسٹل شفٹ ہو گئی۔

پھر ایک روز ماموں مامی آئے، معافی تلافی۔ وہ دوبارہ سے چھٹی میں گھر جانے لگی سب ٹھیک تھا مگر نہیں

اسے باقاعدہ پلاننگ کے ساتھ ماموں مامی نے سالے صاحب کے ساتھ اسپتال لانے لے جانے کا کام دیا۔ اسے لگا سب نے تسلیم کر لیا ہے۔

مگر یہ اس کا اعتماد جیتنے کی کوشش تھی۔ ماموں کا گھر لاہور شہر کے کافی باہر تھا۔ وہ راستے میں کتابوں کا مطالعہ کرتی گردوپیش سے بے خبر بیٹھی رہتی۔ گاڑی کا ویرانے میں رکنا۔ سالے صاحب نے بہت دیر تک بونٹ اٹھا کر درستی کی کوشش کی پھر جیسے جھک کر پچھلی نشست پر نیم دراز ہو گیا وہ آگے سے اتر آئی۔

"آپ ایسے کیسے لیٹ گئے ہیں چھوٹے ماموں! اندھیرا بڑھ رہا ہے اور اتنی سنسان سڑک..... پلیز کوشش کریں ناں۔" وہ پچھلی نشست پر اس کے پیروں کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کوشش ہی تو کر رہا ہوں۔ ایک سال سے۔" وہ آنکھوں پر رکھے ہاتھ کو اٹھاتے ہوئے عجیب سا مسکرایا

"جی؟"

"اب تو عمل کا وقت ہے۔" اس نے یکدم ذرا سا اٹھ کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے کھینچا۔ وہ دھڑام سے اس کے اوپر آ گری اور جکڑی گئی اس کے پرہوس شکنجے میں

.....

"کیا کر رہے ہیں۔ چھوٹے ما۔" اتباع کا منہ اس کی گردن کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔ بمشکل سر کو ذرا سا اٹھاتے ہوئے وہ پوری جان سے چلائی تھی۔

"اونہوں..... چلانے کی کوشش نہ کرنا۔ کوئی نہیں آئے گا۔" اس نے اس کو ذرا سا ڈھیلا کرتے ہوئے اس کے بال سہلائے تھے۔

"مجھے چھوڑ دیں۔" وہ حلق کے بل چلائی مگر ناکامی کا سامنا۔

وہ بری طرح جکڑی جا رہی تھی۔ وہ بری طرح مچلی جا رہی تھی۔ اس کی پوری کھال اتار کر نمک مرچ لگا کر رکھ دیا جاتا، وہ تب بھی اتنی شدت سے نہ تڑپتی چلاتی، جتنی جدوجہد اس نے کی مگر آگے باقاعدہ پلاننگ تھی۔

وہ دبلی پتلی، انجان بے خبر۔

وہ کھاگ تنو مند زور آور اور سب سے بڑھ کر بدنیت ہوس کار۔ ہر شے اس کے لیے سازگار۔

مگر نہیں۔ اتباع کا منہ اس کے شانے کی جانب دبا ہوا تھا اور اس کا سانس گھٹا ہوا تھا۔ مگر ذہن و دل میں کوئی گھٹن نہیں تھی۔

اس نے گردن کے نرم گوشے میں اپنے دانت پورے جسم کی طاقت لگا کر گاڑ دیے۔ بوٹی یقیناً" اس کے دانتوں میں دب گئی تھی، اگلے ہی پل وہ آزاد تھی۔

اس نے پوری طاقت سے دروازہ بند کر کے پنڈلی کی ہڈیوں پر شدید چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ ایک جوتا نکلا پھر دوسرا پھر دوپٹا..... پھر بال کھل گئے۔

اس کے پیروں میں چبھنے والے پتھروں، کانٹوں سے نکلنے والا خون راستوں پر نشان چھوڑ رہا تھا۔

وہ بچ گئی تھی۔ اس نے اپنی عزت بچالی تھی۔ اس نے منافق چہرے کو پہچان لیا تھا۔ وہ زندگی میں دوبارہ کبھی۔ کسی کا اعتبار نہیں کرے گی۔ ہر شخص کے اندر کیا چلتا ہے۔ نہیں پہچانا جا سکتا۔ وہ بھی۔

"نہیں۔" وہ بری طرح کھوئی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر زلزلے کے تاثرات تھے۔

"آپ کہاں ہیں ڈاکٹر اتباع؟" ڈاکٹر غازی نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا۔

"آں..... ہاں..... نہیں۔"

"کیا نہیں.....؟"

"میں..... مم مم..... میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔" وہ قطعیت سے نفی میں سر ہلاتے بولی اور کسی چھوٹے بچے کی طرح ڈاکٹر عثمان غنی کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"میں آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" اس نے بالکل ناسمجھی کے عالم میں ان کے ہاتھ کو تھام لیا تھا۔ ڈاکٹر غازی کا چہرہ ناسمجھی کے بعد پھیکا سا پڑ گیا۔

ڈاکٹر عثمان غنی کو پل بھر کچھ احساس سا ہوا، اپنا ہاتھ غیر محسوس طور الگ کرتے ہوئے وہ سب کو دیکھ کر مسکرائے۔

"ٹھیک ہے اتباع میرے ساتھ اور ڈاکٹر شاہان، پلوشے آپ غازی کے ساتھ نکلیے۔" انہوں نے بیٹے کو اشارہ کیا۔

"ایسے کیسے ایک منٹ میں..... پوری پلاننگ ہوتی ہے یوں یکدم۔" شاہان کے چہرے پر حیرت کے بعد ناگواری سی آ رکی۔

"اٹس او کے شاہان..... کام تو ایک ہی کرنا ہے ناں آپ نکلیے۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہتے جیپ کی جانب بڑھے۔ اتباع کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی معمول کی طرح پیچھے لپکی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہ پل بھر کو رکے اور اتباع کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا۔ انہیں لگا وہ کہیں اور ہی پہنچی ہوئی ہے۔

"سب ٹھیک ہے ناں بیٹا.....؟" وہ ذرا سا جھکے اپنائیت سے پوچھ رہے تھے۔

"ہاں!" اس کے منہ سے ٹھنڈا سانس نکلا۔

"میں ٹھیک ہوں سر! آپ چلیے۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

ڈاکٹر غنی نے چند پل رک کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

ایک بہترین مصروفیت کے ساتھ گزرا دن خوش گوار یت کا دیرپا احساس چھوڑ گیا۔ اس کے اعصاب پرسکون تھے۔ نئے تجربے، نئے لوگ، نیا پن..... وہ مگن سی ہو گئی۔ اور یہی اس کی فطری خامی تھی شاید۔ اداس ہے تو گردوپیش سے بے بہرہ۔ خوش ہے تب بھی بے خبر۔ کیا ہو رہا ہے۔ ہلکے پھلکے بدلاؤ کا پتا لگنا تو مشکل ہوتا ہے مگر یکسر الٹ ہو جائے تو.....

اسے ڈاکٹر شاہان کا رویہ کچھ روکھا، الجھا اور خفا سا مروت کے اندر گندھا گندھا سا لگا۔ وہ بے تکلفی اور

اپنائیت۔ اسے کمرے کا ماحول کچھ ٹھٹھرا سا لگا۔۔۔ شاید وہم۔

مگر پھر وہاں باہر۔۔۔ ڈاکٹر غازی۔ اوہ اس دن اس نے کیا کر دیا تھا۔ اس نے کافی کا مگ بنایا۔ خود کو شال میں لپیٹا اور تسلی سے بیٹھ کر اس دن کو سوچا اور جی بھر کے سوچا۔ نتیجہ۔ شرمندگی‘ افسوس‘ پچھتاوا۔

بے خیالی میں کیا کر دیا۔ اسے معذرت کرنی ہو گی۔ ڈاکٹر غازی جیسے اچھے دردمند انسان۔ ان کے کردار کی پاکیزگی‘ سوچ کا نکھار ان کے چہرے سے‘ چال ڈھال سے جھلکتا تھا۔

لیکن اس دن۔۔۔ وہ معذرت کرے گی ناک رگڑنے کی حد تک‘ کسی کے بارے میں غلط گمان کرنا۔ گناہ عظیم ہوتا ہے۔۔۔ ہاں۔

وہ خود کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔۔۔ ہاں۔

جب ذہن و دل صاف ہوا تو ہر شے اچھی لگنے لگی۔ وہ بہت جوشیلے انداز میں ڈاکٹر غازی کے کمرے تک آئی مگر دھاڑ سے دروازہ کھولنے کے اگلے پل ہی سارے جملے ہوا بُرد ہو گئے۔ دماغ خالی بھک۔ زبان تالو سے چپک گئی۔ اب وہ کیا کہے گی۔

ڈاکٹر غازی اور ڈاکٹر شاہان ٹیبل پر کہنیاں ٹکائے۔ تقریباً" سر جوڑے بیٹھے تھے۔ درمیان میں رکھی چائے پر کتھئی سی تہہ جم چکی تھی۔ کوئی گمبھیر مسئلہ۔ گفتگو میں تیزی تھی۔ مگر انداز سرگوشیانہ تھا۔ اس کی آمد نے دونوں کو چپ لگا دی‘ وہ استفہامیہ نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ میں بعد میں آتی ہوں۔"

"ناں۔ نہیں۔ آیئے آپ!" ڈاکٹر غازی کی جملہ خوش آمدیدی مگر لہجہ محتاط تھا۔ وہ متزلزل ہو گئی۔

"میں چلتی ہوں غازی! تم فارغ ہو تو پھر دیکھتے ہیں۔" ڈاکٹر شاہان نے اپنی ٹھنڈی چائے ایک ہی لمبے گھونٹ میں حلق سے اتاری اور کوٹ کلائی پر جماتی اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتی باہر نکل گئیں۔

"پلیز۔۔۔" وہ دروازے میں ایستادہ تھی ڈاکٹر غازی نے ہاتھ کے اشارے سے کرسی دکھائی کہ "آؤ اور بیٹھو۔" اتباع کو اندر آنا ہی تھا۔ وہ بیٹھ ہی گئی مگر بولے کیسے۔۔۔ کہاں سے شروع کرے۔ کیا سیاق و سباق اور جزئیات نگاری سے کام لے۔ یا صرف سوری کہے ؟؟

وہ حسب معمول جملہ تیار کرنے کی ادھیڑبن میں گردوپیش سے بے گانہ ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر غازی نے کھنکھار کے اسے حاضر کرنے کی سعی کی۔

"آں۔۔۔!" اتباع چونکی۔ "میں آپ سے معذرت کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے یکدم کہہ دیا۔

"یہ میری زندگی کا سب سے انوکھا‘ ناقابل یقین واحد واقعہ ہے۔" غازی نے فوراً" کہا یعنی وہ بھی وہی سب سوچ رہا تھا اور وہ معذرت کا منتظر تھا۔ اسے خواہش تھی‘ وہ گویا انتظار میں تھا۔ "میں نے ایسی ذلت آمیز‘ بے اعتباری کبھی نہیں جھیلی۔"

دونوں کے درمیان خاموشی آکر بیٹھ گئی۔ اتباع کو کوئی جملہ مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ آغاز۔۔۔ مشکل‘ بے حد‘ چھوٹے سے اطلاعی فقرے میں سب شکوے سمٹے ہوئے تھے۔

"میں نے کبھی آپ کو۔۔۔ یعنی جب سے میں یہاں آئی ہوں۔ میں نے آپ کو کبھی شلوار قمیص میں نہیں دیکھا۔" اس نے جھکی پلکیں اٹھا کر غازی کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"واٹ۔۔۔!" وہ سچ مچ اچھل پڑا تھا۔ اچنبھا مسکراہٹ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی۔ مگر اتباع بہت دور جا چکی تھی وہ بول رہی تھی۔

"اور وہ بھی مہندی۔۔۔ شاید نسواری سے رنگ کا سوٹ۔۔۔

نسواری رنگ کے کپڑے پہنا ایک شخص دنیا کا سب سے بُرا انسان تھا اور۔۔۔ اور گلابی رنگ کے کپڑوں میں لڑکی اس وقت اس کائنات کی سب سے بے بس مظلوم لڑکی تھی۔ آپ کبھی بھی ویسے نہیں ہوں گے۔۔۔ بلکہ نہیں ہیں مگر پتا نہیں اس وقت میں کہاں چلی گئی تھی۔ میں نے اس روز آتشی گلابی کپڑے پہن رکھے تھے۔ آئی ایم سوری ڈاکٹر غازی!"

اس کے لہجے میں کرچیاں تھیں۔۔۔ بے چارگی‘ بے بسی‘ ماتم‘ تکلیف جیسے کوئی اسے لوہے کے برش سے رگڑ رہا ہو۔

ڈاکٹر غازی ناسمجھی کے عالم میں اسے تک رہے تھے۔ حق دق بے یقین کیا ہوا ہو گا؟

"آپ یقین کیجئے سر۔۔۔ وہ اس پوری دنیا کا سب سے برا انسان تھا۔ ایسے ہی ہم راستے میں اکیلے تھے۔ ایسی ہی سردی تھی۔ اس نے بھی سر پر پشاوری ٹوپی پہن رکھی تھی۔ مجھے لگا کہ وہ شام۔۔۔ دوبارہ آئی ایم سوری۔۔۔" اس کے حلق میں گولا اٹکا۔ اس کے انداز میں بے بسی اور بچوں جیسی معصومیت کے ساتھ شکوہ تھا۔ نہ سمجھا سکنے کی الجھن۔۔۔

"وہ بہت برا۔۔۔ آدمی تھا سر۔۔۔ مجھے لگا۔" وہ انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ پھر اسے دفعتاً" دھیان آیا۔

"مگر میں۔۔۔ نے۔۔۔ اسے۔ میں جیت گئی تھی سر سچی۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں‘ پلکیں جھکی سی اور ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ۔

غازی نے سب کچھ بھلا کر اس دھوپ چھاؤں کے منظر کو اپنے دل میں کھبتے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"وقت سب سے بڑا استاد ہے آج اس کا مطلب بھی سمجھ میں آگیا۔ گود سے گور تک علم۔ انکشاف۔ سو اتباع فاطمہ آج آپ نے یہ سیکھا کہ کسی کی آنکھ میں آنسو دیکھ دل کٹتا ہے اور تکلیف سے آنسو بھی نکل پڑتے ہیں۔۔۔ اسی طرح کسی کو خوش دیکھ کر خوش بھی ہوا جا سکتا ہے۔"

اس نے گرم شال کو اپنے وجود پر مزید کستے ہوئے سوچا۔ آتش دان میں کڑکتی لکڑیاں اور دہکتے سرخ رنگ کے شعلے‘ گرمائش ہمک‘ سکون و اطمینان۔۔۔ اور خوشی۔۔۔ شدید سردی سے انگلیاں ٹھٹھری سی تھیں۔ مگر وہ سب بے نیاز سے تالیاں پیٹتے تھے۔

دوسرے کمرے سے آتے لوک گیت کی آواز۔۔۔ بڑی بوڑھی عورتیں اپنی لرزتی ہمکپاتی آواز میں لمبی تانیں اڑاتی تھیں ان کے گیت میں خوشی تھی مستقبل کے خواب۔ دعائیں۔ کچھ اشعار چلے جانے والوں کا نوحہ بھی تھے۔ موسم کی سختی اور اپنی جفاکشی کے قصے۔۔۔ جو گا نہیں سکتی تھیں۔ وہ پوپلے منہ سے سر مارتی تھیں کہ ہم گانے والی سے متفق ہیں۔ ہم خوش ہیں۔ گاؤ گاؤ اور گاتے جاؤ۔۔۔ کچھ زندہ دل خوشی سے جھومتے ہوئے کھڑی ہو جاتی تھیں اور ایک دائرے کی صورت کھڑے ہو کر ہاتھ اور کر کے گھما گھما کے رقص کرتیں۔

معزز مہمان ڈاکٹر صاحبان کو بھی دعوت دی گئی کہ وہ رقص میں حصہ ڈالیں مگر بڑی مشکل سے دونوں ہی نے انہیں تالیاں پیٹنے پر ہی راضی کیا۔

کمپاؤڈر یوسف کے ہاں شادی کے سترہ برس بعد جڑاں بچے ہوئے تھے بیٹا بیٹی۔۔۔ بے نام و نامراد رہنے کا دکھ سہتے یوسف اور خالدہ کے لیے یہ معجزہ تھا۔ مایوسی کے گھپ اندھیرے سے اچانک روشنی کی کرنیں پھوٹ پڑی تھیں۔ اجالا اتنا۔۔۔ اتنا۔۔۔ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا۔۔۔

ایک مشکل کیس۔ خالدہ کی بڑی عمر۔۔۔ بلڈ پریشر اور سو قباحتیں۔۔۔ مگر ڈاکٹر شاہان کی مہارت اور بے حد دلچسپی۔۔۔ اتباع اور پلوشے مددگار۔۔۔

"اور اگر آج یہ اسپتال نہ ہوتا اور اگر اتنے قابل ڈاکٹر نہ ہوتے۔

لیکن جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ اپنی زندگی کے حوالے سے ہر فیصلہ کرنے کا اختیار ہمیں ہی دیا جاتا ہے اور پھر ہم ان اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ تب ہم کو "اصل بااختیار" غیر محسوس طریقے سے جھنجھوڑ دیتا ہے کہ میں ہوں اور یہ چاہتا ہوں۔

اور تب ہی ہم کسی غیر مرئی مقناطیسی کشش کے سہارے وہاں تک کھنچے چلے جاتے ہیں جہاں دراصل ہمیں "ہونا چاہیے تھا" ہم باپ بیٹے کا یہاں آنا اگر ہم اپنی دس سالہ پلاننگ پر نگاہ ڈالتے تو ڈائری میں دس سالوں کے دس دن بھی یہاں کے لیے نہیں تھے مگر اب دیکھو‘ اصل پلان میکر نے ہمیں آٹھ برسوں سے

یہاں بھیج دیا بلکہ جما دیا۔ ٹھہرا دیا۔ اب تو لگتا ہے صدیوں سے یہیں کے ہیں۔

اور رحمت یہ ہوئی کہ کوئی پچھتاوا ‘گلہ ‘مایوسی نہیں ---- ہر نکلتا دن دل کو خوشی دیتا ہے اور خود پر فخر محسوس ہوتا ہے وہ کہتا ہے‘ جو میرے بندوں سے پیار کرتا ہے وہ مجھے پیارا ہے۔ تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں بندوں سے پیار ہو اور ہم یہی درس دینا چاہتے ہیں کہ بندوں سے پیار کرو۔ جس حد تک جس طرح کر سکو۔ بس۔"

ڈاکٹر غنی نے اس کے سوال کے جواب میں بہت محبت سے کھوئے لہجے میں وجہ بیان کی تھی۔

"ہم ہونی سے ناواقف ہوتے ہیں جبکہ اسے ہو کر رہنا ہوتا ہے۔ زلزلوں سے زمین پھٹ جاتی ہے اور پہاڑ آنکھ میں ڈالنے کا سرمہ ---- مگر یہی زلزلے بعض مہر لگے دلوں کو پھاڑنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

"ہم میں سے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو پھٹی زمین کو دیکھ کر آنکھیں پھاڑتے ہیں۔ مگر ان کے دل نہیں پھٹتے۔ اپنی بد اعمالیوں ‘بد عہدیوں پر قائم رہتے ہیں۔ مجھے خود پر حیرت ہے کہ میں تمہیں اپنے دل کے انتہائی اندر کی بات بتا رہا ہوں مگر ---- خیر ----

کراچی جیسے شہر میں رہتے ہوئے آپ کسی اور جگہ پر رہنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اس شہر میں سحر ہے جو جکڑ لیتا ہے۔"

اس نے سر جھکا لیا تھا۔ وہ بھی تو یہی سوچتی تھی۔ منتر پھونکنے والی ہوائیں۔ ساحل کی ریت۔ جب ہی تو وہ لپکتی تھی۔

"تمہیں شاید میری بات بہت عجیب لگے ہو سکتا ہے ناگوار گزرے۔" ڈاکٹر غنی نے بے نیازی سے شانے اچکائے تھے مگر بہرحال یہ ایک حقیقت ہے۔ یا اگر تھوڑا مارجن دو تو اسے میرا ذاتی خیال کہہ سکتی ہو۔" وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے الفاظ جمع کر رہے تھے۔

"ڈاکٹر بے حس ہوتے ہیں ‘احساسات سے عاری اب خود سوچو جو آنے والے کو خوش آمدید اور جانے والے کو دوبارہ ملنے کی آس نہ دے کہ اچھا جی پھر ملیں گے اس انسان کا سنگدل کہلانا تو بنتا ہے ناں ‘بد اخلاق۔" وہ ہنسے تھے" اور اگر کوئی بہت ہی محبت لگاؤ جھاڑنے آئے۔ پیروں کی طرح دعا دینے پر آجائے تو وہ یہ کہ خدا آپ کو دوبارہ یہاں کبھی نہ لائے۔"

جملے کے اختتام پر ان کی ہنسی میں اتباع کی ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

"میں تمہیں ایک بات بتاتا ہوں۔ کسی حکمران نے حکم جاری کیا کہ تمام سلطنت کے لوگ فلاں تالاب میں ایک ایک گلاس دودھ ڈالیں۔ تاکہ وہ صبح تک بھر جائے ‘یہ حکم اس لیے کہ معلوم ہو کہ یہ شخص اپنی ذات میں کتنا کمل دار ہے۔ اب ہر شخص نے یہ سوچا کہ ساری مملکت کے لوگ تو ڈالنے جائیں گے ہم ایک میں نہ گیا تو کیا فرق پڑتا ہے کیسے پتا چلے گا تمہیں پتا ہے اگلی صبح تالاب جوں کا توں خالی تھا۔ کیوں کہ مملکت کے ہر فرد نے یہی سوچ رکھا تھا کہ ایک میں نہ گیا تو ---- کیا ہو گا۔

اور تمہیں اب شاید حیرت ہو گی کہ ‘حصہ نہ ڈالنے کا ارادہ باندھنے والا ایک فرد میں بھی تھا۔" ڈاکٹر غنی نے نگاہیں دیوار پر ٹکا دی تھیں۔

وہ چونک گئی اور کچھ نہ سمجھی۔

"2005ء کا زلزلہ ساری قوم کو جگا گیا۔ ہم نے اپنے تئیں اتنا فرض پورا کیا کہ وہاں جمع ہوئے۔ سامان کو اپنے دفتر میں بیٹھے بیٹھے پیک کرنے اور نام و مقام لکھنے ہی کو کل سمجھا۔ غازی ڈاکٹرز کے ساتھ والنٹری طور ان علاقوں کی طرف جانے کا کہنے لگا تو میں نے منع کر دیا۔ یہ سب میرے آبائی علاقے تھے۔ میں سالوں پہلے ان سب کو چھوڑ کر بہت آگے بڑھ چکا تھا اور واپسی کے لیے پیچھے۔ کوئی وجہ نہیں۔ کچھ میرا استھما کا مسئلہ۔ میں کتراتا رہا۔ جان چھڑاتا رہا۔ ہم کر تو رہے تھے جو کر سکتے تھے۔ اتنے سب لوگ ان علاقوں میں چلے جاتے تو یہاں کون رہتا ---- مگر غازی جوان خون ٹھان چکا تھا۔ میں نے اسے لاکھ ان علاقوں کے موسم سے ڈرایا ‘صعوبتوں پر دھیان دلوایا۔ مگر وہ طے کر چکا تھا۔

وہ میرا بہت لاڈلا بیٹا ‘کل سرمایہ ہے۔ میں اس کے لیے فکر مند تھا۔ اس کی جلد واپسی کا منتظر ----

"آپ کے خیال سے بابا میں آ تو گیا ہوں مگر میرے یہ دس دن آٹے میں نمک بھی نہیں ---- وہاں زخم ہیں درد ہے اور آنسو ---- دس سال بھی کم ہوں گے چیزوں کو واپس جگہ پر جانے کے لیے ---- ہم سب لوٹ آئے ہیں اور جو ہیں وہ بھی پلٹ جائیں گے۔ مگر وہاں تمام ایریا میں لوگوں کو وقتی توجہ کی نہیں ---- پوری سرپرستی کی ضرورت ہے ہر حال میں ----" وہ دکھ سے چور چور لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"دوائیاں ‘کپڑے ‘دودھ ‘بسکٹ ‘کمبل ---- بابا! وہاں تو وہ لوگ ہیں جو یہ بھی نہیں جانتے کہ پولی فیکس لگاتے ہیں کہ کھاتے ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ لوٹ آؤ ---- سب بہتر ہو جائے گا۔ کیسے ہو جائے گا بہتر ---- کون رکا ہے وہاں بہتر کرنے کے لیے ----" وہ بہت آزردہ اور مایوس تھا اور اس کے ان جملوں نے مجھے بہت سال پہلے کا منظر یاد کروایا۔

جب اپنے باپ کی بیماری پر امدادی کیمپ سے ملنے والی بہت مہنگی دوا مجھے مل تو گئی تھی۔ مگر میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا کہ کیسے استعمال کروں۔ کب کروں اور ----

تب مجھے یہ بھی یاد آیا کہ میں نے عہد کیا تھا کہ میں اس قابل بنوں گا کہ مجھے پتا ہو اور میں سب کو بتاؤں کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔ مگر وعدوں کو فراموش کرنا اور دعاؤں کی مستجابی کے بعد اللہ کی رحمت کو بھول جانا انسانی فطرت ہے۔ غازی تو اٹھ کر چلا گیا مگر میں جہاں کا تہاں جم گیا۔

یہ سب میرے بڑکھوں کی زمینیں تھیں میں چپے چپے سے واقف ---- اور بس اب تو بھول ہی گیا کہ اس دنیا سے پرے بھی ایک دنیا ہے ‘اب یہی دنیا ہے اور یہی خاتمہ ----"

اتباع سحر زدہ تھی۔ لوگ کیسے ہوتے ہیں اور کیسے ہو جاتے ہیں۔ اچھے سے برے اور برے سے اچھا۔

تو کیا وہ بھی یہاں آئی نہیں ہے ---- بھیجی گئی ہے مگر کیوں ---- ???

"مجھے نہیں پتا تمہارے یہاں آنے کی وجوہات ارادے ‘خیالات ---- مگر میں تمہیں یقین دلا دوں معاوضہ ‘وقت ‘محنت سب اپنی جگہ اٹل مگر بہرحال تم ایک نیکی کا حصہ بن گئیں۔ ہر وقت اداس اور روتی پائی جاتی ہو۔ کوئی چیز تمہارے دل کے لیے نہیں ہے۔ نصیحت کرنا مجھے پسند نہیں۔

مگر پیاری بٹیا! تم کم از کم مجھ سے یہ یقین لے سکتی ہو کہ تم نیکیاں جمع کر رہی ہو اور ان نیکیوں کو بینک میں جمع کرواؤ نہ کرواؤ مگر ان پر سود لگتا رہتا ہے۔ دو گنا چو گنا اور یہ سود حرام نہیں ہوتا۔"

وہ انداز تخاطب پر انہیں تادیب کرنا چاہتی تھی۔ مگر ان کے جملے کے اختتام پر اس کی آنکھیں جھر جھر بہنے لگیں۔

ہاں۔ وہ اپنی زندگی کو اس نظر سے بھی تو دیکھ سکتی ہے۔

"سارے قصے سے قطع نظر اتباع ---- ! ایمان کا تقاضا ہے کہ لوح محفوظ پر ہر شے لکھ دی گئی۔ تو ساری وجوہات ‘حالات اپنی جگہ مگر اس کے لیے یہ جگہ بھی رکھی گئی تھی۔ تو خوش رہو اور نصیحتیں ہمیشہ کاٹ دار نہیں ہوتیں۔ وہ بے ضرر چٹکی کا احساس بھی ہو سکتی ہیں اگر ان کے اندر چھپی حکمت کو بھانپ لیا جائے اور تسلیم کر لیا جائے۔"

اور اس وقت یوسف اور خالدہ کی خوشی میں تالیاں پیٹتے وہ اتنی خوش تھی اتنی کہ شاید ہی کبھی اتنا کھلکھلا کر ہنسی ہو۔

اندر محبت کی گرمائش تھی۔ باہر برف کھڑکیوں دروازوں سے ٹکرا ٹکرا زمین بوس ہوتی جا رہی تھی۔



"آپ بستر پر آجائیے ڈاکٹر شاہان ---- !" اتباع نے آواز دی۔ وہ بہت دیر سے آرام کرسی پر کمبل میں چھپی الطاف فاطمہ کی "چلتا مسافر" پڑھ رہی تھی۔ آتش دان کی چٹختی لکڑیاں بھی اس کا انہماک توڑنے

سے قاصر تھیں۔
وہ تو بس یونہی ورق پلٹتے ہوئے سامنے کھڑکی پر نگاہ پڑی تو وہ چونکی۔ ڈاکٹر شاہان نجانے کب سے کھڑی تھیں اور باہر دیکھتی تھیں۔ گہری سوچ، کچھ حسرت کچھ ملال چہرے پر اپنی اپنی باری سے آتے جاتے تھے۔

ان کے وجود پر اکثر و بیشتر ایک سناٹے کی سی کیفیت چھا جایا کرتی تھی۔ کبھی وہ بیٹھے بیٹھے کھو جاتیں۔ انتباع الجھ جاتی، وہ پوچھنا چاہتی تھی مگر اول روز کی ناد یب......
"مجھے یہاں کمبل میں آگ کے پاس بیٹھ کر بھی ٹھنڈ لگ رہی ہے اور آپ کب سے یہاں ہیں اب بھی واش روم جانے کی مجبوری سے اٹھی ہوں۔" اس نے کہا اور کھڑکی کے شفاف شیشے سے باہر جھانکا۔
یوسف کے کچھ دور دراز کے دوست بچوں کی مبارک باد دینے آئے تھے۔ یوسف نے ان کے کھانے پینے کا خوب اہتمام کر رکھا تھا۔ تمام اسپتال کے مرد بھی مدعو تھے اور اب شاید کھا پی کر فارغ تھے۔ جب ہی الاؤ کے گرد شدید ترین سردی سے بے نیاز خوشی منانے کے لیے رقص کر رہے تھے۔ ایک وہ ساتھی کوئی ساز لے کر بیٹھا تھا۔ وہ کچھ گا بھی رہا تھا۔
مزے کی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر عثمان غنی اور ڈاکٹر غازی بھی رقص میں شریک تھے اور ان کی مہارت قابل دید تھی۔
"یہ تو بڑے مزے کا سین ہے" وہ مزے سے بولی۔
"واؤ...... حیرت ہے ان لوگوں کو سردی نہیں لگ رہی۔" اس نے سوال شاہان کو پیش کیا۔
"الاؤ دہک رہا ہے اور رقص تو ویسے ہی رگوں میں خون کو دوڑاتا ہے بلکہ انہیں تو شاید گرمی لگ رہی ہو...... چھوڑو...... مجھے واقعی سردی لگنے لگی ہے۔ تم بھی آجاؤ۔"
ڈاکٹر شاہان جواب دیتے ہوئے پلٹ گئیں۔ انتباع نے جی بھر منظر دیکھا اور واپس اپنی جگہ پر آ کمبل میں کچھ مچھ ہو گئی۔ وہ اپنی ٹھٹھری ہتھیلیاں آگ سے تاپنے کو آتش دان کی جانب جھکی ہوئی تھی۔
ڈاکٹر شاہان نے اپنی کرسی بھی آگ سے نزدیک ترین جمائی۔ وہ یہاں بیٹھ کر اپنے موبائل کے گانوں سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔ انتباع نے دوبارہ کتاب کھول لی۔
"ڈاکٹر شاہان...... !" اس نے دفعتاً پکارا۔ ان کے کانوں میں ہینڈز فری لگی تھی۔ سو متوجہ نہ ہوئیں تو انتباع نے عجلت سے ان کا ہاتھ ہلایا۔
"کون سا گانا سن رہی ہیں۔ کیا ہوا بھلا...... چہرے پر اتنا غم اتنا شدید اداس رو دینے والا تاثر......"
وہ بری طرح چونکی مگر آنکھ کھلتے ہی چہرے کے تاثر میں صرف "سوال" رہ گیا باقی سب غائب "آئی ایم سوری...... دراصل۔"
موراسیاں موسے بولے نا
میں لاکھ جتن کر ہاری...... میں لاکھ......
بہت مدھم سی آواز پر بھی اس نے گانا پہچان لیا۔ شاہان نے سرعت سے آف کا بٹن دبا دیا۔
"نہیں کچھ نہیں...... بعض گانے، جملے آپ کو ٹرانس میں لے جاتے ہیں۔" وہ پھر خود کو چھپا چکی تھیں۔ "تم بتاؤ کون سی کتاب پڑھ رہی ہو دو دن سے تمہارے پاس ہے۔ کیا ہے بھلا یہ......؟"
انتباع نے ٹھنڈی سانس بھری (ہاں ٹھیک ہے ناں ہر شخص کے دل کی دنیا اس کی ملکیت ہی ہے۔ جواب دینا اتنا ضروری بھی نہیں)۔
"چلتا مسافر......"
یہ کیسا نام ہوا "مسافر ہے تو چلے گا ہی ناں......"
"نہیں نہیں...... !" انتباع نے سر نفی میں ہلایا۔
یہ بہت ہی شاہکار ناول ہے الطاف فاطمہ نے اس ناول کو بنگلہ دیش کے پس منظر میں لکھا ہے۔
مرکزی کردار نصیبا ہے۔ یہ خاندانی لونڈی ہے۔ آبنوسی حسن کی مالکہ "ایک انتہائی خوب صورت شہزادہ فدا ہو جاتا ہے اس پر مگر وہ پوری مضبوطی اور وقار سے اپنی جگہ کھڑی رہتی ہے۔ وہ اپنی حقیقت سے بھی واقف ہے اور زندگی کے حقائق سے بھی۔ محبت کی آنچ اس کے دل تک پہنچتی ہے لیکن وہ نہ جل کر راکھ

ہوتی ہے اور نہ اپنی ہستی کو فراموش کرتی ہے۔ وہ عملی ہے۔ خوابوں خیالوں سے پرے۔۔۔ پھر زندگی کے ایک موڑ پر وہ اپنے ہی جیسے ملازم سے شادی کر لیتی ہے، جس کی بیوی پانچ بچے چھوڑ کر مر جاتی ہے اور وہ کہتی ہے۔ زندگی خوابوں خیالوں کی نذر کرنے والی شے نہیں۔ اسے کسی کے کام آنا چاہیے۔"

اس نے کسی رٹو طوطے کی طرح نصیبا کے کردار کی وضاحت کی تھی۔

"یہ بک میں نے کئی سال پہلے پڑھی تھی مگر کرائے پر لے کر۔۔۔ سر کی لائبریری میں نظر آئی تو فوراً لے آئی۔۔۔ سر کہتے ہیں کہ۔۔۔"

"ڈاکٹر غنی کی کیا رائے ہے۔ اس کردار کے بارے میں؟" ڈاکٹر شاہان نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ۔۔۔ وہ تو بہت ہی متاثر ہیں اس کردار سے بھی اور کہانی کی بنت سے۔۔۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے برِصغیر کی عورت کی اصل شبیہہ ہے۔ نسوانیت اور محبت سے گندھی عورت، ممتا سے بھرپور، وقار کی علامت جو تمام عمر دکھ اور درد سہہ کر بھی سکھ فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔"

"اتباع! کیا دل کی آواز کے پیچھے جانا بے وقوفی ہے، ذلت ہے۔" شایان نے پوچھا۔

"میرے خیال میں تو نہیں۔" اتباع نے پرسوچ لہجے میں کہا۔ "لیکن دماغ کی وارننگ کو ہمیشہ مدِنظر رکھنا چاہیے۔"

"یہ تو بڑی بے ہودہ بات ہوئی ناں کہ دل میں کسی اور کو بسایا جائے۔۔۔ اور گھر کسی اور۔۔۔ کا۔۔۔"

"ارے نہیں۔۔۔ نصیبا نے ایسا کب کیا۔۔۔ لیکن اس نے ناممکن کے حصول میں زندگی گزارنے کے بجائے زندگی کی حقیقتوں کو ترجیح دی۔"

"چھوڑو نصیبا کو۔۔۔" شاہان نے بیزاری سے کہا مگر انداز کچھ کھویا کھویا سا بھی تھا۔۔۔ "یہ بتاؤ کیا محبت کو حاصل کرنے کے لیے کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

"پتا نہیں ڈاکٹر شاہان۔۔۔ مگر۔" وہ جملہ بنانے کو ٹھہری۔ "محبت ریاضی کا سوال نہیں ہوتی کہ بار بار کی کوشش سے حل ہو جائے گی۔ کوئی نہ کوئی فارمولا جواب تک لے جائے گا۔ محبت تو شاعری کی طرح حلول پروارد ہونے کا نام ہے۔ یہاں کوئی کوشش کام نہیں آتی۔"

"تت۔۔۔ تم اتنے وثوق سے اتنی گہرائی سے محبت کا فلسفہ کیسے بیان کر رہی ہو، کیا تم نے کسی سے محبت کی؟"

شاہان نے اپنی پیتا بھول اسے ٹوکا اور وہ جو کھوئے انداز میں کہیں اور تھی۔ بری طرح چونک کر پلٹی۔

وہ کیا جواب دیتی۔ وہ تو خود اس امر سے انجان تھی کہ ایک شخص کے قدموں کی چاپ کیسے اتنے شور میں بھی پہچان لیتی ہے۔

صبح خوشی لے کر آتی ہے کہ وہ اسے بس ایک نظر دیکھ لے۔

شام دکھ اداسی کہ یہ کالک سفیدی کا لبادہ کب اوڑھے گی اور وہ اسے دیکھ سکے گی۔

تصوّر کے تصویر بننے میں شاید ابھی وقت تھا۔ گمان سے یقین کا سفر۔۔۔ پرخطر۔۔۔

☼ ☼ ☼

ہم خواب دیکھتے ہیں، خواہش کرتے ہیں، ارادے باندھتے ہیں تو دراصل اللہ کے پاس موجود رجسٹر میں سب کچھ درج کرواتے جاتے ہیں۔ پھر وقت آنے پر اس کے حکم سے ہر چیز ظہور پذیر ہو جاتی ہے سو طے ہوا کہ خواہش، خواب اور ارادہ شرط ہے۔

سو یہ خواہش بھی پورا ہونا تھی۔ اس نے بہت خوش دلی سے سوچا تھا۔ مگر اب ہر بار ناکام ہو ہو کر بددل ہو کر بیٹھی تھی۔ وہ لاکھ کوشش کے باوجود سنو مین بنا ہی نہ پا رہی تھی، ایک قد آور سنو مین۔۔۔

پلوشے، ڈاکٹر شاہان، ڈاکٹر غازی۔۔۔ خان بابا، ڈرائیور کے نو عمر بیٹے سب لوگ کچھ نہ کچھ بنا کر اب فخر سے اپنی پیش کش کے ہمراہ کھڑے تھے۔ نوک پلک سنوارتے، صرف وہ تھی جو سر پکڑے بیٹھی تھی۔

"آپ مقابلے سے آؤٹ ہو جائیں گی، ٹائم ختم ہونے کو ہے۔" پلوشے نے کہا۔

"کیوں؟ کیوں؟ مجھے دوسروں سے زیادہ ٹائم دیا جائے۔ میرا فرسٹ ایکسپرینس ہے۔" اس نے نقطہ نکالا۔

ڈاکٹر عثمان غنی جج کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کا سر اثبات میں ہلا۔ وہ اتنے سال بعد ہونے والی بے حد برف باری سے لطف اندوز ہونے کے لیے اپنے وزن سے چوگنے گرم کپڑے پہنے ان کے ہمراہ انجوائے کرنے آتے تھے۔ ڈاکٹر غازی اپنے بابا کی وجہ سے فکر مند تھے۔ وقتاً "فوقتاً" فلاسک میں سے قہوہ ڈال کر بصد اصرار پلاتے اور مسلسل چلغوزے کھانے پر زور دیتے۔ ڈاکٹر غنی کو ایسا موسم راس نہیں آتا تھا۔

برف کی سفید چادر ہر شے کا حجاب بن گئی تھی ہر رنگ روپ غائب تھا۔ سفیدی سفیدی، پاکیزگی کا پرتو

پہاڑوں پر جمی برف اور آسمان کا رنگ ایسے ہم آہنگ تھا کہ باقاعدہ نظر ٹکانی پڑتی۔ پہاڑ کا ختم اور آسمان کہاں شروع۔۔۔

"نہیں بنتا مجھ سے۔" اس نے ہار مان کر برف پر ٹھوکر مار دی۔ وہ بہت زیادہ افسردہ ہو گئی تھی۔ بار بار ناکامی۔۔۔ ہونہہ۔ سب اپنے اپنے شاہکار کے ساتھ تصویریں بنوا رہے تھے۔

"آپ بھی ادھر آ کر تصویر بنوائیں۔ یہ موسم جانے پھر کب آئے۔"

"ایسے ہی کیوں خوامخواہ۔" اس نے نروٹھے پن سے کہا۔ "میرا اپنا تو بنا نہیں مجھے نہیں پرائے پر حق جمانا۔" اس کے بچکانہ انداز پر سب ہنس دیے۔

"میں بتاتا ہوں تم کہاں غلطی کر رہی ہو۔" ڈاکٹر عثمان غنی اس کے پاس آ گئے۔

"بنیاد مضبوط ہونی چاہیے۔ تمہیں برف جمانا نہیں آ رہی۔" وہ برف کی ڈھیریاں اٹھانے لگے۔

"ارے بابا۔۔۔ کیا کر رہے ہیں ٹھنڈ لگ جائے گی۔" غازی چلّایا۔

"چھوڑیں ڈاکٹر عثمان غنی! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" ڈاکٹر شاہان چلی آئیں۔

پلوشے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"کچھ نہیں ہوتا۔۔۔ مجھے کرنے دو۔ بس پانچ منٹ۔۔۔" وہ ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکتے ہوئے اسے بنیادی خامی بتانے لگے۔ اب سب اپنا کام چھوڑے ان کے گرد جمع تھے۔

سارا کام اسی نے کیا مگر بہرحال ڈاکٹر عثمان غنی اس کے مددگار تھے اور ان ہی کے مدد کے سہارے اس کا سنو مین اپنے پورے قد سے کھڑا تھا۔

"یاہو!" اس نے بچوں کی طرح اچھل اچھل کر خوشی کا اظہار کیا۔ سب کی تالیوں نے اس کے چہرے کو گلال کر دیا۔ سب نے اپنے موبائل سے تصاویر بنائیں۔

"ڈاکٹر غنی کی تکنیک ہے ساری۔" ڈاکٹر شاہان نے ڈاکٹر غازی سے کہا۔

"محنت میری ہے۔" وہ چلّائی۔

"وہ تو آپ بہت دیر سے کر ہی رہی تھیں۔" غازی نے چھیڑا، سب ہنس دیے۔ اس نے خفا نگاہوں سے ڈاکٹر غازی کا چہرہ دیکھا اور اپنے سنو مین کی طرف متوجہ ہوئی۔

"اس کے سر پر تو ٹوپا ہی نہیں۔۔۔ اور مفلر۔" اس نے اپنا میرون مفلر اس کے گلے سے باندھا۔

"اب ٹوپا۔۔۔؟" اس نے متلاشی نگاہیں گھمائیں۔

"ٹوپا یہ لے لو۔" ڈاکٹر عثمان غنی نے اپنے سر سے میرون پھندنے والا ٹوپا آگے بڑھ کر سنو مین کے سر پر ٹکا دیا۔

اتباع سمیت سب حق دق رہ گئے۔ پل بھر کو سناٹا چھا گیا۔ ان کے سر پر اب ہلکی تہہ والی گرم ٹوپی تھی۔

"ٹھنڈ لگے گی بابا۔۔۔ بیمار پڑ جائیں گے آپ۔۔۔" غازی نے کہا۔

ڈاکٹر شاہان نے بے بسی آمیز ناگواری سے یاد دلایا۔ "پھر سانس لینے میں تکلیف ہو گی، ارے۔"

"اتباع کی تصویر تو ہو جائے ذرا۔۔۔" وہ بولے

ان کے متوجہ کرنے پر سب سنومین کو دیکھنے لگے۔ وہ سج گیا تھا۔ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ سب کے موبائل ٹک ٹک چل رہے تھے "میں رجا کو بھیجوں گی تصویریں۔" اس نے کہا۔ دفعتاً" اسے بہت پرانی خواہش یاد آئی۔

"سنومین دوست سا لگتا ہے اپنا اپنا سا میں اس کے ساتھ جپھا ڈال سکتی ہوں ابو) وہ یکدم سنومین سے لپٹ گئی۔ ابو اُسے لگا وہ اسے کہیں سے دیکھ رہے ہیں' اس کی معصوم بچپن کی خواہش پوری ہونے پر خوش ہیں بہت.....

مگر..... اس کی جپھی میں کچھ زیادہ ہی شدت تھی ۔ اگلے پل ہی سنومین دھڑام سے گر کے اس کے قدموں میں برف کا ڈھیر بن گیا اس کے پیر دب سے گئے۔ وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑی اور بار بار پاؤں اٹھا کر برف کو جھٹکا۔ اسی اچھل کود میں میرون پھندنے والا ٹوپا اس کے پیروں تلے آگیا اور رگید اگیا۔

"ہاں آں.....!" اس کی آنکھیں خوف' شرمندگی' حیرت سے پھٹ پڑیں۔ "یا اللہ!" اس نے تیر کی سی تیزی سے ٹوپا اٹھایا جھاڑا اور سینے سے لگالیا۔ "آئی ایم سوری..... آئی ایم سو۔" ٹوٹے جملے کے ساتھ آنکھ سے موتی بھی ٹوٹ ٹوٹ نکلے۔ اس کا چہرہ خفت سے سفید پڑ گیا تھا اور ہونٹوں پر لرزہ۔

"کوئی بات نہیں' لاؤ دو کیا ہو گیا؟" ڈاکٹر غنی نے مشفق انداز میں کہا اور ہاتھ بڑھایا کہ ٹوپا لے لیں۔

"نن..... نا..... نہیں۔" وہ دو قدم پیچھے ہو گئی۔ سب کے لیے یہ بہت عجیب صورت حال تھی۔

"یہ..... اب سر پر رکھنے کے قابل نہیں..... رہا..... آئی..... سوری۔"

"بے وقوف ہیں آپ ۔ کیوں نہیں رہا قابل لائیں دیں۔" ڈاکٹر غازی آگے آئے۔

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہاتھ پکڑ کر روکا "نہیں۔

میں..... میں آپ کو نیا ٹوپا لا کر دوں گی۔ یہ نہیں' نہیں۔" اس کے حلق میں آنسوؤں کے گولے تھے۔

گھڑی بھر کا وقفہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔

ٹوپا سینے سے لگا تھا اور پھندنا ہونٹوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے جذب کے عالم میں ٹوپے کے پھندنے کو بوسہ دیا۔ وہ یکدم مڑی اور برف پر گرتے پڑتے بھاگتی چلی گئی وہ جلد از جلد اس ماحول سے' اس شرمندگی سے' ذلت سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

ٹوپا سر کی عزت' پگڑی..... اس کے پیروں تلے رل گئی ہائے۔ اس کی بے کلی کو آرام کہاں..... ڈاکٹر عثمان غنی اس کے لیے کیا تھے؟ کاش وہ بتا پاتی۔

وہ ساری رات کمبل میں منہ دیے روتی رہی۔

تمام لوگوں کے لیے اس کا رویہ ناقابل یقین' ناقابل فہم اور..... اور..... ناقابل.....

☼ ☼ ☼

صبح ہاسپٹل میں بھی اس کی سوجی آنکھیں سب کو متوجہ کرتی رہیں۔ وہ بہت افسردگی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی۔

برف باری کے بعد نزلے زکام اور کچھ نمونیہ کے مریض آگئے تھے۔ رش تھا اور سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ ڈاکٹر شاہان کیس کر رہی تھیں۔ پلوشے ان کی مددگار.....

"اٹھو بیٹا! آنکھیں کھولو بستر چھوڑو اور منہ دھولو..... اتنا رونا ٹھیک نہیں ہے۔"

ڈاکٹر شاہان نے اسے صبح اس طرح جگایا تھا۔

"آپ کے رویے نے ہم سب کو بہت حیران کیا۔"

"ٹوپی تو سر کی عزت ہوتی ہے ناں.....!" اس نے جواب دیا تھا۔

"یہ میری زندگی کی سب سے بڑی شرمندگی ہے۔" وہ بہت افسردہ تھی۔

"اٹس او کے....." شاہان نے کچھ اور پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا (ٹوپا چوم کر کون سی شرمندگی مٹانے کی خواہش یا کوشش تھی؟)

"آپ بہت قریب ہو گئی ہیں ڈاکٹر غنی سے۔"

پلوشے نے رائے دی یا سوال کیا۔

"وہ ہیں ہی اتنے اچھے..... اپنے اپنے سے۔" اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"یہاں موجود ہر شخص نے میری زندگی بدل دی ہے پلوشے.....

ڈاکٹر شاہان جیسی ہمدرد پر خلوص دوست..... تمہاری ہمراہی..... تمہاری باتیں۔ میں نے تم سے بھی بہت کچھ سیکھا ہے کہ کیسے اپنے علاقے کے لوگوں کی مدد کے لیے تم نے تمام تر مخالفتوں کے باوجود گرتے پڑتے اپنی نرسنگ مکمل کی۔ اور ڈاکٹر غازی..... ان کی عمر کے نوجوان شہروں میں پارٹیز گیدرنگ میں زندگی کے ہر پہلو سے اپنا حصہ کشید کرنے کے لیے ہر صحیح غلط راستہ اپنانے کو تیار رہتے ہیں جبکہ وہ خود تو آئے ہی' اپنے والد کو بھی لے آئے اور....."

"اور ڈاکٹر غنی؟؟؟" شاہان نے کسی قدر عجلت سے رائے جاننی چاہی تھی۔

"وہ....." اس نے لمبا کھینچا "وہ تو....." اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ "میرا ذخیرہ الفاظ ان کے بارے میں..... وہ میرے....."

"ہیلو ڈاکٹرز what's up (کیا ہو رہا ہے)" ڈاکٹر عثمان غنی کی آمد نے تینوں کو چونکا دیا۔ وہ گلے میں مفلر لٹکائے فل فارم میں تھے البتہ سرخ ناک سردی کا اثر دکھا رہی تھی۔

"ادھورا رہ جانے والا جملہ.....؟"

اتباع کی چمکتی آنکھوں میں شرمندگی آکر براجمان ہو گئی۔ اس کی نظریں زمین پر جم گئیں۔ ڈاکٹر عثمان غنی ڈاکٹر شاہان سے مریض کا حال پوچھنے لگے جو تین روز پہلے برف سے لڑھکتا کھائی میں گر کے شدید زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔

دونوں ڈاکٹرز بے حد پروفیشنل انداز میں محو گفتگو تھے..... پلوشے ہدایات سننے کے لیے سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔

"موسم ٹھیک ہوتے ہی میں آپ کو نیا ٹوپا لا دوں گی سر!" اس نے اپنے خیالات سے سر اٹھا کر اچانک کہا۔

"ہائیں..... نیا ٹوپا.....!" ڈاکٹر اتباع کی راگنی ابھی تک وہیں تھی۔

ڈاکٹر عثمان غنی مڑے اور اس کی ٹیبل کے پاس آ رکے جو سر جھکائے نظریں جوتوں پر ٹکائے میز کی سطح ناخن سے کھرچتی کھڑی تھی۔

"لیکن مجھے تو وہی ٹوپا چاہیے۔" ڈاکٹر غنی کا لہجہ شریر اور دونوں حاضرین کے لیے حیران کن تھا۔

اتباع کا مانو دماغ گھوم گیا۔

"جب میں نے ایک بار کہہ دیا ہے کہ وہ نہیں مل سکتا۔ تو آپ ضد کیوں کرتے ہیں؟" اس کا جھپٹا مار' چڑچڑا انداز..... ڈاکٹر غنی کا قہقہہ در و دیوار کے لیے بھی حیران کن تھا۔

"صرف تمہاری شکل بھیڑ جیسی ہے۔ پنجہ تم بلیوں والا مارتی ہو..... سمجھیں۔"

وہ اپنی دی مثال پر دوبارہ ہنس دیے ۔ سنجیدہ' خاموش طبع' اپنی کتابوں میں گم رہنے والے ڈاکٹر کا یہ روپ پلوشے کے لیے از حد حیرانگی کا باعث تھا مگر اپنی بے ساختہ ہنسی کو روک نہ پائی۔

اتباع کی شکوہ کناں نگاہیں ڈاکٹر عثمان غنی کے چہرے پر اٹھیں۔ پھر اس نے ناراضی کا تاثر دینے کے لیے بی پی اپریٹس کا ڈھکن بند کیا اور گویا رخصت کو تیار.....

"اب پھر کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر رونا ہو گا۔ ہے ناں۔" وہ جیسے اس کی رگ رگ سے واقف ہو چکے تھے۔

اتباع نے برا سا منہ بنایا۔

"جی نہیں! میں لائبریری جاؤں گی۔"

"یعنی کافی امپروومنٹ ہو گئی ہے۔ اب بی بی غم کو بھلانے کے دوسرے راستوں کو پہچاننے لگی ہیں۔" ان کا شریر لہجہ "تم چلو..... میں نے کچھ کتابیں نکال رکھی ہیں۔ پھر مل کر پڑھیں گے۔"

"میں او پی ڈی میں ہوں۔ آپ فارغ ہو کر آیئے ڈاکٹر شاہان!" وہ سنجیدگی سے کہہ کر بڑھ گئے۔

داخلی دروازے سے دو عورتیں ایک روتے چلاتے بچے کو لیے اندر داخل ہو رہی تھیں یعنی ڈاکٹر

اتباع کے مریض۔وہ دوبارہ سیٹ پر بیٹھ گئی۔
ڈاکٹر شاہان اور پلوشے کے لیے ساری گفتگو اچھنبے کا باعث تھی۔ اتنی بے تکلفی، اپنائیت، احساس اور جذب سے گندھی گفتگو۔۔۔۔

یہ رشتہ کب بنا؟
کب پروان چڑھا؟
کہ سایہ دار شجر کی طرح گھنیرا ہو گیا؟؟؟؟
ڈاکٹر عثمان غنی جیسے شخص کا۔۔۔ اتباع جیسی۔۔۔
اونہوں۔
ایک مضبوط تعلق۔۔۔ سا احساس۔
تعلق۔۔۔؟؟؟ جانے۔۔۔ یا۔

☼ ☼ ☼

بہار تتلی کے پر جیسی تھی۔ ہلکی پھلکی بے وزن اور رنگ دار۔۔۔
سورج کا پگھلا سونا ہریالی کے اندر گویا اپنی چمک پھونک رہا تھا۔
سردی اور برف سے ٹھٹھری ہوئی دھرتی انگڑائی لے کر بیدار ہو گئی تھی۔
اس کی شوخیوں کے کیا کہنے۔ جنگلی پھول پتّوں کی مہک قوت شامہ کے لیے امتحان تھی۔ کہاں سے آئی اور کس کی ہے۔
اعصاب پر طاری یہ ہلکا پن بے حد خوشگوار تھا۔
ڈاکٹر عثمان غنی اور وہ لکڑی کی بیرونی سیڑھیوں پر بے فکری سے بیٹھے تھے دونوں کی گود میں کتابیں تھیں۔
"بہار نے جیسے ہر شے درست کر دی ہے، مجھے لگتا ہے سارے دلدّر سردی کے تھے۔ اب تو مریض بھی نہیں آتے۔" اس نے تبصرہ کیا۔
"یہ فرصت شاید ہمارے لیے ہے ڈاکٹر شایان فارغ ہوں تو فارغ، ورنہ تین تین دن تک پلک جھپکانے کا وقت بھی نہیں ملتا۔" ڈاکٹر غنی نے یاد کروایا۔ ڈاکٹر شایان ایک ایمرجنسی ڈلیوری کیس ہینڈل کرنے بھاگی گئی تھیں۔
"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے تائیداً سر ہلایا۔ "آپ بتائیے کون سی بکس ہیں۔"
"آواز دوست ہے۔ مختار مسعود نے 47 کے واقعات سے متاثر ہو کر لکھا ادبی سطح پر اس کا بڑا چرچا رہا۔"
"میں پڑھ چکی ہوں سر اسے۔۔۔ اور یہ شہاب نامہ تو شاید کئی بار۔۔۔"
"شہاب نامہ دراصل ہماری ادبی و سیاسی تاریخ کی طرح ہے ناں۔ بلکہ مجھے لگتا ہے ایوب خان دور میں ادب کی جو سرپرستی کی گئی۔ وہ پھر دوبارہ نہیں ملی۔ اسی دور میں شاید سب سے اچھا ادب لکھا گیا ہے۔"
"بالکل درست۔۔۔ تم لائق لڑکی ہو۔"
"نا صرف یہ بلکہ اشفاق، بانو، انتظار حسین اور ممتاز مفتی کا علی پور کا ایلی، بھی اسی دور کا شاہکار ہیں۔ سر اب شاید ایسا ادبی کام نہیں ہوتا۔ پروفیشنل ازم ہر شے پر چھا گیا ہے۔" اس کے انداز میں مایوسی آ گئی۔
"اس موضوع کو نہ چھیڑو بی بی! اس پر تو ہم چھ ماہ بحث کر سکتے ہیں۔ پھر بھی نتیجہ خیزی سے دور۔ تم یہ کتاب لو۔۔۔ نہج البلاغہ حضرت علی کے خطبات و اقوال ہیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر سمجھ میں آ جاتا ہے کہ یہ کیوں کہا گیا۔ کہ میں (نبی) علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ۔ پہلے پڑھی ہے؟"
"نہیں سر۔۔۔!" اس نے اشتیاق سے کتاب پکڑ لی ۔۔۔ "میں ضرور پڑھوں گی۔"
"اسے پڑھو۔۔۔ زندگی گزارنے کا ڈھنگ۔۔۔ سیکھ لو گی۔" وہ ایک ایک جملے پر زور دے کر بولے۔
"آپ خوش نصیب ہیں ڈاکٹر اتباع۔۔۔ بابا نے اپنی سب سے قیمتی کتابیں آپ کے حوالے کر رکھی ہیں۔"
ڈاکٹر غازی کہیں باہر سے لوٹے تھے۔ اتباع جھینپ کر ورق پلٹنے لگی۔
"کہہ رہے تھے، مرتے وقت تم پر چھوڑ کر جاتا تو دیمک چاٹ جاتی۔ اب اتباع کو دے کر جاؤں گا وہی اس کی اصل حقدار ہے۔"
اتباع کی ٹھوڑی گردن سے چپک گئی۔
"تمہاری غلط فہمی ہے جان پدر۔۔۔! میں اپنی زندگی کی سب سے اہم ترین متاع بھی اسی کو دینا چاہتا ہوں۔"
ڈاکٹر غازی نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔ "یہ لے لیں گی؟ کتابوں کو تو سینے سے لگائے بیٹھی ہیں۔" اب کی بار ڈاکٹر عثمان غنی کے قہقہے سے لکڑی کی سیڑھیاں تک تھرا اٹھیں۔ اتباع اس معنی خیز جملے کو خاک نہ سمجھی۔
"ہونہہ!" وہ بھنّا کر کھڑی ہو گئی۔ "مجلس میں دو افراد کو اشاروں میں بات نہیں کرنی چاہیے آداب کے خلاف ہے۔ ہونہہ۔"
"تو موصوفہ جا کہاں رہی ہیں۔ سن سکتی ہیں تو سن کر جائیے۔" ڈاکٹر عثمان غنی کا لہجہ خوش دلی اور شوخی سے معمور تھا۔
"ناراض تو ہو کر جا رہی ہو مگر تم ہو اچھی لڑکی۔۔۔" اتباع کے بڑھتے قدم رکے۔۔۔ اس نے ہونٹ کا کونہ دانت میں بھینچ کر مسکراہٹ دبائی۔
"ناراض تو کر دیا ہے۔۔۔ مگر ہیں آپ بڑے اچھے ۔۔۔" وہ مڑ کے کہتے رکی۔
"ہاہاہا۔۔۔ کہو ناں لڑکے۔۔۔!" ڈاکٹر عثمان غنی کے لطف کی حد نہ تھی۔
غازی نے بہت دلچسپی سے اس نوک جھونک کو دیکھا۔ وہ مصنوعی خفگی دکھاتی اندر چلی گئی۔
میرون پھولوں والے زرد سوٹ میں کالی گھنی پلکوں والی لڑکی۔۔۔ باغ میں کھلے سارے پھولوں سے زیادہ شگفتہ لگ رہی تھی۔ موسم کا جوبن اس پر بھی ٹوٹ کر برسا تھا۔
برف اور سردی نے ہر شے کی خوب صورتی ڈھانپ دیا تھا۔ اب بہار میں گرم موٹے کپڑوں سے آزاد اس کا نازک سراپا شاخ گل کی طرح لچکتا تھا۔
ڈاکٹر غنی نے بیٹے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے کچھ کہا تھا۔ دونوں ہنس پڑے۔
اس ساری گفتگو کے کچھ حصے کچھ آدھے کاٹے جملے کسی اور کے کانوں میں بھی پڑے تھے۔ ڈاکٹر شاہان حق دق رہ گئیں۔ وہ سنگی مجسمے کی طرح جوں کی توں کھڑی تھیں۔ صرف کپکپاتے ہونٹ۔۔۔ اور پھر ٹپ ٹپ گال پر پھسلتے آنسو۔۔۔ بتاتے تھے یہ مجسمہ نہیں انسان ہے، زندہ انسان۔
"کیا ہوا ڈاکٹر شاہان! کیا ہوا؟" پلوشے کی نگاہ پڑی۔
"آں۔۔۔ مجھے لے چلو۔۔۔ پلوشے! مجھے کہیں لے چلو۔۔۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ اپنے ذاتی لیپ ٹاپ پر رجا سے ہمکلام تھی۔ یہ ڈاکٹر غازی نے اسے منگوا کر دیا تھا۔ پیسے اسی کے تھے۔ مگر خصوصی دلچسپی غازی ہی کی تھی۔ ڈاکٹر شاہان سر تک چادر تانے سو رہی تھیں۔ دو تین روز سے ان کی طبیعت خراب تھی، وہ رات کے آخری پہر رجا سے محو گفتگو تھی۔ بدہم بدہم۔۔۔
"تم مجھے فون نہیں کرتیں لیکن مجھے برا نہیں لگتا اور سچ کہوں میں نے انتظار کرنا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ ایک طمانیت ہے کہ تم کہیں نہ کہیں مصروف و مگن ہو تب ہی تو۔۔۔ میں اپنے تصوّرات میں تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں اتباع! مجھے خوشی ہے تمہیں دوست مل گئے ہیں۔"
"مجھے محبت بھی مل گئی رجا!" اس کا لہجہ خوشی سے مخمور تھا۔
"تو تسلیم ہی کر لیا۔ کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ کبھی دکھا بھی دو۔" رجا کی آواز میں شوخی تھی۔
"دکھا دوں گی کبھی۔۔۔ کیا کہوں کہ جی ذرا اسکرین کے سامنے آئیے آپ۔۔۔"
"آپ کا بردکھوا ہوتا ہے۔" رجا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
اتباع نے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔
"میں نے تم سے کہا تھا ناں، پہاڑ ندیاں، وادیاں، مجھے بلاتی تھیں۔"
"ڈاکٹر صاحب کا نام بھی شامل کر لو ان ناموں میں۔ وہ بھی صدائیں لگاتے ہوں گے۔" رجا پھر چہکی۔
"تم بہت بدتمیز ہو۔"

"اور تم بہت گھنی میسنی۔"

"لو میں نے کیا کیا ہے؟"

"وہ پھول دینے والا قصہ پورا نہیں سنایا تھا۔ میں خود ہی قیافے لگاتی رہی۔"

"اچھا وہ۔" اتباع نے لمبا کھینچا۔ "ہماری سسٹر ہے پلوشے۔ میں نے یونہی اس سے کہا کہ یہاں کے لڑکوں کو لڑکی منانے کے لیے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی ہوگی۔ اتنے پھول ہیں۔ سارے رنگوں کا گلدستہ دو اور لڑکی راضی۔ پلوشے نے انکار کیا کہ آپ کے لیے پھول اہم ہوں گے۔ نہ لڑکے دینا پسند کرتے ہیں نہ لڑکیاں لینا۔ سب سے اہم معاشی طور پر مضبوطی ہے۔ پھول وول سب کتابی باتیں۔"

"معاش ضرور اہم ہے مگر محبت سے بڑھ کر نہیں۔ میں تو نثار ہو جاؤں اگر کوئی مجھے اس طرح پھول دے۔" میں نے کہا۔

اب اس نے یہ قصہ مزے لے لے کر سب کو سنایا۔ اگلے روز سے پھول دینا شروع۔ اتنے دن ہو گئے ہیں گنتی یاد نہیں۔ مگر وہ روز میرے لیے ایک پھول لاتے ہیں۔ اور تم حیران ہوگی ہر دن نیا پھول۔ کبھی بڑا کبھی چھوٹا۔ کل میں سر جھکائے ایک کیس کے سلسلے میں میڈیکل بک پڑھ رہی تھی بے حد سنجیدگی سے کچھ لینے کے لیے اندر آ گئے۔ قسم سے میرا پورا دھیان کتاب پر تھا۔ یکدم آواز آئی۔

"پتا نہیں آپ کب نثار ہوں گی۔ میں گرد و نواح کے چپے چپے سے پھول ڈھونڈ کر روز وار رہا ہوں، فکر صرف یہ ہے کہ اسٹاک ختم ہو گیا تو کیا پھر دوسائی کے میدانوں میں جاؤں گا۔ وہاں سے اب ہر روز صبح صبح تو آ نہ سکوں گا پھر آپ کہیں گی محبت میں اتنا بھی نہ کر سکا۔ لوگ چاند تارے توڑ لانے کا وعدہ کرتے ہیں۔ میں نے وعدہ تو کوئی نہیں کیا مگر پھولوں کی اقسام اب ختم ہونے کو ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا کروں۔"

اتنی معصومیت سے سوال کیا کہ میں سب بھول بھال منہ دیکھتی رہی۔

"تو آپ کو کہا کس نے ہے پھول لانے کے لیے؟"

"اسی لیے۔" فوراً" افسردہ ہو گئے۔ "میں بغیر کہے لا رہا ہوں جب ہی آپ ناقدری کر رہی ہیں، جواب ہی نہیں دیتی ہیں۔"

"اری احمق! فوراً" آئی لو یو بول دیتی۔" رجا نے سر پٹخا۔

"یہ آسٹریلیا نہیں ہے۔" اتباع کی جان جل گئی۔

"تو پھر آئی ہیٹ یو کہہ دینا تھا۔" رجا کو تپ چڑھی۔

"ارے واہ خوامخواہ۔ کیوں؟" اس نے تیزی دکھائی اور دونوں ایک ساتھ ہنس دیں۔

"لیکن کوئی جواب تو دیا ہو گا ناں۔" رجا کی تشفی نہ ہوئی تھی۔

"کسی لڑکی کا پھول قبول کر لینا تمام سوالوں کا جواب ہوتا ہے۔"

میں استانی بن گئی فوراً" اور ان کا تو منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ایک رنگ آئے ایک جائے۔ پھر فوراً" سر پر پیر رکھ کے بھاگے۔ شاید کچھ دیر اور رکتے تو بھنگڑا ڈالتے۔ اپنی عمر و رتبے کا لحاظ آ گیا ہو گا۔" اس کی آواز خوشی سے کھلی پڑ رہی تھی۔ رجا دل کھول کر ہنسی۔

"اور۔ اور۔ بتاؤ ناں؟" وہ نجانے کیا اگلوانا چاہتی تھی۔

دونوں اپنی خوشی میں مست تھیں۔ گھٹی گھٹی سسکیوں کی جانب دھیان ہی نہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"میرے اندازے غلط ہی نکلتے ہیں مگر آج مجھے اندازے کی غلطی پر رنجیدگی نہیں ہے۔" اس نے اونچی آواز میں کہا۔

"کون سا اندازہ۔" پلوشے کی آواز بھی بلند تھی۔ وہ سب برآمدے میں کھڑے تھے۔ بارش کی بوندیں منہ زور تھیں۔ آدھا برآمدہ گیلا ہو چکا تھا۔

"یہی اندازہ کہ بارش کا اصل لطف ساحل سمندر پر ہے۔ نہیں بارش کی اصل خوب صورتی تو یہاں ہے۔"

تیز دھار نے نظروں کے آگے سرمئی جالی دار پردہ حائل کر دیا تھا۔ ہر منظر دھند میں چھپ گیا تھا۔ حد نگاہ

…ہو گئی تھی۔ پہاڑ شائبہ رہ گئے تھے۔ شاید نہیں… نظر تو آ نہیں رہے۔"

"…تو نا پلوشے بھیگتے ہیں۔"

"ہاں جی۔ یہ سمندر والی بارش نہیں۔ آپ بھی… بیمار پڑ جائیں گی۔"

"…اور آپ کو کہہ نہیں سکتی ڈاکٹر شاہان! آپ بہت… اور دل گیری دکھائی دے رہی ہیں۔ نیلے میرون… میں وہ بہت پژمردہ دکھائی پڑتی تھیں۔" "اور پلیز… اور رنگ پہن لیا کریں۔ یہ بہت سجتا ہے آپ پر… یقین کریں دوسرے رنگ بھی بہت پیارے لگیں گے۔"

"کس کو۔ کس کو پیارے لگیں گے؟" آنکھوں میں تیرتی اداسی سے زیادہ ناامید حملہ۔

اتباع اٹک گئی۔ "کسی کو پیارے نہیں۔ آپ بہت اچھی لگیں گی۔ رنگ زندگی کے احساس کا نام ہے۔"

"میں کسی کو اچھی نہیں لگ سکتی۔" وہ قطعیت سے بولیں۔

"ہائیں یہ۔"

"چائے لیں، پانڑا بی بی! خدارا پکوڑے مزے کے بنے ہوں۔" ڈاکٹر عثمان غنی نے آواز لگائی۔

وہ برآمدے کے دوسرے سرے پر کرسی سنبھال چکے تھے۔ گرم چائے اور پکوڑوں کی مہک۔

"ام امیشہ مزے دار کانا بناتی اے۔" پانڑا بی بی لوائے بے نیازی سے اندر غائب ہو گئی سب حق دق۔ اور پھر زور و شور سے ہنس دیے۔ پکوڑے واقعی مزے دار تھے۔

ڈاکٹر شاہان کے چہرے سے ٹپکتی نقاہت اور آنکھوں کی اداسی ماحول پر غالب آ گئی۔ پانچ افراد کی… کے بیچ جو بارش کا شور حاوی تھا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آئی ایم سوری۔"

ڈاکٹر شاہان یکدم ادھوری چائے چھوڑ کھڑی ہو گئیں۔ پلوشے بھی اٹھ گئی۔ اتباع نے نا سمجھی سے دیکھا۔ اسے کچھ عجیب سا احساس ہوا پلوشے کے انداز میں ہمدردی تھی۔ ڈاکٹر عثمان غنی کی آنکھوں میں سنجیدگی اور قطعی پن۔

انہوں نے بس اک نظر کھڑے ہوئے لوگ دیکھے اور ذرا سا پہلو بدل چائے کے گھونٹ لینے لگے۔ اتباع کو گمان گزرا غازی کے چہرے پر ناگواری و ناراضی سی تھی۔ پتا نہیں کیوں وہ ڈاکٹر شاہان کے پیچھے گیا تھا۔

اتباع کو عجیب سا لگا۔ کچھ تھا جس کی سب کو خبر تھی۔ اس کی ٹوہ والی فطرت نہیں تھی اور کچھ شاہان کی پہلی تادیب۔ ہاں ہر شخص کے پاس اپنی کہانی اپنی وجوہات اپنے دکھ سکھ ہوتے ہیں اور کچھ دل اتنے سخت بھی ہوتے ہیں کہ سب سہتے ہیں اور عیاں نہیں ہوتے۔

اس کے ذہن میں مختلف واقعات فلم کی طرح چلنے لگے۔ شاہان فطری طور زندہ دل تھیں مگر جب اپنے خول میں سمٹتیں تو ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی اجنبی بن جاتیں۔

"اتباع!" ڈاکٹر غنی کی پرسوچ آواز ابھری، وہ اپنے خیالات سے ابھری۔

"تم سے کچھ مانگوں۔ تو۔ دو گی؟"

"مجھ سے؟" اس نے اپنی شہادت کی انگلی اپنے سینے پر رکھی۔ "میں کیا دے سکتی ہوں سر۔! میرے پاس کچھ نہیں ایسا جو۔"

"تمہارے پاس ہے ایک۔ ہاں۔ مجھے اسی کی ضرورت ہے۔"

کس چیز کی ہاں؟" وہ نا سمجھی سے ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ جس پر گمبھیرتا مگر تیقن بھی تھا۔ طمانیت کی کیفیت۔

"کیا ہوا پلوشے۔؟" اس کی نگاہ یکدم ٹھہری۔ ڈاکٹر غنی بھی چونکے۔

"وہ۔ میں۔ ڈاکٹر صاحب کا فون لینے آئی تھی۔ ادھر رہ گیا تھا۔" وہ کچھ گھبرا کے صفائی دیتے بولی۔

"ہاں یہ رہا۔" اس نے موبائل اٹھا کر دونوں کو دکھایا اور الٹے قدموں پلٹ گئی۔ اتباع نے اچنبھے سے ڈاکٹر عثمان غنی کا چہرہ دیکھا اپنی بات کا تسلسل ٹوٹنے پر

ان کے چہرے پہ ناگواری تھی اور وہ کیا کہہ رہے تھے۔

اسے گھبراہٹ سی ہوئی۔ کوئی پر اسراریت...؟؟؟ کوئی راز... کیا تھا۔

"آ... آپ کچھ کہہ رہے تھے سر!"

"آں ہاں..." وہ سوچوں سے ابھرے۔

اتباع الجھی... یہ کون سی بات ہوئی۔

اور ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ کھو گئے۔ شاید الفاظ مجتمع کر رہے تھے۔ اتباع منتظر تھی۔ ڈاکٹر غازی واپس آ گئے تھے۔ ڈاکٹر شاہان نے آرام کرنے کا کہہ کر انہیں بھیج دیا تھا۔ غازی کے چہرے پر سنجیدگی اور کچھ غصہ سا تھا۔ اتباع کو صورت حال بہت عجیب ناقابل فہم لگ رہی تھی۔ اتباع کے چہرے پر ہر بار نگاہ پڑتے ہی غازی دل سے مسکرا دیا کرتا تھا۔ مگر اس بار بس اس کے چہرے پر ایک نرم تاثر پل بھر کو ٹھہرا تھا۔

"میں تمہیں ایک ہی نام سے پکارنا چاہتا ہوں اتباع اگر تمہیں وہ پسند نہیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم سے بہت انسیت لگاؤ اور محبت ہو گئی ہے۔ بہت زیادہ۔"

اتباع کے سر پر دھماکہ ہوا۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ پیروں سے مانو زمین کھسک گئی۔

جملے کا پہلا حصہ... جملے کا دوسرا حصہ...

"اور اس غازی کو بھی... مگر اس نے کہا نہیں ہو گا۔ میں نے پہلے کہہ دیا ہے۔ سو میری بات مان لو۔ ہمارے گھر آ جاؤ ہمیشہ کے لیے۔"

"ہاہ...!" اس کی انگلیاں ہونٹوں سے چپک گئیں۔

"غازی کا ہاتھ پکڑ کے..." ان کے جملے میں اداسی، فکر مندی، شرارت اور محبت بھری ہوئی تھی۔

ایک بے حد عجیب طرح کے بے حد قابل اعتراض دکھائی دیتے جملے کا انت... اتنا خوب صورت چونکا دینے والا۔

لڑکیاں ہمیشہ اظہار کے خوب صورت جملوں، رویوں کی منتظر رہتی ہیں۔ اسے کس طرح کا ری ایکشن دینا چاہیے۔

اس کے چہرے کے حق دق الجھے تاثرات پہ ڈاکٹر عثمان غنی زور سے ہنس دیے۔ غازی کا چہرہ بھی کھلا کھلا تھا۔

"مجھے یقین ہے اس نے تمہیں کچھ نہ کہا ہو گا سوائے پھول دینے کے۔" اتباع اچھلی (ڈاکٹر غازی بھی) "میں اظہار محبت کر چکا ہوں احمق! اگر تمہیں کچھ کہنا ہے تو تم بھی کہہ سکتے ہو۔"

غازی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بند کر لیے۔

"نہیں، باقی بھی آپ ہی کہیے۔" اس نے جل کر کہا تھا۔

ڈاکٹر عثمان غنی دل کھول کر ہنسے۔ اتباع کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا پیاری لڑکی... تم کو کیا واقعی ہم سے محبت نہیں ہوئی... کمال ہے۔" وہ حیرت سے بولے۔

اتباع نے سر اٹھایا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب تھیں۔

"تت تت..." ڈاکٹر عثمان غنی کی تاسف سے پُر آواز گونجی وہ غازی کو لتاڑ رہے تھے۔ "مجھے یقین تھا۔ تمہارا پرپوزل کسی بھی لڑکی کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو بھر دے گا۔ اتنا دکھ... چچ چچ۔"

"نہیں نہیں..." اس نے بے ساختگی سے سر اٹھا کر نفی میں گردن ہلائی۔

اس کا عجلت بھرا انکار ڈاکٹر عثمان غنی کے چہرے پر طمانیت آمیز شرارت لے آیا اور غازی نے بہت دلچسپی سے کچھ ہونق دکھائی دیتی اتباع کو دیکھا۔ یہ اتنی اچانک صورت حال...

"تو پھر تمہارا جواب... کیا ہو گا؟" اتباع کی آنکھیں جھلملانے لگیں۔ وہ کیا جواب دے۔

"رشتے ایسے طے ہوتے ہیں۔ ماں باپ، رشتے دار، دوست... سب کہاں تھے؟" اور ڈاکٹر عثمان غنی کو چہرہ پڑھنے میں کمال حاصل تھا گویا۔

"تم ہاں کر دو... پھر باقی جس جس سے کہو گی میں اس کے پاس چلا جاؤں گا دامن پھیلانے۔" وہ پدرانہ

شفقت سے اس کے چہرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ دونوں باپ بیٹا کی نگاہیں اپنے چہرے پر محسوس ہو رہی تھیں۔ دھاڑیں مار مار کر رونے کی خواہش پر کیسے کنٹرول کیا تھا۔ یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس کا سر نفی میں ہلا۔

"کوئی نہیں ہے... کوئی نہیں رہا۔" اس نے بمشکل کہا۔

"ارے بے وقوف!" ڈاکٹر عثمان غنی نے یکدم اس کے شانے پر بازو پھیلا دیے۔ "یہ کیسی بات کر دی۔ پیار کرتے ہیں ہم تم میری بیٹی بن جاؤ... یہ غازی بھی تو کچھ کلم کرے، آئے میرے پاس تمہارا ہاتھ مانگنے... تھوڑی منت ترلے کرے... جوتیاں چٹخائے۔ ایسے نہیں اپنی بیٹو کا ہاتھ دوں گا نہیں۔ کیوں ٹھیک ہے ناں؟"

ڈاکٹر غازی نے شانے اچکا کر کوئی اعتراض نہ ہونے کا عندیہ دیا تھا۔

وہ آنسو پونچھنے لگی۔ دل بھر بھر آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پیاری بیٹو! سدا خوش و خرم و کامران رہو

جب تک یہ سطور تم پڑھنا شروع کرو گی۔ میں تم سے بہت دور جا چکا ہوں گا۔ تم یقیناً" حیران ہو رہی ہو گی کہ میں نے تمہیں کیسے مخاطب کیا۔ پہلے کبھی آمنے سامنے ایسے پکارا نہیں ناں... ہماری کبھی گفتگو بھی تو نہ ہوئی ناں... میرا نہیں خیال کہ ہم نے کبھی باہم کوئی مکالمہ کیا ہو۔

لیکن اس سے یہ خیال نہ کرنا کہ میں تمہیں جانتا نہیں تھا، تمہارے وجود سے انجان تھا۔ بے خبر یا نعوذباللہ متنفر... توبہ استغفار۔ بھلا بیٹیوں کے ساتھ ایسے جملے سجتے ہیں، وہ تو بس پیار کیے جانے کے لیے دنیا میں بھیجی جاتی ہیں۔

کل رات میری طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ ہوش و بے ہوشی کے وقفے... دل میں درد تھا، رگوں میں خون کی جگہ مرچیں دوڑنے لگی تھیں جیسے۔ حلق خشک۔ سب سمجھے جانکنی کا پل بس یہی ہے مگر میں تو کہوں گا فرشتہ اجل بس پیر کا انگوٹھا ہلا گیا۔ کہ بس آ رہا ہوں... فرشتے ایسی مہلت کب دیتے ہیں اس تشنجی کیفیت سے نکلا تو بلب کی سفید روشنی میں ہر شے بہت نکھری ستھری تھی۔ ہر منظر واضح...

ارد گرد کھڑے مہربان دھیرے دھیرے پلٹ گئے کہ ابھی بڈھے میں دم ہے اور ابھی کچھ نہیں ہوا۔ سفید چادر میں چت لیٹا میں بظاہر پُر سکون دکھائی دے رہا ہوں گا مگر تم سوچو جس نے چند لمحے پہلے آخری کلمہ پڑھ لیا ہو۔ وہ پُر سکون ہو سکتا ہے۔ جب ہم موت کو قریب دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں ساری زندگی کا ہر پل فلم کی طرح نگاہوں میں گھوم جاتا ہے۔ اور میری فلم کامیاب تھی۔

نماز، روزہ، زکواۃ، حج سب تو کر لیا۔ حقوق و فرائض... مگر دیکھو ہم وہاں نہیں تھیں مگر اچانک اس کمرے میں آ دھمکیں۔ تم منہ سے کچھ نہ بولیں۔ مگر مجھے دفعتاً" خیال آیا اگر اللہ نے مجھ سے نماز سے پہلے تمہارے بارے میں سوال کر لیا تو...؟

مجھے کلمے یاد تھے اور ماتھے پر سجدوں کا کالا نشان... بتا دیتا۔ میں نے کبھی فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی۔

مگر بیٹو! یہ میرا ایک پل سیاہی کی جانب مائل چہرہ جو انت میں اتنا سیاہ ہو گیا کہ سجدے کے نشان پر بھی چڑھ گیا۔ اب کیا دکھا کر قبر کے عذاب سے جان چھڑاؤں اور جنت کا مطالبہ کروں۔

میرے بدترین اعمالوں کی گٹھڑی میرے منہ پر مار دی گئی۔ جاؤ چلے جاؤ...

تمہارے گھر میں ایک یتیم مٹی میں رلتا رہا۔ ٹھوکروں میں پلتا رہا اور تم نے ایک بار بھی اس کے سر پر دست شفقت نہ رکھا۔

میرا قلم لڑکھڑا رہا ہے بیٹو... میں رو رہا ہوں ناں

اور یتیم کون ہوتا ہے، یتیم وہ ہوتا ہے جس کے

حقوق کی پاس داری کے لیے آیتوں پر آیتیں اتاری جاتی رہیں۔ اچھا ہے تم میرے سامنے نہیں ہو ورنہ پتا نہیں۔

مجھے یاد ہے بیٹو! سارے گھر کو تم ہی سے شکایتیں ہوتی تھیں۔ نقصان، شور، بدتمیزی، غلطیاں سب تم سے منسوب کردی جاتی تھیں۔ مگر تم جواباً" کچھ کہتی بھی تو نہیں تھیں۔ بڑھاپا میری یادداشت کھا گیا ہے مگر مجھے کچھ یاد ہو نہ ہو، یہ ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ تمہاری تائی اور چچی تمہاری شکایت لگانے میرے پاس کھڑی ہیں۔ تم متوقع سزا کے ڈر سے سہمی کھڑی ہو اور تب ہی ایک عجیب حرکت کرتیں کہ میرے نزدیک آکر میری ہی پشت پر کھڑے ہو کر میری آستین جکڑ لیتیں۔ اب منصف کیا سزا سنائے۔ مجرم اسی کی تو پناہ میں ہے۔

تم ایسا کیوں کرتی تھیں، مجھے جواب کی شدید طلب ہے۔

اس گھر جائیداد میں تم برابر کی حق دار تھیں۔ تین بھائیوں کی مشترکہ ملکیت یہ گھر تمہارا بھی تھا مگر پتا نہیں کب تمہارے ابو کے انتقال کے بعد وہ ہم دونوں بھائیوں کی ملکیت رہ گیا۔ اسی طرح کاروبار میں بھی سلطان کا اتنا ہی حق تھا مگر وہ مر گیا تو حصہ ختم ہو گیا؟ تم تھیں ناں اس کی وارث..... مگر ایک اکیلی لڑکی کو اتنا بڑا حصہ کیسے دیا جاسکتا ہے اور اب تم ٹکڑوں اور ٹھوکروں میں پڑی تھیں۔

سچ کہوں۔ مجھے کبھی احساس نہیں ہوا۔

ہاں، گھر میں اچھا پک رہا ہے تو سب کھا رہے ہیں۔ ہاتھ پکڑ کر کون روکے گا۔

سب کے لیے اچھا پہننے کو آتا ہے ناں۔ دونوں بھائیوں کی بیویاں بہنیں تھیں تو تفریق کیسی..... یاد ہی نہ رہا، تیسرے بھائی نے ایک بیٹی چھوڑ دی دو کے آسرے پہ.....

میں نے کبھی تمہارے چہرے پر ہنسی نہیں دیکھی۔ مسکراہٹ..... تم مسکراتی کیوں نہیں تھیں؟

دبلی پتلی، مسلونی خاموش ویران آنکھوں والی خاموشی سے گھر کے کاموں میں لگی یا پھر گود میں کتابیں رکھ کر بیٹھی تنہا لڑکی.....

میرے..... ہاتھ رعشہ زدہ ہو رہے ہیں۔ کاش میں سب لکھ پاتا۔ تمہاری کم مائیگی، چہرے سے چھلکتی بے بسی جو قدرت نے دی تھی۔ اس پر طاری مسکینیت ہمارا کارنامہ ہی رہی ہوگی۔ ہے ناں۔

کیا تم ہمیں معاف کردو گی؟

بیٹا! کردینا..... کیونکہ اب معافی مانگنے کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں..... رات سے اب تک تم ہزار روپ بدل کر میرے سامنے آرہی ہو اتنی بار تو حقیقت میں بھی نظر نہ آئی ہوگی۔

میں تم سے خالی خولی معافی طلب نہیں کر رہا۔ میں مداوا کرنے کی کوشش بھی کروں گا مگر تم جان لو۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اور تمہاری پرواہ اور فکر ..... یاد رکھو، زندگی پر، خوشیوں پر تمہارا بھی پورا حق ہے اور وقت آنے پر وہ تمہیں مل جائیں گی۔ بس ہمت جوان رکھنا۔ مایوس مت ہونا اور اور کبھی بددعا مت دینا کسی کو بھی.....

اللہ پر یقین رکھنا، اس نے ہر شخص کے لیے ہر چیز طے کر رکھی ہوتی ہے۔ ہاں ایک بات اور۔ میں جو کر کے جا رہا ہوں۔ اس پر تم ڈٹی رہنا پیچھے نہ ہٹنا یہ تمہارے حق سے تو بہت کم ہے۔ مگر ہے تمہارے ہی لیے۔ اپنی تعلیم جاری رکھنا۔ تم سلطان کی طرح بہت قابل لڑکی ہو، اسی کی طرح ذہین۔

حیران ہو رہی ہو ناں..... پیاری بیٹو! ابھی تو بتایا کل رات فرشتہ پیر کا انگوٹھا ہلا گیا تھا۔ تم.....

آگے صفحے پر لمبی سی بے اختیار لکیر کھنچی تھی۔

اس نے ہچکیوں سے لرزتے وجود کو بمشکل سہارا دیا تھا۔ سالوں پہلے بھی وہ اس خط کو، ہر ہر نقطے کو پڑھ کر تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ اس کی بے کلی کو آرام نہ تھا۔ اس نے اپنا منہ سر پیٹ ڈالا تھا۔ اور اتنے سال بعد بھی سینہ کوبی کی خواہش کو روکنے کے لیے اس نے ہونٹ کاٹ کاٹ ڈالے تھے۔ جبڑے اتنی سختی سے بھینچے کہ گردن کی رگیں پھٹنے کو ہو گئیں۔

وہ ان کے پہلو سے جا کر کیوں لگتی تھی؟ ان کی پناہ میں چھپ جانے کا مطلب.....

وہ ابو کے بھائی تھے ناں تو ابو ہی کے جیسے لگتے تھے۔ شکل، آواز.....

چچی اور تائی بہنیں تھیں۔ اس پر کوئی پہاڑ توڑ ظلم نہیں تھا۔ مگر وہ بن ماں کی بچی تھی اور اس کی ماں نہیں تھی جو اسے روکتی کہ چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے میلے کپڑے نہیں دھوئے جاسکتے۔

اس کے سر میں جوئیں بھاگتیں اور جسم پر میل کی تہیں بنیاں اٹ جاتیں۔

اس کے باپ کی لائبریری کچن وسیع کرنے کے لیے بھاری قیمتی اور "ردی" آٹھ آنے سیر بیچ دی گئی۔ باپ مر گیا تو گھر کے بڑے ہوتے لڑکوں کو وہ کمرہ دے دیا گیا۔

"وہ لڑکی ہے تو لڑکیوں کے بیچ رہے ناں۔"

ڈبل اسٹوریز بے بی بیڈز والے کمرے کے کونے میں اس کا گدا..... "اے سی میں سوتی ہے ناں۔"

وہ پڑھنے لکھنے ٹی وی دیکھنے کھانے کے درمیان آرام سے اٹھالی جاتی۔ وہ چھوٹے بچوں کو کمر پر ٹکا کر بہلاتی تاوقتیکہ مائیں نیند سے بیدار ہوں کاموں سے فارغ.....

بہت بڑے بڑے شاپنگ مالز کے سیل اسٹینڈ سے کپڑے ..... شمار اس کا بھی مشہور برانڈ کا ہوتا۔ وہ جوتے بہت جلد تو ٹوٹتی ہے۔ باقی تو چلاتے ہیں۔"

اس کی زندگی قطعاً" فلمی یا افسانوی نہیں تھی کہ کوئی ملازم چپکے سے ہمدردیاں جتا کر چوریاں بناتا۔ بوا اس کی روٹی ڈالنا اکثر بھول جاتیں۔ اسے بوٹیوں کے نام نہیں معلوم تھے۔ چیسٹ پیس، لیگ پیس، یا ونگز..... وہ بچے کھچے شوربے سے چھوا چھوا کر کھاتی۔ دبلی پتلی مایوس ویران آنکھوں والی مایوس بچی..... سال کے تین سو چونسٹھ دن سب کی نظروں سے اوجھل رہتی 365 واں دن اس کا ہوتا جب وہ کلاس میں اسکول میں اول آجاتی۔ بس..... اور اپنے بچوں کو جھاڑتی تائی چچی اپنے کمروں میں بند ہو جاتیں۔ وہ رپورٹ کارڈ اور ٹرافی لیے سناٹے کے عالم میں اکیلی کھڑی رہ جاتی۔

"سلمان صاحب کی وصیت کا دوسرا اہم ترین نقطہ یہ ہے کہ آپ میڈیکل کالج میں داخلہ لیں گی اور ہر قیمت پر اپنی ڈاکٹری کی پڑھائی مکمل کریں گی۔" وکیل کہہ رہا تھا.....

وہ سر ہلا گئی۔ وصیت کے پہلے حصے نے گھر کے گیارہ افراد کو جلتے توے پر لا کھڑا کیا تھا۔

بڑے تایا اپنی زندگی میں اپنی آل اولاد میں سب تقسیم کر گئے تھے۔ سلمان چچا نے بھی سب کہہ رکھا تھا، صرف اس کلاتھ اسٹور کی نامزدگی نہ ہوئی تھی۔ اولاد کا خیال تھا بعد میں برابر بانٹ لیں گے۔

مگر اتنا بڑا اسٹور۔ اتنے اہم ترین علاقے کا سب سے چلتا مال اور سونے کی چڑیا جیسا اسٹور جہاں مردانہ بچکانہ زنانہ تمام ورائٹی تھی۔

کتنی خاموشی سے اس اتباع فاطمہ کے نام کر دیا گیا۔

دونوں بہنوں کا حال برا تھا۔ آپس میں رشتے طے تھے۔ سلمان چچا کی بیٹے کو اسٹور ملتا تو عیش تایا کی بیٹی ہی نے کرنا تھا ناں۔

ہائے، ہائے۔

اور تب بڑی عیاری، بھری محبت سے تایا کے بے اولاد بیٹے کا رشتہ اسے دے دیا گیا۔

"تم پڑھائی جاری رکھنا۔ ہمیں تو فخر ہے، تم اتنی لائق۔ ہماری بہو ڈاکٹر۔"

اور ماں باپ کی ترسی اتباع کو ان سب سے محبت اور لگاؤ تھا۔ وہ ماں ہی جاتی۔ مگر رجا.....

اور اگر وہ تائی کا سمجھاؤ نہیں مانتی تو گھر چھوڑ دے (اب اسے کیا کمی) اور رجا سے بڑھ کر سالوں بعد آنے والے ماموں..... وہ اپنی ماں کا عکس پاتے ہوئے لاہور چلی آئی۔

"اب اس گھر میں دوبارہ کبھی نہ آنا۔ ساری زندگی ہم نے کھلایا پلایا اور اب ماما یاد آگیا۔" وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بس ملنے..... یونہی..... مگر رجا کی امی کا سمجھانا۔

وہ کیوں بچے پیدا کرنے کی مشین کا روپ دھار کر مقام حاصل کرنا چاہتی ہے۔

جوان لائق فائق ذہین اور صاحب جائیداد.....

اس نے لاہور کے پرائیویٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ زندگی کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ گویا دنیا بہت اچھی بھی ہے۔

مگر۔

ماموں کا سالا۔۔۔ اس پر حق جمانے لگا۔ اس نے حق کو تسلیم نہ کیا تو دست درازی تک آ گیا۔ وہ بمشکل جان بچا کر ہاسٹل آ گئی۔

اور یہ کمرہ اب اس کا گھر تھا۔ اس کا کل۔۔۔

"پانچ سال کو انجوائے کرنا' ہر پل سے خوشی کشید کرنا لتباع۔۔۔ ہاسٹل لائف کا چارم ہی الگ ہے۔" رجا اسے للچاتی۔

مگر وہاں اس کی روم میٹ۔۔۔ ایک خبطی دولت مند لڑکی۔۔۔

"میں اس کمرے میں پہلے سے ہوں تو زیادہ حق میرا ہے۔"

میں لائٹ بند کر کے گھپ اندھیرے میں سوتی ہوں۔ مجھے کھڑکیاں کھولنا پسند نہیں۔ گہرے رنگ کے پردے باہر کی روشنی کو اندر نہیں آنے دیتے۔ چلو اتارو یہ ہلکے آسمانی جالی کے پردے۔۔۔"

"لکس صابن یوز کرتی ہو' اینٹی سیپٹک کیوں نہیں۔ تم نے سرسوں کا تیل سر میں ڈالا ہے' آوک اواو۔۔۔" وہ الٹیاں کرتی۔

"یہ الماری کا نیچے والا خانہ خالی کر دو' میں نے سال لے اپنے جوتے رکھنے ہیں اور خبردار جو وارڈن کو بتایا۔"

"یہ میرا کمرہ ہے اور تم جانتی ہو میرا باپ کون ہے۔۔۔ ہاہاہا۔"

ایک مسلسل اذیت کے سال۔۔۔ وہ پہلے اور آخری سال میں اس کے ہمراہ تھی۔ شاید اسی نے اس کے ساتھ رہنا پسند کیا ہو گا۔ اتنی خاموشی سے سب سہنے والی اور کوئی نہیں ملی ہو گی۔

اور اب اسی ڈاکٹر اتباع فاطمہ کو سب ملنے لگا تھا۔ ہر چیز۔ رشتے۔۔۔ محبت دوست۔۔۔ شفقت اور قدم جمانے کو زمین۔۔۔

"آپ نے صحیح کہا تھا چاچو۔۔۔! زندگی میں میرے لیے بھی ہر چیز ہے اور چاچو! میری زندگی میں محبت، سائبان' یقین' سچائی شامل ہو گی۔ مجھے ایسے رشتے مل گئے جنہیں صرف میرے وجود سے پیار ہے۔

نہ دولت سے نہ جسم سے۔ کوئی زور زبردستی نہیں چاچو۔۔۔

آپ کہاں ہیں چاچو۔

ابو! آ کر دیکھیں تو ذرا۔

وہ ہنستی تھی اور روتی تھی۔

دھوپ چھاؤں کا منظر۔

☼ ☼ ☼

اس نے گمان کیا تھا کہ وہ بہت بدل چکی ہے۔ با اعتماد' لاپرواہ' مگن' اب اسے کسی چیز کی پرواہ نہیں۔ سب کچھ تو مل گیا تھا۔ وہ اب کسی سے نہیں ڈرے گی اور کسی سے نہیں گھبرائے گی اور اب وہ کیوں روئے؟

مگر یہ دل بار بار کیوں بھر آ رہا تھا۔ وہ کرسی میں دھنسی مزدوروں کی آمدورفت کو دیکھ رہی تھی۔ پلوشے اور پانڑا بی بی اس کی الماری سیٹ کر رہی تھیں۔ نئے فرنیچر کی پالش کی مہک اس کے سر میں درد کا باعث تھی۔

اس نے کئی بار سوچا کہ وہ پلوشے سے پوچھے۔ مگر ایک غیر محسوس سی تبدیلی کا احساس اب ختمی ہو چکا تھا۔ وہ اپنی نئی خوشیوں' دوستوں' رشتوں میں بری طرح مگن ہو چکی تھی۔ ورنہ بدلتے رویے فوراً" پکڑ لیتی۔ وہ جلد اعتبار کرتی تھی۔ چہرے پڑھتی تھی۔ خوشگواری کی تحریر سے اس کا رابطہ کم تھا مگر ناگواری کو وہ پہلی نگاہ میں بھانپ لیتی تھی۔

"کہیں کچھ غلط تھا" اس نے اپنی پیشانی مسلی۔ مگر کیا۔۔۔ اور کیوں۔ ؛ ہاں وہ لطف اٹھا رہی تھی۔ ڈاکٹر غازی کی مسکراتی نظروں کا۔۔۔

ڈاکٹر عثمان غنی کا مشفق دوستانہ روپ اس کی زندگی کی ساری محرومیاں ہڑپ کر گیا تھا۔ اس کے مریض' اس کا پیشہ' عبادت' اس کی کتابیں۔۔۔ وہ اتنی مگن ہو

چکی تھی کہ گزرے وقت کی کوئی تلخی اب دل کو نہیں نچوڑتی تھی۔ مگر.....

"میں اس کمرے میں بہت خوش تھی پلوشے! ہاں میں نے شروع میں الگ کمرے کی فرمائش کی تھی۔ مگر ..... اب تو ایسا کچھ نہیں تھا۔"

"مگر یہ تو طے تھا ڈاکٹر صاحبہ کہ نئے کمروں کی تعمیر مکمل ہوتے ہی آپ کو کمرہ مل جائے گا۔"

ایک بے حد الجھے اندیشے کا بہت سیدھا منطقی جواب.....

"مجھے بہت انسیت ہو گئی تھی وہاں سے ..... میرا دل نہیں لگ رہا پلوشے!" اس نے اپنی ہتھیلیاں مسلیں۔

پلوشے نے ابرو چڑھائے۔ "اگر آپ کہیں تو ڈاکٹر شاہان کو یہاں منتقل کر دیتے ہیں۔ آپ وہاں رہیے۔ آپ کا دل لگ جائے گا تب تو۔" اتباع کو اس کے لہجے سے آنچ نکلتی محسوس ہوئی۔

"کوئی بات ہے پلوشے.....؟" وہ چونکی۔ "میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں وہ بہت چپ چپ رہتی ہیں۔ اور تنہا بھی۔ بس کام مکمل اور کمرے میں ..... بلکہ کمرے میں بھی یا تو موبائل پر ہوتی ہیں یا پھر سر تک چادر تان لیتی ہیں۔ کیا ہوا ہے؟"

پلوشے کے چلتے ہاتھ پل بھر کو رکے۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا طنز آیا اور معدوم ہو گیا۔

"غلط فہمی ہے آپ کی....."

پانزا نے مقامی زبان میں پلوشے سے پوچھا کہ ڈاکٹر کیا کہہ رہی ہے۔ پلوشے نے جواب میں انتہائی ناگواری سے تیز تیز لہجے میں کچھ کہا۔ اتباع سمجھ تو نہ سکی مگر ایک فوری فیصلے کے تحت کمرے سے نکلی۔ وہ خود معلوم کرے گی کہ کیا بات ہے۔

ڈاکٹر شاہان کا کمرہ بکھرا ہوا تھا۔ اتباع کا سامان شفٹ کیا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا۔ ڈاکٹر شاہان چائے بنانے کے لیے سلیب کے سامنے کھڑی تھیں اور نگاہیں ابلتے قہوے پر تھیں۔ مگر دھیان کہیں اور ہی تھا۔

اس نے دھیرے سے شانہ چھو کر متوجہ کیا۔ وہ چونک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔ نیلی آنکھیں حلقوں کے گھیرے میں تھیں۔ ناامیدی، ہار، پچھتاوا۔ دکھ کی تحریر.....

"اگر کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کر لیتے ہیں اور اگر غلطی تو میں معذرت طلب ہوں گی۔ کچھ دن گزرے ہم ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہو گئیں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ چائے کپ میں انڈیلنے لگیں۔

"میں نے بہت کم عمری میں لوگوں کے بدلتے رویے پہچاننا شروع کر دیا تھا ڈاکٹر شاہان! ہاں اس بار ..... دھیان ذرا دیر سے آیا مگر بہر حال کوئی بات ہے اور بہت بڑی بات۔ میں اب یادداشت پر زور دوں تو..... آپ بہت خاموش ہو گئی ہیں۔ مگر میرے ساتھ تو باقاعدہ خفا لگتی ہیں۔ باقی سب سے تو کم ہی سہی مگر بات کرتی ہیں بلکہ۔" اسے یکدم کلک ہوا "مجھے تو آپ نے کئی دن سے مخاطب بھی نہیں کیا۔ ہاں ناں....." اس کو جیسے سب یاد آنے لگا تھا۔ "ایسا ہی ہے" اس نے زور دیا۔ "میں نہیں جاؤں گی۔ اس کمرے سے..... بھلے آپ جتنا مرضی کہیں۔"

اس نے منہ بسور کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "مجھے بتائیے ناں ڈاکٹر! کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں ہے۔" شاہان نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ "میں نہیں جاؤں گی جب تک آپ مجھے بتائیں گی نہیں۔"

وہ بچکانہ لاڈ سے اچھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں تو آپ کو اب جانے کو کہہ بھی کون سکتا ہے۔ اب تو آپ ہر شے کی مالکن ہونے والی ہیں۔"

پلوشہ کچھ لینے آئی تھی۔ اتباع بھونچکی رہ گئی۔ کیا ہو گیا تھا۔

"تو کیا ڈاکٹر عثمان غنی نے....." لیکن وہ تو کہہ رہے تھے اس کے جواب سے پہلے وہ کسی کو.....

"تو آپ کیا سمجھتی ہیں ایسی باتیں چھپ جاتی ہیں۔" پلوشے کے لہجے میں آگ سی تھی۔

...ع کا سارا وجود جھنجھنا اٹھا۔

"...نے تو بازی مار لی ہے بھئی۔"

...کے چہرے پر رنگ بکھر گئے۔ "میں بتانے ہی ...تھی مگر پھر سر نے کہا کہ وہ باضابطہ اعلان کریں خود ہی..... تو بس اس لیے۔" اس کے چہرے کا تبسم دل موہ لینے والا تھا۔

"اور..... اور غازی سر نے کیا کہا؟" پلوشے کو پوری ...مات درکار تھیں۔ ڈاکٹر شاہان کا چہرہ سوالیہ تھا مگر وہ ...یں ظاہر کر رہی تھیں کہ جیسے دھیان نہ ہو۔

"وہ..... وہ بھی..... پہلے تو....." اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ پانزا لی بی ہانپتی کانپتی آئیں۔

"اب آم تھک گیا۔ کانا مانا نہیں بنا سکتا۔" پانزا نے اپنے تئیں انہیں ڈرایا۔

"کوئی بات نئیں بی بی..... آج میں کچھ بناؤں..... میرا بہت دل ہے بریانی کا۔ اب تو سب راشن بھی آ گیا ہے۔"

اسے یاد آیا، وہ یہاں آ کر کراچی جیسی چٹ پٹی بریانی کو ترس گئی تھی یہاں سب پلاؤ کے شائق تھے۔

"سر تیز مسالے نہیں کھاتے پھر ان کے لیے کیا ...ے گا؟" شاہان نے پہلی بار دلچسپی لی۔

"میں نے پوچھ لیا ہے، وہ مان گئے ہیں۔ میں بند کو بھی کارائتہ بناؤں گی پھیکا سا۔"

"زمائی ٹول داکور واک اختیار وا غستو۔" پانزا نے بہت برا منہ بنا کر واپسی کے قدم بڑھائے۔ اتباع سمجھ نہ سکی۔ پلوشے کے انداز میں طنز آ گیا تھا۔ اور ڈاکٹر شاہان کا سر جھک گیا تھا۔

"کیا کہہ رہی ہیں۔ کیا اختیار؟" وہ ایک آدھ ہی لفظ ہی پکڑ پائی۔

"کچھ نہیں..... وہ کہتی ہی رہتی ہیں۔ تم یہ بتاؤ، جب تمہیں اب ڈاکٹر صاحب کے گھر ہی شفٹ ہو جانا ہے تو..... اتنا ملال کس لیے۔ تب بھی تو یہ کمرہ چھوٹنا ہی تھا ناں؟" ڈاکٹر شاہان نے پہلی بار اتنا بڑا جملہ کہا۔

"وہ..... تو اور بات ہوتی ناں....." اس کا چہرہ رنگا گیا۔

☼ ☼ ☼

"یار! تم کہہ تو رہی تھیں پلوشے بہت پیاری ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سوچتی ہو۔ ڈاکٹر غازی کے ساتھ شاید ....." رات اس کی بپتا کے جواب میں رجا نے فوری قیاس کے گھوڑے دوڑائے۔

"نہیں یار..... اس کا منگیتر ہے فوج میں..... لیکن پتا نہیں ڈاکٹر شاہان کو کیا ہو گیا ہے..... بہت ہی خاموش اور افسردہ ہو گئی ہیں۔ مجھے تو ترس آنے لگا ہے۔ پہلے تو اتنی اچھی سی تھیں۔ گانے سنتی تھیں اور گنگناتی بھی تھیں۔ سادہ کپڑے پہنتی تھیں مگر کپڑے بناتی بہت تھیں مگر سب نیلے رنگ کے..... نیلے رنگ کے سارے شیڈ..... مجھے پتا نہیں کیوں لگتا ہے۔ وہ مجھ سے کتراتی ہیں۔ پہلے کی طرح....."

"کہیں وہ خود تو ڈاکٹر غازی میں انٹرسٹڈ نہیں تھیں؟" رجا نے منہ پھاڑ کے کہا۔

"نہیں!" اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"پاگل ہو تم۔ وہ بڑی ہیں ان سے....." اس کا دل و دماغ ہل گیا تھا مگر ڈپٹ کر جواب دیا۔ رجا کو بھی اور خود کو بھی.....

"بڑے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔" رجا مصر تھی۔ "احمق! خود سوچو، ایک بے حد حسین، قابل ڈاکٹر ایسے سخت موسموں سے لڑتی اس بیابان میں کیوں پڑی ہے تم کو پہلے ہی دن سہیلی بنا لیا۔ مگر ساتھ ہی وارننگ کر دی۔ بی بی اپنا حد نہ لانگنا۔ تمہیں سال بھر ہونے کو آ رہا ہے اتباع..... تمہاری عقل آخر ہے کہاں.....؟ کیا کرتی ہو تم.....؟" رجا نے گویا سر پیٹ لیا۔

"ارے احمق! دماغ پر زور ڈالو..... اور کوئی ایسا پل ڈھونڈو جو ان کا بھید دے کیا دونوں ساتھ دیکھے کبھی.....؟"

اتباع کے پیٹ میں گرہیں پڑنے لگیں۔

"وہ..... وہ تو اکثر ساتھ ہی ہوتے ہیں۔ مل..... مل کر کچن میں کبھی کھانا بھی پکاتے ہیں..... وہ اس بار ان کے لیے شاپنگ کر کے آئیں، وہ بھی نیلے رنگ کی

کرتی۔۔۔ ساتھ واک پر بھی جاتے ہیں۔ پوٹیو ہم پر گئے تھے۔ وہ تو بہت اچھے دوست کی طرح رجا۔"
اس کی آواز خوف سے پھٹ رہی تھی۔
بب۔۔۔ بلکہ دد۔۔۔ دونوں کی برتھ ڈے کی ڈیٹ ایک ہے ڈاکٹر شاہان نے خود کیک بیک کیا اور۔۔۔ اس پر G اور S بھی لکھا تھا ہائے۔۔۔" اس کے بے دم ہاتھ نیچے گر گئے۔
"احمق اعظم۔۔۔!" رجا نے دانت پیسے "تم ہر بار لوگوں پر اعتبار کرلیتی ہو۔ محبت کے نام پر سب لٹا دینے کو تیار ہوجاتی ہو۔ تائی کو پوتا دینے کے لیے بہو بننے چلی تھیں۔ اسٹور کے لانچ میں بہو بنا رہے تھے وہ تمہیں۔ اتنی سامنے کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔
ماموں کے کالے منہ والے سالے کو ماموں جان، ماموں جان کہتی رہیں اور وہ عیار لومڑ صرف جان، جان سنتا رہا۔۔۔ تمہیں لوگوں کے چہرے اور آنکھیں پڑھنے کیوں نہیں آتیں۔" رجا اپنے بال نوچ لینے والی تھی۔
"کیا دنیا میں کہیں سچ نہیں۔ خلوص، ایمان داری۔"

"تو۔۔۔ تو انہیں کس نے روک رکھا تھا۔ وہ۔۔۔ انہیں اپناتے ناں۔ میں تو ابھی کل۔" اس کی آواز ہکلاہٹ کا شکار تھی۔
"پیچھے پڑ گئی ہوگی مگر ڈاکٹر عثمان غنی کو کیا پڑی ہے کہ وہ اتنی بڑی عمر کی عورت کو بہو بنائیں۔ ہیں بولو۔"
"یعنی اس دھوکا دہی میں سر بھی شامل ہیں۔" اس کا دل چور چور ہوگیا۔
ڈاکٹر عثمان غنی جن پر وہ اتنا اعتبار کرتی تھی کہ وہ کہتے تو وہ آنکھیں بند کرکے بس ان کے ہاتھ کو تھام کر اس خطرناک ندی کے سرے پر پہنچ جاتی جس پر ایک نگاہ ڈالنے کے لیے دل گردہ چاہیے تھا۔
"مگر وہ روز کے پھول۔"
"ہاں لیکن رجا! ایک بار۔۔۔ ایک بار بھی ڈاکٹر غازی نے اظہار نہیں کیا۔ انہوں نے تو اقرار کیا تھا۔ اثبات میں سر ہلایا تھا اپنے بابا کی گفتگو پر۔" ہاں وہ سب پا لینے کے گمان میں۔۔۔ کتنی باتوں کو فراموش کر گئی۔
لیکن یہ سب رجا کا تلخ ترین حقیقت پسند ہونا بھی تو ہو سکتا ہے۔ رجا جیسے حقیقت پسند لوگ جو ہر پہلو کو جانچتے ہیں۔
اور اس جیسے خوش فہم جو سب اچھا اچھا دیکھنا پسند کرتے ہیں۔
"چہرے پر دو آنکھیں ہی سجتی ہیں۔ تیسری آنکھ اگر ماتھے پر نمودار ہوجائے تو بدصورتی اور خوف کا باعث بنتی ہے اور یہی تیسری آنکھ اگر نہ ہو تو دنیا ٹھوکروں پر رکھ لیتی ہے۔ پاگل کہتی ہے" آوازے کستی ہے۔
اللہ نے یہ تیسری آنکھ سب کو دی ہے۔ مگر پوشیدہ رکھ کے۔ مگر جو لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں وہ کبھی کسی مقام پر نہیں ہارتے۔ نامور بیدار ذمے دار لوگ۔"

بہت پہلے پڑھی گئی بات اس کے دماغ سے ٹکرائی

رجا کب کی آف ہوچکی تھی۔ وہ دیوار سے لگی تھی پھسلتے پھسلتے زمین پر بیٹھ گئی۔ سر گھٹنوں میں دے کر وہ بہت عرصے بعد تنہائی اور کم مائیگی کے احساس کو لے کر روئی تھی۔

☼ ☼ ☼

سوچوں نے اس کے اعصاب پر دباؤ ڈال رکھا تھا۔ وہ شدید سر درد اور سرخ آنکھوں کے ساتھ اپنے بستر میں دھنسی رہی۔ اس نے طبیعت خرابی کا کہہ کر دروازہ بند کرلیا۔ وہ تکیے پر گال ٹکائے اوندھی پڑی تھی۔ روئی نمی کو جذب کرتی جارہی تھی۔
وہ کڑیاں جوڑ رہی تھی۔ ڈاکٹر شاہان اور ڈاکٹر غازی۔۔۔ کڑی در کڑی۔۔۔ ایک لمبی زنجیر تیار۔ ایسی زنجیر جو اس کی گردن کے گرد شکنجہ کستی جاتی تھی۔ اس کا سانس گھٹتا جاتا تھا۔
ہاں وہ بے خبری میں ماری گئی۔ ڈاکٹر عثمان غنی تو جانتے تھے ناں کہ وہ ایک مخلص رشتے کی متلاشی ہے۔

...رف خلوص، اپنائیت، چاہ۔ کیا دنیا میں کوئی چیز پوری ...اس کے لیے نہیں تھی اور کیا ضرورت تھی ...کٹر غنی کو اسے اس سب معاملے میں گھسیٹنے کی ...اس نے کب خواب دیکھا۔ فرمائش کی۔ وہ تو اپنے ...سیٹ اپ سے بہت خوش تھی۔ اسے لوگ ...جگہ، موسم سب راس آگیا تھا۔ وہ ڈاکٹر غنی ...دوستی، محبت، شفقت، سایہ دار اعتبار کا رشتہ بنا کر ...تمام عمر یہاں گزار دیتی تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ پچھتاوا ...کے نہ لگاتا۔ اس نے مدر ٹریسا بننے کا کبھی نہیں ...سوچا تھا مگر کیا ساری زندگی خدمت خلق کے ساتھ گزارنا مشکل ہوتا۔ اسے جوڑی دار کی ہر لحاظ سے ...طلب تھی۔
مگر کیا دولت اور نام پانے کے لیے، نہیں نہیں۔۔۔ وہ تو ہمیشہ رشتوں کے پیچھے لپکی تھی۔
اس نے بے اولاد تایا زاد کو قبول کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ بدلے میں وہ اسی خاندان، گھر، شہر کا حصہ رہتی اور کیا چاہیے۔ وہ ماں کے چہرے کا عکس کھوجنے کے لیے اس کالے منہ والے سالے پر بھی مان لیتی۔ اسے ...رت کی چاہ بھی نہیں تھی۔ وہ اسے خدا کے فضل سے حاصل تھی۔ دولت وہ دونوں ہاتھوں سے کما سکتی تھی۔ دولت اس کے بینک میں ہر ماہ جمع ہوتی رہتی تھی۔ وہ تو بس پر خلوص رشتوں اور اعتبار کی متلاشی تھی۔ ہاں۔۔۔
"کیا ڈاکٹر عثمان غنی جیسے شخص نے اسے ٹریپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ینگ ڈاکٹر، ینگ بلڈ ان کے اسپتال کے لیے۔۔۔" شک اس کے اندر بار بار سر اٹھاتا اور وہ اس کا سر کچل کچل ہار گئی۔
سب ہی تو واقف تھے۔ پلوشے میں شاید کچھ مروت لحاظ تھا مگر پاخرابی بی جیسی منہ پھٹ کڑوی عورت۔۔۔
اس نے سوچا کہ وہ ہر بار اسے دیکھ کر باقاعدہ بڑبڑاتی تھیں۔ ان کے لہجے کی کاٹ اور تضحیک۔۔۔ وہ کچھ جملے تواتر سے بولتیں۔ کبھی دھیمے کبھی ببانگ دہل۔۔۔

"بعد میں آئی اور گھر والی بن بیٹھی۔" ہاہ۔۔۔ وہ حق دق رہ گئی۔
ڈاکٹر غنی نے اپنی پسند کو بیٹے پر ٹھونسا۔ وہ کرتے کرتے نہ کرتے بیٹے کی مرضی مگر اسے کیوں گھسیٹا؟ کیا وہ اب کبھی بھی کسی کا اعتبار کرے گی۔ کسی بھی رشتے کا۔
اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے والے لوگ ۔۔۔
وہ آج پھر وہیں کھڑی تھی جہاں سے چلی تھی۔ امی کا انتقال۔ نہیں ابو کا۔۔۔ چاچو۔۔۔ گھر والوں کا منتقمانہ رویہ۔۔۔ ماموں کے گھر اس کی آؤ بھگت اور پھر اس کے انکار پر سالے صاحب کی جارحانہ حرکتیں۔۔۔
اس کی نفسیاتی روم میٹ۔۔۔ لیکن نہیں۔ سب سے زیادہ تکلیف اس بار ہوئی تھی۔
کیا ہوگیا تھا اس کے ساتھ۔ شاہان کا رویہ۔ انہوں نے پہلے دن تادیب کردی تھی۔ وہ دوست بن کر رہتی تھیں۔ مگر شاید دوست بناتی نہیں تھیں۔ ڈاکٹر غنی سے اس نے بہت خوب صورت رشتہ بنایا تھا۔ کاش ڈاکٹر شاہان اسے کچھ بتا دیتیں۔ کوئی اشارہ دیتیں تو وہ ہی ڈاکٹر غنی کو قائل کرلیتی۔ ٹھیک ہے ڈاکٹر غازی، ڈاکٹر شاہان سے عمر میں کچھ چھوٹے تھے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔
ڈاکٹر شاہان کو تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت ہوتی۔ وہ خود کو ذرا سا فریش لک دیتیں۔ ڈھلتے بال شوخ رنگ تو بالکل ہی الہڑ دوشیزہ معلوم ہوتیں۔ مگر وہ تو ایک آدھ بار ٹوکنے پر بھی اپنے گیٹ اپ پر مصر رہیں۔
لیکن وہ یہ سب کیوں سوچ رہی ہے۔ اسے کیا حاصل۔۔۔ بلکہ اس نے تو سب کھو دیا۔
رجا کہتی ہے 'وہ پل کھوجوں جو بھید دے سکے۔'
"ہاہ!" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کھوجنے کی کیا ضرورت، سب سامنے ہی تو تھا۔ بس اسے پتا نہیں چلا۔۔۔ اسے کبھی پتا نہیں چلتا تھا کسی بھی چیز کا۔

وہ دونوں بہت اچھے دوست معلوم ہوتے تھے۔
وہ اکثر انہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دور دور تک واک کرتے دیکھا کرتی تھی۔ نجانے کون کون سی باتیں

اور

اور ایک روز وہ رو رہی تھیں اور ڈاکٹر غازی نجانے تسلیوں کے کون کون سے جملے ان کے کانوں میں انڈیل رہے تھے۔ پانی کا گلاس پلا رہے تھے۔

ہاں اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ایسے ہی ایک موقع پر ڈاکٹر غنی کے چہرے پر شدید ناگواری' بے بسی' غصہ سا تھا۔

ڈاکٹر غازی کے انداز میں ناکامی۔

اور ڈاکٹر شاہان کی شکوہ کناں نگاہیں — ڈاکٹر غنی کے چہرے پر تھیں اور وہ جیسے پیر پٹختے کمرے سے نکلے تھے۔

وہ اس منظر کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی مگر نہیں۔ انسان ہنستے ہیں۔ روتے ہیں۔ وہ دکھی ہوتے ہیں۔ خفا ہوتے ہیں تو منایا جاتا ہے۔ روتوں کو چپ بھی کرواتے ہیں اور پانی کا گلاس بڑھانا آنسو پونچھنا معمول ہے۔ اس میں کاہے کی کھوج..... ہاہ

انسان کسی بھی بات پر کبھی بھی دکھی ہو سکتا ہے۔ ہائے۔ اسے مشق ستم کیوں بنایا گیا؟

اس نے شاید پہلی ملاقات کے پہلے پل میں ڈاکٹر عثمان غنی سے اعتبار کا رشتہ جوڑا تھا۔ اور پھر یہ اعتبار دن بدن مضبوط ترین ہوتا گیا۔ ایمان کی طرح — اور

"تم لڑو۔ گریبان پکڑ لو اس غازی کا — شہید کر دو اسے۔" رجا بہت دور بیٹھی چلا رہی تھی۔

"شاہان کو آئینہ دکھاؤ..... احمق!"

"اور ڈاکٹر غنی — خود غرض آدمی' مان ہی جاتے زندگی تو بیٹے نے گزارنا ہے ناں۔ ہٹ دھرمی کیوں بھلا....؟"

"اور وہ کرپٹ' پلان میکر غازی — باپ کو خوش کر دیا۔ پسندیدہ بہو لا دی دونوں واک کرنے جاتے سسر' بہو — کتابوں میں جھک مارتے۔

وہ محبوبہ کے آنسو پونچھتے۔ دو آنکھوں کا درست استعمال..... دونوں پہلو آباد ہونہہ!" رجا کے آگ جیسے گرم جملے اس کا تن من پھونک رہے تھے۔

"ہاں وہ ہمیشہ فالتو ہی کی تھی۔ اس کے پاس کوئی جگہ نہیں۔ اس کا کوئی مستقل ٹھکانا نہیں۔ وہ ادھر ادھر لڑھکتی رہے گی۔ بعض لوگوں کے لیے زندگی گیند کی طرح ہوتی ہے ٹکنا نصیب نہیں ہوتا۔ نہیں رہے گی وہ اب یہاں۔

رشتوں سے بے اعتباری اور ٹھوکریں اس کے دل میں سوئیوں کی طرح گڑی تھیں۔ مگر اس بار اس کے دل میں بھالا اتار دیا گیا تھا۔ خون ہی خون — محبت بھرا دل سالوں ٹپکتا ہے اور اس کا دل اس شخص کی محبت سے بھرا تھا جس نے کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ فقط تابعداری میں سر ہلا دیا تھا۔

محبت کینسر ہوتی ہے جسم میں گھس جاتی ہے دھیرے دھیرے بے خبری میں جگہ بناتی ہے۔ پتا تب چلتا ہے جب پورا وجود کینسر زدہ ہو جاتا ہے۔ لاعلاج۔

اسے بھی پتا نہیں چلا تھا' وہ کب ڈاکٹر غازی کی اسیر ہوئی۔ کاش..... بھاڑ میں گئی ڈاکٹری جو اپنے اندر پلتے ناسور سے بے خبر تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ روشنی سے اندھیرے میں داخل ہوئی تھی۔ سو مانوس ہونے میں کچھ پل گزرے' ایک ہفتے سے وہ ساری دنیا سے گویا منہ چھپائے نیم تاریک کمرے میں پڑی تھی اور ابھی اتنی بہت زیادہ آوازوں پر بادل نخواستہ باہر آئی تھی۔ ہائیں.....

وہ سب..... سب کے سب جتھا بنا کر اس کے پیچھے کیوں آ گئے تھے؟ وہ کیا ان کا کچھ لے آئی تھی؟ قطعی نہیں۔ اس نے جلد بازی میں بس ایک بڑے بیگ میں کچھ بے حد ذاتی سامان' کاغذ' فائلز' چند کپڑے ٹھونسے تھے۔ وہ خانو کی گاڑی میں خاموشی سے آ کر بیٹھ گئی تھی

"کوئی سوال نہیں خانو! بس چلو' مجھے لاری اڈے پہ اتار دینا اور تمہیں اللہ کا واسطہ کسی سے نہ کہنا۔ تم نے مجھے چھوڑا بلکہ کہاں چھوڑا۔" اس کی حرکت اور لجاجت

"میں کچھ لے کر نہیں بھاگ رہی۔ تم میرا بیگ چیک کرلو مگر بس یہاں سے نکلو..... نکلو! خانو۔" وہ رو رہی تھی۔ ڈرائیور کو بھی بھینچی بھینچی آواز میں چلائی۔

وہ اپنی تمام کتابیں چھوڑ آئی تھی۔ اپنے سارے گرم کپڑے۔ اس نے دوبارہ ان برفوں میں نہیں جانا تھا۔

اور ان کتابوں میں سب جھوٹ ہوتا ہے۔ ان میں دکھائے گئے لوگ' دکھائے گئے خواب — حقیقت میں کبھی وقوع پذیر نہیں ہوتے۔

وہ کبھی ان بھونڈے سہاروں پر اعتماد نہیں کرے گی۔

وہ رجا کے ماموں کے گھر آئی تھی۔ وہ آگے کہاں جانے والی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

اس نے بہت خوب صورتی سے سجے بڑے سے ڈرائنگ روم کے صوفے پر بیٹھے لوگوں کو دیکھا۔ وہ سب اسے ہی دیکھ رہے تھے اور وہ — اس کی نگاہیں ڈاکٹر شاہان پر ٹکیں۔ آسمان جیسے نیلے اور سیاہ امتزاج کے سوٹ میں بے حد فریش اور خوب صورت نظر آ رہی تھیں ان کے ہونٹوں پر بہت دنوں بعد اس نے پرخلوص مسکراہٹ دیکھی اور نیلی آنکھوں میں چمک خوشی اور شرارت سی۔

وہ خود سے آگے بڑھ کر یوں گلے ملیں جیسے صدیوں کی بچھڑی ہوں اور اسے پا کر نہال.....

ڈاکٹر غنی کریم کلر پینٹ پر گہری نیلی شرٹ میں تھے اور اس کا — غازی کا نیلا سرمئی نما چیک..... یہ نیلا رنگ..... زہر کا رنگ اس کی خوشیوں کو' زندگی کو نیلا کر گیا تھا..... کڑواہٹ نیل و نیل۔

وہ اب کیا کرنے آئے ہیں۔ صفائی دینے' سچ سنانے یا جھوٹ گھڑنے۔

مگر وہ کسی کا اعتبار نہیں کرے گی۔ وہ تسلیم کر چکی ہے' حقیقت جان چکی ہے۔ وہ اکیلی ہے۔ بے وقوف ہے مگر مومن ہے۔ ایک ہی سوراخ سے بار بار..... نہیں قطعی نہیں۔

وہ ممانی بیگم کی ایکسائٹمنٹ دیکھ کر حیران تھی۔ وہ کچن کیبنٹ دھڑ دھڑ کھول بند کر رہی تھیں۔

"تم ذرا کرنل صاحب کو جا کر دیکھو۔ کتنے خوش ہیں کہہ رہے ہیں۔ تین بیٹے بیاہے۔ ہر بار جا کر درخواست پیش کرنا پڑی کہ جی اپنی بیٹی ہماری بنا دیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی ان کے در پر مانگنے آیا ہے۔ کہہ رہے ہیں۔ ڈاکٹر غنی کے جوتے گھسوا کر ہی "ہاں" کریں گے۔"

"ہائیں!" اس کے سر سے سب گزر گیا۔ "رجا کی بھی یہی ہدایت ہے۔" وہ کچن سے ٹرالی گھسیٹتی نکلیں۔

"رجا کی بھی....." اس نے دہرایا۔ کیا اسے سننے میں غلطی ہوئی۔ وہ بس چند منٹ ٹھہر کر ممانی کے پیچھے کچن میں آ گئی تھی۔

"اور یہ سب یہاں تک کیسے..... اور..... رجا؟"

اس نے اپنی پیشانی مسلی۔

غازی نے کچن کے دروازے پر ٹھٹک کر اس کی جانب دیکھا۔ ہلکے انگوری جارجٹ کے سوٹ میں بہت کمزور الجھی دکھائی دے رہی تھی وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس اونچی اسٹول نما کرسی پر بیٹھی تھی۔ ٹراؤزر کے کٹ سے دودھیا پنڈلی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مسلسل ہلتا پیر اندرونی خلفشار کا مظہر تھا۔ سفید انگوٹھے والی چپل اس کے پیروں میں بے پناہ جچ رہی تھی۔

"سچائی کا بوجھ زیادہ ہوتا ہے کہ غلط فہمی کا.....؟" وہ اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔ اس کے دل و دماغ میں جھکڑ تھے۔

"غلط فہمی کی گٹھڑی بداعمالوں کی گٹھڑی کی طرح وزنی ہوتی ہے اتباع!" وہ بری طرح چونکی۔ اس نے پہلی بار..... پہلی بار اسے ڈاکٹر اور صاحبہ کے سابقے لاحقے بغیر پکارا تھا۔

"یہ سچ ہے کہ تم..... بقول بابا..... انہیں پہلی نگاہ ہی میں پسند آگئی تھیں۔ بھولی بھالی معصوم تنہا..... بٹی بٹی سی..... پھر بہت جلد بہو بہو سی بھی..... ہاں میں نے فیصلہ دیر سے کیا..... یہ تو میں نے سالوں پہلے سوچ لیا تھا کہ میں اب بابا کی کسی بات سے انکار نہیں کروں گا کہ انہوں نے میری اتنی بڑی بات مان لی۔ شہر چھوڑ کر، دوست احباب بھلا کر وہ میرے خواب کے لیے یہاں آگئے۔ میں نے تب ہی قسم کھالی تھی کہ انہوں نے میری ایک مانی ہے اور میں ان کی سو..... مانوں گا۔"

(جب ہی شاہان کو چھوڑ دیا)

"اچھی، بری، بھلی جیسی بھی....." وہ قصداً" رکا۔ وہ اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا مگر اندر برپا ہوئے طوفان سے قطع نظر وہ بہت خالی پن سے اجنبی کی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔

"بابا کا تجربہ، عمر، مقام، وہ پہلی نگاہ میں تمہیں بھانپ گئے جبکہ میں ان سے عمر میں کم اور عقل میں تو لازمی تم ایک دھیمے، نرم احساس کی طرح مجھ پر حاوی ہوئیں۔

اردگرد سے بے خبر..... فون پر ہنستی لڑکی.....

دوست کو درماں سمجھ کر دل ہلکا کرتی لڑکی.....

ہمدرد..... مگر اصول پسند..... باہمت..... مگر بہت بزدل..... بھی۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوشی سے اچھلنے والی.....

ٹوپا پیروں میں رل گیا تو تکلیف، شرمندگی کے احساس سے رونے والی۔

بہت گہری باتیں بھی کرتی اور جس کی خواہشیں بہت سادہ.....

تم ایک کتاب تھیں اتباع! اور ہر صبح ایک نیا ورق پلٹ جاتیں گویا.....

اس نے اسے اتنی گہرائی سے دیکھا تھا اور سوچا..... لیکن اب وہ کیا کرنے آیا ہے۔ باپ کی فرماں برداری کی قسم پوری کرنے کے لیے..... لیکن وہ نیلی آنکھوں کا اداس پیچھا زندگی بھر کے لیے برداشت نہیں کر سکتی۔

"یہ میری غلطی ہے کہ میں نے اظہار نہیں کیا۔" اس نے پہلی بار چونک کر نگاہیں اٹھائیں

"رجا نے بتایا ہم کو بہت گلے ہیں مجھ سے....."

"رجا نے؟" وہ بھونچکی رہ گئی۔

"میں سب کہتا اور کرتا مگر تم بھاگ نکلیں....."

اتباع کی آنکھوں میں حیرت، شرمندگی اور خوف کا رنگ۔ کیا ہو رہا تھا اس کے ساتھ۔ اس نے اپنا سر پکڑا۔ غازی کو اس پر ترس آگیا۔ اس کی آنکھوں کا خالی پن۔ ہونٹوں کی پپڑی اور نحیف وجود۔ وہ اسے اس الجھن سے تو نکالے ورنہ اتنے خوب صورت الفاظ گویا ضائع ہی جا رہے تھے۔

"نیلا رنگ میرا پسندیدہ ہے۔ ڈاکٹر شاہان کا پسندیدہ رنگ گلابی اور سفید ہے لیکن اتباع! نیلا رنگ بابا کا بھی تو پسندیدہ ترین ہے ناں۔ مجھے اس لیے پسند ہے کہ شاید باپ بیٹے کی چوائس ایک ہے مگر ڈاکٹر..... شاہان کو یوں پسند ہے کہ وہ ڈاکٹر غنی کا پسندیدہ رنگ ہے۔

"ڈاکٹر صاحبہ کی غلط فہمی تو دور ہو گئی۔ اب تم بھی دل صاف کرو اور یہ آنسو بھی۔ منظر واضح نظر آئے گا۔"

غازی نے اپنی انگلیوں سے اس کا سر ہلایا۔

اتباع کی کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر اس نے دوبارہ سہ بارہ غازی کے الفاظ دہرائے تو جیسے اچھل پڑی۔

کیا..... وہ کیا کہہ رہا تھا۔

"ڈاکٹر عثمان غنی اور ڈاکٹر شاہان!" وہ ایک دم کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

"آ، آ..... آپ کا مطلب ہے..... کہ سر اور..... ڈاکٹر شاہان..... اللہ؟" اس کے اردگرد دھماکے ہوئے تھے۔

"جی ہاں!" غازی نے مزے سے کہا۔ "آپ غلط فہمی کا شکار ہو کر بھاگ نکلیں اور وہ رو رو کر جان ہلکان کرتی رہیں۔" اس نے دونوں خواتین کا مذاق اڑایا۔

وہ کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھی۔ اس نے سر ہاتھ پر گرا لیا۔

"تو وہ سب؟؟؟"

کھڑکی کے کھلے پٹ سے ٹھنڈی یخ ہوا میں چیکی..... تو کیا وہ ڈاکٹر غنی کو دیکھ رہی تھیں؟ اتنی دل آزردہ.....

"لیکن نہیں....." وہ ہکلائی۔ اس نے سر اٹھا کر اس کا متبسم چہرہ دیکھا۔

"سر پر پہاڑ ٹوٹنا۔" اسے اب سمجھ میں آیا۔ مگر تو غازی پوچھتا تھا۔ اس کی یادداشت میں کوئی ایسا ڈھونڈنے سے بھی نہ تھا جو سراب بن جاتا۔

"مم..... مم میں نے تو کبھی نہیں دیکھا..... انہیں تھے۔ وہ تو آپ ہی کے ساتھ۔" وہ دوبارہ اپنی بات پر پکی ہونے لگی۔

"کیا نہیں دیکھا۔ بابا ایسا کوئی پل آنے ہی کب دیتے تھے۔ جان چھڑا کر بھاگتے تھے گویا۔ میرے ساتھ اس لیے تھیں کہ میں تو جیسے سہیلی تھا ناں۔ بابا کی بے اعتباری۔ کج ادائی، بے رخی اور بہت کچھ کے گلے وہ میرے سامنے ہی کرتی تھیں ناں..... شکایتیں لگاتیں اور بدلے میں مجھے متوقع امی کے آنسو پونچھنے ہی پڑتے۔" وہ بہت ہی شریر انداز میں کہہ رہا تھا۔

اتباع قطعاً" نہ مسکرائی۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تو آپ اتنی زحمت کیا بھی نہ کریں۔ رجا بی بی کہتی ہیں۔ آپ کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا سب بتانا پڑتا ہے۔"

"رجا نے کیا کہا..... کب؟"

"ان ہی نے سب کہا۔ بھئی، آپ بہت خوش قسمت خاتون ہیں جو ان جیسی دوست ہیں آپ کے پاس۔ اتنی دور سے مقدمہ لڑ کے جیتیں۔ وہ تو تب لیے اچھا ہے دور ہیں ورنہ۔" غازی نے ہاتھ اٹھائے۔ پھر اسے اس کے حال پر جیسے رحم سا آگیا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ میں ڈاکٹر شاہان کے لیے سہیلی جیسا ہوں۔ ان کا واحد ہمدرد اور کامیابی کے لیے بک اپ کرنے والا واحد تماشائی۔ مگر مجھے آغاز کی بالکل خبر نہیں۔

ڈاکٹر صاحبہ کا کالج لائف کا کرش تھا شاید..... نو عمری میں لڑکیاں اپنے استاد سے متاثر ہو ہی جایا کرتی ہیں۔ پھول دیتی ہیں کارڈز، گفٹس..... وہ عمر کا ایک انتہائی جذباتی دور ہوتا ہے۔ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہی وہ سب بھول بھال جاتی ہیں۔

مگر کچھ ڈاکٹر شاہان جیسی بھی ہوتی ہیں۔ بابا نے آغاز کو بہت سرسری لیا۔ وہ زبردست پرسنالٹی کے مالک تھے۔ خوبرو، دراز قد، گفتگو کے شہنشاہ..... پھر میری امی کے انتقال کے بعد..... رجسٹرڈ کنوارے ان کی بہت ڈیمانڈ تھی۔ ینگ نرسز ڈاکٹرز بھی ہوکے بھرتی تھیں۔

بابا بہت باوقار طریقے سے ہینڈل کیا کرتے تھے۔ یہ سارا شور و غوغا بس مسکراہٹ، پسندیدگی کی نگاہ تک محدود رہتا۔ کوئی بدمزگی نہیں۔ مگر شاہان کی پسندیدگی جنون بن گئی۔ پتا نہیں کب اور کیسے وہ اتنا آگے بڑھ آئیں کہ واپسی کے راستے بند ہو گئے۔

بابا کا پہلا ری ایکشن صرف اور صرف حیرت تھی۔ پھر اس پر شرمندگی..... لوگ کیا کہیں گے۔ ان کے کردار پر حرف آتا۔ وہ اتنی چھوٹی تھیں۔ ان سے اور بابا کیسے خیر مقدم کرتے اگر انہیں دوبارہ گھر بسانا ہوتا تو میری امی کے فوراً" بعد بسا لیتے۔ مگر وہ میری پرورش کا مشکل دور گزار چکے تھے۔ ان کے دوست، احباب، کتابیں، دلچسپیاں، کہیں گنجائش نہیں تھی۔

ڈاکٹر شاہان کو بے وقوف کہہ کر جان چھڑانے کی کوشش کی۔ نادان کہا۔ زمانے کی اونچ نیچ۔ تماشا، مگر وہ نجانے عشق کی کس منزل پر پہنچ چکی تھیں۔ ہر مثال ان کے تلوے کے نیچے ہوتی۔ انہیں کسی بھی طرح قائل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

عمر کا فرق۔ فضول بات۔

دنیا۔ سائی فٹ۔

زندگی بس دل سے مشروط ہوتی ہے۔ دھڑکن بس۔

عمر کے فرق کو پکے جوڑے میں باندھ لیا۔ سفید بال

آیا تو سب سے نمایاں کر کے بال بنائے۔ اپنی عمر سے بڑا نظر آنے کے لیے سو سو جتن کرتی ہیں اب بھی مگر بابا ۔۔۔ میں ان سے لڑ کر آیا ہوں۔ ایک لڑکی ان کے لیے ہر شے کو چھوڑ چھاڑ موسم کی سختیاں جھیل رہی ہے۔"

ڈاکٹر غازی مسلسل بول کر چپ ہوئے۔

"یہاں آتے ہوئے بابا خوش ہو گئے۔ بھول بھال جائیں گی شاہان انہیں ۔۔۔ مگر مزہ آ گیا جب وہ یہاں تک آ گئیں۔

بابا خوب بھنائے۔ "اسے کیوں رکھا۔" میں نے کہا میں اتنی قابل ڈاکٹر کو واپس نہیں کر سکتا۔ بابا کے پسندیدہ رنگ پہنتی ہیں ویسا ہی پرفیوم ان کے گھر میں سب بہن بھائی اپنی زندگیوں میں مگن ۔۔۔ شاید ہی کوئی جانتا ہو وہ کس پتھر سے سر پھوڑ رہی ہیں۔"

آپ نے کبھی نوٹ نہیں کیا۔ بابا کبھی غلطی سے یہی پوچھ لیں۔ "شاہان پشنٹ نمبر 2 کا کیا حال ہے؟" تو وہ چار دن تک فقط مخاطب کیے جانے پر جھوم سکتی ہیں؟"

اس نے اس سے تو یوں سوال کیا جیسے بڑی فاطمہ فاضلہ ہو۔ جس کے چہرے پر رنگ آ رہا تھا جا رہا تھا۔

"سر ۔۔۔ سرمانے کیوں نہیں۔ اتنی تو پیاری ہیں وہ ۔۔۔ 'ہائے!'" اسے دکھ نے گویا نڈھال کر دیا۔

"میں نے دیکھا ہے کئی بار انہیں۔ اداس 'خاموش 'بے چین 'روتے ہوئے مائی گاڈ ۔۔۔" وہ حق دق تھی۔ انکشافات اف!

"سر کتنے ضدی ہیں۔ لگتے تو نہیں۔" اسے اب اور کچھ یاد نہیں رہا تھا۔

"ضدی ڈاکٹر صاحبہ بھی کم نہیں۔" غازی گویا لطف اٹھا رہا تھا۔ "کہتی ہیں۔ محبت میں ضد نہ ہو تو محبت تھوڑی ہوئی۔ آج تو کل کوئی اور کیوں۔"

اتباع کے سر پر دھماکے ہو رہے تھے۔

(کیک پر لکھا S اور G ۔۔۔ G فار غازی ۔۔۔ او نہوں G فار غنی۔ ہاں)

"اندر ہی اندر سوال جواب نہیں کرتے۔ بعض اوقات پوچھ لینا چاہیے قیافہ شناسی ہنر ہے مگر ہر ایک اس میں طاق ہو ممکن نہیں۔ اور تم سوری تو سے۔ بالکل بے وقوف ہو۔ میں بابا کے دبے دکھوں کا مداوا کرنے کے لیے بس انہیں کندھا دیا کرتا تھا۔"

"ارے!" اتباع کے چہرے پر حیرت اور شرمندگی کے بعد خفگی آ رکی۔

"میں نہیں کہہ رہا' کچی رپورٹ دی ہے آپ کی بی بی رجا نے۔" وہ ہنسا۔

"واپس چلو اتباع! تم سمجھانا بابا کو۔ تم ان کی پیاری بٹیا ہو۔ وہ تمہاری بات نہیں ٹالیں گے۔" غازی نے بہت جذب اور مان سے کہا۔

"وہ بہت اچھی ہیں۔ انمول محبت۔ میں پاگل۔ بابا کو شاید فرق نہ پڑے مگر وہ ختم ہو رہی ہیں۔ گھل رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ گزرتا وقت شادابی اور محبت کو ڈھانا شروع کر دے۔"

"میں بھی ناں ۔۔۔ بس۔" یہاں یقیناً "اب اس کا رونا بنتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا گئی۔

"ارے ۔۔۔ رے ۔۔۔ آخر تم اتنا روتی کیوں ہو۔ ارے؟ مجھے کوئی تجربہ نہیں۔" وہ بوکھلا کر کھڑا ہوا پھر بیٹھ گیا۔

"یار! ابھی تو میں نے اظہار محبت بھی نہیں کیا اور سچ مجھے اس کا تجربہ بھی نہیں۔ بڑی پریشانی ہے۔ میرے بھونڈے انداز پر کہیں تم سوسائیڈ ہی نہ کر لو ۔۔۔ منہ سے تو کچھ کہتی ہو نہیں بس جو سودا سر میں سمائے۔"

وہ اس کے چہرے کو دیکھنے کی سعی کرنے لگا۔ کیا ہاتھ ہٹائے۔

مگر اتباع شرمندگی' خجالت کے بعد اب شرم سے چہرہ چھپائے ہوئے بھی اچھی یوں ہے۔ تو پھر یوں ہی سہی۔

کھلے ہیں دل کے کواڑ' آجاؤ
بہت بے چین 'بے قرار' آجاؤ
کیوں ہے شکوہ میری خموشی سے
میں کروں گا اظہار آجاؤ
کچھ نئے پھول ڈھونڈ لایا ہوں
کر لو ان کو گلے کا ہار آجاؤ
آنے والا ہے برف کا موسم
اس کے پیچھے بہار' آجاؤ

"یار کب تک منہ چھپا کر رکھو گی۔ اب بس بھی کرو۔ مانا میں شاعر نہیں ہوں۔ ہوں گے شعر بے وزن مگر ہیں تو میرے دل کی سچی آواز۔"

پوری غزل اس کے جھکے سر اور چہرے پر جمے ہاتھوں کو دیکھ کر سنائی تھی اب گویا وہ عاجز ہو گیا۔

"اچھا چلو! اٹھو واپس چلتے ہیں۔ برف کا زمانہ لوٹنے کو ہے۔ اس بار سنو مین بنانا۔ میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔ بابا سے کہیں گے۔ وہ ڈاکٹر شاہان کے مددگار نہیں۔ تم انہیں قائل کر لو گی ناں؟"

وہ عام سے لہجے میں بولا۔ موصوفہ چہرہ دکھانے کو تیار ہی نہ تھیں۔

"اچھا پھر تمہاری مرضی ۔۔۔ مگر یوں ہے کہ سنو مین اچھا بن گیا۔ تو اس بار خوشی میں مجھ سے لپٹ جانا اور میرا یقین رکھنا۔ میں ڈھے جانے والوں میں سے نہیں۔"

وہ شاید واپسی کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

اصولاً" اتباع کو اب شرم سے چہرہ ہاتھوں سے ڈھانپنا چاہیے تھا مگر وہ ہاتھ ڈھیلے کر کے کھلی آنکھوں نیم وا ہونٹوں سے ۔۔۔ اسے دیکھنے کھڑی ہو گئی۔

اتنے خوب صورت الفاظ اور ایسا عزم۔

باہر نکلتے ہوئے غازی رکا اور پلٹا۔ اس کی آنکھوں میں محبت 'اعتبار' لگاوٹ 'یقین' اعتماد 'خوشی اور اظہار کے اتنے گہرے رنگ تھے کہ وہ جیسے رنگوں میں نہا گئی۔

"بے وقوف ہو تم ۔۔۔ یہ وقت دراصل چہرہ چھپانے کا تھا۔" اس نے بہت غیر محسوس دباؤ سے شہادت کی انگلی سے اس کی ناک کی نوک کو چھوا۔

اتباع کا سر گردن سے جا لگا۔

"زندگی میں ہمارا حصہ محفوظ ہوتا ہے اور رجا صحیح کہتی ہے۔ تم نوازی جانے والی مخلوق ہو۔ اللہ نے کچھ لے لیا۔ مگر میرے خیال میں۔ بہت زیادہ دے دیا اب جیسے بابا۔ رجا جیسی ہمدم غم گسار دوست جو ہزاروں میل دور بیٹھے معاملات حل کر سکتی ہے اور سب سے بڑھ کر میں ۔۔۔ اللہ نے میرے جیسا شخص تمہارے حوالے کر دیا کہ جو مرضی کرو۔ اک نگاہ بھی مت ڈالو۔ اس بے چارے نے اب کہیں نہیں جانا۔"

وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ اتباع ایک لفظ نہ بولی۔ خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جن کے دل کی پکار دوسروں کی زبان سے ادا ہونے لگتی ہے۔



نگہت سیما

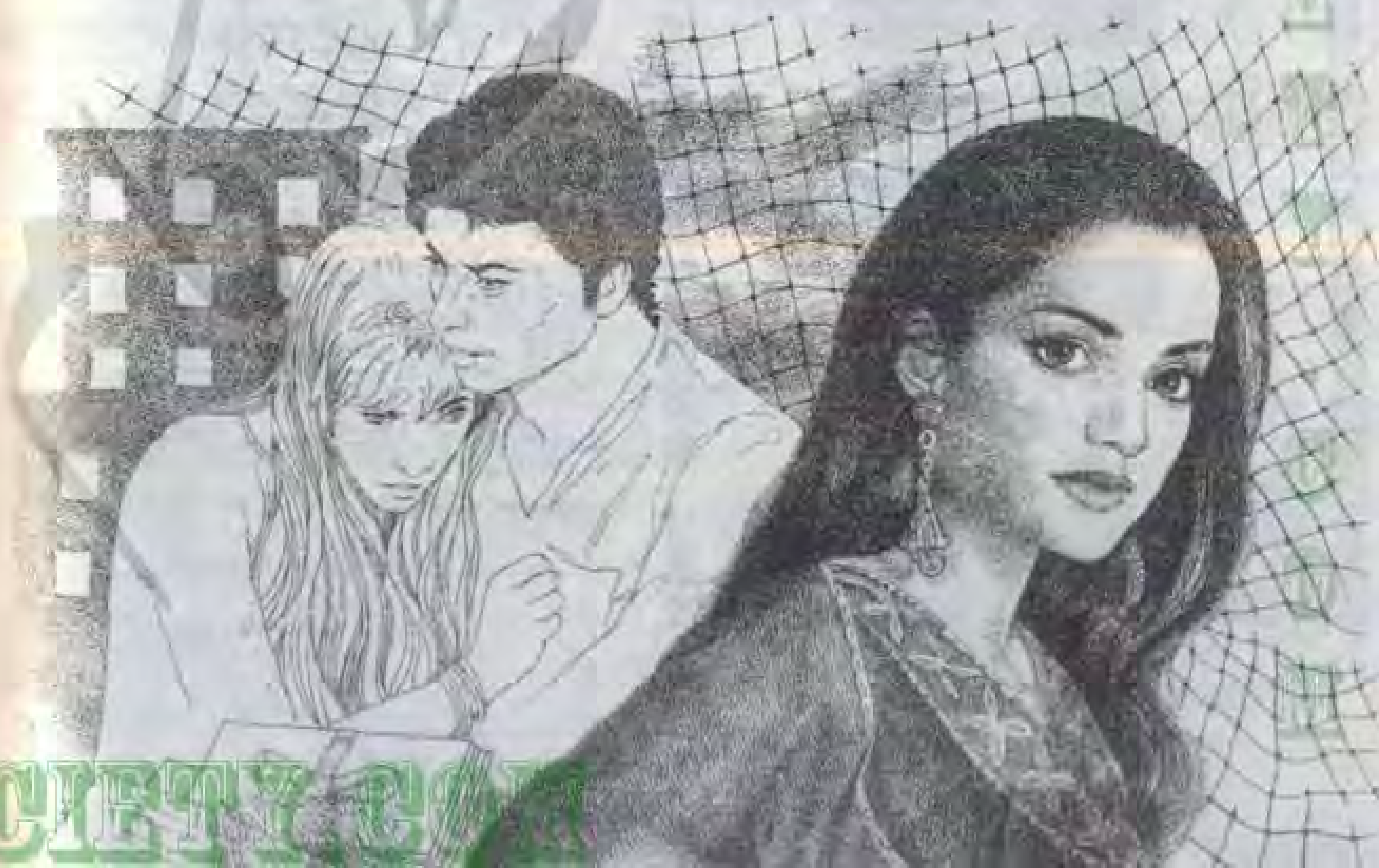
زمین کے آنسو

ایک فلک شاہ کو خوابوں میں اکثر ایک خوب صورت اور نشیلی آنکھوں والی لڑکی روتے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس نے اسے فرضی نام "حور عین" دے رکھا ہے۔ وہ اس پر کچھ تحریر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"الریان" کے سربراہ عبدالرحمٰن شاہ ہیں۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ، عثمان اور احسان (شانی) ان کے بیٹے ہیں۔ عمارہ (عمو) اور زارا ان کی بیٹیاں ہیں۔

"مراد پیلس" کے سربراہ مراد شاہ کے بیٹے سلجوق، عبدالرحمٰن کے گہرے دوست ہیں۔ سلجوق کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے فلک شاہ (موی) "الریان" آجاتے ہیں۔ وہاں ان کی سب سے دوستی ہو جاتی ہے۔ احسان سے ان کی دوستی زیادہ گہری ہو جاتی ہے اور عمارہ سے محبت کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ فلک شاہ کالج میں سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصہ لینے لگتے ہیں۔ فلک شاہ کو سلجوق کے انتقال کے بعد ان کی والدہ زریں جائیداد کے چکر میں لے جاتی ہیں مگر وہاں اس کا شوہر فیروز فلک سے چڑنے لگتا ہے۔ سلجوق کے انتقال کی وجہ سے جائیداد کے شرعی حق سے محرومی کے بعد وہ فلک شاہ کو واپس مراد شاہ کے پاس چھوڑ جاتی ہے اور چھ ماہ بعد فوت ہو جاتی ہے۔

مکمل ناول



عبدالرحمٰن شاہ کی بہن مروہ کی سسرالی رشتے دار مائرہ سے ملاقات میں احسان اسے پسند کرنے لگتے ہیں۔ عبدالرحمٰن، فلک شاہ سے اپنے بیٹوں کی طرح محبت کرنے لگتے ہیں اور اپنی بیٹی عمارہ کی شادی کردیتے ہیں۔ ایک جھگڑے میں فلک شاہ "الریان" والوں سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کرکے بہاول پور چلے جاتے ہیں۔ بہت عرصے بعد ان کے بیٹے ایبک کی "الریان" میں آمد ہوتی ہے۔ احسان کی بیوی مائرہ اور بیٹی رابیل کے علاوہ سب ایبک کی آمد پر خوش ہوتے ہیں جبکہ عمر احسان ایبک کا فین ہے۔ "الریان" میں رہنے والی 'ریب فاطمہ جو کہ مروہ پھپھو کے شوہر کی رشتے کی بھانجی ہے' ایبک سے کافی متاثر ہے۔

عمارہ اور فلک شاہ "الریان" آنے کے لیے بہت تڑپتے ہیں۔ عمارہ کو انجائنا اٹیک ہوتا ہے تو عبدالرحمٰن شاہ بھی بیمار ہوجاتے ہیں۔

احمد رضا اور سمیرا' حسن رضا اور زبیدہ بیگم کے بچے ہیں۔ احمد رضا بہت خوب صورت اور ہینڈسم ہے۔ وہ خوب ترقی' کامیابی اور شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رضا کا دوست ابراہیم اسے ایک بزرگ اسماعیل خان سے ملواتا ہے۔ ان سے مل کر رضا کو حسن بن صباح کا گمان گزرتا ہے۔

عمارہ کی طبیعت بہتر ہوتے ہی ایبک انہیں عبدالرحمٰن شاہ کی بیماری کا بتاتا ہے۔ عمارہ یہ سنتے ہی باباجان سے ملنے کے لیے بے چین ہوجاتی ہیں۔

احسان شاہ' فلک شاہ کو مائرہ سے اپنی محبت کا احوال سناتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ مائرہ —— ان سے کھل کر اظہار محبت کرچکی ہوتی ہے جبکہ ان کا رشتہ عمارہ سے طے ہوچکا ہے اور وہ عمارہ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔

احمد رضا کو پولیس گرفتار کرکے لے جاتی ہے۔ اس پر الزام ہوتا ہے کہ وہ اسماعیل خان سے۔ جو خود کو اللہ کا بھیجا ہوا خلیفہ کہتا ہے 'لوگوں کو بہکا رہا ہے' ملتا ہے۔ احمد رضا کو اس کے والد گھر لے آتے ہیں۔

الوینا جو اسماعیل کے ہاں احمد رضا کو ملی تھی۔ وہ اسے فون کرکے بلاتی ہے۔

اسماعیل' احمد رضا سے کہتا ہے کہ احمد رضا کو دولت' عزت اور شہرت ملنے والی ہے۔ احمد رضا مسرور ہوجاتا ہے۔ ہمدان کو عمارہ پھوپھو کی بیٹی انجی بہت پسند تھی' لیکن گھر والوں کے شدید ردعمل نے اسے مایوس کردیا۔ نئی نسل میں سے کوئی نہیں جانتا کہ عمارہ پھوپھو پر الریان کے دروازے کیوں بند ہیں۔

اریب فاطمہ مروہ پھوپھو کی سسرالی رشتہ دار ہے' جسے مروہ پھوپھو پڑھنے کے لیے الریان لے آئی ہیں' یہ بات مائرہ بھابھی کو پسند نہیں ہے۔ ایبک' عمارہ کو لے کر باباجان کے پاس آیا تو اتنے عرصہ بعد انہیں دیکھ کر باباجان کی طبیعت بگڑ جاتی ہے۔ باباجان کی طبیعت سنبھل جاتی ہے۔ اسپتال میں' عمارہ کو دیکھ کر سب بہت خوش ہوتے ہیں' مگر مائرہ اور رابیل انہیں تنفر اور سخت تنقیدی نظروں سے دیکھتی ہیں۔ مائرہ عمارہ سے کافی بدتہذیبی سے پیش آتی ہے جبکہ احسان شاہ غصے سے منہ موڑ کر چلے جاتے ہیں۔

فلک شاہ' مروہ پھپھو سے مائرہ کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ وہ فلک اور عمارہ کے فوری نکاح کا مشورہ دیتی ہیں۔ یوں مصطفیٰ اور عثمان کے ولیمہ میں ان دونوں کا نکاح ہوجاتا ہے۔ مائرہ رحیم یار خان سے مصطفیٰ کو فون کرکے اپنا نام پوشیدہ رکھ کر فلک شاہ کے خلاف بھڑکاتی ہے مگر مصطفیٰ مروہ پھپھو سے بات کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں تاہم ان کو یہ فون کال آج بھی یاد ہے۔

فلک شاہ نے حق نواز کی پارٹی باقاعدہ طور پر اختیار کرلی۔ مائرہ اور احسان کی شادی کے بعد ایک جھگڑے میں فلک شاہ کبھی بھی "الریان" میں قدم نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں بصورت دیگر ان کی طرف سے عمارہ کو طلاق ہوگی جبکہ احسان شاہ کہتے ہیں کہ "الریان" سے اگر کوئی "مراد پیلس" گیا تو وہ خود کو گولی مارلیں گے۔

سمیرا کو شک ہوجاتا ہے کہ احمد رضا' اسماعیل خان کے پاس اب بھی جاتا ہے تاہم احمد رضا اسے بہلا لیتا ہے اور یوں ہی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسماعیل خان اسے ورلڈ سوسائٹی آف مسلم یونٹی کا اہم کارکن بنا کر اس سے الٹے سیدھے بیان دلواتا ہے۔ حسن رضا یہ خبر پڑھ کر احمد رضا کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔

عبدالرحمٰن شاہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو ایبک انہیں کرنل شیردل کی انیکسی میں لے آتا ہے۔ وہاں سے وہ فلک شاہ سے ملنے بہاول پور جانے کا ارادہ کرتے ہیں۔ احسان شاہ' مائرہ اور رابیل کے ساتھ رحیم یار خان چلے جاتے ہیں اور عمارہ سے نہیں ملتے۔ ایبک کی پیدائش کے بعد مائرہ نے احسان شاہ کے ساتھ منگنی کرتے ہوئے فلک شاہ کو دھمکی دی تھی کہ وہ اپنی بے عزتی نہیں بھولی ہے اور وہ اس بات کا بدلہ ضرور لے گی۔

ایبک' اریب فاطمہ سے اظہار محبت کرتا ہے۔

حسن رضا' احمد کو گھر سے نکال کر دکھی ہوجاتے ہیں۔ تاہم انہیں احمد کی حرکت پر ملال بھی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے معافی مانگتے ہیں اور اس کے دوست ابراہیم کے ساتھ اسے ڈھونڈتے ہوئے طیب خان کی کوٹھی جا پہنچتے ہیں' مگر وہ غلطی کا اظہار کردیتا ہے۔ احمد رضا' الوینا کے ساتھ رہنے لگتا ہے۔ وہ اکثر گھر جانے کی خواہش کرتا ہے۔ مگر الوینا مختلف حیلے بہانوں سے اسے روک لیتی ہے۔ ایک پریس کانفرنس میں طیب خان اور رباب حیدر مدہوشی کی کیفیت میں احمد رضا سے اسماعیل خان کی نبوت کا بیان دلوا دیتے ہیں۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ اس بیان کی تردید کرتا ہے' مگر رچی اسے سختی سے جھٹلا دیتا ہے۔

پانچویں قسط

"سب ٹھیک ہے نا؟" وہیل چیئر کی پشت پر ہاتھ رکھے تھوڑا سا جھکتے ہوئے انجی نے پوچھا تو انہوں نے مڑ کر اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور پھر تنقیدی نظروں سے اس ماسٹر بیڈ روم کا جائزہ لینے لگے۔ جس کے عین وسط میں انجی ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

عبدالرحمٰن شاہ جب بھی بہاول پور آتے' اسی ماسٹر بیڈ روم میں ٹھہرا کرتے تھے۔ داداجان نے کبھی انہیں گیسٹ روم میں نہیں ٹھہرایا تھا۔

"پتا ہے انجی!" انہوں نے پھر ذرا سا مڑ کر انجی کی طرف دیکھا۔ "باباجان جب بھی یہاں آتے' داداجان بھی یہیں منتقل ہوجاتے تھے۔

"تو عبدالرحمٰن اتنی دور سے آیا ہے تو میں اسے اکیلے کمرے میں اجنبیوں کی طرح چھوڑ دوں؟"

ان کی اپنی منطق تھی۔ وہ ادھر سوتے تو میں بھی ادھر ہی آجاتا اور مزے سے نیچے میٹرس بچھا کر سوجاتا۔ پہلے جب سلجوق بابا تھے تو یہاں صرف ایک ڈبل بیڈ ہوتا تھا پھر داداجان نے ادھر سنگل بیڈ ڈلوالیا۔ تمہیں پتا ہے انجی! یہ سلجوق بابا کا بیڈ روم تھا۔"

ایک گہری سانس لے کر وہ ایک بار پھر تنقیدی نظروں سے بیڈ روم کا جائزہ لینے لگے۔

"یہ والا بیڈ تو باباجان کے لیے صحیح رہے گا۔ واش روم بھی ادھر ہی ہے اور عمو... وہ بھلا کہاں الگ روم میں سوئے گی۔ اتنے عرصہ بعد تو اپنے باباجان سے ملی ہے۔ ایبک بتا رہا تھا عمو اور باباجان رات دیر تک باتیں کرتے رہے۔ چھبیس سالوں کے دکھ سکھ بھلا ایک رات میں کیسے کہے ہوں گے انہوں نے۔ اس بیڈ پر تمہاری ماما سوئیں گی۔ میں اور آپی... ہم بھلا اکیلے اپنے اپنے بیڈ روم میں کیا کریں گے۔ ایسا کرو' گیسٹ روم میں وہ جو ایک سنگل بیڈ ہے نا۔ وہ ادھر لگوا دو۔ آپی تو نیچے میٹرس پر سوجائے گا۔"

"جی بابا!" نجم مسکرائی۔

"اور ہاں سنو! اسٹور سے سنبل والے تکیے نکلوا دیے ہیں نا۔ باباجان تو صرف سنبل کا تکیہ ہی استعمال کرتے ہیں۔ وہاں "الریان" میں تو صرف سنبل کے تکیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔"

"جی باباجان! میں نے تکیے دھوپ میں رکھوا دیے ہیں۔"

"اچھا...!" وہ پھر سے کمرے کو دیکھنے لگے تھے۔

"باباجان کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہو۔ بے چینی نہ ہو وہ

اجنبیت محسوس نہ کریں۔ چھبیس سال کوئی کم عرصہ نہیں ہوتا۔" وہ چھبیس سالوں بعد بابا جان سے ملیں گے ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بابا جان کے لیے کیا کریں۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ پورے "مراد پیلس" کو پھولوں سے سجا دیتے۔ صبح سے وہ پورے گھر میں اپنی وہیل چیئر بھگاتے پھر رہے تھے اور ہدایات دے رہے تھے۔

ٹی وی لاؤنج اور سٹنگ کی ترتیب بدلی تھی۔ مالی کو لان کی صفائی کے لیے کہا تھا، لیکن پھر بھی جیسے دل مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

رات جو ایبک نے بتایا کہ وہ ماما اور بابا جان کے ساتھ کل بہاولپور آرہا ہے تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہ آیا۔ وہ فون ہاتھ میں لیے ساکت بیٹھے تھے۔

"بابا۔۔۔ بابا!" ایبک نے بے چین ہو کر بلایا تو وہ چونکے۔ "ایبک! ابھی تم نے کیا کہا تھا، بابا جان بہاولپور آرہے ہیں؟ کہیں میرے کانوں نے غلط تو نہیں سنا۔ کبھی کبھی ہوتا ہے نا ایسا کہ آدمی وہی دیکھنے اور سننے لگتا ہے جو اس کے دل کی چاہ ہوتی ہے۔" وہ ہولے سے ہنسے تھے۔

"جی بابا! کل ہمارے ساتھ بابا جان بھی آرہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔ بابا جان آرہے ہیں۔ وہ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں۔ ناراض تو نہیں ہیں نا؟" وہ بچوں کی طرح پوچھ رہے تھے۔

"نہیں بابا! وہ آپ سے ناراض نہیں ہیں بالکل بھی نہیں۔ ابھی سو رہے ہیں جاگیں گے تو میں آپ کی بات کروا دیتا ہوں۔"

"نہیں آبی۔۔۔ نہیں میں کیا بات کروں گا۔ مجھ سے کوئی بات نہیں ہو پائے گی۔ وہ آئیں گے تو میں ہاتھ جوڑ لوں گا۔۔۔ پاؤں پکڑ لوں گا۔" ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

"بابا پلیز ریلیکس!" دوسری طرف ایبک پریشان ہو گیا تھا۔ وہ رو رہے تھے۔

"تم پریشان مت ہونا ایبک۔۔۔! بس اس خیال سے رونا آگیا کہ اتنے سالوں بعد بابا جان سے ملوں گا۔"

انہیں ایبک کی آواز سے محسوس ہوا تھا کہ وہ بہت پریشان ہو گیا ہے۔

"تمہاری ماما کیسی ہیں۔۔۔ بات کرواؤ نا۔"

"ماما تو انکل شیر دل کی بیگم کے پاس ہیں۔ ابھی آجاتی ہیں تو۔۔۔"

اور ایبک کو خدا حافظ کہہ کر وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تیزی سے اپنی کرسی کا ہینڈل گھماتے باہر آئے تھے۔

"انجی۔۔۔ انجی سنو بیٹا۔"

وہ کچن میں ملازمہ کے ساتھ تھی۔ یکدم باہر نکل آئی۔

"انجی! بابا جان آرہے ہیں عمو کے ساتھ۔" انجم بھی یکدم خوش ہو گئی تھی۔ وہ پہلی بار بابا جان کو دیکھے گی۔ یہ احساس ہی خوش کر دینے والا تھا۔

"کل صبح کسی وقت کی فلائٹ ہے۔ سنو انجی! ذرا ایبک کو فون تو کرو۔ کل ہی کہا تھا نا اس نے۔" وہ پھر سے بے یقین سے ہونے لگے تھے۔

"جی۔۔۔ جی بابا میں ابھی فون کر کے ساری تفصیل پوچھ لیتی ہوں۔" وہ بھی پرجوش ہو رہی تھی۔

اور جب ایبک سے بات کر کے وہ انہیں فلائٹ کا ٹائم بتا رہی تھی تو ایک بار پھر ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انہوں نے انجی کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا انجی! کہ بابا جان آرہے ہیں۔ جب میں ان سے ملوں گا، انہیں دیکھوں گا تو میں کیسے۔۔۔"

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے بابا!" انجی نے ہولے سے ان کا بازو تھپتھپایا تھا۔

انجی ان کے ساتھ ہی کمرے میں آگئی تھی اور پھر بہت دیر تک وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی تاکہ ان کا دھیان بٹ سکے اور واقعی ان کا دھیان

[ہو] گیا تھا، لیکن پوری رات وہ بے چین ہی رہے تھے۔ ان کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ بیتے ہوئے ماہ و سال واپس لے آئیں اور ان سالوں میں سے اس ظالم [د]ن کو مہینوں اور سالوں کے اس گوشوارے سے نکال دیں۔

رات یونہی بے چینی سے سوتے جاگتے گزری تھی [او]ر صبح فجر کی نماز کے بعد ہی وہ باہر آگئے تھے اور نوکروں کو ہدایات دینے لگے تھے۔

"بابا! آپ کی چائے کا وقت بھی ہو گیا ہے۔ بنا [د]وں؟" انجی نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔!" ان کی نظریں سامنے دیوار پر لگے کلاک کی طرف اٹھیں۔ دس بج رہے تھے۔ آج وقت کتنی آہستگی سے گزر رہا تھا۔

"آپ اپنے بیڈ روم میں جائیں گے یا ابھی ادھر لاؤنج میں ہی بیٹھیں گے۔"

"میں ابھی ادھر ہی ہوں۔" وہ جانے کے لیے پلٹی تو انہوں نے اسے آواز دی۔

"سنو بیٹا! بابا جان کے لیے پرہیزی کھانا بنے گا۔ ایبک سے پوچھ لو نا ڈاکٹر نے کیا کہا ہے کھانے کو۔۔۔ وہ مرچیں کم کھاتے ہیں۔ "الریان" میں سب ہی زیادہ مرچیں نہیں کھاتے تھے لیکن جب میں اور شانی باہر جاتے تو خوب کرارے کھاتے کھاتے، زبردست مرچ مسالے والے۔ شانی کہتا تھا کہ کچھ ڈشز ایسی ہوتی ہیں جب تک تیکھی نہ ہوں، مزا نہیں آتا اور گھر میں بھی جب کڑاہی وغیرہ بنتی تو وہ خاص طور پر کچن میں جا کر یاد دہانی کرواتا کہ مرچ ذرا تیز ہی ہونا چاہیے۔"

وہ ذرا سا مسکرائے تھے۔ انجی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی اور انہوں نے کرسی کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا۔ تب ہی ان کی نظر ماسٹر بیڈ روم کی کھلی کھڑکی پر پڑی تھی۔ شاید انجی نے کمرا سیٹ کرتے ہوئے کھولی تھی۔ وہ کتنی ہی دیر تک بے دھیانی سے کھلی کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ بیڈ روم کے اندر کا کچھ حصہ کھلی کھڑکی سے نظر آرہا تھا اور جو حصہ نظر آرہا تھا وہاں ایک آرام

کرسی پڑی تھی۔ کئی بار انہوں نے کھلی کھڑکی سے سلجوق بابا کو کرسی پر بیٹھے موٹی موٹی کتابیں پڑھتے دیکھا تھا۔

سلجوق بابا بہت کم بات کرتے تھے، بہت کم بولتے تھے اور جب کبھی یہ کھڑکی کھلی ہوتی تو وہ چپکے چپکے کھڑکی سے انہیں دیکھتے تھے۔ وہ انہیں بہت اچھے لگتے تھے۔ بہت مہربان، بہت شفیق۔ کہانیوں کے رحم دل شہزادوں جیسے۔

اس روز وہ آنکھیں موندے آرام کرسی کی پشت پر سر رکھے لیٹے تھے جب وہ کھڑکی کے بالکل قریب چلے گئے تھے۔ اور بہت غور سے انہیں دیکھ رہے تھے، جب اچانک انہوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹے تھے۔ دادا جان نے انہیں سمجھایا تھا کہ سلجوق بابا کو بالکل تنگ نہیں کرنا ہے۔ تنگ کرو گے تو وہ زیادہ بیمار ہو جائیں گے۔

اور انہیں یاد تھا سال ڈیڑھ سال پہلے کی ہی تو بات تھی جب وہ ان کے پاس سونے کی ضد کرنے لگے تھے۔ تب سلجوق بابا ان کے ضد کرنے پر انہیں پاس سلانے لگے تھے اور سونے سے پہلے وہ اسے ضرور کوئی چھوٹی سی کہانی سناتے تھے۔ کہانیاں تو دادی جان بھی سناتی تھیں، لیکن انہیں اپنے بابا سے کہانی سننا زیادہ اچھا لگتا تھا اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر یا کبھی اپنے اوپر رکھ کر سونا بھی بہت اچھا لگتا تھا۔ اور ایک روز بابا سے کہانی سنتے سنتے انہوں نے پوچھ لیا تھا۔

"بابا! میری مما کہاں ہیں۔ کیا وہ اسد کی مما کی طرح فوت ہو گئی ہیں؟"

اور سلجوق حیرت سے انہیں دیکھنے لگے تھے۔

انہیں خاموش دیکھ کر انہوں نے خود ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ ان کی مما فوت ہو گئی ہیں۔ تب انہوں نے بابا کا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"تو آپ ایک اور مما لے آئیں نا میرے لیے۔ پتا ہے اسد کے پپا اس کے لیے نئی مما لے آئے ہیں۔ بہت پیاری سی۔۔۔ جب میری مما آجائیں گی نا تو میں

ان سے کہانیاں سنوں گا اور وہ مجھ سے بہت پیار کریں گی۔"

"کیا دادی جان کہانی نہیں سناتیں؟" سلجوق بہت سنجیدہ تھے۔

"سناتی ہیں۔" انہوں نے اثبات میں سرہلایا تھا۔

"اور وہ آپ سے پیار بھی کرتی ہیں۔ آپ کی مما سے بہت زیادہ۔۔۔ اگر آپ کی مما ہوتیں تو وہ آپ سے اتنا پیار نہیں کرتیں جتنا دادی جان کرتی ہیں۔"

"ہاں دادی جان پیار تو بہت کرتی ہیں۔" وہ الجھ کر انہیں دیکھنے لگے تھے "لیکن وہ تو دادی جان ہیں نا اور مما تو مما ہوتی ہیں۔۔۔"

اور تب سلجوق بالکل چپ ہوگئے تھے اور وہ ان کے بولنے کا انتظار کرتے کرتے سوگئے تھے۔ صبح سلجوق بابا کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ دادا جان انہیں اسپتال لے گئے تھے۔ پھر کئی دن اسپتال رہنے کے بعد دادا جان انہیں انگلینڈ لے گئے تھے اور کتنے تھوڑے دن وہ ان کے پاس سوئے تھے۔

دادا جان کی بات یاد کرکے وہ کھڑکی کے قریب سے ہٹ گئے تھے، لیکن سلجوق بابا نے انہیں بلالیا تھا۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے پھر اس روز سلجوق بابا نے ان سے بہت ساری باتیں کی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا۔

"شاید میں بہت سارے دن آپ کے ساتھ نہ رہوں آپ میری باتوں کو یاد رکھنا بیٹا! ابھی شاید آپ میری باتوں کو نہ سمجھ سکیں، لیکن ایک وقت آئے گا جب آپ ان کو سمجھ سکیں گے۔۔۔ اپنی مما کو معاف کردینا بیٹا! ہوسکتا ہے کبھی آپ کو لگے کہ انہوں نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تب بھی۔۔۔ وہ آپ کی ماں ہیں۔ انہوں نے آپ کو جنم دیا۔ تکلیف اٹھائی۔ اس تکلیف کا حق تو آپ کبھی ادا نہیں کرسکتے۔"

اور وہ یونہی ناسمجھی سے انہیں دیکھتے رہے تھے جو بات وہ سمجھ سکے تھے وہ یہ تھی کہ بابا کہیں جارہے ہیں وہ خوف زدہ سے ہوگئے تھے۔

"بابا! چائے!" انجی نے اندر آکر کہا تو انہوں نے چونک کر انجی کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ بھی عمارہ کی طرح کبھی نہیں بھولتی تھی کہ وہ اس وقت چائے پیتے ہیں۔

"تھینک یو بیٹا!" چائے کا کپ تھامتے ہوئے وہ مسکرادیے۔

"بابا! میں کچن میں ہوں۔ بلالیجیے گا جب کمرے میں جانا ہو۔"

انہوں نے سرہلا دیا۔ "ٹھیک ہے تم جاؤ اور سنو اپنی نگرانی میں سب تیار کروانا۔۔۔ اور ہاں جواد کو تم نے فلائٹ کا ٹائم وغیرہ بتادیا تھا نا۔"

"جی بابا!"

"اسے ایک بار پھر یاد کروادینا کہیں کام کی مصروفیت میں بھول ہی نہ جائے۔" انہوں نے ایک بار پھر تاکید کی، انجی سرہلا کر باہر چلی گئی۔ چائے پیتے ہوئے وہ ایک بار پھر ماضی میں کھوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

زندگی ان پر بہت مہربان تھی۔ دادا جان اور دادی جان کی شفقتیں، بابا جان اور "الریان" کے باسیوں کی محبتیں، چاہتیں اور پھر عمارہ کی ہمراہی میں کٹتا زندگی کا سفر۔

اس سے زیادہ بھلا آدمی کیا چاہ کرسکتا ہے۔ اور انہیں اس سے زیادہ کی چاہ تھی بھی نہیں۔ وہ بہت خوش، بہت مطمئن تھے۔

ہاں کبھی کبھی انہیں مائرہ کا خیال آتا تو وہ لمحہ بھر کے لیے الجھ ضرور جاتے تھے۔ اس نے کہا تھا وہ اپنی توہین نہیں بھولتی۔ کبھی بھی نہیں۔ تو وہ کیا کرے گی کیا اپنی توہین کا بدلہ لے گی، لیکن کس طرح۔ یہ وہ سمجھ نہیں پارہے تھے اور عمارہ کی خوش کن رفاقت زیادہ دیر کے لیے انہیں کچھ سوچنے بھی نہیں دیتی تھی۔

اس رات جب وہ رحیم یار خان سے واپس آئے تھے تو ان کے دل سے ہزاروں وسوسے لپٹے ہوئے تھے۔ مائرہ کی وہ گفتگو اس کا لب ولہجہ، اس کا انداز۔۔۔ آخر وہ کیا کرسکتی ہے۔ رحیم یار خان سے لاہور تک وہ صرف یہی سوچتے رہے تھے اور کچھ سمجھ نہیں پائے تھے تب وہ شیر دل کے پاس آگئے تھے۔

شیر دل کے علاوہ الریان میں انہیں کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیتا تھا جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتے۔ شانی ان کے بہت قریب تھا، لیکن وہ شانی سے یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے، وہ ہرٹ ہوسکتا تھا۔۔۔ وہ مائرہ سے اتنی محبت کرتا تھا کہ شاید وہ ان کی بات کا یقین ہی نہ کرتا۔ پھر مصطفیٰ بھائی تھے، لیکن مصطفیٰ سے کچھ بھی کہنے میں انہیں جھجک محسوس ہوتی تھی۔ کیا پتا، وہ سوچیں کہ ضرور ان کی طرف سے ہی کچھ حوصلہ افزائی ہوئی ہوگی تب ہی مائرہ اس طرح کررہی ہے۔

حق نواز تھا ان کا دوست، لیکن وہ بہت جذباتی تھا۔ وہ ساری بات سن کر یقیناً "مائرہ کے گھر جا پہنچتا اور اس کے والدین سے کہتا کہ بیٹی کو سنبھال کر رکھیں۔ لے دے کے ان کی نظر شیر دل پر ہی ٹھہری تھی۔۔۔ وہ بہت سمجھ دار، بہت بردبار تھے ان بیتے دنوں میں شیر دل کے ساتھ ان کی دوستی کا رشتہ استوار ہوچکا تھا۔ سو انہوں نے شیر دل سے ہر بات کہہ دی۔ پہلی ملاقات سے لے کر اس آخری رحیم یار خان والی ملاقات تک۔

اور شیر دل ہنس دیا تھا۔

"تم یونہی ڈر رہے ہو یار! یہ لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ فضول ڈائیلاگ بازی۔۔۔ وہ بھلا تمہارا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ تمہارا نکاح ہوچکا ہے۔ چند ماہ بعد رخصتی ہوجائے گی اور پھر۔۔۔ سب محبت وحبت ختم۔"

شیر دل نے اس ساری بات کو بہت معمولی لیا تھا اور وہ جو ساری رات جاگتے رہے تھے مطمئن سے ہوگئے تھے اور پھر واقعی کچھ نہیں ہوا تھا وہ عمارہ کو رخصت کرواکے گھر لے آئے تھے۔ اس روز کے بعد ان کی مائرہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ہاں احسان شاہ سے وہ اس کے متعلق سنتے رہتے تھے۔

"مائرہ ایسی ہے۔۔۔ مائرہ ویسی ہے۔ یار! مجھے لگتا ہے

جس روز میری مائرہ سے بات نہیں ہوگی۔ وہ میری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

اور وہ حیرت سے احسان شاہ کو دیکھتے رہ جاتے تھے۔

"شانی! تم اتنا زیادہ چاہتے ہو مائرہ کو؟"

"اس سے بھی زیادہ جتنا تم سوچ سکتے ہو۔"

"اللہ کرے، وہ بھی تمہیں اتنا ہی چاہے، جتنا تم چاہتے ہو اسے۔" بے اختیار ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"وہ بھی مجھے اتنا ہی چاہتی ہے یار! تم خوامخواہ اس کے متعلق مشکوک نہ ہوا کرو۔"

"نہیں میں مشکوک تو نہیں ہوا بس تمہیں دعا دے رہا تھا۔"

"ہاں بس دعائیں دیتے رہا کرو۔" احسان نے تھوڑا سا سر خم کیا تھا۔

ان دنوں وہ بے حد شوخ ہو رہا تھا۔ اس نے رحیم یار خان کے بھی دو تین چکر لگائے تھے، لیکن ہر بار ہی انہوں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتے تھے اور نہ ہی مائرہ کا سامنا کرنا چاہتے تھے۔ سو بہانہ بنا دیتے اور پھر احسان شاہ اور مائرہ کی منگنی کے بعد وہ اور بھی مطمئن ہو گئے تھے۔ اور احسان شاہ جو دو سال کے لیے باہر جا رہا تھا، منگنی کے بعد اس نے باہر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا۔ بابا جان کو قائل کرنے کے لیے اس کے پاس بہت سے دلائل تھے۔

"مرتضیٰ بھائی اور عثمان بھائی باہر ہی سیٹل ہو گئے ہیں۔۔۔ مصطفیٰ بھائی باہر جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ عمارہ کی شادی ہو گئی ہے۔ کچھ دنوں تک زارا بھی رخصت ہو جائے گی۔ میں بھی چلا گیا تو "الریان" تو ویران ہو جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے احسان شاہ! کیسی باتیں کرتے ہو۔" اماں جان لرز گئی تھیں۔

"اللہ ہمارے "الریان" کو آباد رکھے۔ تم سب ہنستے بستے رہو۔"

"لیکن اماں جان! میں آپ کو اور بابا جان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے یہاں بہت اچھی جاب مل رہی ہے۔۔۔ آپ بابا جان سے کہہ کر میرا جانا منسوخ کر دیں۔۔۔ میں پڑھائی سے نہیں بھاگ رہا اماں جان۔۔۔ بس مصطفیٰ بھائی یا عثمان بھائی یہاں آ کر رہیں گے جب تو میں چلا جاؤں گا پڑھنے، لیکن فی الحال نہیں۔"

احسان بھائیوں میں سے سب سے چھوٹا تھا اور اماں جان کا لاڈلا بھی۔۔۔ اماں جان نے بابا جان کو قائل کر لیا کہ فی الحال وہ احسان کو باہر نہ بھیجیں۔ انہیں پتا چلا تو حیرت ہوئی۔

"یار! تمہیں اسکالر شپ مل رہا تھا۔۔۔ ایم ایس سی کی ڈگری کی تو اور ہی بات ہوتی ہے۔ زیادہ اچھی جاب مل جاتی۔"

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں دو سال کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ دو سال بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے۔۔۔ دو سالوں میں جانے کیا ہو جائے مائرہ۔۔۔"

"کیوں کیا تمہیں مائرہ پر اعتبار نہیں ہے؟ کیا وہ تمہارا انتظار نہیں کرے گی؟"

"مائرہ پر تو مجھے خود سے زیادہ اعتبار ہے ایک! لیکن اس کے والدین "نہیں، بہت جلدی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ اس کی عمر کی لڑکیاں دو دو بچوں کی مائیں بن چکی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے ساتھ ہی لے جاؤں۔۔۔ اول تو ایسا اتنی جلدی ممکن نہیں ہے اور پھر بابا جان بھی اس کے حق میں نہیں ہیں۔۔۔ اور نہ ہی بابا جان یہ چاہتے ہیں کہ میں شادی کر کے اسے چھوڑ جاؤں، سو میں نے یہیں جاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

اور وہ جو بابا جان کے کہنے پر اسے سمجھانا چاہتے تھے خاموش ہو گئے تھے۔ عمارہ کو بھی اس کا اسکالر شپ چھوڑ دینے کا افسوس تھا۔ مصطفیٰ نے بھی اپنے طور پر سمجھایا تھا، لیکن احسان نے جاب شروع کر دی تھی۔ یوں وہ پہلے جیسی ملاقات تو نہیں رہی تھی۔۔۔ لیکن پھر بھی وہ ہر شام الریان باقاعدگی سے جاتے تھے اور پھر عمارہ کو لے کر گھر آ جاتے تھے۔

انہوں نے بابا جان کے کہنے پر امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کیا تھا، لیکن وہ خود کم ہی۔ آفس جاتے تھے ان کا زیادہ وقت تو پارٹی کے دفتر میں گزرتا تھا۔ بیتے سالوں میں انہوں نے اپنی پارٹی میں جگہ بنالی تھی اور وہ کافی مقبول اسٹوڈنٹ لیڈر کے نام سے پہچانے جاتے تھے، لیکن "الریان" میں کوئی بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں سے واقف نہیں تھا۔ یو ای ٹی میں تھے تو احسان انہیں روکتا تھا۔ گورنمنٹ کالج میں آئے تو احسان سے انہوں نے سب کچھ چھپایا۔ اس لیے کہ بابا جان کو یہ پسند نہ تھا، لیکن وہ سمجھتے تھے کہ نوجوانوں کو ملک کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ ملک جو سیاست دانوں کی وجہ سے دو ٹکڑے ہو چکا تھا۔

"اقتدار کے لالچ نے ملک کو دولخت کیا تھا۔" یہ بات سر الطاف نے سیکڑوں بار کہی تھی۔

جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا، لیکن اب بھی کسی نے کچھ نہیں سیکھا تھا۔۔۔ اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والے سارے وعدہ بھول گئے تھے۔ ملک میں عجیب افراتفری مچی تھی۔

حق نواز ان دنوں بہت چڑچڑا ہو رہا تھا اور اس کی وجہ اس کی ایک صحافی دوست کا اغوا تھا۔ الفلاح بلڈنگ کے سامنے وہ ٹیکسی کے انتظار میں کھڑی تھی کہ ایک سفید کرولا وہاں آ کر رکی۔ اس میں سے دو تین بندے نکلے اور اسے ہاتھ سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ وہ چیختی چلاتی رہی۔ آس پاس کھڑے لوگوں میں سے کوئی بھی اسے چھڑانے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ سب کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔

حق نواز نے بتایا تھا کہ اہم شخصیت نے اسے شادی کی پیش کش کی تھی۔ انکار کا یہ نتیجہ نکلا تھا لاہور میں عجیب صورت حال تھی۔ بھیڑیے گڈریے کا لباس پہنے تھے اور زندگیاں اور عزتیں محفوظ نہ تھیں۔

حق نواز اپنی پارٹی کے ایک ایک کارکن کے پاس گیا تھا۔ پارٹی لیڈر سے بات کی تھی۔ وہ اس اغوا کے خلاف احتجاج کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ پارٹی لیڈر ساتھ دیں۔ ریلی نکالیں اور اسے اس صاحب اقتدار شخص کے پنجے سے چھڑالیں، لیکن پارٹی لیڈروں نے انکار کر دیا تھا۔

"اس وقت اور بہت سے مسائل ہیں جن پر ہمیں توجہ دینی ہے۔ ایک معمولی بات کے لیے ہم ہنگامے نہیں کر سکتے تھے۔"

"وہ ایک معمولی لڑکی تھی۔ تین یتیم بہنوں اور بیوہ ماں کا واحد سہارا۔"

حق نواز بہت مایوس اور اپ سیٹ تھا اور اسے پارٹی سے بہت سی شکایتیں تھیں۔

"ہم نے کیا کچھ نہیں کیا۔ ہمارے ساتھی سڑکوں پر لہولہان ہوئے۔۔۔ اپنے سینے پر گولیاں کھائیں، لیکن یہ ہمیں اتنا سا تحفظ بھی نہیں دے سکتے۔ ہم تو اپنے وطن کے لیے "اپنی قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ لے کر آئے تھے فلک! لیکن لگتا ہے کہ یہ سب صرف اپنے فائدے کے لیے ہمیں چارہ بنا رہے ہیں۔"

"ہم کچھ نہ کچھ تو کر رہے ہیں حق نواز! جو کچھ ہمارے اختیار میں ہے۔"

"ہم کچھ بھی نہیں کر رہے فلک شاہ! ہم صرف الو بن رہے ہیں۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ بنگلہ دیش بنے کتنا وقت گزر گیا، لیکن ہم نے سوائے لکیر پیٹنے کے کچھ نہیں کیا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو کہ ہماری پارٹی کوئی مثبت کام نہیں کر رہی؟"

"پتا نہیں یار!" اس روز حق نواز کا موڈ بہت خراب تھا۔ وہ پارٹی چھوڑنے کی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی ایک پارٹی ممبر سے تلخ کلامی بھی ہو گئی تھی۔ اپنی صحافی دوست کا دکھ اس کے دل میں گڑ گیا تھا۔

"اس سے تو اچھا تھا ہم برسر اقتدار پارٹی میں ہوتے تو کم از کم عابدہ کے لیے کچھ کر سکتے تھے۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے اس کی چھوٹی بہنوں اور ماں کی کیا حالت ہے۔ اس پر رشتہ داروں کا رویہ انہیں مار رہا ہے۔ وہ تو پہلے ہی زندہ درگور ہو گئے ہیں۔۔۔ کاش! میں ان کے لیے کچھ کر سکتا۔"

وہ اسے بہت ساری تسلیاں دے کر آ گئے تھے کہ انہیں عمارہ کو لے کر بہاولپور جانا تھا۔ دادی جان کی خواہش تھی کہ عمارہ کا بچہ بہاولپور میں ہی جنم لے۔

وہاں جاتے ہی عمارہ کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں اسپتال میں فوری طور پر ایڈمٹ کروانا پڑا تھا۔ وہ بہت سارے دن حق نواز سے رابطہ نہیں کر سکے تھے۔ پہلے عمارہ کی پریشانی پھر ایبک کی آمد۔ "الریان" سے سب ہی "مراد پیلس" آئے تھے۔

اور ان بے پناہ مصروف دنوں میں انہیں حق نواز کا فون ملا تھا۔

"میں نے پارٹی کی رکنیت چھوڑ دی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ٹھیک ہے، جیسے تم کہو گے حق نواز! میں تو تمہارے ساتھ ہوں۔ مجھے تو ملک و قوم کے لیے کچھ کرنا ہے۔ پارٹی کوئی سی بھی ہو۔"

"سوچ لو یار! لوگ ایسے بندوں کو "لوٹا" کہتے ہیں۔"

اور وہ ہنس دیے تھے۔ انہوں نے حق نواز سے زیادہ بات نہیں کی تھی کہ مصروفیت ہی بے پناہ تھی۔ "الریان" والوں کی آمد نے "مراد پیلس" میں رونقیں بکھرا دی تھیں۔ دادا جان اڑے اڑے پھرتے تھے۔ دادی جان ہر وقت ایبک کو گود میں لیے بیٹھی رہتی تھیں۔

"ارے یہ تو پورا کا پورا سلجوق ہے۔ شاہ صاحب دیکھیں نا اس کی آنکھیں، اس کے ہونٹ، ناک... ہے نا بنا بنایا سلجوق۔ یاد ہے نا جب سلجوق اتنا سا تھا تو..."

دادی جان دن میں نہ جانے کتنی بار اس بات کو دہراتی تھیں۔

سب کو ہی ایبک بہت پیارا تھا۔ زارا تو اس کے پاس سے ہٹنے کو تیار ہی نہ ہوتی تھی۔ اس نے تو واپس لاہور جانے سے انکار ہی کر دیا تھا۔

"تمہاری پڑھائی کا حرج ہو گا بیٹا!" بابا جان نے اسے سمجھایا تھا۔

"کوئی حرج ورج نہیں ہوتا۔ میں کور کر لوں گی۔ اور جب تک اماں جان ہیں۔ میں بھی یہاں ہی رہوں گی۔"

اور یوں زارا کو چھوڑ کر سب واپس لاہور چلے گئے تھے۔ دادی جان نے انہیں بھی روک لیا تھا۔ حق نواز سے پھر ان کی بات نہ ہو سکی تھی۔ البتہ اخبار میں انہوں نے اپنی اور حق نواز کی پارٹی چھوڑنے کی چھوٹی سی خبر دیکھی تھی۔

زارا اور اماں جان کو وہ لاہور چھوڑنے آئے تو ان کا ارادہ حق نواز کی طرف جانے کا تھا لیکن بہاولپور سے دادا جان کا فون آ گیا تھا۔ دادی جان کی طبیعت خراب تھی اور وہ انہیں واپس بلا رہے تھے اور پھر دادی جان پندرہ دن بیمار رہنے کے بعد وفات پا گئیں۔

یہ ایسا حادثہ تھا کہ وہ سب کچھ بھول بیٹھے تھے۔ دادی جان صرف دادی جان تو نہ تھیں۔ وہ ان کے لیے مما سے بڑھ کر تھیں۔ ابھی ایبک ایک ماہ کا بھی نہ ہوا تھا اور وہ چل دی تھیں۔ لاہور سے شانی بہت دن آ کر ان کے پاس رہا تھا۔ انہیں سنبھلنے میں وقت لگا تھا، لیکن وہ سنبھل گئے تھے۔ دادا جان تھے انہیں تسلی دینے اور سنبھالنے کو۔

"سب کو ایک دن جانا ہے۔ ہمارا وقت تو پورا ہو چکا فلک! کون جانے کب میرا بھی بلاوا آ جائے۔ تمہیں سمجھداری سے کام لینا ہے۔"

"لیکن کچھ دن تو دادا جان! کچھ دن تو دادی جان زندہ رہتیں... ایبک کے لیے... وہ کتنی خوش تھیں نا ایبک کی پیدائش پر۔"

وہ ان کی گود میں سر رکھے لیٹے تھے اور ان کے آنسو دادا جان کے گھٹنوں پر گر رہے تھے۔

"وقت پورا ہو گیا تھا بیٹا! جانا تو تھا ہی۔"

دادا جان نے اس روز ان سے بہت باتیں کی تھیں اور بہاولپور میں ان کے قیام کے دوران بہت سارے معاملات سے باخبر کیا تھا۔ جن سے وہ پہلے بے خبر تھے۔ زمینوں کے معاملات، بینک کے معاملات وہ سب کچھ ان کے نام کر رہے تھے۔

"آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں دادا جان!"

وہ الجھتے تھے، لیکن بہاولپور ٹھہر کر انہوں نے وہ سب جانا سمجھا اور کیا جو دادا جان چاہتے تھے۔ ایبک جب تین ماہ کا ہوا تب وہ لاہور آئے تھے۔ نئی پارٹی میں ان کا پرجوش خیر مقدم ہوا تھا۔ حق نواز انہیں کچھ خاموش اور کمزور سا لگا تھا۔

"حق نواز! تم ٹھیک تو ہو نا... گھر میں سب ٹھیک ہیں۔"

"ہاں سب ٹھیک ہیں۔ سوری یار! شیر دل نے تمہاری دادی جان کا بتایا تھا آ نہیں سکا۔ اس روز بہن کی بارات تھی۔"

"کوئی بات نہیں یار! تم بتاؤ عالیہ کا کچھ پتا چلا؟"

"ہوں۔"

"چلو پارٹی چھوڑنے کا کچھ فائدہ تو ہوا۔"

"پتا نہیں فائدہ ہوا یا نقصان لیکن جس روز میں نے پارٹی جوائن کی اس سے اگلے روز صبح اس کی لاش مل گئی۔ اس کے گھر کی عقبی گلی سے۔"

اور ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ حق نواز سے کیا کہیں۔ حق نواز نے اس موضوع پر پھر کوئی بات نہیں کی تھی اور خود وہ بھی خاموش ہو گئے تھے۔

لیکن رات جب وہ سر الطاف کے پاس گئے تھے تو وہ خود کو اس موضوع پر بات کرنے سے نہ روک سکے تھے۔ انہیں عابدہ کی موت کا از حد دکھ ہوا تھا۔

عابدہ اور حق نواز کے درمیان کوئی محبت کا رشتہ نہ تھا، لیکن حق نواز نے اس کے اغوا اور پھر اس کی موت کا بہت اثر لیا تھا۔ اس نے کتنی ہی بار ایبک سے کہا تھا کہ اگر عابدہ مل جاتی ہے تو وہ فوراً اس سے شادی کر لے گا۔

اکیلی عورت کو ہڑپ کرنے کے لیے بہت سے بھیڑیے منہ پھاڑے منتظر ہوتے ہیں کہ کب موقع ملے اور وہ کب اسے اپنے خونی پنجوں میں دبا لیں۔ اگر عابدہ کی پشت پر کوئی مرد ہوتا تو اسے اتنی آسانی سے اغوا نہ کیا جا سکتا اور اب اس واقعہ کے بعد تو اسے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا... ہمارا معاشرہ ایسا ہی تو ہے۔ عورت کو ہم اکثر بغیر قصور کے ہی مجرم گردان لیتے ہیں اور پھر ساری زندگی اسے سزا دیتے رہتے ہیں۔

ان کے دل پر بہت بوجھ تھا اور انہوں نے سر الطاف سے دل کی ہر بات کہہ دی تھی۔ انہیں پارٹی چھوڑنے کا افسوس تھا۔ وہ اپوزیشن میں رہ کر ہی کچھ کرنا چاہتے تھے۔

"حکمران پارٹی میں شمولیت اختیار کرنے کے بعد ان کی کمزوریوں اور خامیوں پر انگلی اٹھانا مشکل ہو جائے گا اور پھر لوگ بھی انہیں ان کی غلطیوں اور کمزوریوں میں شریک سمجھیں گے۔"

"تم کس بات سے ڈرتے ہو فلک شاہ!" سر الطاف مسکرائے تھے۔ "ان پر انگلی اٹھانے سے یا خود پر انگلی اٹھنے سے؟"

"شاید دونوں باتوں سے..." ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

اور سر الطاف کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ جلسوں اور جلوسوں میں وہ جس گھن گرج کے ساتھ ان کی کمزوریوں اور کرپشن پر بولتے تھے۔ کیا اب ان میں شامل ہو کر وہ اس طرح اتنے ہی جوش و جذبے کے ساتھ بول سکیں گے؟

انہوں نے سوچتے ہوئے سر الطاف کی طرف دیکھا تھا۔

"انسان کو نڈر اور بے باک ہونا چاہیے فلک شاہ! میں سمجھتا ہوں اگر تمہاری نیت نیک ہے اور تم مخلص ہو تو تم پارٹی کے اندر رہ کر زیادہ قریب سے انہیں جان سکو گے۔ اگر تمہیں کچھ غلط لگتا ہے تو روک سکو گے۔ سمجھا سکو گے۔ اس طرح تمہارا کردار زیادہ مؤثر ہو جائے گا۔" سر الطاف نے سمجھایا تھا۔

"شاید آپ صحیح کہتے ہیں سر! لیکن مجھے لگتا ہے کہ ہم نے کچھ غلط کیا ہے... مجھے پارٹی کی کئی باتوں سے اختلاف ہے۔ لازمی بات ہے حق نواز کو بھی ہو گا۔ حق نواز نے صرف عابدہ کے لیے..."

"جانتا ہوں، لیکن اب اپنی بات نبھاؤ۔ روز روز پارٹیاں بدلنا صحیح نہیں ہے۔"

سر الطاف خود کسی پارٹی کے رکن نہ تھے لیکن

نوجوان طلبا میں بے حد مقبول تھے۔ حق بات کہتے ہوئے ذرا نہ جھجکتے تھے۔ کئی احتجاجی جلوسوں میں وہ ان کے ساتھ تھے۔ وہ سر الطاف کے پاس سے اٹھے تو کچھ مطمئن تھے، لیکن لاہور میں اس بار ان کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ عمارہ کو وہ بہاول پور ہی چھوڑ آئے تھے۔ دادا جان ان کے ساتھ آنے کو تیار نہ تھے اور دادی جان کے بعد وہ انہیں اکیلا چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ سو عمارہ بہاول پور میں ہی تھیں۔ ان کا کچھ وقت تو "الریان" میں اور کچھ اپنے دفتر میں گزر جاتا تھا۔

ان دنوں انہوں نے بہت سارے چھوڑے ہوئے کام نبٹائے تھے۔

کبھی کبھار وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی کے دفتر یا سر الطاف کی طرف چلے جاتے تھے۔ حق نواز ایسا ہی تھا خاموش اور افسردہ۔ جانے کن سوچوں میں گم رہتا تھا۔

"الریان" کی خاموشی سے گھبرا کر اماں جان نے احسان شاہ کی شادی کا پروگرام ترتیب دے ڈالا تھا۔ وہ عمارہ کو بہاول پور سے لے آئے تھے۔ دادا جان کو بھی زبردستی ساتھ لے آئے تھے۔ ثنا بھابھی اور راحت بھابھی بھی آگئی تھیں۔ احسان شاہ رحیم یار خان جا کر مروہ پھپھو کو بھی لے آئے تھے۔ الریان میں ایک بار پھر رونقیں اتر آئی تھیں۔ رات گئے تک ڈھولک بجائی جاتی۔ مصطفیٰ، مرتضیٰ اور عثمان کو شادی سے چند دن پہلے آنا تھا اور بے حد مطمئن سے وہ حق نواز کے ساتھ پارٹی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن حق نواز کو حکمرانوں کے بہت سے کاموں پر اعتراض ہونے لگا تھا۔

وہ چاہتا تھا کہ قوم سے جو وعدے کیے گئے تھے وہ پورے کیے جائیں، نہ کہ خود بھی کرپشن اور عیش و عشرت میں مصروف ہو جائیں۔ اس نے جاب بھی چھوڑ دی تھی۔

"یہ جاب مجھے کسی اور کا حق مار کر دی گئی تھی۔ ایسی جاب سے بہتر ہے کہ میں بھوکا مر جاؤں۔"

پارٹی کے جن افراد سے ان کا واسطہ پڑتا تھا۔ وہ اس پر ہنستے تھے اور اس کے خیالات کا مذاق اڑاتے تھے۔

"مجھے لگتا ہے کہ کسی روز میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔" وہ اکثر کہتا تھا۔

"انسان جب بے بس ہو اور کچھ نہ کر سکے تو اسے کیا کرنا چاہیے فلک شاہ!"

"سمجھوتا۔" انہوں نے کہا تھا۔

"نہیں۔ اسے مر جانا چاہیے۔"

"فضول باتیں مت کرو حق نواز!" اس کی باتوں سے اپ سیٹ ہو کر وہ گھر آئے تھے۔ احسان رحیم یار خان جانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"خیریت؟" زارا کی گود سے ایبک کو لیتے ہوئے انہوں نے ایبک کی پیشانی پر ہونٹ رکھے تھے۔

"رحیم یار خان جانے کے لیے۔"

"کیا میرا جانا ضروری ہے احسان؟" وہ ایک دم سنجیدہ ہوئے تھے۔

"ہاں۔" احسان شاہ بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"یار! اب ایک بار ہی جانا دولہا بن کے۔"

"خیال تو میرا بھی یہی تھا، لیکن اب بابا جان کا حکم ہے کہ مروہ پھپھو کے ساتھ جاؤں۔"

"کیوں مروہ پھپھو واپس جا رہی ہیں؟"

"ہاں۔ انکل کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے تو بابا جان نے مناسب سمجھا کہ انہیں بھجوا دیں۔ ابھی شادی میں تو دن ہیں، پھر آجائیں گی۔"

"اور تمہارے دل میں لڈو پھوٹ پڑے ہوں گے کہ اسی بہانے ملاقات ہو جائے گی۔"

ایبک کو زارا کے حوالے کرتے ہوئے وہ مسکرائے تھے۔

"ہاں یار۔! جب سے شادی کی ڈیٹ طے ہوئی ہے۔ محترمہ بات بھی نہیں کر رہی ہیں۔ بقول ان کے وہ ان دنوں اپنی امی جان کے کمرے میں ہوتی ہیں، اس لیے فون نہیں کر سکتیں۔ سو تم ساتھ ہو گے تو کسی بہانے ملاقات ہو جائے۔"

"یہ کام تو مروہ پھپھو بھی کر سکتی ہیں۔" وہ جھک کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگے تھے۔

"ارے مروہ پھپھو نے تو وہاں جاتے ہی آنکھیں پھیر لینی ہیں۔ پکی سسرالی بن گئی ہیں۔ گیا تو تھا منگنی کے بعد ایک بار ذرا جو جھلک بھی دیکھنے دی ہو مائرہ کی۔ اور تم فوراً" اٹھ جاؤ۔ لیسز بند کرو۔ عمارہ کو بتاؤ اور چلو۔ پھپھو تیار ہوں گی۔ ایک روز تم نے حق نواز اور حواریوں کے درشن نہ کیے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

انہوں نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو ایبک ابا کہ مجھے تمہاری سرگرمیوں کا علم نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تم سے کبھی ڈسکس نہیں کیا ورنہ سب جانتا ہوں۔ حالانکہ مجھے اب بھی پسند نہیں ہے تمہارا ان سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور حق نواز جیسے لوگوں سے دوستی رکھنا۔"

"حق نواز بہت پیارا بندہ ہے شانی! اس جیسے لوگ نایاب ہیں۔۔۔ اس کا دل اتنا خوبصورت ہے اتنا شفاف کہ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں وہ اس اتنی ظالم دنیا میں اب تک زندہ کیسے ہے۔"

وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

وہ احسان شاہ کو انکار نہیں کر سکتے تھے حالانکہ ان کا رحیم یار خان جانے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ مائرہ کا ہرگز سامنا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آج بہت سارے دنوں بعد مائرہ کے خیال سے وہ مضطرب اور بے چین ہو گئے تھے۔ لیکن پھر شیر دل کی بات یاد کر کے وہ خود کو تسلی دیتے ہوئے احسان شاہ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

"اب تک تو مائرہ کے دل سے ان کا خیال نکل بھی چکا ہو گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ احسان شاہ کو اپنی محبتوں کا یقین نہ دلاتی۔"

پھپھو انہیں دیکھ کر مطمئن ہوئی تھیں۔

"یہ اچھا ہوا کہ تم بھی ساتھ چل رہے ہو۔ میں بہت پریشان تھی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں پھپھو! ان شاء اللہ انکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" احسان شاہ نے انہیں تسلی دی تھی۔

وہ پھپھو کی بات پر حیران تو ہوئے تھے کہ آخر ان کے ساتھ جانے سے پھپھو کی پریشانی کیسے دور ہو گئی، لیکن پھر انہوں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا، لیکن جب راستے میں ایک جگہ احسان شاہ گاڑی روک کر کچھ کھانے پینے کے لیے لینے ایک ہوٹل میں گئے تو پھپھو کی بات سن کر وہ ششدر رہ گئے تھے۔

"میں بہت پریشان ہوں موی! اس لڑکی نے تو مصیبت کھڑی کر دی ہے میرے لیے۔ اس لیے میں احسان اور مائرہ کی شادی کی مخالفت کر رہی تھی۔"

"کیا ہوا پھپھو؟" وہ بے حد گھبرا گئے تھے۔

"مائرہ نے شادی سے انکار کر دیا۔"

"لیکن اس وقت جب شادی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے تو کیوں۔۔۔؟" اپنی عادت کے مطابق وہ غصے میں آگئے تھے۔ "پہلے ہی انکار کر دیتی تو احسان روپیٹ کر اب تک سنبھل چکا ہوتا۔"

"پتا نہیں کیوں فلک! عامر کا فون آیا تھا۔ میں نے تو بھائی جان سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ عامر کو بھی منع کر دیا کہ ابھی کسی سے بات نہ کرے اور ان کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔"

"لیکن آپ کیا کریں گی وہاں جا کر۔ منتیں کریں گی اس کی۔ اچھا ہے جان چھوٹ جائے گی احسان کی۔ وہ لڑکی احسان کے قابل ہرگز نہیں ہے۔"

"اس وقت جب سب شادی کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔" وہ روہانسی ہو رہی تھیں۔

"تم جانتے ہو نا فلک۔۔۔ میں نے بھائی جان کو مجبور کیا تھا مائرہ کے لیے ورنہ وہ تو راضی ہی نہیں تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پھپھو! احسان شاہ کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔۔۔ مائرہ سے ہزار درجے اچھی لڑکیاں ہیں۔۔۔ ہم اسی تاریخ پر شانی کی شادی کر دیں گے۔"

"اور احسان۔۔۔ وہ کرے گا کسی اور لڑکی سے

شادی؟ وہ بہت محبت کرتا ہے مائرہ سے۔۔۔ اس کی محبت میں جنونی ہے وہ۔"

اور یہاں اس بات پر وہ ہار مان گئے تھے۔

"تو آپ منا لیں گی اسے؟"

"کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے موی۔"

شانی جوس اور سینڈوچ لے آیا تھا لیکن وہ اتنے اپ سیٹ ہو گئے تھے کہ نہ تو انہوں نے سینڈوچ ہی کھایا تھا اور نہ جوس پیا تھا۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ احسان شاہ نے دو تین بار پوچھا بھی تھا۔

"کیا بات ہے فلک! تم کچھ اپ سیٹ لگ رہے ہو۔"

"نہیں اپ سیٹ نہیں ہوں۔ سر میں کچھ درد ہے اور بس۔"

"سوری یار! میں تمہیں زبردستی لے آیا۔ تم وہیں بتا دیتے سر درد کا تو میں۔۔۔" وہ شرمندہ ہوا تھا۔

"ارے یار چھوڑو۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ "اب ایسا بھی درد نہیں ہے۔"

لیکن رحیم یار خان پہنچتے پہنچتے ان کا سر درد شدت اختیار کر گیا تھا۔ بچپن میں انہیں اکثر میگرین کا درد ہو جاتا تھا لیکن اب تو بہت عرصہ سے انہیں اتنا شدید درد نہیں ہوا تھا۔ پھپھو نے فوراً" ہی گیسٹ روم کھلوا کر انہیں آرام کرنے کو کہا تھا۔

"تم لیٹ جاؤ فلک! میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ بھجواتی ہوں۔"

وہ احسان شاہ کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی تھیں۔ اور ان کے جانے کے بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

"کیا ہو گا اگر مائرہ نے پھپھو کی بات نہ مانی تو شانی تو۔۔۔ پھپھو سچ ہی تو کہتی ہیں کہ وہ تو مائرہ سے بہت شدید محبت کرتا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھے تھے جب احسان شاہ پھپھو کے ساتھ باتیں کرتا ہوا اندر آیا تھا۔

"مان لیں پھپھو! انکل نے آپ کو بلانے کے لیے بیماری کا ناٹک کیا ہے۔ ورنہ اچھے بھلے تو ہیں۔"

"بکومت۔۔۔ ان کی طبیعت خراب تھی۔ میں خود ہی چلی آئی۔ انہوں نے تو نہیں بلوایا تھا۔"

"یوں کہیں، آپ خود بھی اداس ہو رہی تھیں ان کے بغیر۔" کس قدر شوخ ہو رہا تھا وہ۔

انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹتی نظر آتی تھی۔

"ابھی کچھ دیر کی بات ہے اور۔۔۔" انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر سر گھٹنوں پر رکھ دیا۔

"فلک!" احسان نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ "میرا خیال ہے تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔ کسی ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔ میں انکل سے پتا کرتا ہوں ڈاکٹر کا۔"

انہوں نے سر اٹھا کر احسان شاہ کی طرف دیکھا اور ان کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"نہیں! ابھی یہ ٹیبلٹ لے کر چائے پیوں گا اور کچھ دیر آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا تم پریشان نہ ہو۔"

"ہاں! تم چائے پی کر کچھ دیر سو جانا۔ مجھے یاد ہے۔ بچپن میں تم جب سو کر اٹھتے تھے تو تمہارا درد ٹھیک ہو جاتا تھا۔"

پھپھو نے چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سر درد کی گولی ان کی طرف بڑھائی۔

"تھینک یو پھپھو۔" انہوں نے گولی لے لی تھی۔ تب پھپھو نے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔

"اور تم احسان اندر اپنے انکل کے پاس جا کر بیٹھو۔ بلکہ تم بھی آرام کرو کچھ دیر۔ میں ذرا آپا کی طرف جا رہی ہوں پھر آ کر کھانا لگواتی ہوں۔"

ان کی نظریں پھپھو سے ملی تھیں اور پھر مضطرب سے ہو کر وہ سر جھکا کر گھونٹ گھونٹ چائے پینے لگے۔ پھپھو احسان شاہ کو ساتھ لے کر باہر چلی گئی تھیں اور جاتے ہوئے دروازہ بھیڑ دیا تھا۔ وہ چائے پی کر لیٹ گئے تھے۔ بہت دیر آنکھیں موندے پڑے رہے لیکن نیند نہیں آئی۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی جب دروازہ ہولے سے کھلا تھا اور پھر کسی نے کمرے کی لائٹ جلائی تھی۔ انہوں نے جو آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹے تھے ہاتھ ہٹا کر

دیکھا تو دروازے کے پاس مائرہ کھڑی تھی۔
"آپ!" ان کے لبوں سے حیرت سے نکلا تھا اور یکدم اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔
"امی کہہ رہی تھیں تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو میں۔"
"پھپھو کہاں ہیں؟" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔
"کچن میں ہیں شاید۔"
"اور احسان؟" وہ اس کی طرف دیکھے بغیر جھک کر بیڈ کے پاس پڑے اپنے جوتے پہننے لگے تھے۔
"مجھے علم نہیں ہے۔ میں اندر نہیں گئی۔ امی کہہ رہی تھیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی بات کرنا ہے۔" اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تھا۔
"مجھے۔" وہ چونکے تھے۔ اور پھر اس سے پہلے کہ ان کے لبوں سے نہیں نکلتا انہیں خیال آیا کہ شاید پھپھو نے اس خیال سے یہ کہا ہو کہ میں اسے سمجھاؤں۔
"ہاں۔ وہ آپ نے شادی سے انکار کیوں کیا؟"
"اس لیے کہ میرا دل نہیں مانتا کہ دل میں کوئی اور ہو۔ شادی کسی اور سے کروں۔"
"تو کیا پہلے آپ کے دل نے آپ کو منع نہیں کیا؟ اب جبکہ شادی سر پہ ہے۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔ اب آپ کا دل کہہ رہا ہے کہ شادی سے انکار کریں۔"
"پہلے میں نے سوچا تھا کہ احسان شاہ سے شادی کر کے میں تمہیں دیکھ سکوں گی۔ زیادہ قریب ہو جاؤں گی لیکن جوں جوں شادی کے دن قریب آ رہے ہیں مجھے لگ رہا ہے کہ یہ زیادہ اذیت ناک ہو گا تمہیں کسی اور کے ساتھ دیکھنا ہے۔"
وہ بمشکل ضبط کیے بیٹھے تھے۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔
"مائرہ حسین۔!" ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ "آپ نے زندگی کو ایک کھیل سمجھا ہوا ہے۔ کیا حق پہنچتا تھا آپ کو ایک شخص کے جذبات اور دل سے کھیلنے کا؟ آپ نے تو شانی کو اپنی محبتوں کا یقین دلایا ہے۔ جھوٹ بولا ہے اس کے ساتھ۔ آپ کے نزدیک خاندان اور افراد کا وقار کوئی معنی نہیں رکھتا؟ نہ آپ کو اپنے والدین کا خیال ہے نہ دوسروں کا۔"
ان کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔
"فار گاڈ سیک مائرہ! آپ ایک سمجھ دار لڑکی ہیں۔ اگر آپ کو شادی نہیں کرنا تھی تو پہلے ہی نہ کرتیں لیکن اب اس مرحلے پر۔" وہ کھڑے ہو گئے تھے۔
"مائرہ پلیز! اس طرح مت کریں۔"
وہ ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ "خاندان کی عزت اور وقار کے لیے اگر میں اس وقت شادی کر لوں تو تم وعدہ کرتے ہو کہ میں اگر اپنے دل کو احسان شاہ کے ساتھ رہنے پر راضی نہ کر پاؤں اور طلاق لے لوں تو اس صورت میں تم عمارہ کو طلاق دے کر مجھ سے شادی کر لو گے؟"
"اور وہ یکدم بھڑک اٹھے تھے۔
"میں اس طرح کا بے ہودہ وعدہ ہرگز نہیں کروں گا۔ میری طرف سے تم جہنم میں جاؤ اور میں نے تمہیں ہرگز نہیں بلوایا تھا۔ میں تو تمہاری شکل تک دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔"
اس کی آنکھوں میں یکدم غصہ لہرایا تھا اور چہرے پر سرخی چھا گئی تھی اور جب وہ بولی تھی تو انہیں اس کی آواز کسی سانپ کی پھنکار کی طرح لگی تھی۔
"زندگی تو تمہاری میں جہنم بنا دوں گی فلک شاہ! تم ہو کس زعم میں۔"
وہ یکدم تیزی سے پلٹ کر دروازہ زور سے بند کرتی چلی گئی تھی۔ وہ بے دم سے ہو کر بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئے۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ مائرہ نے کیا کہا تھا۔ وہ صرف احسان شاہ کے متعلق سوچ رہے تھے۔
اس پر کیا گزرے گی۔ وہ کیسے سہے گا اس غم کو۔ کتنا چاہتا ہے وہ اس بے وفا اور فریبی لڑکی کو۔
پتا نہیں کتنی ہی دیر وہ یونہی سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھے رہے تھے۔ درد شدت اختیار کر گیا تھا' لیکن دھڑکنوں پر انہیں اختیار نہ تھا۔
"الریان" میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ ابرار' عمارہ' ثنا بھابھی' راحت بھابھی رات گئے تک ڈھولک لیے بیٹھی رہتیں۔ ایسے میں جب "الریان" میں خبر پہنچی کہ۔
"نہیں۔ یا اللہ! اس لڑکی کا دل پھیر دے تو چاہے تو کیا نہیں ہو سکتا۔"
انہوں نے نم آنکھوں کے ساتھ سچے دل سے دعا کی تھی۔ اور پتا نہیں وہ کوئی لمحہ قبولیت تھا کہ پھپھو دروازہ کھول کر اندر آئیں اور انہیں بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔
"تم جاگ گئے ہو فلک! کیسی طبیعت ہے اب؟" ان کے لہجے میں وہی نرمی اور شفقت تھی جو "الریان" کے لوگوں کا خاصا تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔
"میں سویا ہی کب تھا۔"
انہوں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔
"تمہاری طبیعت مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی فلک! احسان اور تمہارے انکل آتے ہیں تو تم ڈاکٹر کی طرف چلے جاؤ۔"
"وہ لوگ کہاں گئے ہیں؟"
انہوں نے پھپھو کے چہرے سے اس پریشانی کو کھوجنا چاہا جو وہ رات بھر ان کے چہرے پر دیکھتے آئے تھے۔
"میرے سسرالی عزیزوں میں شادی کے کارڈ دینے گئے ہیں دونوں۔"
"کس کی شادی کے؟" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔
"اپنے احسان کی شادی کے۔" پھپھو کے لبوں پر گہری مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔
"لیکن وہ مائرہ۔" وہ متذبذب سے ہو کر انہیں دیکھ رہے تھے۔
"سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ مان جائے گی۔ آپا اور بھائی جان بہت پریشان تھے۔ میں عامر کو بتا کر سیدھی ادھر ہی گئی تھی۔ یہ ساتھ والا ہی تو گھر ہے۔ وہ تو کسی صورت مان ہی نہیں رہی تھی۔ صاف انکار۔ میرے ساتھ ہی ادھر آئی تھی کہ آپ میں ہمت نہیں ہے تو میں خود احسان شاہ کو بتا دیتی ہوں کہ اس سے شادی نہیں کروں گی۔ میں کچن میں چلی گئی۔
بڑی دیر بعد میں ہمت کر کے کچن سے باہر آئی تو وہ لونگ روم میں بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو کھڑی ہو گئی کہنے لگی۔ امی! میں گھر جا رہی ہوں۔ اور میں نے احسان شاہ سے بات نہیں کی۔ میں آپ کی اور اماں ابا کی خاطر شادی کے لیے تیار ہوں۔ شکر ہے اللہ نے اس کا دل پلٹ دیا۔"
انہوں نے یکدم اطمینان بھرا سانس لیا تھا۔ تاہم انہوں نے تشویش سے پھپھو کو دیکھا تھا۔
"پھپھو! وہ احسان سے محبت نہیں کرتی۔ بعد میں اگر۔" پھپھو مسکرا دی تھیں۔
"بعد میں کچھ نہیں ہو گا۔ میاں بیوی جب نکاح کے بندھن میں بندھتے ہیں' ساتھ رہتے ہیں تو خود بخود محبت ہو جاتی ہے۔"
پھپھو مطمئن تھیں' لیکن ان کے دل پر ابھی بھی بوجھ سا تھا۔
اور پھر نیند کی گولی کھا کر وہ جلد ہی سو گئے تھے۔ ان کی آنکھ فجر کے وقت ہی کھلی تھی۔ طبیعت کافی بہتر تھی۔ سر ہلکا سا بوجھل تھا' لیکن درد نہیں تھا۔ وہ فوراً" ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور پھر نماز پڑھ کر انہوں نے احسان شاہ کو بھی اٹھا دیا تھا۔
"اٹھو یار! ناشتا کر کے نکل جائیں گے۔"
"تھوڑی دیر سے نہیں جا سکتے؟" احسان شاہ نے مندی مندی آنکھوں سے انہیں دیکھا تھا۔
"نہیں۔ پورے چھ گھنٹے کا سفر ہے' یہاں سے لاہور تک کا۔ میں چاہتا ہوں۔ ہم ٹائم سے لاہور پہنچ جائیں۔"
"لیکن مائرہ تو گیارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھتی۔" احسان شاہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔

"کیوں کیا رات ملاقات نہیں ہوئی تھی۔"

"ہوئی تھی، لیکن مختصر سی، تشنہ تشنہ سی۔ پتا ہے پھپھو کہہ رہی تھیں۔ رات وہ آئی تھی ادھر۔ ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں تھے وہ پھپھو کے پاس کچن میں ہی بیٹھ کر چلی گئی۔"

"ویری سیڈ!" فلک شاہ نے اظہار افسوس کیا۔

"ویسے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی۔۔۔؟"

"انکل کے ساتھ جب ان کی طرف ملنے گیا تھا تب۔" احسان شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"فی الحال مختصر ملاقات پر ہی اکتفا کرو۔ تفصیلی ملاقات اب ایک بار ہی کرنا۔"

"ظالم انسان! تم چند گھنٹے رک جاؤ تو۔۔۔ ہم سات آٹھ بجے تک تو پہنچ ہی جائیں گے۔"

"ہاں! لیکن سات آٹھ بجے مجھے میرا ڈاکٹر نہیں ملے گا۔" فلک شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"اوہ ہاں۔۔۔ اب تمہارے سر درد کا کیا حال ہے۔"

"کچھ بہتر ہے، لیکن آنکھوں کے سامنے روشنی کے جھماکے سے آرہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ یہ عام درد میگرین میں ڈھل جائے ہم لاہور پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔"

اور پھر احسان شاہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہوا تھا اور وہ ناشتا کر کے گھر سے نکل پڑے تھے۔ پھپھو ان کے ساتھ واپس نہیں جارہی تھیں۔ ان کا ارادہ دو روز بعد انکل عامر کے ساتھ آنے کا تھا۔

"یہ پھپھو کا سسرال بھی یہاں ہونا تھا اتنی دور پنجاب کی سرحد پر۔" روڈ پر آکر احسان شاہ نے تبصرہ کیا تھا۔

"اب تو تمہارا سسرال بھی یہیں ہی ہے میری جان۔"

"مجبوری ہے۔" احسان شاہ نے کندھے اچکائے تھے اور انہوں نے سر سیٹ کی پشت پر ٹکتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں۔

"تھینک گاڈ! مائرہ مان گئی، لیکن کیسے۔ دو منٹ پہلے میرے سامنے انکار کرنے کے بعد۔ پتا نہیں اس لڑکی کے ذہن میں کیا ہے۔ پھپھو کہتی ہیں شادی کے بعد میاں بیوی کے درمیان خود بخود محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ شہر دل کہتا ہے کہ یہ لڑکیاں یوں ہی ڈائیلاگ مارتی ہیں اور مائرہ کہتی ہے وہ ان کی زندگی جہنم بنا دے گی۔۔۔؟" وہ سارا راستہ یہی ایک بات سوچتے آئے تھے۔ احسان شاہ نے کوئی بات بھی کی تو انہوں نے مختصر جواب ہی دیا تھا۔

گھر آکر ان کا دل چاہا تھا کہ وہ دادا جان سے یہ ساری بات کہہ ڈالیں، لیکن پھر ان کی پریشانی کے خیال سے وہ ان سے کچھ نہ کہہ سکے تھے۔ تاہم انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ "الریان" کم کم ہی جایا کریں گے مبادا کوئی بات ہو جائے، لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے تھے کہ مائرہ ایسی لڑکی نہیں ہے کہ ان کے یا عمارہ کے ساتھ کچھ غلط کرے۔ وہ جذباتی ضرور ہے اور اس نے شاید پہلی نظر میں انہیں پسند کرلیا تھا اور ابھی تک دل سے نہیں نکال نہیں سکی۔۔۔ زندگی میں ہمیشہ ہی اسے سراہا گیا ہوگا۔ وہ تھی ہی اتنی خوبصورت۔ پہلی بار انہوں نے اسے نظر انداز کیا تو وہ ناراضی اور غصے کا اظہار کررہی ہے۔

انہوں نے خود کو تسلی دی تھی اور کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے تھے، لیکن پھر اسٹیج پر جس طرح اس نے عمارہ کا ہاتھ جھٹکا تھا اور جن نظروں سے اس نے عمارہ کو دیکھا تھا۔ انہیں لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں سے نکلتی چنگاریاں اسے بھسم کردیں گی۔

اتنی نفرت تھی اس کی آنکھوں میں کہ وہ بنا کچھ کہے عمارہ کا ہاتھ تھامے اسٹیج سے اتر آئے تھے۔ عمارہ کی آنکھوں میں حیرت تھی وہ شاید کچھ کہنا بھی چاہتی تھیں، لیکن انہوں نے جان بوجھ کر کوئی اور بات چھیڑ دی تھی۔ تاہم انہوں نے وہاں کھڑے کھڑے ہی بہاول پور جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ احسان شاہ کی شادی کے بعد دادا جان بھی بہاول پور جانے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔

"دادا جان! آپ وہاں اکیلے کیا کریں گے۔ یہاں رہیں نا ہمارے پاس۔۔۔ ایک تو آپ کے بغیر بہت

...گی۔" احسان نے کہا تھا۔

"میں پھر آجاؤں گا لیکن میرا دل گھبرا گیا ہے۔ جہاں ساری زندگی گزاری ہو وہاں سے دور رہنا بہت مشکل ہے۔ خاص طور پر اس عمر میں بندے کا دل اپنے ٹھکانے پر ہی لگتا ہے۔"

"دادا جان! آپ کچھ دن رک جائیں تو۔۔۔ ہم آپ کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔ میں نے وہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن بزنس وائنڈ اپ کرنے میں کچھ دن تو لگیں گے۔" اور دادا جان بے حد خوش ہوئے تھے۔

"یہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے فلک شاہ! میں بھی چاہتا ہوں کہ زندگی کے جو باقی ماندہ دن بچے ہیں۔ تم میری آنکھوں کے سامنے رہو میرے پاس۔۔۔"

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا دادا جان! ان شاء اللہ آپ اپنے ہاتھوں سے میرے ایبک کی شادی کریں گے۔"

اور وہ ان کی بات پر مسکرا دیے تھے۔

مگر بہاول پور جانے کے تین دن بعد ہی انہوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں موندلی تھیں۔ رات کو سوئے تو صبح اٹھے ہی نہیں۔

مراد پیلس سے گلزار کا فون آیا تو کتنی ہی دیر تک انہیں یقین نہیں آیا۔۔۔ "الریان" سے سب ہی ان کے ساتھ "مراد پیلس" گئے تھے۔ سوائے مائرہ کے۔ دادا جان کو دفنا کر آئے تو وہ کتنی ہی دیر تک عبدالرحمٰن شاہ کے گلے لگ کر روتے رہے۔

بابا جان بہت دیر تک انہیں تسلیاں دیتے رہے تھے۔

"ہم سب ہیں نا تمہارے اپنے۔ تم تنہا نہیں ہو۔ بابا جان کی جگہ تو کوئی بھی نہیں لے سکتا، لیکن "الریان" کے ہر فرد کے دل میں تم دھڑکتے ہو۔ تمہیں کبھی پریشانی آئی تو تم تک تو وہ بعد میں پہنچے گی پہلے "الریان" کا ہر فرد اس پریشانی کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔"

یہ احسان شاہ تھا جو بابا جان کے بالکل پاس کھڑا تھا، لیکن کتنے دکھ کی بات تھی کہ پھر جب ان پر مصیبت اور پریشانی آئی تو وہ بالکل تنہا کھڑے تھے۔

"الریان" کا ایک فرد بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔

وہ مہینہ بھر بہاول پور رہ کر واپس لاہور آگئے تھے۔

"مراد پیلس" دادا جان اور دادی جان کے بغیر کتنا ویران لگتا تھا، ان کا دل گھبرا جاتا تھا۔ گلزار کو سارے معاملات سمجھا کر وہ لاہور آگئے تھے۔

بابا جان نے ایک بار پھر انہیں "الریان" میں آنے کا کہا تھا۔

"اتنا بڑا گھر ہے موی! کیا تمہارے اور عمو کے لیے جگہ نہیں ہے؟"

ایک لمحہ کے لیے انہوں نے سوچا تھا کہ وہ بابا جان کی بات مان لیں، لیکن پھر انہوں نے سوچا تھا کہ اگر دادا جان ہوتے تو وہ انہیں کبھی بھی "الریان" میں رہنے کا مشورہ نہ دیتے اس صورت میں جبکہ مائرہ بھی وہاں تھیں اور یہ کہ وہ ان سے اور عمارہ سے نفرت کرتی تھیں۔ تب انہوں نے بڑے رسان سے کہا تھا۔

"بابا جان! یہ مناسب نہیں ہے۔"

"اب تم مجھے سمجھاؤ گے فلک شاہ کہ کیا مناسب ہے کیا نہیں۔۔۔" وہ بڑبڑائے تھے۔

"میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔ بابا جان! لیکن دادا جان کہتے تھے۔ بیاہی بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ میکے جا بیٹھیں تو ہلکی ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے بابا جان کا ہاتھ پکڑ کر چومتے ہوئے آنکھوں سے لگایا تھا اور انہوں نے پھر مزید کچھ نہ کہا تھا۔

ان دنوں وہ بہت مصروف ہو گئے تھے۔ اور اس روز بھی رات وہ بہت دیر سے گھر آئے تھے اور عمارہ نے انہیں بتایا تھا کہ بابا جان ان کا دیر تک انتظار کرتے رہے اور وہ اس پر بہت ناراض ہو رہے تھے کہ آپ کسی سیاسی پارٹی کے رکن ہیں۔

"اچھا۔۔۔!" وہ پریشان ہوئے تھے۔ "نہیں کس نے بتایا۔۔۔ شاید احسان شاہ نے۔"

"پتا نہیں۔" عمارہ ایبک کے رونے پر اٹھ کر چلی گئی تھیں اور انہوں نے سوچا تھا وہ کل "الریان" جا کر بابا جان کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کریں گے اور

صبح جب وہ ناشتا کررہے تھے تو مصطفیٰ آگئے۔ انہوں نے اور ثنا بھابھی نے آج واپس جانا تھا۔
"مصطفیٰ بھائی! آپ کیوں جارہے ہیں۔ مرتضیٰ بھائی اور عثمان بھائی تو وہاں سیٹ ہوگئے ہیں۔ آپ تو نہ جائیں پلیز۔ اجنبی ملکوں میں آپ لوگ کیسے دل لگالیتے ہیں؟"
"سال ڈیڑھ سال کی بات ہے یار! پھر ہمیشہ کے لیے آجاؤں گا۔"
"یہ اچھی بات ہے۔" وہ خوش ہوگئے تھے۔
"فلک! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔ دیکھو میں نے پہلے بھی تمہیں سمجھایا تھا یہ سیاست وغیرہ کے چکر میں مت پڑو۔ وقت پڑنے پر یہ لوگ تمہاری طرف دیکھیں گے بھی نہیں جن کے لیے آج تم جانیں دینے کو تیار رہتے ہو۔ کل بابا جان کو شاید کسی نے بھڑکا دیا تھا۔ وہ تو میں نے انہیں کہا کہ تم کسی ویلفیئر تنظیم کے لیے کام کرتے ہو۔ کسی سیاسی پارٹی کے رکن نہیں ہو۔"
وہ سر جھکائے سنتے رہے تھے اور انہوں نے مصطفیٰ سے وعدہ بھی کرلیا تھا کہ اب وہ کوشش کریں گے کہ وہ ان سیاسی سرگرمیوں میں زیادہ ملوث نہ ہوں۔ لیکن وہ حق نواز کو انکار نہیں کرسکتے تھے۔ جب بھی حق نواز انہیں کسی میٹنگ کے لیے بلاتا تو انہیں جانا پڑتا تھا۔ پھر وہ کون سا اپوزیشن میں تھے ان کی پارٹی تو برسراقتدار تھی، سو وہ لاپروا تھے کہ بھلا ڈر اور خوف والی کیا بات ہے۔ بابا جان اور مصطفیٰ بھائی تو یوں ہی ڈرتے ہیں۔
مصطفیٰ چلے گئے تھے اور وہ اپنی زندگی میں بے حد مصروف ہوگئے تھے۔ اس دوران الیکشن ہوئے ان کی پارٹی کامیاب رہی تھی۔
یہ جنوری 1977ء کی بات تھی۔ حق نواز نے پارٹی کے لیے بہت کام کیا تھا۔ وہ بھی اکثر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ حق نواز کو ایک فائدہ ہوا تھا کہ اسے اس کی اہلیت کے مطابق جاب مل گئی تھی۔
وہ جب بھی "الریان" جاتے تو شعوری طور پر کوشش کرتے کہ مائرہ سے ان کا سامنا نہ ہو، اگر سامنا ہوجاتا تو وہ رسماً حال چال پوچھ لیا کرتے تھے اور کبھی دھیان سے انہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا، لیکن انہیں کئی مرتبہ مائرہ کی نظریں اپنے چہرے پر محسوس ہوتی تھیں اور وہ دانستہ نظریں چرا جاتے تھے۔
ان دنوں اپوزیشن کی طرف سے الزام لگائے جارہے تھے کہ انتخابات میں دھاندلی ہوئی ہے۔ وہ حق نواز کی طرف گئے تو وہ کچھ پریشان سا بیٹھا تھا۔
"یار! ایسا تو ہوتا ہے ہر الیکشن میں پارٹیاں ایک دوسرے پر الزام لگاتی ہیں کہ دھاندلی ہوئی ہے۔"
"لیکن اگر میں کہوں اس میں بہت حد تک سچ ہے تو۔" حق نواز نے نظریں چرالی تھیں۔
"ایسا تو ہوتا ہے فلک شاہ! جب اختیار آپ کے پاس ہو تو مرضی کے نتائج حاصل کرنا کون سا مشکل کام ہے۔"
"یہ انصاف تو نہ ہوا حق نواز۔ ہم تو انصاف کے اور سچ کے داعی ہیں۔" حق نواز نے کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ تاہم چائے پیتے ہوئے اس نے ایک ایسی بات کہی تھی کہ وہ چونک پڑے تھے۔
"دن گنے جاچکے فلک شاہ۔ میں نے کئی لوگوں سے بات کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کسی نے میری بات پر دھیان نہیں دیا۔ عجیب عجیب خبریں سننے میں آرہی ہیں۔ کچھ صحافی دوست تو صاف الفاظ میں کہہ رہے ہیں کہ وقت پورا ہوچکا ہے دیکھو کیا ہوتا ہے فلک شاہ! بس تم یہ دعا کرو کہ ملک و قوم کے حق میں بہتر ہو۔ سر الطاف کہتے ہیں نا کہ ملک و قوم کے لیے کام کرنے والے ہر حالت میں اور ہر جگہ کام کرلیتے ہیں۔ اس کے لیے اقتدار کی کرسی ضروری نہیں ہے۔"
وہ حق نواز کے پاس سے اٹھے تو بہت افسردہ سے تھے۔ ہم لوگ اس طرح کیوں ہیں۔ کیوں نہیں مل جل کر اتحاد سے ملک کی ترقی کے لیے کام کرتے۔ ہر ایک دوسرے کو دھکا دینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔
وہ گھر آئے تو عمارہ نے بتایا کہ زارا کی شادی کی تاریخ طے پاگئی ہے۔
"ارے وہ تو بہت چھوٹی سی ہے۔" انہیں حیرت

ہی تھی۔
"بس اچانک ہی رشتہ آیا اور بابا جان نے فیصلہ کرلیا۔" عمارہ نے انہیں بتایا۔ وہ "الریان" جانے کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔ اس روز بڑے دنوں بعد وہ کتنی دیر تک "الریان" میں رہے تھے۔ زارا کو چھیڑتے، بابا جان سے سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ یکدم ہلکے پھلکے ہوگئے تھے۔
احسان شاہ اور وہ بہت دیر تک بابا جان کے پاس بیٹھے تفصیلات طے کرتے رہے تھے اور جب وہ اور عمارہ واپس آرہے تھے تو انہوں نے مائرہ کو دیکھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ عمارہ نے اسے خدا حافظ کہا تو اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔
"تمہارا حوصلہ ہے بھئی! جو تم ہر روز میکے چلی آتی ہو میاں اور بچے سمیت، ورنہ شادی کے بعد تو گھر سے نکلنا مشکل ہوجاتا ہے عورت کے لیے۔ شاید تمہارا اپنے گھر میں دل نہیں لگتا۔"
وہ جو ایبک کو اٹھائے ہوئے دو قدم آگے نکل گئے تھے، ٹھٹک کر رک گئے۔ عمارہ حیرت سے مائرہ کو دیکھ رہی تھیں۔ اور مائرہ کے لبوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی اور نظریں جو عمارہ کے چہرے پر جمی تھیں، ان میں اتنی نفرت تھی کہ غیرارادی طور پر وہ دو قدم آگے ہوکر عمارہ کے سامنے اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ عمارہ ان کے پیچھے چھپ گئی تھی۔ شاید وہ اسے مائرہ کی نظروں میں چھپی نفرت سے بچانا چاہتے تھے۔ ان کی نظریں مائرہ کی نظروں سے ملی تھیں۔ مائرہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جیسے وہ ان کی کیفیت سے محظوظ ہورہی ہو اور پھر فوراً ہی وہ رخ موڑ کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی تھی اور وہ بمشکل ضبط کی حدوں سے گزرتے عمارہ کا ہاتھ تھامے لاؤنج سے باہر نکل آئے تھے۔ اس روز انہوں نے سوچا تھا کہ بابا جان کے اصرار پر بھی انہوں نے "الریان" نہ رہنے کا بالکل صحیح فیصلہ کیا تھا اور اسی روز انہوں نے بہاول پور جانے کا پکا فیصلہ کرلیا تھا۔ حالانکہ دادا جان کے بعد وہ کچھ متذبذب سے ہوگئے تھے اور انہوں نے لاہور ہی میں رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا، لیکن اب ایک بار پھر وہ عمارہ سے کہہ رہے تھے "عمو! ہم زارا کی شادی کے بعد بہاول پور چلے جائیں گے۔ دادا جان اور دادی جان کی خواہش تھی نا کہ ہم وہاں رہیں "مراد پیلس" میں۔"
"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہمیں بہاول پور میں ہی رہنا چاہیے۔" آنسو ان کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔
"آپ نے سنا نہیں تھا، مائرہ بھابھی کیا کہہ رہی تھیں شاید انہیں ہمارا "الریان" میں جانا پسند نہیں ہے۔ حالانکہ مجھے ذرا دیر ہوجائے تو بابا جان خود فون کرلیتے ہیں۔"
انہوں نے عمارہ کے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے کہا تھا۔
"یار! یہ نند بھابھی کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم دل پر مت لو۔"
عمارہ کو تو انہوں نے سمجھا لیا تھا، لیکن خود وہ سمجھ نہیں پارہے تھے کہ مائرہ ایسا کیوں کررہی ہے۔ اب جبکہ وہ احسان شاہ کے ساتھ ایک بہت خوش گوار زندگی گزار رہی ہے۔
یہ زارا کی شادی کے تین دن بعد کی بات تھی۔ زارا رخصت ہوکر جاچکی تھی۔ اور یہ جولائی 1977ء تھا، جب حق نواز کا فون آیا تھا۔ فوجی حکومت آگئی۔ وزیراعظم گرفتار ہوگئے۔
"نہیں۔" انہیں یقین نہیں آرہا تھا۔
"تم نے ٹی وی نہیں لگایا اور خبریں نہیں سنیں۔"
"زارا کا ولیمہ اٹینڈ کرکے رات دیر سے آئے تھے۔ میں ابھی تک سورہا تھا۔ تم کہاں ہو اور عوامی ردعمل کیا ہے؟"
"میں گھر پر ہوں۔ اور فی الحال تو کوئی ردعمل دیکھنے میں نہیں آرہا۔ شاید شام تک ہم لوگ اکٹھے ہوں۔"
"میں آرہا ہوں تم گھر پر ہی رہنا۔"
"میں نے تم سے کہا تھا نا کہ کچھ برا ہونے والا ہے۔ کاش ہم یہ کچھ برا ہونے سے پہلے خود کو سنبھال

لیتے، لیکن جب آدمی بااختیار ہوتا ہے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔" حق نواز جذباتی ہو رہا تھا۔

وہ اسے خدا حافظ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور جب وہ تیار ہو کر باہر نکلے تو لوگ گلیوں میں ٹولیاں بنائے کھڑے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بات کر کے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے تھے۔ وہ میڈیکل اسٹور سے ایبک کی دوا لے کر گھر آئے تو انہوں نے عمارہ کو بتایا کہ وہ کچھ دیر کے لیے حق نواز کی طرف جا رہے ہیں اس لیے اگر وہ چاہیں تو انہیں "الریان" چھوڑ جاتے ہیں، لیکن عمارہ نے منع کر دیا۔

"زارا آجائے سسرال سے تو پھر ہم بہاول پور چلے جائیں گے۔" وہ چونکے تھے۔

"کیا مائرہ بھابی نے پھر کچھ کہا؟"

"نہیں۔" عمارہ نے نظریں چرالی تھیں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے آہستگی سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے..... ہم چند روز تک چلے جائیں گے۔" اور پھر وہ حق نواز کی طرف آگئے تھے۔ حق نواز بہت افسردہ سا تھا۔

کل کیا ہوگا، اس کے متعلق وہ کچھ اندازہ نہیں کر پا رہے تھے۔

"کیا مارشل لا ہی ہر مسئلے کا حل ہے۔ کیا ہمارے پاس ان مسائل کو نبٹنے کا کوئی اور حل نہیں ہے۔ کوئی منصفانہ حل..... یہ تو جبر ہے یار! زیادتی ہے۔"

وہ چپ چاپ حق نواز کی باتیں سنتے رہے تھے۔ اس دوران حق نواز کے پاس دو تین فون بھی آئے تھے۔ آخر طے یہ پایا تھا کہ کل کسی وقت وہ سب پارٹی کے دفتر میں اکٹھے ہو کر صورت حال پر غور کریں گے۔ پارٹی لیڈر تو جیل میں تھے۔

وہ کل ملنے کا وعدہ کر کے جلد ہی اٹھ آئے تھے۔ گھر آئے تو عمارہ بے حد پریشان بیٹھی تھیں۔ ایبک کا بخار تیز ہو گیا تھا۔ وہ اسی وقت ایبک کو اسپتال لے گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے داخل کر لیا تھا۔ ٹمپریچر بہت ہائی تھا۔ دو دن بعد وہ ایبک کو لے کر گھر آئے تو شیر دل کا فون آگیا تھا۔

"کہاں تھے فلک تم..... میں نے کتنے ہی فون کیے۔" شیر دل بے حد پریشان تھا۔

"کیا ہوا خیریت ہے۔"

"خیریت نہیں ہے..... حق نواز دو دن سے غائب ہے۔ وہ گھر سے یہ کہہ کر نکلا تھا کہ پارٹی کے دفتر جا رہا ہے۔ کچھ دیر تک آجائے گا لیکن واپس نہیں آیا۔ ماموں کا رات کو فون آیا تھا۔ تب سے سارے سورسز استعمال کر رہا ہوں، کچھ پتا نہیں چل رہا۔"

وہ خود بے حد پریشان ہو گئے تھے۔ شکر ہے شیر دل کی پوسٹنگ ان دنوں لاہور میں ہی تھی، ورنہ حق نواز کے والد بے چارے کیا کرتے

"تم کہاں ہو شیر دل؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"میں اس وقت ماموں کی طرف ہی ہوں۔"

"او کے میں آتا ہوں ابھی۔"

"لیکن تمہارا بیٹا بیمار ہے۔"

"اب تو ٹھیک ہے۔ ایک دو دوستوں کو جانتا ہوں جو حق نواز کے بہت قریب تھے۔ ان سے پتا کرتے ہیں۔"

وہ عمارہ کو بتا کر حق نواز کے گھر آگئے تھے۔ اس کے والد اور والدہ کی حالت بہت خراب تھی۔ رو رو کر سب کا برا حال ہو رہا تھا۔ وہ شیر دل کے ساتھ ان سب جگہوں پر گئے تھے، جہاں سے کچھ معلوم ہونے کی توقع تھی لیکن کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ سوائے اس کے کہ حق نواز پارٹی کے دفتر گیا تھا لیکن وہاں سوائے محسن اور افضال کے اور کوئی نہیں آیا تھا اور وہ بھی جلدی چلے گئے تھے..... سب سے آخر میں حق نواز ہی گیا تھا.....

مزید ایک دن گزر گیا تھا حق نواز کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ وہ بے حد افسردہ سے بیڈ پر لیٹے تھے جب عمارہ نے بتایا تھا۔ "بابا جان صبح سے کئی بار فون کر چکے ہیں۔ ایک چکر بھی لگایا ہے ادھر کا..... اماں جان بھی بہت اداس ہو رہی ہیں زارا کے لیے..... کچھ دیر کے لیے چلیں ادھر؟"

"تم چلی جاؤ عمو..... میں تھوڑی دیر تک شیر دل کی طرف جاؤں گا۔ شاید حق نواز کا کچھ پتا چلا ہو۔"

پھر عمارہ کے جانے کے بعد وہ شیر دل کی طرف چلے گئے تھے۔ اس کے ساتھ وہ مختلف جگہ انہیں ڈھونڈتے رہے تھے۔ کئی تھانوں سے بھی پتا کیا۔ شیر دل وردی میں تھا۔ اس لیے ہر جگہ اچھی طرح لوگوں نے گائیڈ کیا۔

"آخر کہاں چلا گیا وہ؟" انہوں نے شیر دل سے پوچھا تھا۔

"مجھے ڈر ہے کہ گرفتار کر لیا گیا ہے اسی دن سے ڈرتے تھے۔"

"اگر گرفتار کر لیا گیا ہے تب بھی پتا تو چلے کہاں ہے۔ کس جیل میں رکھا گیا ہے اسے۔ ملاقات تو ہو کسی صورت۔" انہوں نے شیر دل سے کہا۔

"یہی تو پتا نہیں چل رہا فلک شاہ..... اور سنو! تم بھی محتاط رہنا۔ ادھر ادھر تبصرہ مت کرتے رہنا۔"

شیر دل کے ساتھ کافی دیر تک ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ بہت دیر تک حق نواز کے گھر بیٹھے رہے تھے۔ اور جب وہ وہاں سے نکلے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ انہیں وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا تھا۔ "الریان" پہنچتے پہنچتے بارہ بج گئے تھے۔ گو کہ گرمیاں تھیں اور لاہور میں ابھی بارہ بجے لوگ جاگ رہے تھے۔ سڑکوں اور مارکیٹوں میں بھی آمد و رفت تھی پھر بھی "الریان" کے حساب سے بہت دیر ہو گئی تھی اور انہیں ابھی عمارہ کو ادھر سے لینا تھا اور بابا جان کا حکم تھا کہ آٹھ بجے تک سب گھر میں موجود ہوں..... جس میں نو بجے تک کی رعایت تھی اور اب تو بارہ بج رہے تھے۔ بابا جان ضرور ناراض ہوں گے۔ گھر جا کر عمارہ کو فون کر دیتا ہوں کہ شانی کے ساتھ آجائے۔ صبح تک بابا جان کا غصہ کم ہو جائے گا سو وہ اپنے گھر چلے گئے تھے اور ابھی انہوں نے اپنے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ فون کی بیل سنائی دی۔

"عمارہ کا فون ہو گا۔" وہ مسکرائے اور ریسیور اٹھایا لیکن دوسری طرف شیر دل تھا۔ گھبرایا ہوا سا۔

"فلک شاہ! فوراً" میو اسپتال پہنچو۔ حق نواز آئی سی یو میں ہے۔"

"کیا ہوا اسے؟"

"کچھ مت پوچھو ابھی آجاؤ۔ وہ مر رہا ہے اور اس نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔" شیر دل رو پڑا تھا۔ "پتا نہیں کب..... وقت کم ہے۔ دیر مت کرنا۔"

اور وہ ریسیور کریڈل پر ڈال کر الٹے قدموں باہر نکلے تھے۔ اور تیزی سے اپنے گیٹ سے نکل کر "الریان" آئے تھے۔

"عمارہ کہاں ہے؟" دروازہ کھلتے ہی انہوں نے عنایت بی بی سے پوچھا تھا۔

وہ عمارہ کو حق نواز کے متعلق بتانے آئے تھے اور یہ کہ آج رات وہ "الریان" میں ہی ٹھہر جائے۔ کیا پتا اسپتال میں ہی رکنا پڑے انہیں۔ وہ حق نواز کو اس حالت میں چھوڑ کر آ تو نہیں سکتے تھے۔

"جی پہلے تو بڑے صاحب کے کمرے میں تھیں لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا وہ چھوٹے شاہ جی کے کمرے میں جا رہی تھیں۔"

احسان شاہ کو سب ملازم چھوٹے شاہ جی کہتے تھے۔ وہ تیزی سے احسان شاہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھے تھے۔ شیر دل نے کہا تھا وقت کم ہے۔

دل ہی دل میں حق نواز کی زندگی کی دعا مانگتے ہوئے انہوں نے دروازے کو ہلکا سا دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔ سامنے ہی بیڈ پر مائرہ بیٹھی تھی..... ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی جو دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئی تھی۔ عمارہ کو دیکھنے کے لیے انہوں نے کمرے میں نظر دوڑائی تھی۔

"عمارہ.....!" ابھی لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی تھے کہ مائرہ بیڈ سے اترتے ہوئے تیز لہجے میں بولی تھی۔

"تم یہاں..... تمہاری جرأت کیسے ہوئی اس وقت میرے کمرے میں آنے کی۔"

"سوری....." وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹے تھے۔

"میں..... وہ..... عمارہ۔"

لیکن اس نے انہیں بات مکمل نہیں ہونے دی۔

"فلک شاہ! تم کیا سمجھتے ہو اپنے آپ کو؟ یہ کہ تم کبھی مجھے زیر کرلو گے۔ جھکالو گے لیکن محبت زبردستی کا سودا نہیں ہے۔ پہلے جب تم میرے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کرسکے تو اب تو میں احسان شاہ کی بیوی ہوں۔ میں پہلے بھی اس سے محبت کرتی تھی اب بھی کرتی ہوں۔ تمہیں شرم آنا چاہیے فلک شاہ اب تو کم از کم۔۔۔"

"یہ کیا کہہ رہی تھی مائرہ۔ وہ ششدر سے ہو کر اسے دیکھنے لگے تھے۔

"میں اس شخص کی بیوی ہوں جو تم پر جان چھڑکتا ہے۔۔۔ اور تم اس کی بیوی پر اب بھی بری نظر رکھتے ہو۔"

تب ہی واش روم کا دروازہ کھلا تھا اور احسان شاہ باہر نکلے تھے۔ مائرہ تیزی سے احسان شاہ کے قریب گئی۔

"یہ۔۔۔ یہ فلک شاہ تمہارا دوست تمہارا بھائی۔۔۔ یہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ شادی کرنا چاہتا تھا لیکن میں تم سے۔۔۔ اور اب۔۔۔ میں نے سمجھا تھا اب یہ تمہارا خیال کرے گا لیکن۔۔۔"

وہ رک رک کر بول رہی تھی اور احسان شاہ ساکت کھڑا شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دم جیسے ٹرانس سے باہر آئے تھے۔

"نہیں۔۔۔ شانی۔۔۔ میں۔۔۔ خدا کے لیے مجھے ایسی نظروں سے مت دیکھو۔۔۔ یہ لڑکی۔۔۔" یہ وہ ٹھٹکے تھے۔

"مائرہ بھابی جھوٹ بول رہی ہیں۔ تم جانتے ہو۔"

"نہیں شانی! میں نے سچ کہا ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ احسان شاہ کے بازو پر رکھا تھا۔

"بہت بار اس نے مجھ سے اظہار محبت کیا اور۔۔۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" وہ چلائے تھے۔

"آہستہ بولو فلک شاہ!"

مائرہ کے لبوں پر عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی اور وہ ایسی نظروں سے فلک شاہ کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ تم سمجھ رہے تھے کہ میں بھول چکی ہوں اپنی توہین۔ اپنے ٹھکرائے جانے کی بے عزتی۔

"احسان شاہ!" انہوں نے بے بسی سے احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ "پلیز میری بات سنو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جو کچھ مائرہ بھابی نے کہا ہے اس میں ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے۔ ہم آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آج میں تمہیں سب کچھ بتادوں گا۔ شروع سے لے کر آخر تک' اس وقت میں جلدی میں ہوں۔ حق نواز مر رہا ہے۔ مجھے اس کی طرف جانا ہے لیکن پلیز تم میرا یقین رکھو۔ فلک شاہ مر تو سکتا ہے لیکن۔۔۔"

"مجھے کچھ نہیں سننا فلک شاہ! نہ اب نہ پھر کبھی۔" احسان شاہ کے لہجے میں اتنی ٹھنڈک تھی کہ وہ کانپ گئے۔ "بہتر ہے کہ آج کے بعد تم اس گھر میں قدم بھی نہ رکھو۔"

احسان شاہ نے رخ موڑ لیا تھا۔ مائرہ انہیں تمسخر بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ باہر لاؤنج میں کھڑی عنایت بی بی بلند آواز میں انہیں بلا رہی تھی۔

"مومی صاحب! آپ کا فون ہے کسی شیر دل کا۔"

اور وہ جو احسان کی طرف بڑھنے لگے تھے' وہیں ہی رک گئے۔

صبح وہ احسان شاہ سے بات کرلیں گے۔ وہ احسان شاہ ہے۔ ان کا دوست' ان کا یار' ان کا دل۔۔۔ وہ صبح اس سے ہر بات کرلیں گے۔ ایک ایک بات بتائیں گے تو وہ ضرور ان کی بات سنے گا بھی اور سمجھے گا بھی' وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے تھے اور تیزی سے لاؤنج میں رکھے فون کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے سائیڈ پر پڑا ریسیور اٹھایا۔ اس سے ٹوں ٹوں کی آواز آرہی تھی۔ انہوں نے ریسیور واپس کریڈل پر رکھا اور عنایت بی بی کی طرف دیکھا۔ جو وہاں لاؤنج میں ایک طرف بیٹھی نہ جانے کیا کررہی تھی۔

"کچھ کہا تھا شیر دل نے؟"

"بس آپ کا پوچھا تھا۔ آپ ادھر تو نہیں ہیں اور کہا تھا۔ وہ جارہا ہے جلدی پہنچو۔"

تب ہی ان کی نظر بابا جان پر پڑی تھی۔ غالباً جب عنایت بی بی نے بلند آواز میں انہیں بلایا تھا تو وہ آواز سن کر اپنے بیڈ روم سے باہر نکلے تھے اور دروازے میں کھڑے تھے اور انہوں نے پہلے انہیں نہیں دیکھا تھا۔

"یہ تم آدھی آدھی رات تک کہاں آوارہ گردیاں کرتے رہتے ہو؟" اسے اپنی طرف دیکھتا پا کر عبدالرحمٰن شاہ کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔

"یہ گھر ہے کوئی سرائے نہیں ہے اور نہ ہی یہاں" کی روایت ہے آدھی رات کو گھر میں گھسنے

وہ حیران ہوئے تھے۔ بابا جان کو انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی بار یوں غصے سے بولتے ہوئے دیکھا

"بابا جان!" وہ معذرت کرنا چاہتے تھے اور انہیں بتانا چاہتے تھے کہ حق نواز کی وجہ سے انہیں دیر ہوئی لیکن عبدالرحمٰن پاشا نے ان کی بات سنے بغیر پھر کہا

"ہزار دفعہ سمجھایا ہے۔ منع کیا ہے' سیاست سے باز آجاؤ۔ یہ کچھ نہیں دے گی تمہیں۔ لیکن اب کل کو پولیس کھڑی ہوگی دروازے پر گرفتار کرنے۔ تمہارا دوست گرفتار ہوا ہے تو تمہاری باری بھی آئے گی۔ اگر تم نے یہی کچھ کرنا ہے تو بہتر ہے کہ "الریان" مت آؤ۔"

"بابا جان!" ان کے پیچھے کھڑی عمارہ نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا تھا۔

"بابا جان صحیح کہہ رہے ہیں۔" احسان شاہ بھی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ اس کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں۔

"آج کے بعد الریان میں قدم مت رکھنا فلک شاہ!"

انہوں نے مڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا تھا۔ اگر انہیں حق نواز کی طرف جانے کی جلدی نہ ہوتی تو وہ سب کچھ واضح کرکے ہی احسان شاہ کے کمرے سے نکلتے لیکن تقدیر میں ایسا ہونا نہیں لکھا تھا۔

لاؤنج میں رکھے فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ عنایت بی بی کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے گھنٹی بند ہوچکی تھی۔ "شاید شیر دل کا فون۔۔۔ حق نواز۔" ان کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔

"سن لیا ہے نا تم نے فلک شاہ کہ آج کے بعد یہاں مت آنا۔ قدم بھی نہ رکھنا یہاں۔"

حق نواز مر رہا تھا اور یہاں یہ سب شروع ہوگیا تھا۔ وہ یکدم بھڑکے تھے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ آج کے بعد اگر میں نے یا میری بیوی نے الریان میں قدم رکھا تو میری بیوی مجھ پر تین طلاق سے حرام ہے۔"

انہیں بابا جان کی بات پر غصہ نہیں آیا تھا۔ انہیں احسان شاہ کے شک نے مار دیا تھا۔

وہ تیر کی طرح بابا جان کے ساتھ کھڑی عمارہ کی طرف بڑھے تھے' جو ایبک کو کندھے سے لگائے کھڑی کانپ رہی تھیں اور پھر عمارہ کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً" کھینچتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے کی طرف بڑھے تھے اور لکڑی کا بھاری دروازہ ایک ہاتھ سے کھولتے اور ایک ہاتھ سے عمارہ کا ہاتھ تھامتے وہ باہر نکل گئے تھے اس تمام عرصے میں انہوں نے عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جو فرنٹ سیٹ پر ایبک کو گود میں لیے بیٹھی مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے انہوں نے ایک نظر عمارہ کی طرف دیکھا تھا۔

"ہم اسپتال جارہے ہیں۔"

انہوں نے بس اتنا ہی کہا تھا اور ہونٹ بھینچے گاڑی چلانے لگے تھے۔ ان کے ماتھے کی رگیں پھولی ہوئی تھیں اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔ انہیں کچھ احساس نہیں تھا کہ وہ کیا کر آئے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عمارہ رو رہی ہے لیکن اسپتال تک انہوں نے پھر عمارہ کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اسپتال کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرکے وہ اترے اور عمارہ کو وہیں بیٹھنے کی تاکید کرکے وہ تیزی سے اسپتال کی عمارت کی طرف بڑھے تھے۔ گیٹ کے اندر قدم رکھتے ہی انہیں شیر دل نظر آیا تھا۔

"شیر دل!" وہ تیزی سے اس کی طرف لپکے تھے۔

"تم نے اتنی دیر کردی فلک۔۔۔ اور وہ چلا گیا۔" شیر دل ان کے گلے لگ گیا تھا۔

"چلا گیا ان کا انتظار کیے بغیر۔؟"

"اس نے دوبارہ آنکھ کھولی تھی اور دونوں بار تمہیں بلانے کی استدعا کی تھی۔ وہ تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

شیر دل کہہ رہا تھا اور ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سارا راستہ وہ سوچتے آئے تھے کہ کچھ غلط ہو گیا ہے۔ شاید حق نواز اور ان کے خدشے صحیح نکلے تھے۔

شیر دل انہیں وہیں چھوڑ کر ایمبولینس کا پتا کرنے چلا گیا۔ وہ مرے مرے قدموں سے اندر کاریڈور میں آئے تھے۔ وہاں حق نواز کے والد تھے۔ اس کی بہن اور ماں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی جیسے ایک کہرام سا اٹھا تھا۔ وہ حق نواز کے والد کے گلے لگ کر بہنوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر اندر حق نواز کو دیکھنے چلے گئے تھے۔ اس کے پاس اس کا کوئی دوست تھا۔ انہوں نے اس کے چہرے سے چادر ہٹائی۔ آنکھیں موندے وہ بہت سکون سے سو رہا تھا۔

حق نواز جس نے پاکستان بنتے نہیں دیکھا تھا لیکن جو کہتا تھا کہ "یہ ملک اتنی آسانی سے نہیں بنا تھا اور یہ لوگ جو اس ملک کو لوٹ کر کھا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ نہیں جو الگ ملک چاہتے تھے۔ ورنہ یہ ہندو ذہنیت ترک کر دیتے۔ علیحدہ ملک چاہنے والے گزر گئے۔ اللہ انہیں اپنی رحمت میں چھپائے۔ یہ لوگ ان شہیدوں کو فراموش کر چکے ہیں۔ جنہوں نے اپنا آج اس قوم کے کل کے لیے قربان کر دیا تھا۔ ان شہیدوں کے مقبروں پر خاک اڑتی ہے۔ ان کے بچے بھوکے اور بے آسرا ہیں۔ ان کی بیوائیں اس معاشرے کا زہر جرعہ جرعہ پی رہی ہیں۔ اس قوم نے بے حیا اور بے غیرت طبقے کو پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ ایسا طبقہ جس کی عفت و عصمت کورے کاغذ پر لکھی ہوئی ہوتی ہے جہاں جو چاہے دستخط کر دے۔۔۔ مجھے پاکستانی قوم سے گلہ نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اوروں کی طرح ان پر بھی کوئی دوسری قوم مسلط نہ کر دی جائے۔ ان کی اجتماعی قبریں دریافت نہ ہوتی پھریں۔"

ابھی چند دن پہلے کی ہی تو بات تھی جب وہ کہہ رہا تھا۔

"فلک شاہ! میں سوچ رہا ہوں کہیں اور چلا جاؤں کسی اور ملک میں۔"

"کیوں اتنے مایوس ہو گئے ہو۔"

"پتا نہیں۔"

"مت جاؤ اپنے پاکستان کو چھوڑ کر۔" انہوں نے کہا تھا۔

"یہ پاکستان میرا ہے۔ اس میں بسنے والے ان بچھوؤں اور سانپوں کا نہیں۔ میں اگر پاکستان میں نہ رہوں تو بھی میری ملکیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پاکستان سے بہت محبت کرتا ہوں فلک شاہ! لیکن میں یہاں رہ کر یہ اذیتیں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔"

اور وہ چلا گیا تھا۔

وہ الٹے قدموں باہر نکل آئے تھے۔ ان میں اس کا چہرہ دیکھنے کی تاب نہ تھی۔

"بیٹا! بچیوں کو اور اس کی والدہ کو گھر لے جاؤ۔۔۔ ہم اسے لے کر کچھ دیر میں آتے ہیں۔"

وہ سب کو لے کر گاڑی تک آئے تھے تو عمارہ اب بھی رو رہی تھیں۔ انہوں نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھا تھا۔

"عمو! حق نواز چلا گیا۔" عمارہ نے نظریں اٹھائیں۔ سرخ انگارہ آنکھیں، بھیگی پلکیں۔ وہ نظریں چرا کر پیچھے دیکھنے لگے تھے۔

حق نواز کی والدہ اور بہنوں کی آنکھیں اب بھی آنسو بہا رہی تھیں۔ انہوں نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔

"ہم حق نواز کے گھر جا رہے ہیں۔"

عمارہ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگیں۔ اور حق نواز کی والدہ کی طرف دیکھتے ہوئے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ خاموشی سے ڈرائیو کر رہے تھے۔ ان کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے "الریان" میں کیا ہوا تھا وہ بھول چکے تھے یا یاد نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فجر کی اذانوں تک ان کی ذہنی کیفیت یہی رہی تھی۔ حق نواز کے گھر کے ڈرائنگ روم میں کارپٹ پر بیٹھے لوگوں کو آتے اور

[...]واز کے والد سے افسوس کرتے دیکھتے رہے۔ شیر [...]بھی کبھی اندر آ کر ماموں کو تسلی دیتا۔ ان کے گلے [...]کر روتا اور پھر چلا جاتا۔ وہ رشتہ داروں کو اطلاع [...]اور دوسرے انتظامات میں مصروف تھا۔ گھر کے [...]ونی حصے سے کبھی کبھی آہ و بکا کی آواز آتی تو وہ [...]تے۔ انہیں اس وقت شیر دل کے ساتھ ہونا [...]تھا لیکن وہ یوں بیٹھے تھے جیسے ان کے جسم سے [...]نے جان نکال دی ہو۔ آتے جاتے شیر دل نے دو [...]بار انہیں دیکھا تھا پھر ایک بار وہ حق نواز کے والد [...]کچھ پوچھ کر اس کے قریب آیا تھا۔

"فلک۔۔۔!" اس نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھے [...]

"تم ٹھیک تو ہو نا۔"

"ہاں۔"

تب شیر دل نے یکدم دونوں بازو پھیلا دیے تھے اور [...]اس کے سینے سے لگے رو رہے تھے۔ رات سے اب [...]تک وہ اس طرح کھل کر نہیں روئے تھے۔ بہت دیر [...]تک وہ یونہی شیر دل کے گلے سے لگے رہے تھے پھر شیر [...]دل نے ان کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے انہیں الگ [...]کیا۔

"فلک شاہ! بھابھی کچھ دیر کے لیے گھر جانا چاہتی [...]ہیں۔ بچے کے کچھ کپڑے اور ضرورت کا کچھ دوسرا [...]سامان لانا ہے۔"

وہ بنا کچھ کہے آنسو پونچھتے ہوئے باہر آ گئے تھے [...]کچھ دیر بعد عمارہ بھی ایبک کو اٹھائے آ گئی تھیں۔ وہ [...]بے حد تھکی تھکی اور نڈھال لگ رہی تھیں۔ خاموشی [...]سے انہوں نے ایبک کو ان کی گود سے لیا تھا۔ گھر تک [...]دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ گھر کے [...]باہر ہی گاڑی کھڑی کر کے وہ اترے تھے اور ان کی [...]نظریں بے اختیار "الریان" کی طرف اٹھی تھیں۔

[...]"الریان" کے گیٹ کے دونوں اطراف لیمپ جل رہے [...]تھے۔ پیتل کے یہ لیمپ انہیں بچپن سے ہی بہت پسند [...]تھے۔ یکدم انہوں نے نظریں ہٹا کر عمارہ کی طرف [...]دیکھا تھا جو نگاہیں جھکائے کھڑی تھیں۔ ان کے دل [...]میں جیسے کسی نے سوئی چبھوئی تھی لیکن پھر بھی وہ

اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہو چکا ہے۔

"تم اگر گھر ٹھہرنا چاہو تو رک جاؤ۔ میں جنازے کے بعد چکر لگاتا ہوں۔" انہوں نے عمارہ سے کہا تھا۔ عمارہ خوفزدہ سی ہو کر انہیں دیکھنے لگی تھیں اور انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔"

"الریان چھوڑ دیتا ہوں۔" وہ کہتے کہتے رک گئے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے پھر چلتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر حق نواز کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ گاڑی باہر نکالتے ہوئے ان کی نظریں "الریان" کے گیٹ کی طرف اٹھی تھیں۔ اس وقت بابا جان فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے تھے لیکن آج گیٹ بند تھا شاید وہ چلے گئے تھے یا شاید ابھی نہیں گئے تھے۔ انہوں نے بے دھیانی سے سوچا تھا اور پھر حق نواز کے متعلق سوچنے لگے تھے اس کے جنازے کے متعلق ابھی تک فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کب اٹھایا جائے گا۔

کیونکہ اس کی جس بہن کی شادی ہوئی تھی وہ دبئی میں تھی اور رات سے ہی وہ ایئرپورٹ پر بیٹھی تھی اور پتا نہیں اسے کب فلائٹ ملی تھی۔ ملی بھی تھی یا نہیں

کچھ دیر بعد وہ پھر حق نواز کے گھر کے سامنے تھے۔ پچھلی گلی میں گاڑی پارک کر کے وہ عمارہ کے ساتھ اندر آئے تھے۔ عمارہ اندر چلی گئی تھیں اور وہ ایک بار پھر حق نواز کے والد کے پاس آ کر بیٹھ گئے تھے۔ محلے کے چند لڑکے وہاں موجود لوگوں میں چائے تقسیم کرنے لگے تھے۔ ان کا سر درد سے پھٹ رہا تھا لیکن انہوں نے چائے نہیں لی۔ کچھ دیر بعد اور لوگ آنا شروع ہو گئے تھے۔ جنازہ عصر کے بعد مونا کے آنے کے بعد رکھا گیا تھا۔ حق نواز کو اپنی اس بہن سے بڑی محبت تھی جو عمر میں اس سے صرف دو سال چھوٹی تھی اور اس کے متعلق بات کرتے ہوئے وہ اکثر جذباتی ہو جاتا تھا۔

آنے والوں میں کچھ اجنبی چہرے بھی تھے۔

انجانے سے لوگ ادھر ادھر متجسس نظروں سے تکتے ہوئے ایک دو نے ان سے بھی بات کرنے کی کوشش کی تھی اور حق نواز کی موت کے متعلق پوچھا تھا کہ کیسے ہوئی۔ وہ خود نہیں جانتے تھے تو کیا کہتے۔ جنازے میں بھی کچھ اجنبی چہرے تھے۔ شیردل نے بھی پوچھا تھا کہ کیا وہ انہیں جانتے ہیں اور کیا وہ حق نواز کے دوست ہیں۔ انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"حق نواز! مجھے اس خارزار میں اکیلا چھوڑ کر کیوں چل دیے دوست۔"

قبر پر مٹی ڈالتے ہوئے انہوں نے سرگوشی کی تھی اور پھر انہیں اپنے اوپر کئی چبھتی نظروں کا احساس ہوا تھا اور وہ پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اور یہ نظریں پورے جنازے میں انہیں اپنے اوپر اٹھتی محسوس ہوتی رہی تھیں اور پھر حق نواز کے گھر سے فارغ ہوتے گیارہ بج گئے تھے اور جب وہ گھر آکر اپنے بیڈ پر لیٹے اور عمارہ ایبک کو چینج کروا کے بیڈ روم میں آئیں تو بارہ بج رہے تھے۔ ایبک کو اس کی کاٹ میں لٹا کر عمارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے وہ ساکت بیٹھی انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"عمو! بہت تھک گئی ہوگی۔ سو جاؤ۔" انہوں نے بوجھل پلکیں اٹھا کر عمارہ کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر یونہی انہیں دیکھتے رہے تھے اور وہ جو کل رات سے حق نواز کے دکھ میں سب کچھ بھولے ہوئے تھے یکدم سب کچھ پوری جزئیات کے ساتھ انہیں یاد آگیا تھا۔

احسان شاہ نے کیا کیا کہا تھا۔ ایک ایک لفظ دل کو کاٹنے لگا تھا۔

"عمو! یہ ہمارے ساتھ کیا ہوگیا۔ بابا جان اور شانی نے ایسا کیوں کیا ہمارے ساتھ؟"

بہت سارے آنسوؤں نے ان کے حلق میں اکٹھے ہو کر ان کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

"انہوں نے تو جو کچھ کہا۔ کہا لیکن آپ نے جو کچھ کہا وہ۔۔۔ آپ نے ایسا کیوں کہا۔ کیوں آپ نے اپنے لیے اور میرے لیے "الریان" کو شجر ممنوعہ بنا دیا۔"

عمارہ کے آنسو ان کے رخساروں پر پھسل رہے تھے اور انہیں پہلی بار اپنے الفاظ کی سنگینی کا ادراک ہوا تھا۔

"نہیں۔۔۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عمارہ کو دیکھنے لگے تھے۔ وہ اتنے غصے میں کیوں آگئے تھے۔

انہوں نے بلا سوچے سمجھے یہ کیا منہ سے نکال دیا تھا۔ دکھ بڑا تھا۔ غم بھی شدید تھا۔ جان سے زیادہ عزیز دوست نے ان پر شک کیا تھا۔ انہیں الریان میں آئندہ قدم نہ رکھنے کو کہا تھا لیکن انہوں نے ایسے الفاظ۔۔۔ بچپن میں ان کا خانساماں اکثر بیوی سے لڑتے جھگڑتے ہوئے ایسے الفاظ بولتا تھا۔ تم وہاں گئیں تو تم مجھ پر تین طلاق سے حرام۔۔۔ تم نے یہ کیا تو۔۔۔

دادا جان انہیں ایسا کہنے پر کتنا ڈانٹتے اور سمجھاتے تھے اور شاید بچپن میں سنے جانے والے یہ الفاظ ان کے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں چھپے ہوئے تھے جو غصے کی حالت میں منہ سے پھسل گئے تھے۔ اس لیے تو کہا جاتا ہے کہ بچوں کے سامنے گالی نہ دی جائے نہ کوئی غلط بات کہی جائے۔

"اب۔۔۔ اب کیا ہوگا عمو؟" وہ عمارہ کا ہاتھ پکڑے بے بسی سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ عمارہ کے رونے میں شدت آگئی تھی۔

"کیا اب ہم کبھی "الریان" میں قدم نہیں رکھ سکیں گے۔"

یہ احساس اتنا تکلیف دہ تھا کہ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگے۔ پتا نہیں کتنی دیر وہ دونوں روئے تھے۔ چپ ہوئے، ایک دوسرے کو تسلی دی، پھر رونے لگے تھے۔ رات کے دو بجے وہ اٹھے تھے اور عمارہ سے کہا تھا۔ "ایبک کا سامان رکھ لو بیگ میں۔" عمارہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ بنا کچھ پوچھے

دادی جان نہیں تھیں۔ دادا جان بھی نہیں تھے۔ وہ کس سے اپنا دکھ کہتے۔ کون انہیں اس دکھ سے نکلنے کی راہ دکھاتا۔۔۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ تب وہ عمارہ کو لے کر رات کے دو بجے شیردل کے گھر پہنچ

تھے۔ شیردل بھی رات دیر سے ہی گھر آیا تھا اور ... تک جاگ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی حق نواز کی ہی ... کر رہے تھے جب بیل ہوئی تھی۔ رات کے دو بجے عمارہ اور فلک شاہ کو دیکھ کر وہ حیران تو ہوا تھا لیکن ... نے کچھ پوچھا نہیں تھا۔ عمارہ اور فلک کی آنکھیں ... جو شدت گریہ سے سوجا ہوا تھا۔ ایک نظر ان پر ... کر وہ انہیں گیسٹ روم میں لے آیا تھا۔ اگر رات ... اس پہر وہ آئے تھے تو ضرور کوئی اہم بات ہوگی یہ شیردل سمجھ سکتا تھا لیکن اس نے کچھ پوچھا نہیں

"تم اور بھابھی آرام کرو۔ میں گرم دودھ اور سکون ... بھجواتا ہوں۔ صبح بات کریں گے۔"

"نہیں شیردل!" انہوں نے شیردل کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ کر مت جاؤ پلیز۔" وہ سسکے تھے۔ "یہاں رہو میرے پاس ورنہ یہ دیواریں مجھے پیس ڈالیں گی میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"کیا ہوگیا ہے فلک شاہ؟"

شیردل نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں نے تو اس لیے کہا تھا کہ تم ڈسٹرب لگ رہے ... ایک پرسکون نیند لے کر اٹھو گے تو آرام سے بات کرلیں گے لیکن خیر۔۔۔"

انہوں نے اپنی بیگم سے کہا کہ وہ عمارہ اور ایبک کو اندر لے جائیں اور گرم دودھ کے ساتھ انہیں سکون کی کوئی ٹیبلٹ دے دیں۔

عمارہ اندر چلی گئیں تو ایک بار پھر شیردل نے ان سے کہا تھا۔

"فلک! تم آرام کرتے صبح تک کچھ سنبھل جاتے ... بات کرلیتے۔"

"صبح۔" انہوں نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر شیردل کو دیکھا۔ "میری زندگی میں اب کیا کوئی صبح ہوگی۔ میں نے سب کچھ برباد کر دیا۔ میرے غصے نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ دادا جان کہتے تھے غصہ نہ کیا کرو موی۔ یہ غصہ تجھے کہیں نقصان نہ پہنچا دے اور ابھی دادا جان کو اس دنیا سے گئے چند ماہ بھی نہیں ہوئے اور میں نے اپنا کتنا بڑا نقصان کرلیا۔"

شیردل خاموشی سے ان کی بات سن رہا تھا۔

"میں بچپن میں ایسا نہیں تھا شیردل! لیکن جب مما مجھے اپنے ساتھ زبردستی لے گئیں تو میرے اندر بہت سارا غصہ جمع ہوگیا۔ میں کچھ کر نہیں سکتا تھا اس لیے فیروز کی طرح اس کی دیکھا دیکھی چیزیں توڑ کر اور چلا چلا کر بول کے غصہ نکالنے لگا۔۔۔ پھر جب میں واپس دادا جان کے پاس آیا تو تب بھی چھوٹی سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ تب بابا جان مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر گئے تھے بہاولپور میں نیورو سرجن تھے ڈاکٹر فرجام انہوں نے مجھے میڈیسن بھی دی تھیں۔"

شیردل نے انہیں ٹوکا نہیں تھا وہ جانتا تھا کہ وہ کسی بڑے دکھ سے گزر رہے ہیں۔

"مائرہ نے اپنی محبت کے ٹھکرانے کا بدلہ لے لیا شیردل! اس نے مجھ سے سب کو چھین لیا۔ الریان کو۔۔۔ اور احسان شاہ کو۔"

شیردل نے بہت تحمل سے ان کی ساری باتیں سنی تھیں۔

"میں بہت خود غرض ہوں نا شیردل۔۔۔! تم آج رات اپنے ماموں زاد بھائی کو دفنا کر آئے ہو اور میں اپنا دکھ لے کر تمہارے پاس آگیا لیکن میں بھی کہاں جاتا۔ میرا تو کوئی بھی نہیں ہے شیردل۔۔۔ میرے تو دادا جان کے بعد سارے رشتے الریان سے ہی تھے۔"

"اٹس اوکے یار!" شیردل نے ان کا ہاتھ تھپتھپا کر انہیں تسلی دی تھی۔ "سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ صبح دیکھتے ہیں، سوچتے ہیں۔ ہمیں کیا کرنا ہے۔"

"تم گواہی دو گے نا شیردل! احسان شاہ کے سامنے، میں نے تمہیں سب کچھ بتایا تھا نا مائرہ کے متعلق۔ وہ مجھ سے بہت بدگمان ہو گیا ہے۔"

اور شیردل نے بمشکل انہیں نیند کی گولی دی تھی اور پھر اگلے تین دن تک وہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلے

تھے۔ وہیں گیسٹ روم میں انہوں نے جیسے خود کو مقید کرلیا تھا۔ عمارہ کیسی تھی۔ ایبک کا کیا حال تھا انہوں نے پوچھا تک نہیں تھا۔ وہ عمارہ سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔ انہوں نے عمارہ سے "الریان" چھین لیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ حق نواز کے قل میں بھی نہیں گئے تھے۔ شیر دل نے واپس آکر بتایا تھا۔ کئی راوین ساتھی جنہیں حق نواز کے متعلق اب پتا چلا تھا۔ قل والے دن مسجد میں آئے تھے۔ ان میں کچھ نامانوس اور اجنبی چہرے بھی تھے لیکن یہ وہ لوگ نہیں تھے جو جنازے میں شامل ہوئے تھے۔ ایک نے تمہارے متعلق پوچھا بھی تھا۔ اچھا ہی ہوا تم نہیں گئے۔"

شیر دل کچھ الجھا ہوا تھا تب پہلی بار انہوں نے حق نواز کے متعلق پوچھا تھا۔ کہاں تھا وہ' کیسے ملا' کس نے اسے اس حال تک پہنچایا۔

"معلوم نہیں۔۔۔" شیر دل کو علم نہ تھا۔ "کچھ لوگ اسے اسپتال میں چھوڑ گئے تھے۔ وہاں ایک وارڈ بوائے اسے پہچانتا تھا۔ اسی کے محلے کا تھا اس نے ماموں کو فون کر کے بتایا تھا۔"

"اور حق نواز نے کچھ نہیں بتایا؟" انہوں نے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ اس نے صرف تمہارا پوچھا تھا اور تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ مجھے لگتا ہے وہ تمہیں کوئی خاص بات بتانا چاہتا تھا۔ یا کسی سے خبردار کرنا چاہتا تھا۔"

اور آج تک یہ علم نہیں ہو سکا تھا کہ کن لوگوں نے اسے اس حال تک پہنچایا تھا۔ بس کچھ شکوک تھے وہم تھے جن کا اظہار کرنے سے سب ہی ڈرتے تھے۔

کاش! اس رات وہ سب نہ ہوتا اور وہ حق نواز سے مل سکتے۔۔۔ پھر وہ اس کے قاتلوں کو کبھی معاف نہ کرتے۔

"وقت بدل چکا ہے فلک! سرعام کوئی تبصرہ مت کرنا۔ بہتر ہے کہ احتیاط کرو۔" انہوں نے سرہلا دیا تھا۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"اپنے آپ کو سنبھالو فلک شاہ! تم نے تین دن سے بھابھی کی بھی خبر نہیں لی۔"

"کیسے اس کا سامنا کروں شیر دل۔۔۔ کوئی حل' کوئی ترکیب بتاؤ۔۔۔ تو میں جا کر بابا جان کے پاؤں پکڑ کر ان سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ انہیں سب بتا دوں گا۔ شاید میری بات کا یقین نہ کریں لیکن وہ میرے بات کا یقین کرلیں گے۔ مروہ پھپھو میری گواہی دیں گی۔ وہ تو سب جانتی ہیں۔ میں کیوں انہیں بھول گیا تھا۔ میں ابھی فون کرتا ہوں انہیں۔"

"وہ مسئلہ تو حل ہو ہی جائے گا فلک شاہ! لیکن جو غضب تم ڈھا چکے ہو' اس کا کیا ہوگا۔۔۔ میرے علم کے مطابق تم اور عمارہ بھابھی اب کبھی 'الریان' میں نہیں جا سکتے ورنہ۔۔۔"

اور وہ جیسے یکدم ڈھے گئے تھے اور شیر دل کا ہاتھ تھامے وہ کسی ننھے بچے کی طرح رو رہے تھے۔ تب شیر دل انہیں ساتھ لے کر کئی علما کے پاس گیا۔ ان دنوں شاہی مسجد میں مفتی اعظم مولانا قاسم ہاشمی آئے ہوئے تھے۔ وہ شیر دل کے ساتھ ان سے بھی ملے تھے اور ساری صورت حال بتائی تھی۔ ہاشمی صاحب نے بہت توجہ سے ان کی بات سنی تھی اور کہا تھا۔

"جو کچھ آپ نے کہا ہے اس صورت میں اگر آپ دونوں "الریان" میں قدم رکھیں گے تو ہمارے حنفی فقہ کی رو سے طلاق واقع ہو جائے گی۔ شرعی اصطلاح میں اس مشروط طلاق کو طلاق مغلظہ کہا جاتا ہے۔ جو کہ واقع ہو جاتی ہے۔ نہ رجوع کر سکتے ہیں نہ نکاح دوبارہ ہو سکتا ہے۔"

"مفتی صاحب پلیز! کسی فقہ میں کوئی گنجائش کوئی رعایت۔" وہ گڑگڑائے تھے۔

"آپ معلوم کر سکتے ہیں۔ حیرت ہے آپ نے اتنے ایجوکیٹڈ اور سمجھ دار ہو کر اس طرح بات کی ہے۔"

"بس غصے میں پتا ہی نہیں چلا۔"

"اسی لیے تو غصے کو حرام کیا گیا ہے۔ یہ جو مسئلہ آپ لے کر آئے ہیں۔ ہمارے نچلے طبقے اور بعض اوقات نچلے متوسط طبقے میں اس طرح کی باتیں عام

معمولی سمجھ کر کہہ دی جاتی ہیں۔ لوگ نتائج کی پروا نہیں کرتے۔ اکثر مرد بیویوں سے کہہ دیتے ہیں تم بہن کے گھر گئیں تو طلاق۔ تم نے فلاں سے بات کی تو طلاق۔ کئی گھروں میں جانے کا اتفاق ہوا تو اس طرح کی باتیں سننے میں آئیں کہ میرے بھائی نے طلاقیں ڈالی ہوئی ہیں بھابھی میکے نہیں جا سکتی۔" اور پھر صلح ہو جاتی ہے گھروں میں آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس نے تو طلاقیں ڈالی ہوئی تھیں۔ یہ سب کم علمی جہالت اور مذہب سے ناآشنائی ہے۔ بلکہ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ میں نے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی بات بات پر "رن طلاق" کہتے سنا ہے۔

مفتی صاحب افسردگی سے کہہ رہے تھے اور وہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ شرمندہ اور دل گرفتہ۔

وہ بھاری دل کے ساتھ شیر دل کے گھر آئے تو تین دن کے بعد عمارہ کے سامنے ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے۔

"عمو! مجھے معاف کر دو۔ میں نے بہت ظلم کیا تم پر خود پر..... لیکن اگر تم چاہو تو الریان چلی جاؤ۔ ایبک کو بھی لے جاؤ..... میں سمجھوں گا یہ میری غلطی کی سزا ہے۔ میں تمہارے اور ایبک کے بغیر جینے کی کوشش کروں گا۔ جی سکا تو....."

وہ دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے اور ان کے آنسو ان کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ عمارہ وحشت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

"یہ..... یہ کیسی باتیں آپ کر رہے ہیں۔"

"اور کیسی باتیں کروں عمو..... میری وجہ سے "الریان" تم سے چھوٹ جائے' یہ مجھے گوارا نہیں ہے۔"

"کوئی کفارہ نہ ہوگا؟"

"نہیں کوئی کفارہ نہیں..... کوئی رجوع نہیں۔"

"تو.....؟"

عمارہ نے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو ہاتھوں میں لیتے ہوئے نرمی سے کہا تھا۔

"غلطی ہوئی ہے آپ سے مانا۔ "الریان" کے دروازے ہم پر بند ہوئے ہیں۔ "الریان" کیا ہے موئی اینٹوں اور پتھروں کی ایک چار دیواری ہی ہے نا۔ ہمارے گھر کے دروازے تو کھلے ہیں۔ بابا جان' اماں جان سب ہمارے گھر تو آ سکتے ہیں نا۔ آپ نے ایسا تو کچھ نہیں کہا تھا نا کہ۔"

"عمو! وہ آئیں گے ہمارے گھر؟" انہوں نے بچوں کی طرح پوچھا تھا۔

"کیوں نہیں آئیں گے۔ میں فون کروں گی بابا جان کو..... وہ جانتے ہیں آپ کے غصے کو بھی اور....."

"وہ مجھ سے بہت ناراض تھے عمو..... پتا نہیں کیوں۔"

"ہاں پتا نہیں مائزہ بھابھی نے انہیں کیا کہا تھا کہ وہ پریشان ہو گئے تھے آپ کے لیے۔ وہ سمجھے تھے کہ آپ کوئی جلوس وغیرہ نکال رہے ہیں۔ کہیں گرفتار نہ ہو گئے ہوں اور مائزہ بھابھی نے خوامخواہ انہیں غصہ دلایا تھا۔ وہ پریشانی میں ناراضی کا اظہار کر گئے تھے لیکن احسان بھائی..... مجھے ان کی سمجھ میں نہیں آئی وہ اس طرح آپ سے کیوں ناراض ہو رہے تھے۔ وہ کیوں کہہ رہے تھے کہ آپ کو کہ آپ "الریان" سے نکل جائیں۔"

"عمو!" ان کا سر جھک گیا تھا۔ وہ عمارہ کو نہیں بتا سکتے تھے کہ احسان شاہ ان پر شک کر رہا تھا۔ وہ یہ بتا کر پھر عمارہ سے نظریں نہیں ملا سکتے تھے۔

عمارہ نے خود ہی اندازہ لگایا تھا۔ "ضرور مائزہ بھابی نے بھڑکایا ہوگا انہیں..... پتا نہیں انہیں مجھ سے اور آپ سے اتنی چڑ کیوں ہے۔"

"چڑ' نہیں عمو! نفرت۔" ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"ہاں شاید۔" عمارہ نے کہا تھا اور اس روز اتنے دنوں بعد وہ ذرا سا پرسکون ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک "الریان" محض اینٹوں کی چار دیواری نہیں تھا۔ عمارہ کے نزدیک بھی نہیں تھا لیکن اگر "الریان" کے باسی ان سے نہ بچھڑتے تو وہ "الریان" کی جدائی برداشت کر لیتے لیکن "الریان" کے باسیوں نے ان سے ناتہ توڑ

لیا تھا..... یہ دکھ انہیں اور عمارہ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ عمارہ نے شیر دل کے گھر سے دو تین بار فون کیا تھا لیکن بابا جان' اماں جان کسی سے اس کی بات نہیں ہو سکی تھی۔

انہوں نے خود بھی ایک بار فون کیا تھا احسان کے آفس میں۔ احسان نے ان کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ وہ اس کے آفس گئے تھے۔ اس نے ملنے سے انکار کر دیا۔ کاش مصطفیٰ بھائی یہاں ہوتے یا مروہ پھپھو ہی ہوتیں۔ وہ ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ سعودیہ میں تھیں۔ تب بے حد دل گرفتہ سا ہو کر انہوں نے بہاول پور جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ شیر دل کی پوسٹنگ راولپنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے دس پندرہ دن تک چلے جانا تھا..... یوں بھی وہ اس کے گھر نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنے گھر جانا ہی تھا اور اپنے گھر جانا اور وہاں رہنا بہت تکلیف دہ تھا۔

"عمو! اس شہر میں رہ کر "الریان" سے دور رہنے کا عذاب جھیلنا بہت مشکل ہے۔ وہاں اس گھر میں آتے جاتے الریان پر نظر پڑے گی تو دل پھٹے گا۔ کیسے الریان کو اپنے لیے اجنبی ہوتا دیکھو گی عمارہ! چلو بہاول پور واپس جاتے ہیں۔" اور یوں ایک رات وہ شیر دل کے ساتھ جا کر سارا سامان لے آئے اور ملک صاحب کو گھر کی چابی دی اور آخری بار الریان کے گیٹ پر نظر ڈال کر بہاول پور آ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"بابا آپ ابھی تک یہیں ہیں۔" انجی کی آواز پر انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ "آپ نے چائے بھی نہیں پی۔ ٹھنڈی یخ ہو گئی ہے۔"

"ہاں کچھ سوچنے لگا تھا۔" انہوں نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"ضرور بابا جان کے متعلق سوچ رہے ہوں گے۔" انجی نے اندازہ لگایا تو ان کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جواد کا فون آیا تھا پوچھ رہے تھے آپ چلیں گے ایئرپورٹ وہ لے چلیں گے آپ کو اگر آپ کا دل چاہتا ہے تو۔"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا تھا۔ وہ وہاں ایئرپورٹ پر بابا جان کو دیکھ کر کیسے خود پر قابو پا سکیں گے کیسے ضبط کر سکیں گے۔

"انجی بیٹا! میں کچھ دیر آرام کروں گا مجھے میرے کمرے میں لے چلو....."

وہ بے حد تھکن محسوس کر رہے تھے۔ ماضی کی گلیوں میں چکراتے بہت سی تکلیف دہ یادوں نے انہیں نڈھال سا کر دیا تھا۔

"جی بابا.....!" انجی نے ان کی کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھا تھا۔ "آپ کے لیے اور چائے بنواؤں بابا؟"

انہیں اپنے کمرے میں لے جاتے ہوئے انجم نے پوچھا تھا لیکن انہوں نے منع کر دیا اور اپنے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موندتے ہوئے وہ ایک بار پھر ماضی میں کھو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

حسن رضا نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"یا اللہ! وہ جہاں بھی ہے۔ جس جگہ بھی ہے اسے خیریت سے رکھ اور اگر وہ مرتد ہو گیا ہے تو اسے توبہ کی توفیق عطا کر اور اس کا دل پھیر دے مولا!"

ایک آنسو ان کے پھیلے ہاتھوں پر گرا۔

"یا اللہ! تجھے تو اپنے بندے کے آنسوؤں سے پیار ہے۔ میرے آنسوؤں کی لاج رکھ لے اسے مرتد ہونے سے بچا لے۔ اسے ان آنسوؤں سے آشنا کر جو تیرے ڈر اور خوف سے بہتے ہیں۔"

اب آنسو تواتر سے ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

"یا اللہ! تو تو میرے شب و روز کا گواہ ہے۔ تو جانتا ہے میں ایک دنیادار آدمی ہوں لیکن پھر بھی میرا دل تو ہر مسلمان کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے بھرا ہے۔ سمیرا کہتی ہے مجھے اسے صفائی کا موقع دینا چاہیے تھا۔ اسے سمجھانا چاہیے تھا وہ نہ

سمجھتا پھر جو چاہے کرتا۔
زبیدہ زبان سے کچھ نہیں کہتی لیکن اس کی آنکھیں ہی سب کہتی ہیں۔ بلکہ اس کی آنکھیں تو گلہ بھی کرتی ہیں ناراضی بھی دکھاتی ہیں لیکن میں کیا کرتا۔ مجھے لگا تھا جیسے وہ مسلیمہ کذاب کا ساتھی ہے اور میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی جو مسلیمہ کذاب کی سرکوبی کے لیے نکلی تھی اور اس ادنیٰ سپاہی کے سامنے صرف مسلیمہ کذاب نہیں تھا اس کے ساتھی بھی تھے اور وہ بھی سرخروئی کا تاج سر پر پہن کر عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اے اللہ! میں ایک کمزور انسان ہوں۔ اولاد کی محبت سے مجبور باپ۔ تو نے خود ہی تو سورۃ انفال میں فرمایا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سب فتنہ ہیں۔
یا اللہ! مجھے اس طرح نہ آزما۔ اسے سیدھا راستہ دکھا۔ توبہ کا راستہ۔ میں کسی آزمائش کے قابل نہیں ہوں میرے اللہ......!
وہ کچھ دیر یونہی گڑگڑا کر دعا مانگتے رہے پھر چہرے پر دونوں ہاتھ پھیر کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا چہرہ ابھی تک گیلا تھا۔ انہوں نے جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔ جائے نماز تہہ کر کے تخت پوش پر رکھی اور وہاں تخت پوش والی دیوار پر بنے طاق سے قرآن مجید نکال کر وہیں بیٹھ کر پڑھنے لگے۔ وہ اس وقت چند صورتیں اور ایک دو رکوع ہی پڑھا کرتے تھے کیونکہ انہیں دفتر جانا ہوتا تھا۔ روزانہ کی طرح پڑھ کر انہوں نے قرآن مجید بند کیا تب ہی سمیرا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ان کے قریب آئی۔
"السلام علیکم ابو!"
"وعلیکم السلام بیٹا! جیتی رہو۔"
"آپ کے لیے چائے بنا دوں۔" اس نے پوچھا تو انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور قرآن مجید کو جزدان میں لپیٹنے لگے۔
سمیرا کچن کی طرف بڑھی۔ وہ صبح فجر کے بعد چائے پینے کے عادی تھے، لیکن جب سے احمد رضا گیا تھا وہ اکثر چائے نہیں پیتے تھے۔ سارے معمولات متاثر ہو گئے تھے۔ صرف ان کے ہی نہیں۔ اس گھر کے تینوں افراد کے۔
گیٹ پر سے اخبار والے لڑکے نے اخبار اندر پھینکا تو انہوں نے سمیرا کی طرف دیکھا۔ سمیرا کچن میں جاتے جاتے صحن کی طرف مڑ گئی اور اخبار اٹھا کر انہیں دیا۔ انہوں نے اخبار کھولا پہلے صفحے پر بالکل وسط میں خبر چھپی تھی۔
"اسماعیل کذاب کے ساتھیوں کی پریس کانفرنس۔"
انہوں نے یکدم آنکھیں بند کر لیں۔ جیسے وہ یہ خبر نہ پڑھنا چاہتے ہوں پھر ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور خبر پر نظر دوڑائی۔
"اسماعیل کے دو ساتھیوں نے پریس کانفرنس کی۔ وہ دونوں خود کو اس کا خلیفہ کہتے ہیں۔ جن میں سے ایک طیب خان ہے۔ جس کا تعلق افغانستان سے ہے جبکہ رباب حیدر پاکستانی ہے۔ کانفرنس میں اس کا ایک اور ساتھی احمد رضا بھی تھا۔"
انہوں نے دانت سختی سے ایک دوسرے پر جما لیے۔
"پتا چلا ہے کہ وہ اسماعیل خان کا خاص بندہ ہے اور صحافیوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ نعوذ باللہ اسماعیل اللہ کا پیامبر اور نبی ہے۔"
انہوں نے اخبار کو اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیا اور دانت پر دانت جمائے اسے رسّی کی طرح بل دے رہے تھے پھر یکدم انہوں نے چونکتے ہوئے اخبار کو پرے پھینکا جیسے وہ کوئی زہریلا سانپ ہو۔
لمحہ بھر وہ تخت کے کنارے پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو دیکھتے رہے پھر تیزی سے اٹھ کر کچن کی طرف آئے۔ سمیرا دروازے کی طرف پیٹھ کیے کیتلی میں ابلتے پانی کو دیکھتے ہوئے پتا نہیں کیا سوچ رہی تھی شاید اسے۔
وہ چائے بناتے ہوئے ناشتا تیار کرتے ہوئے وقفے وقفے سے کچن کے دروازے سے سر باہر نکال کر

آوازیں دیتی رہتی تھی۔
"احمد... رضی جلدی کرو... دیر ہو جائے گی..."
اور کبھی کبھی وہ سیڑھیاں اتر کر لمحہ بھر سیڑھیوں کے قریب بنے بیسن کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر آئینے میں اپنا جائزہ لیتا۔ یوں ہی بلاوجہ سنورے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے سنوارتا ہوا کچن کے دروازے پر آکر کھڑا ہو جاتا ایک ہاتھ چوکھٹ پر رکھے وہ سمیرا کے ساتھ باتیں کرنے لگتا..... پھر دونوں میں نوک جھونک ہنسی مذاق چلتا رہتا۔
سمیرا کو شاید اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا کہ اس نے مڑ کر دیکھا۔
"ابو آپ۔" وہ دروازے پر ہاتھ رکھے ساکت کھڑے تھے۔ ان کے چہرے پر پتھروں کی سی سختی تھی اور آنکھوں میں ویرانی تھی وہ جیسے کہیں خلا میں دیکھ رہے تھے۔
"ابو! کیا ہوا؟" سمیرا نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"
"ہاں!" وہ جیسے گہری نیند سے چونکے تھے۔ "اخبار والے کو کہلوا دینا آئندہ اخبار نہ لائے۔ بل کلیئر کر دینا۔"
"جی!" سمیرا حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنی بات کر کے تیزی سے مڑے تھے اور کمرے میں چلے گئے تھے۔
زبیدہ کمرے میں نہیں تھیں۔ جب سے احمد رضا گیا تھا وہ اکثر دل گھبراتا تو اٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی جاتی تھیں۔ آج بھی وہ کسی ٹائم اٹھ کر سمیرا کے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں سے کاٹتے ہوئے بیڈ پر بیٹھ گئے۔
"یا اللہ! میں اس آزمائش کے قابل نہیں تھا۔ یا اللہ مجھے حوصلہ دے۔ ہمت دے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ نہ تو جسمانی قوت ہے نہ ایمانی کہ میں اس ملعون شخص کا خاتمہ کر سکوں جس نے جھوٹا دعوا کیا اور مجھ میں یہ طاقت بھی نہیں ہے کہ میں اسے بھلا سکوں۔ وہ جو میرے گھر کا چراغ تھا۔"
انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔
"وہ یہاں میرے سینے پر سر رکھ کر سوتا تھا۔ اس کے ننھے سے سر کا بوجھ آج بھی مجھے اپنے سینے پر محسوس ہو رہا ہے۔"
"یہاں وہ مجھے پیار دیتا تھا۔"
انہوں نے ایک انگلی سے اپنا رخسار چھوا۔ "اس کی ہونٹوں کی نمی ابھی تک میرے رخسار پر موجود ہے۔
وہ یوں اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے میری عینک اتار کر اپنی آنکھوں پر لگاتا تھا..... اور پھر قل قل کر کے ہنستا تھا۔ اس کی ہنسی ابھی بھی اس کمرے میں گونج رہی ہے۔ میرے اللہ! میری مدد فرما کہ میں اسے بھول سکوں۔ اسے یاد نہ کروں۔ میں اسے اس طرح بھولنا چاہتا ہوں کہ کبھی آج کے بعد میرے لبوں پر اس کا نام نہ آئے۔ آج کے بعد میں کبھی اسے دیکھنے کی خواہش نہ کروں اور وہ مجھے کبھی نظر نہ آئے۔"
سمیرا ان کے پیچھے دروازے تک آئی تھی اور پھر ذرا سا جھانک کر انہیں خاموش بیٹھے دیکھ کر واپس برآمدے میں آئی تھی اور تخت پر پڑے مڑے تڑے اخبار کو ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے تخت پوش پر پھیلایا تھا۔
دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اخبار پر نظر ڈالی
اس کی نظریں پریس کانفرنس کی تفصیل پر تھیں۔
"احمد رضا تم نے ایسا کیوں کیا..... تم تو بہت سمجھ دار تھے۔ بہت عقلمند تھے پھر کیسے یقین کر لیا۔" اس نے اخبار کو اٹھا لیا تھا اور اب اسی طرح بل دے رہی تھی پھر اخبار کو وہیں پھینک کر آنسو روکتی ہوئی وہ ابو کے کمرے کی طرف بڑھی اور ذرا سے کھلے دروازے سے اس نے دیکھا۔ حسن رضا اسی طرح بیڈ پر بیٹھے تھے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور ان کے لبوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر کچن میں آگئی۔
"اچھی طرح رو لیں۔ شاید رونے سے دل کا بوجھ

کم ہو جائے۔ رونا تو ہے، جب تھک جائیں گے تو چپ کر جائیں گے اور جب۔۔۔ رضی یہ تم نے کیا کر دیا۔"

وہ کچن میں آکر بیٹھ گئی۔ چائے کا پانی ابل ابل کر سوکھ گیا تھا۔ سفید ہوتا پانی اس نے سنک میں پھینک کر نیا پانی رکھا۔ اور جب اس نے چائے دم دی تو اس نے دیکھا حسن رضا اپنے کمرے سے نکل کر تخت کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے چائے کپ میں ڈالی اور کچن سے باہر قدم رکھا۔ حسن رضا ہولے ہولے اخبار کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے۔ مڑا تڑا اخبار جو تخت کے کونے پر بل دی ہوئی رسی کی طرح پڑا تھا۔ اٹھا کر تخت پر پڑے گول تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ سمیرا نگاہیں جھکائے تخت پر بیٹھے حسن رضا کے قریب آئی اور چھوٹی سی ٹرے تخت پر رکھی۔

"ابو! چائے۔" اس نے ان کی طرف نہیں دیکھا تھا اسے لگا تھا وہ اگر ان کی طرف دیکھے گی تو اس کا ضبط جواب دے جائے گا۔ وہ ان کے اس شکست خوردہ اور مایوس اور بے بس چہرے کو نہیں دیکھ سکے گی۔ سو وہ ان کی طرف دیکھے بغیر ٹرے رکھ کر واپس مڑ گئی تھی۔

بہت دیر وہ یونہی کچن میں بیٹھی رہی تھی پھر اسے خیال آیا کہ زبیدہ کب سے جاگ رہی تھیں اس نے انہیں چائے نہیں دی اور نہ ہی ناشتہ بنایا ہے۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ لیکن رو نہیں پا رہی تھی اس نے فریج سے ڈبل روٹی اور انڈے نکالے۔ تب ہی حسن رضا نے اسے آواز دی۔

"سمیرا بیٹا! دروازہ بند کر لو۔"

"ابو!" وہ تیزی سے کچن سے باہر نکلی "میں ابھی ناشتا لا رہی ہوں۔"

"میرا جی نہیں چاہ رہا۔" اس کی طرف دیکھے بغیر انہوں نے قدم صحن میں رکھ دیے تھے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں؟" وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی گیٹ تک آئی تھی۔

"دفتر جا رہا ہوں۔"

"لیکن ابھی تو صرف سات بجے ہیں۔"

"ہاں آج کچھ جلدی جانا ہے۔"

اس نے ان کے کوٹ کی جیب سے جھانکتے اخبار کو دیکھا۔ وہ باہر نکل گئے وہ کچھ دیر یونہی گیٹ کے پاس کھڑی رہی۔ پھر سر جھٹک کر پلٹی۔ تخت پوش کے پاس آکر اس نے ٹرے کی طرف دیکھا۔ چائے کا کپ ایسے ہی پڑا تھا۔ حسن رضا نے چائے نہیں پی تھی۔ اسے ان پر بے حد ترس آیا۔ میرا سیدھا سادہ شفیق باپ۔ رضی! تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ بالکل اچھا نہیں کیا رضی! ہمارے ساتھ، اپنے ساتھ۔ اس کی جلتی ہوئی آنکھوں میں نمی پھیل گئی اور وہ رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

رونے سے زندگی کے مسائل حل نہیں ہوتے اور اگر حل ہو سکتے تو احمد رضا اس وقت دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہوتا لیکن وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے صوفے پر بیٹھا تھا۔ رچی جا چکا تھا مگر اس کی انگلیوں کی چبھن اب بھی اسے اپنے کندھوں پر محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس کی وہ سرد، بے مہر آواز اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اس کے بالکل قریب آکر اور اپنی سخت انگلیاں تقریباً" اس کے کندھوں میں چبھوتے ہوئے اس نے اپنی بات دہرائی تھی۔

"یہ سب تم نے ہی کہا تھا احمد رضا۔۔۔ پندرہ سولہ صحافیوں کی موجودگی میں اور اب تم اس سے مکر نہیں سکتے۔"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ سب بکواس جو اس اخبار میں لکھی ہے میں وہ نہیں کہہ سکتا۔ میں ایک سچا مسلمان ہوں۔"

"اچھا!" رچی یونہی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے تمسخر سے مسکرایا تھا۔ "کیا تم مجھے ایک سچے مسلمان کی تعریف بتاؤ گے۔"

اور اس کی نظریں جھک گئی تھیں۔ وہ یہاں اپنے شب و روز بغیر کسی رشتے کے الوینا کے ساتھ بسر کر رہا تھا اس نے ان سارے دنوں میں ایک بار بھی خدا کے سامنے سر نہیں جھکایا تھا۔

"ہاں بولو نا۔"

اس نے اپنی انگلیاں اس کے کندھوں میں چبھوئیں۔

"میں اس تعریف پر پورا نہیں اترتا۔ میں جانتا ہوں۔"

وہ بولا تو اس کی آواز کمزور تھی۔

"لیکن میں نے کلمہ طیب پڑھا ہے اور میں اس پر یقین رکھتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں۔"

"چلو مان لیا۔ ایسا ہی ہے۔" رچی نے اس کے کندھوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر سے منوں بوجھ ہٹ گیا ہو۔

"لیکن تم نے تو اپنی زبان سے ان اتنے صحافیوں کے سامنے جو کچھ کہا وہ یہاں اس اخبار میں موجود ہے۔ اور اس ایک اخبار میں نہیں کئی اخباروں میں۔"

اس نے اپنے حلق کو خشک ہوتے محسوس کیا اور بے بسی سے رچی کی طرف دیکھا۔

"تم یقین کرو رچی! میں نے ایسا کچھ نہیں کہا اور میں ایسا کیسے کہہ سکتا ہوں۔ جب میں ایسا سمجھتا ہی نہیں۔ میں حضرت صاحب کو اللہ کا ایک نیک بندہ سمجھتا ہوں اور۔۔۔ ہاں یہ بات تو شاید رباب حیدر نے کہی تھی یا پھر طیب خان نے، میں نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔"

"اور انہوں نے کیا کچھ غلط کہا تھا۔ نہیں ناں، تب ہی تم نے ان کی تائید میں ان کی بات دہرائی تھی۔"

وہ الجھی الجھی نظروں سے رچی کو دیکھنے لگا تھا۔

"ہو سکتا ہے تم ایسا نہ سمجھتے ہو ایسا نہ کہنا چاہتے ہو۔" رچی نے آواز میں نرمی پیدا کی تھی۔

"لیکن تم شاید نشے میں تھے۔"

"لیکن وہ تو شراب طہور تھی۔" وہ ہکلایا۔

"کبھی کبھی شراب طہور بھی نشہ کر دیتی ہے۔ رچی نے قہقہہ لگایا۔

"بہرحال میں ایک کرسچین ہوں لیکن میں بھی سمجھتا ہوں کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے لیکن یہ۔"

اس نے اخبار کی طرف اشارہ کیا۔

"اس میں جو کچھ لکھا ہے تم اسے جھٹلا نہیں سکتے۔"

"میں ابھی اس اخبار کے آفس میں فون کر کے تردید چھپواتا ہوں۔ میں اعتراف کر لوں گا کہ خمار کی حالت میں میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا تھا لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں۔۔۔" رچی نے پہلو بدلا تھا۔

"احمق آدمی! تم اپنے ملک کے لوگوں کو نہیں جانتے ہو۔ ایسے معاملوں میں وہ پاگل ہو جاتے ہیں۔ مرنے مارنے پر تیار۔ وہ تمہاری اور اسماعیل خان کی جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ ایک اخبار میں معمولی سی ایک تردید چھپ بھی گئی تو کتنے لوگوں نے اسے پڑھنا ہے۔ وہ ہزاروں لوگ جو اس خبر کو پڑھ چکے ہیں۔"

اسے ہزاروں لوگوں کی پروا نہیں تھی بھلے کروڑوں لوگ پڑھ لیتے لیکن ایک شخص وہ خبر نہ پڑھتا۔

اسے صرف ایک شخص کی پروا تھی۔ جو اس کا باپ تھا۔

اسے صرف ان دو عورتوں کی پروا تھی جن میں سے ایک اس کی ماں اور ایک بہن تھی۔ بھلے ساری دنیا پڑھ لیتی بس یہ تین لوگ نہ پڑھتے۔ رچی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ رچی کیوں آیا تھا۔۔۔ کیا صرف یہی بتانے۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھامے بیٹھا تھا۔ جب الوینا اندر آئی تھی۔

"احمد۔۔۔" الوینا نے اسے بلایا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر آج اس کی آنکھوں میں کوئی چمک پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی، خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ اس بات پر یاسمین اپنے جیٹھ، جٹھانی سے بھی شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جبکہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایازاد، اجلال رازی سے ہوچکی ہے جو اعلا تعلیم کے لیے امریکہ گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلتا ہے تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوجاتی ہے اور اجلال سے منگنی بھی توڑدیتی ہے۔ اجلال تعلیم مکمل کرکے واپس آتا ہے تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلتا ہے۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی روکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خودسر ہوتی جارہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر سب کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔ مگر سارہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کرتی۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے۔ کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔



تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کرلیتا ہے۔
شمشیر، تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے اسپتال داخل کروادیتا ہے۔

اریبہ، یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے، مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کردیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی، اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نازیبا گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہوتی ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد اسے ریک سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہتے ہیں۔ بعد میں انہیں پتا چلتا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

وہ شمشیر پر رقم چوری کا الزام لگاتے ہیں تو وہ پریشان ہوجاتا ہے۔ اریبہ، ماں کی اصلیت جان کر بالکل بدل جاتی ہے اور مضطرب رہنے لگتی ہے۔

رازی، اریبہ سے ملنے جاتا ہے تو اریبہ اس کی باتیں سن کر کچھ الجھ سی جاتی ہے۔
تاجور کو اسپتال سے باہر روتے دیکھ کر اریبہ اسے اپنے ساتھ گھر لے آتی ہے۔
توصیف احمد کے سابقہ چوکیدار الیاس کی نشاندہی پر شمشیر کی بے گناہی ثابت ہوجاتی ہے۔ وہ رہا ہو کر دل گرفتہ سا اسپتال جا کر تاجور کا معلوم کرتا ہے۔ مگر اسے صحیح معلومات نہیں مل پاتیں۔ اسپتال کا چوکیدار فضل کریم اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ وہاں سے شمشیر اپنے گاؤں جاتا ہے۔ مگر ابا کو تاجور کی گمشدگی کے بارے میں نہیں بتاتا۔ تاباں کی شادی ہوجاتی ہے۔ تاباں کو دیکھ کر شمشیر پچھتاتا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اپنے ساتھ چلنے کا کہتا ہے۔ مگر تاباں منع کردیتی ہے۔

یاسمین، اریبہ کی جلد از جلد شادی کرنے کی فکر میں پڑجاتی ہے۔ مگر اریبہ دوٹوک انداز میں منع کردیتی ہے۔ یاسمین چالاکی سے اپنے گھر تمام رشتے داروں کو دعوت پر مدعوت کرتی ہے۔ اجلال مضطرب سا دعوت میں شریک ہوتا ہے۔ اسے دیکھ کر اریبہ مزید الجھن کا شکار ہوتی ہے۔

بلال اسٹڈی کے لیے امریکہ چلا جاتا ہے۔ اجلال، اریبہ سے محبت کا اظہار کرتے کرتے اچانک گریزاں ہوجاتا ہے۔ اجلال بے حد نادم ہوتا ہے۔ سارہ اسے سب کچھ بھولنے کا کہتی ہے۔ وہ ڈھکے چھپے لفظوں میں سمیر سے بات کرتی ہے۔ مگر اس کی طرف سے سخت جواب ملتا ہے۔ شمشیر کو اسپتال میں اریبہ نظر آجاتی ہے۔ وہ اس سے شدید نفرت محسوس کرتا ہے اور کالج سے واپسی پر اسے اغوا کرلیتا ہے۔

اریبہ کے اغوا ہوجانے پر سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ اجلال ساجدہ بیگم سے کہہ دیتا ہے کہ اب وہ اریبہ سے شادی نہیں کرے گا۔ شمشیر اریبہ سے تمیز سے پیش آتا ہے۔ کچھ دن بعد اریبہ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے شمشیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔
شمشیر علی کو اریبہ اچھی لگنے لگتی ہے۔ وہ اریبہ سے گریز کرنے لگا۔ شمشیر علی، اریبہ کو اپنا سیل فون دے دیتا ہے کہ وہ جس سے چاہے رابطہ کرلے۔

۔۔۔۔ ۱۶ ۔۔۔۔
سولہویں قسط

شمشیر علی تاباں کے دیکھنے سے قدرے گڑبڑا گیا تھا۔
"میرا میاں مجھے کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگانے دیتا۔ روٹی بھی خود پکا کے کھلاتا ہے مجھے۔" تاباں اسے چڑانے والے انداز میں بولی تھی۔
"وہ تو تمہیں دیکھ کر ہی لگ رہا ہے۔ سامنے چاچا خیرو کی موٹی بھینس ہے ناں۔ ویسی ہوگئی ہو۔" شمشیر علی نے جل کر اس کے موٹاپے کو نشانہ بنایا تھا۔
"کیوں نہ ہوں، کھاتے پیتے گھر کی ہوں پھر خوش رہتی ہوں۔ تیری طرح جلتی کڑھتی نہیں۔" تاباں اب لڑنے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ "بڑا آیا مجھے موٹی بھینس سے ملانے والا۔ اپنے آپ کو تو دیکھ۔"
"او ہو تاباں! کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ بھائی مذاق کررہے ہیں۔" تاجور نے پریشان ہو کر تاباں کو خاموش کرانے کی کوشش کی۔
"مذاق کررہا ہے۔ سنبھا کے رکھ اسے۔ مجھے نہیں اچھے لگتے ایسے مذاق۔" تاباں روٹھے انداز میں بولی تھی۔
"اور کیسے مذاق اچھے لگتے ہیں تمہیں۔ ذرا وہ بھی بتادو۔" وہ پھر چھیڑنے سے باز نہیں آیا۔
"ہونہہ!" تاباں نے ناک سکیڑ کر چہرہ دوسری طرف موڑتے ہوئے ناراضی کا اظہار کیا تھا۔
"بھائی، اب آپ کچھ نہیں کہنا۔" تاجور نے اس کی منت کی۔
"اچھا جاؤ، چائے ناشتے کا انتظام کرو پھر ہمیں جانا بھی ہے۔" وہ تاجور سے کہتے ہوئے صحن میں اتر گیا اور ہینڈ پمپ چلا کر منہ دھونے لگا۔ پھر جب منہ پر صابن لگایا تو ہینڈ پمپ خود ہی چلنے لگا۔ اس نے پہلے دھیان نہیں دیا لیکن پھر منہ پر پانی کا چھپاکا مارتے ہی چونکا تھا۔ ہینڈ پمپ چلاتے ہوئے چوڑیوں کی کھنک اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ پانی کی موٹی دھار کے نیچے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر جیسے بھول گیا تھا۔
"اتنی جلدی کیوں جارہے ہو؟" تاباں نے دھیرے سے پوچھا تھا۔
"بس اب یہاں دل نہیں لگتا۔" اس نے کہہ کر ہاتھوں کے پیالے سے پانی اپنے منہ پر اچھالا تھا۔
"کہیں اور دل لگالیا ہے کیا؟" تاباں اگر چھیڑنے والے انداز میں پوچھتی تو شاید وہ اعتراف کرلیتا۔ لیکن اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔
"ابھی تو نہیں لیکن سوچ رہا ہوں، کہیں دل لگا ہی لوں۔" اس نے کہا تو وہ بے ساختہ بولی تھی۔
"ہٹ کملے! سوچنے سے تھوڑی دل لگتا ہے۔"
"پھر....؟" وہ گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔
"آپ ہی آپ لگ جاتا ہے۔ پتا بھی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا ہے پھر دل اپنا نہیں ہوتا۔ پرایا ہو کر بڑے دکھ دیتا ہے۔" وہ جانے کس خیال میں کھوئی تھی۔ چونکی تو اسے گھور کر بولی۔
"لے ایسے انجان بن رہا ہے جیسے تجھے پتا ہی نہیں۔ پکا بے ایمان ہے تو۔"
وہ ہنستے ہوئے تار سے تولیہ کھینچ کر اندر چلا آیا۔
"تاج! شہر جاتے ہی اپنے بھائی کی شادی کرادینا۔" تاباں اسے سناتے ہوئے جارہی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دروازے سے باہر جاتی تاباں پر الوداعی نظر ڈالی تھی۔



اجلال رازی نوٹ کررہا تھا کہ ساجدہ بیگم جب سے توصیف ولا سے ہو کر آئی تھیں، پریشان اور اپ سیٹ تھیں۔ پہلے تو وہ اسی انتظار میں رہا کہ وہ خود ہی بتائیں گی کہ وہاں کیا باتیں ہوئیں لیکن جب دیکھا کہ وہ توصیف ولا

کے ذکر سے ہی کترا جاتی ہیں تب اس سے رہا نہیں گیا اور اس وقت فرصت سے ان کے پاس آ بیٹھا تھا۔

"ہاں اب بتائیں امی! آپ کو کیا بات پریشان کر رہی ہے؟" اس نے بیٹھتے ہی بلا تمہید پوچھا تھا۔

"میں اب صرف اپنے بچوں کے لیے پریشان ہوں اور کوئی بات نہیں ہے۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"میرے حساب سے جب تم امریکا سے آئے تھے' اسی وقت تمہاری شادی ہو جانی چاہیے تھی۔ خیر اب بتاؤ۔ تم نے کیا سوچ رکھا ہے۔ اپنا نہیں تو بہن کا تو سوچو' اس کے لیے جو ایک دو رشتے آئے تھے وہ تمہیں پسند نہیں آئے۔ بس رازی! بہت ہو گیا۔ میں اب جلد ثنا کی شادی کرنا چاہتی ہوں اور ساتھ میں تمہاری بھی۔" ساجدہ بیگم اچانک پھٹ پڑی تھیں۔

"بالکل کریں' کس نے منع کیا ہے۔" وہ ساجدہ بیگم کا غصہ کم کرنے کے لیے فوراً" کہہ گیا۔

"کس نے منع کیا ہے۔ تم لوگوں کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ بس اب میں تم لوگوں سے نہیں پوچھوں گی' کل ہی ملنے جلنے والوں سے بات کروں گی۔ متبادل رشتہ مل جائے تو اچھا ہے۔" ساجدہ بیگم کی آخری بات پر وہ اچھل پڑا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں امی! آپ صرف ثنا کے رشتے کی بات کریں۔"

"اور تم....؟" ساجدہ بیگم نے کڑے تیوروں سے اسے دیکھا تھا۔

"میں....!" وہ گڑبڑا گیا۔ "میرا مطلب ہے میں پسند کر چکا ہوں۔"

"کون ہے؟" ساجدہ بیگم کا انداز ہنوز تھا۔

"بتاؤں گا' ثنا کی بات ہو جائے تو پھر میں بھی بتا دوں گا۔"

"میں کہہ رہی ہوں رازی! میں تم دونوں کی ساتھ ہی شادی کروں گی۔"

"ایسا ہی کر لیجئے گا امی! ناراض کیوں ہو رہی ہیں۔" وہ ساجدہ بیگم کے کندھے دبانے لگا تو پھر زیادہ دیر ساجدہ بیگم ناراض نہیں رہ سکیں۔ بولیں تو کچھ نہیں لیکن ان کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا تھا۔ تب وہ دھیرج سے پوچھنے لگا۔

"آپ کو غصہ کس بات پر ہے امی؟" ساجدہ بیگم نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

"بتائیں نا امی! جب سے آپ چچا جان کے گھر سے ہو کر آئی ہیں۔ میں آپ کو پریشان دیکھ رہا ہوں' یاسمین آنٹی نے کچھ کہا یا اریبہ نے؟"

"تمہارا وہم ہے۔ وہاں کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ ہاں امینہ نے یاسمین سے کہا تھا کہ اب وہ جلدی بیٹیوں کی شادی کر دے۔" ساجدہ بیگم نے اس بات کو سرسری بیان کیا پھر بھی وہ ٹھٹکا تھا۔

"پھر یاسمین آنٹی نے کیا کہا؟"

"کیا کہتی۔ اس نے جس طرح مجھے دیکھا تھا۔ میں پریشان ہو گئی۔ بیٹا! یہ ٹھیک ہے کہ میں خود بھی اریبہ سے تمہاری شادی کے حق میں نہیں ہوں لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ ہمارے مابین رنجش پیدا ہو نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ یاسمین تمہاری آس پر اریبہ کو بٹھائے رکھے۔ یہ رشتہ ہم اپنے طور پر ختم کیے بیٹھے ہیں' وہاں بات نہیں پہنچی۔ گو کہ امینہ کی بات سے یاسمین سمجھ تو گئی ہو گی پھر بھی وہ ہم سے تصدیق ضرور چاہے گی۔" ساجدہ بیگم دل گرفتی سے بول رہی تھیں۔

"بیٹا! میں خود بیٹی کی ماں ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں توصیف سے کیا کہوں اور کیسے کہوں گی۔ سچ کہوں تو مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔ امینہ کے ذریعے کہلوا دوں توصیف کو؟" آخر میں انہوں نے سوالیہ نظروں سے رازی کو دیکھا تو وہ جو اندر اٹھتی ٹیسوں کو دبانے کی سعی میں ہونٹ بھینچے بیٹھا تھا' آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔

"پھر؟" ساجدہ بیگم کے صرف ہونٹ ہلے تھے۔

"آپ بہت زیادہ سوچنے لگتی ہیں امی! اتنی ٹینشن نہ لیا کریں۔ آخر میں کس مرض کی دوا ہوں۔ نادان' نا سمجھ نہیں ہوں۔ کسی طریقے سے میں خود ہی یہ معاملہ نمٹا دوں گا' آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

وہ بہت دیر تک انہیں تسلی دیتا رہا تھا پھر جب اپنے کمرے میں آیا تو اس کا اپنا ہی دل احتجاج کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ اپنی پرانی ڈگر پر چلنے لگی تھی۔ صبح کالج پھر اسپتال جہاں سے تین چار بجے اس کی واپسی ہوتی تھی تو گھنٹہ بھر آرام کے بعد شام تک وہ یاسمین اور سارہ کے ساتھ رہتی۔ پھر اب وہ کچن میں خواہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی بی بی کا ہاتھ ضرور بٹاتی تھی اور اس نے سالن بہت اچھا بنایا تھا۔ اس لیے اس وقت سارہ نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"کیا وہاں تم سے کھانا پکوایا جاتا تھا!"

"ہاں صرف کھانا ہی نہیں جھاڑو پونچھا بھی کرتی تھی۔" وہ ہنس کر بولی تھی۔

"واقعی......"

"ہاں۔ سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا کتنے آدمیوں کا کھانا پکاتی تھیں؟" سارہ نے تجسس سے پوچھا۔

"صرف دو۔" وہ روانی میں کہہ کر سٹپٹا گئی۔ "میرا مطلب ہے اور لڑکیاں بھی تھیں ناں تو سب کو کام سے لگائے رکھنے کی خاطر وہ ہر ایک لڑکی سے دو آدمیوں کا کھانا پکواتے تھے۔"

"کسی خاص ڈش کی فرمائش بھی ہوتی تھی؟" سارہ نے مزید پوچھا تو اب وہ قصداً" چڑ کر بولی۔

"کیا فضول باتیں لے کر کھڑی ہو گئی ہو' چلو جاؤ۔"

"اور جو تم یہاں کھڑی ہو' تمہیں جانا نہیں ہے کیا۔ رازی بھائی پندرہ منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔" سارہ نے جاتے جاتے یاد دلایا تھا۔

"اف! میں تو بھول ہی گئی تھی۔"

وہ چولہا بند کر کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی تھی اور جب تک وہ تیار ہوئی رازی بھی آ گیا۔ اس نے یاسمین کو جب رازی کا فون آیا تھا تب ہی بتا دیا تھا کہ رازی اسے آؤٹنگ پر لے جانا چاہتا ہے اور یاسمین کی اجازت سے ہی رازی سے ہامی بھری تھی۔ ابھی بھی پہلے اس نے یاسمین کے کمرے میں جھانک کر اپنے جانے کا بتایا پھر باہر آئی تھی۔

رازی نے اسے دیکھتے ہی گاڑی کا دروازہ کھولا تو ایک پل کو اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا پھر یوں خاموش ہو گیا جیسے اب کبھی نہیں دھڑکے گا۔

"کیا ہوا....؟" رازی کو اس کا رکنا محسوس ہوا تھا' فوراً" اسے دیکھا تو وہ آہستہ سے نفی میں سر ہلا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔

"تمہیں آنے میں دیر تو نہیں ہوئی؟" رازی نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔۔۔ گاڑی کے اندر خاموشی نے ڈیرا جما لیا جبکہ باہر بلا کا شور تھا۔ ٹریفک کے اژدحام سے نکلنے میں گھنٹہ بھر لگ گیا اور جب وہ ساحل پر بنے سنگی بینچ پر بیٹھے' سورج سرخی مائل نارنجی لبادہ اوڑھ چکا تھا۔ اریبہ کی نظریں اس نارنجی گولے پر ٹھہر گئیں جو دھیرے دھیرے سمندر میں اتر رہا تھا۔ رازی سوچ رہا تھا کہ بات کیسے اور کہاں سے شروع کرے کہ اریبہ نے دھیرے سے اسے پکارا تھا۔

"رازی.....!"

"ہوں.....!" وہ اپنی ہی آواز پر چونکا تھا۔

"ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں تم سے، مجھے صرف ہاں یا ناں میں جواب دینا۔ کوئی سوال مت کرنا۔" وہ ہنوز ساکت بیٹھی سامنے نظریں جمائے بولی تھی۔

رازی اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے خود ہی قیاس کرنے لگا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتی ہے۔ جب سمجھ نہیں پایا تو کچھ سوچ کر خود بھی شرط رکھ دی۔

"تم بھی سوال مت کرنا۔"

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی، پھر ذرا سا اثبات میں سر ہلا کر پکار کر پوچھنے لگی۔

"رازی! کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" رازی نے یکدم نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر خود کو سوال کرنے سے روکا تھا ورنہ پوچھنے جا رہا تھا۔ "اب بھی سے کیا مطلب؟"

"بتاؤ رازی! کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟" اس نے پھر پوچھا۔

"ہاں، لیکن کروں گا نہیں۔" ہاں اور نہیں کے درمیان بس ایک پل کا فاصلہ تھا۔ زندگی اس نارنجی گولے کی مانند آخری ہچکی لے کر گہرے پانیوں میں اتر گئی تھی۔

"تم بھی کیا بس بجھے جاؤ گی؟" کوئی اس کے کان میں دھیرے سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا چیخ کر کہے "نہیں" اور پھر رازی کو جھنجوڑ کر پوچھے۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں؟" لیکن ادھر سے بھی سوال نہ کرنے کی شرط تھی۔ وہ اٹھنے کے لیے اپنی توانائیاں مجتمع کرنے لگی۔

رازی کا حال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس نے خود اپنے اجڑنے کا سامان کیا تھا۔

"سنو.....!" کتنی دیر بعد رازی کی بوجھل آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ "میں جانتا ہوں اریبہ! کتنے سوال تمہارے ذہن کی دیواروں سے سر پٹخ رہے ہیں اور میں یہ نہیں کہوں گا کہ میرے پاس جواب نہیں ہے۔ ہر بات کا جواب ہے لیکن مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم خاموشی سے الگ ہو جائیں۔ شاید محبت کا بھرم رہ جائے۔"

"محبت؟" اریبہ کے ہونٹوں نے بے آواز جنبش کی تھی۔

"ہاں میرے دل کا ہر ہر گوشہ ابھی بھی تمہاری محبت سے آباد ہے۔ اس میں کبھی کمی نہیں ہوئی اور محبت تو امتحان لیتی ہی ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ہمیں کسی بڑے امتحان میں ڈال کر خود کہیں دور نکل بھاگے کیوں نہ ہم اسے یہیں دفن کر دیں۔ کبھی کبھی اس کے مزار پر پھول چڑھانے آجایا کریں گے یا پھر پلٹ کر دیکھیں گے بھی نہیں۔" وہ ٹوٹ کر بول رہا تھا۔ اریبہ کا دل چاہا اپنے کان بند کر لے لیکن اس میں اپنے ہاتھ اٹھانے کی سکت بھی نہیں تھی۔

"اور سنو!" قدرے تاخیر سے وہ پھر بولنے لگا۔ "میں چاہتا ہوں ہماری منگنی ٹوٹنے کا اعلان تمہاری طرف سے ہو۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں الزام تمہارے سر رکھنا چاہتا ہوں بلکہ۔"

"بس، بس کرو رازی! خاموش ہو جاؤ۔" وہ ایک ہاتھ سے اپنا چہرہ ڈھانپتے ہوئے بولی تھی۔

رازی نے اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر آنکھیں بند کر لیں۔ وہ کرب کی جانے کن منزلوں سے گزر رہا تھا۔ خاموشی ایک بار پھر دیوار بن گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اریبہ جب گھر آئی تو اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور یہ بھی اچھا ہوا کہ اس وقت یاسمین اور سارہ بھی عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں آتے ہی واش روم میں بند ہو گئی۔ وہ رونا چاہتی تھی۔ چیخ چیخ کر رونا چاہتی تھی لیکن آنسوؤں نے دل کا راستہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے آئینے میں اپنا دھواں دھواں چہرہ دیکھا تو اسے خود پر ترس آیا۔ تو وہ جلدی جلدی منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر واش روم سے نکل آئی۔

سارہ نماز کا دوپٹہ تہہ کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ پوچھنے لگی۔

"کیسی رہی آج کی شام.....؟"

"یادگار.....!" اس کے اندر کا سناٹا اچانک چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ "کوئی ہنسا نہ رویا اور فیصلہ ہو گیا۔"

"کیسا فیصلہ!" سارہ ٹھٹکی۔

"میں نے اور رازی نے ایک دوسرے کو اپنی محبت سے آزاد کر دیا ہے۔ ٹھیک کیا ناں؟" اس نے تصدیق کے لیے سارہ کو دیکھا۔ وہ سانس روکے کھڑی تھی۔

"ہاں سارہ! یہی ٹھیک ہے۔ میں بار بار ٹوٹ رہی تھی۔ پھر میں نے سوچا جس بندھن کی وجہ سے میں بار بار ٹوٹ رہی ہوں میں اس بندھن کو ہی کیوں نہ توڑ ڈالوں اور میں نے توڑ دیا۔ اب درد تو ہو رہا ہے لیکن اس اذیت سے کم جو مجھے تائی امی اور پھپھو کے رویے سے ملی تھی۔"

"رازی بھائی نے احتجاج نہیں کیا؟" سارہ نے سناٹے میں پوچھا تھا۔ اریبہ سے فوری جواب نہیں بن پڑا تو یوں بن گئی جیسے اس نے سنا ہی نہیں۔

"ضرور کیا ہوگا رازی بھائی نے ضرور احتجاج کیا ہو گا۔" سارہ نے یکدم چیخ کر اریبہ کو بازو سے کھینچا تھا۔ "کیا تھا ناں؟"

"نہیں۔" جیسے کائنات تھم گئی تھی۔ کتنی دیر بعد اسے اپنے بازو پر سارہ کا ہاتھ سرکتا محسوس ہوا تو اس نے جھرجھری لی تھی۔

"تم ہرٹ ہوئی تھیں؟" سارہ ہنوز سناٹے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں مان ٹوٹ گیا نا..... لیکن اچھا ہی ہوا پتا چل گیا۔ رازی بھی عام سا مرد ہے۔ سطحی سوچ رکھنے والا۔ وہ اپنی ساری زندگی ایک ایسی لڑکی کو دان نہیں کر سکتا جس کی پارسائی مشکوک ہو۔" وہ بولتے ہوئے سارہ کی طرف سے رخ موڑ گئی، پھر ایک دم پلٹی تھی۔

"لیکن تمہیں کیوں افسوس ہو رہا ہے۔ تمہارے خیال میں تو رازی میرے قابل نہیں تھا۔ ہے نا..... یا تم نے مجھے بہلانے کی کوشش کی تھی۔"

"ان ساری باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے اریبہ! رازی بھائی نے تم سے محبت کی ہے۔" سارہ عاجز ہو کر بولی۔

"میں نے بھی رازی سے محبت کی ہے۔ میری اولین محبت، میری آنکھوں میں سجنے والا پہلا خواب۔ جس کی قسمت میں شرمندہ تعبیر ہونا نہیں لکھا گیا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"کتنی عجیب بات ہے۔ ہم ناکامیوں کو قسمت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ مل گیا تو ہمارا کمال، نہیں ملا تو قسمت خراب، جب پانے پر شکر نہیں تو کھونے پر شکوہ کیوں۔" وہ رکی، چونکی پھر حیران ہوئی۔

"ارے! مجھے شاید زندگی کا فلسفہ سمجھ میں آ رہا ہے۔"

"نہیں تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ پاگل ہو رہی ہو تم۔ تمہیں خود نہیں پتا تم کیا کہہ رہی ہو کیونکہ تم خود کو بہت بہادر پوز کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مت کرو ایسی فضول کوششیں۔ محبت کی چوٹ چھپائے نہیں چھپتی۔ میں دیکھ رہی ہوں تمہارے اندر محشر برپا ہے تو تم بھی کر دو محشر برپا۔ کچھ باقی نہ بچے۔" سارہ پھٹ پڑی تھی۔

"تو ابھی کیا بچا ہے؟" اریبہ یکدم ڈھے گئی پھر یوں ٹوٹ کے روئی کہ سارہ کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شمشیر علی تاجور کو اپنے ساتھ واپس لے آیا تھا۔ اب اس کے اندر پہلے کی طرح یہ خوف نہیں تھا کہ سارا دن تاجور اکیلی کیسے رہے گی۔ شاید اس لیے کہ اب اسے گھر کے ساتھ گھر والوں کا تعاون بھی حاصل تھا۔ پھر سال بھر تاجور اریبہ کے گھر رہ کر کافی سمجھ دار بھی ہو گئی تھی۔ شہری طور طریقے بھی سیکھ گئی تھی۔ پھر بھی وہ اسے سمجھا رہا تھا۔

"دیکھو تاجور! تمہیں گھر میں سارا دن اکیلے رہنا ہو گا اس لیے احتیاط کرنا۔ کسی کے بھی آنے پر بے دھڑک دروازہ مت کھول دینا۔ پہلے پوچھ کر پورا اطمینان کر لینا۔ ویسے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے دیکھا ہے یہاں اچھے لوگ رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تمہاری بھی دوستی ہو جائے گی پھر تمہارا یہاں دل لگ جائے گا۔"

"میرا دل لگ گیا ہے بھائی!" مجھے یہ گھر اچھا لگ رہا ہے پھر سارہ اور اریبہ باجی بھی تو میرے پاس آئیں گی ناں۔" تاجور نے کہا تو وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"پتا نہیں۔"

"مجھے پتا ہے۔ وہ دونوں مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔ جب انہیں پتا چلے گا کہ میں واپس آگئی ہوں تو وہ ضرور آئیں گی۔ بھائی! آپ بھی مجھے ان کے گھر لے جائیں گے ناں۔ بی بی سے ملنے تو مجھے وہاں جانا پڑے گا۔"

"بی بی کون؟ اریبہ کی امی؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"نہیں بی بی اریبہ باجی کے گھر کچن کا سارا کام کرتی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے قرآن شریف پڑھایا ہے اور مزے مزے کے کھانے بنانے بھی سکھائے ہیں۔ بہت اچھی ہیں بی بی۔" تاجور کے لہجے میں توصیف ولا کے مکینوں کے لیے انسیت چھلک رہی تھی۔

"اور کون کون رہتا ہے وہاں؟" شمشیر علی کو اب دل نے اکسایا تھا۔

"اور بس اریبہ باجی کی امی اور ایک بھائی ہے اور ان کے ابا دوسری بیوی کے گھر رہتے ہیں۔" تاجور نے بتایا تو وہ اچھلا تھا۔

"کیا اریبہ کے ابا نے دو شادیاں کی ہیں؟"

"آپ کو نہیں پتا؟" تاجور نے اس کی لاعلمی پر حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے کیا پتا۔" وہ سنبھل کر کہنے لگا۔ "خیر ہمیں کیا' وہ دو کریں یا چار۔ ہمارے ابا نے بھی تو دو کی ہیں۔"

"اچھا بھائی! آپ اریبہ باجی کو فون کر کے بتائیں ناں کہ میں آگئی ہوں۔" تاجور کا شوق دیکھتے ہوئے اس نے جیب سے موبائل نکال کر پہلے ٹائم دیکھ کر سوچا کہ اس وقت اریبہ اسپتال میں ہو گی پھر اس کا نمبر ملا کر موبائل تاجور کو تھما دیا۔

"لو تم خود بات کر لو۔"

"السلام علیکم اریبہ باجی!" تاجور بولنا شروع ہوئی تو وہ بظاہر انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

"اچھا آپ سارہ باجی ہو۔ جی میں واپس آگئی ہوں۔ آپ آئیں گی نا میرے گھر۔ ہاں میں خود بھائی کے ساتھ آپ کو لینے آجاؤں گی۔"

تاجور کی باتوں سے وہ خاص جھنجلا رہا تھا۔ کیونکہ جس کے بارے میں وہ سننا چاہتا تھا اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔ اس کے سیل پر کال اس کی بہن نے ریسیو کی ہے' وہ خود کہاں ہے۔ سوچتے ہوئے شمشیر علی کا دھیان تاجور کی

طرف سے ہٹ گیا تھا۔ جب ہی اس نے سنا ہی نہیں مزید کیا باتیں ہوئیں۔ جب تاجور نے موبائل اس کے ہاتھ میں تھمایا تب وہ چونک کر بولا تھا۔

"ہو گئی بات؟"

"جی سارہ باجی سے بات ہوئی ہے اریبہ باجی تو بیمار ہیں۔"

"اریبہ بیمار ہے۔" وہ بے چین ہوا تھا۔

"جی سارہ باجی بتا رہی تھیں اریبہ باجی کو بہت تیز بخار ہے۔" تاجور اس کی بے چینی سے بے خبر مزید کہنے لگی۔ "پتا ہے بھائی! اریبہ باجی بھی کھو گئی تھیں۔ پتا نہیں کہاں چلی گئی تھیں۔ سب گھر والے بہت پریشان تھے اور بے چاری اریبہ باجی بھی تب سے پریشان رہتی ہیں۔"

"اچھا جاؤ چائے وائے بناؤ۔" اس نے تنگ ہو کر کہا پھر بالکونی میں نکل آیا۔ پہلے بھی وہ اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ یہی بالکونی اور کمپاؤنڈ میں کھیلتے بچے۔ وہی منظر تھا لیکن زندگی کروٹ بدل گئی تھی۔

"شام! اس بات سے قطع نظر کہ یہ حادثہ یا واقعہ میری زندگی پر کس طرح اثر انداز ہو گا' تمہارا بہر حال کچھ نہیں بگڑا۔" اریبہ کی بات یاد آنے پر اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔

"ایسا کیا کروں میں کہ تمہارا ابھی کچھ نہ بگڑے۔"

☼ ☼ ☼

ساجدہ بیگم کو اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر رازی سمجھ گیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہو گی جب ہی یہ کہنے سے گریز کیا کہ "آپ کیوں آگئیں امی! مجھے بلا لیا ہوتا" اور نہ ہی جاننے کے لیے عجلت دکھائی تھی۔ ساجدہ بیگم آرام سے بیٹھ گئیں تب بھی وہ کوئی سوال اٹھانے کے بجائے کہنے لگا۔

"بلال کا فون آیا تھا امی! پیسوں کا تقاضا کر رہا تھا۔"

"کیوں.... میرا مطلب ہے وہ جب تک وہاں رہے گا تم اسے پیسے بھیجو گے؟ وہ خود کچھ نہیں کرے گا جیسے تم کر رہے تھے؟" ساجدہ بیگم نے کہا۔

"کرنا تو بلال کو بھی چاہیے اور میں اس سے کہتا بھی ہوں لیکن پتا نہیں وہ کیا سوچے ہوئے ہے۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولا تھا۔

"اگر تمہیں کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا بیٹا! تو واپس بلا لو اسے۔" ساجدہ بیگم کے لہجے میں فکر مندی محسوس کر کے اسے اس موضوع سے ہٹنا پڑا۔

"دیکھوں گا۔ آپ سنائیں سب ٹھیک ہے ناں۔"

"ہاں ٹھیک ہی ہے۔ آج دن میں توصیف آئے تھے۔" ساجدہ بیگم نے بتایا تو وہ ٹھٹک گیا۔

"چچا جان.... خیریت؟"

"اب کیا بتاؤں بیٹا! برسوں کا ناتا ٹوٹ رہا ہے۔ دکھ تو ہو گا۔"

"چچا جان نے کیا کہا؟" اس نے بے صبری سے ٹوکا تھا۔

"وہی تمہاری اور اریبہ کی بات کر رہے تھے کہہ رہے تھے مجھے اب یہ رشتہ مناسب نہیں لگ رہا۔ آپ جہاں چاہیں رازی کی شادی کر دیں۔ پھر معذرت بھی کر رہے تھے۔" ساجدہ بیگم آزردگی سے بول رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا ناں اریبہ کی باتوں سے یاسمین سمجھ گئی ہو گی پھر اس نے توصیف سے کہا ہو گا۔ جب ہی وہ خود آکر منع کر گئے ہیں۔"

رازی چپ ہوگیا۔ یوں بھی اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

"گو کہ یہ اچھا ہوا کہ بات ادھر سے ختم ہوگئی لیکن ان دو گھروں کے درمیان جو خلیج حائل ہوگئی ہے۔ اس کا مجھے افسوس ہے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ خاندان بھر میں تمہارے باپ اور چچا کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ یاسمین کی بد اخلاقی اور بد سلوکی کے باوجود بھی ان بھائیوں میں معمولی سی رنجش نہیں ہوئی اور اب۔۔۔" ساجدہ بیگم کی آواز بھر اگئی۔

"اب بھی رنجش نہیں ہوگی امی!" رازی نے بے چین ہو کر ساجدہ بیگم کے ہاتھ تھام لیے۔ "ایک رشتہ ٹوٹ جانے سے سارے رشتے نہیں ٹوٹ گئے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ جس طرح ہمارے دلوں میں چچا جان کی محبت اور احترام میں کمی نہیں آئی' اسی طرح چچا جان کی شفقت میں بھی کمی نہیں آئے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" ساجدہ بیگم دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"اور بھی کچھ کہا چچا جان نے؟"

"نہیں زیادہ باتیں نہیں کیں توصیف نے۔ ہاں! تمہاری طرح وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ یہ رشتہ ختم ہوجانے سے ہمارے آپس کے تعلقات میں ان شاء اللہ فرق نہیں آئے گا۔"

"ان شاء اللہ! بس اب آپ دل پر بوجھ نہ رکھیں۔ کچھ دنوں میں سب بھول بھال جائیں گے اس سارے قصے کو۔" وہ ساجدہ بیگم کو تسلی دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلیں اب آپ آرام کریں۔"

"اچھا وہ بلال کا تم کیا کرو گے۔ ابھی پندرہ دن پہلے ہی تو تم نے اسے پیسے بھجوائے تھے' پھر اب ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے اسے۔" ساجدہ بیگم نے پھر وہی موضوع چھیڑ دیا جس سے وہ بچنا چاہ رہا تھا اور اب پچھتایا بھی کہ اس نے کیوں بتایا کہ بلال پیسوں کا تقاضا کر رہا ہے۔

"میں اس وقت مصروف تھا امی! اس لیے بلال سے تفصیلی بات نہیں ہو سکی تھی۔ صبح میں پھر فون کر کے معلوم کروں گا اس سے۔" اس نے بظاہر سرسری انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے پھر مجھے بتانا ضرور۔" ساجدہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جی۔"

"اور ہاں!" ساجدہ بیگم کو جیسے اچانک کچھ یاد آیا تھا۔ "میں نے ثنا کے لیے خواجہ صاحب کی بیگم سے کہا تھا۔ انہوں نے ایک دو رشتے بتائے ہیں۔"

"پھر۔۔۔؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"اس اتوار کو آئیں گے وہ لوگ۔ تم گھر پر ہی رہنا اور دیکھو اب اس بات کو سرسری مت لینا۔ تمہارے والد نہیں ہیں' جو میں بے فکری سے بیٹھی رہوں۔ میری زندگی میں تم سب کے گھر آباد ہوجائیں' تب مجھے سکون ملے گا۔" ساجدہ بیگم کی غیر معمولی سنجیدگی پر وہ خاموش ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تین دن کے بخار نے اریبہ کو نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ چہرہ ستا ہوا اور آنکھوں میں ویرانیوں نے ڈیرے جما لیے تھے۔ اسے دیکھ کر یاسمین کا کلیجہ پھٹنے لگتا تھا اور یہ احساس کہ اس کے گناہوں کی سزا اس کی بیٹی کو مل رہی ہے' اسے اور تڑپاتا تھا۔ سارہ اپنی جگہ پریشان تھی' اور اریبہ گم صم جیسے اب اسے کچھ نہیں کہنا کچھ نہیں سننا۔

اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے وہ ساکت بیٹھی تھی۔ یاسمین کچھ دیر پہلے اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی اور اب اس کی جگہ سارہ آ بیٹھی تھی۔

"اریبہ! تمہاری خاموشی مجھے مار ڈالے گی۔ کچھ بولو خدا کے لیے۔ تم نے سنا ابھی مما کیا کہہ رہی تھیں۔ ڈیڈی امی کو منع کر آئے ہیں۔ تمہارے فیصلے پر مہر ثبت ہوگئی ہے۔ پھر بھی اگر تم کہو تو میں رازی بھائی سے بات کروں؟"

اریبہ کے چہرے پر بے چینی پھیل گئی۔ بولی کچھ نہیں۔

"میں رازی بھائی کو یقین دلاؤں گی کہ تم پر کوئی آنچ نہیں آئی۔" سارہ اب قدرے جھجکی تھی۔ اریبہ نے ایک دم اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"نہیں سارہ! فیصلہ ہوگیا ناں' اب کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہیں ہوگی۔ جب تم سہہ نہیں سکتیں تو پھر یہ روگ مت پالو۔ رازی بھائی عام مردوں کی طرح نہیں ہیں۔ تم انہیں سچ بتاؤ گی تو وہ تمہارا یقین کریں گے' کیونکہ وہ تمہیں دل سے چاہتے ہیں۔" سارہ اس کا ہاتھ دبا کر کہہ رہی تھی۔

"میں جانتی ہوں' پھر بھی نہیں۔" اس کے حتمی انداز پر سارہ خاموش ہوگئی تو قدرے رک کر وہ کہنے لگی۔

"تم میری وجہ سے پریشان ہو رہی ہو ناں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا' بخار تھا اتر گیا۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ بس بخار کے بعد کی کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ ایک دو دن میں یہ بھی نہیں ہوگی۔"

"اچھا۔۔۔!" سارہ کے سینے سے آپ ہی آپ گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"ہاں' اب یہ موضوع ختم ہوجانا چاہیے۔ دوبارہ اس پر بات مت کرنا۔" وہ کہہ کر اپنا سیل فون اٹھا کر چیک کرنے لگی' پھر سارہ کو دیکھ کر پوچھا۔ "تاجور کا فون آیا تھا؟"

"ہاں' پرسوں آیا تھا۔ اس وقت تمہیں ہوش نہیں تھا۔ میں نے اس کا فون اٹینڈ کیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھی' ٹھیک تو ہے ناں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ بھائی کے ساتھ واپس آگئی ہے۔ تمہاری بیماری کا سن کر پریشان ہوگئی تھی۔" سارہ نے بتایا تو اریبہ اندر ہی اندر جز بز ہو کر بولی۔

"تم نے میرا کیوں بتایا اسے؟"

"ظاہر ہے' وہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہہ دیا۔ تمہیں بخار ہے۔"

"اچھا جاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے لیکن میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔" اس نے سارہ کو اٹھانے کی غرض سے کہا۔

"پھر کیا کھاؤ گی؟" سارہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ ہلکا پھلکا' ایسا کرو سینڈوچ بنادو' ساتھ چائے بھی۔"

"اچھی بات ہے۔" سارہ چلی گئی تب اس نے شمشیر علی کو کال ملائی تھی۔

"کہاں ہو تم!" شمشیر علی نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔ اس کے لہجے میں عجیب سی تھکن تھی' جیسے جانے کب سے اسے ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔

"میں ہوں' تم کیوں مجھے کال کر رہے تھے؟" اس نے نروٹھے پن سے پوچھا۔ وہ اپنے موبائل پر اس کی آٹھ دس مس کال دیکھ چکی تھی۔

"کیوں کر رہے تھے کیا مطلب۔۔۔ میں تمہیں کال نہیں کر سکتا؟" شمشیر علی نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے صاف منع کر دیا تو ادھر وہ خاموش ہوگیا۔

"دیکھو شام! وہ قدرے رک کر گویا ہوئی۔ "تمہارا کام ہوگیا ناں اب تم مجھے فون مت کرنا۔ تاجور کے بہانے

سے بھی نہیں۔ میں تمہیں گھر کا نمبر سینڈ کردوں گی۔ تاجور کو جب بات کرنی ہو۔ گھر کے نمبر پر کال کرے۔ سن رہے ہو ناں۔"

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" شمشیر علی نے اس کی ساری بات سن کر نہ کوئی سوال اٹھایا' نہ جواب دیا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ ضبط سے بولی تھی۔

"لیکن تمہاری آواز ٹھیک نہیں لگ رہی اور تم اسپتال بھی نہیں جارہیں۔ کیوں؟" شمشیر علی نے جلدی سے پوچھا کہ کہیں وہ فون بند نہ کردے اور اس نے واقعی جواب دینے کے بجائے سیل آف کردیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اریبہ سے بات کرکے شمشیر علی کی بے چینی بجائے کم ہونے کے مزید بڑھ گئی تھی۔ اس لیے نہیں کہ اریبہ نے اسے فون کرنے سے منع کردیا تھا بلکہ اسے یہ خیال ستاتا تھا کہ گمشدگی کے بعد اب کہیں اس پر زندگی تنگ تو نہیں ہوگئی۔ جیسا کہ اس نے خود کہا تھا۔

"تم نادان نہیں ہو' جانتے ہوگے کہ لڑکی اگر ایک رات بھی گھر سے باہر رہے تو پھر لوگ اسے کس نام سے پکارتے ہیں۔"

گوکہ اب شمشیر علی کے اختیار میں کچھ نہیں تھا لیکن وہ اس لڑکی اریبہ کو رسوا نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ اس کی عزت و آبرو کا وہ خود محافظ تھا۔ یہ صرف وہی جانتا تھا اور وہی اس کی گواہی دے سکتا تھا۔ لیکن اریبہ کچھ بتائے تب ناں' وہ تو اب بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ فون کرنے سے بھی منع کردیا تھا تو پھر اس نے فون تو نہیں کیا لیکن اسپتال کے چکر ضرور لگاتا تھا' پھر پورے پندرہ دن بعد اریبہ نظر آئی تو وہ اس کے سامنے جم کر کھڑا ہوگیا۔

"تم نے کہا تھا کہ تاجور اب صرف تمہاری بہن نہیں ہے کہ تم اسے لے کر چلتے بنو۔"

"پھر۔!" اریبہ کی پیشانی پر شکنیں پڑگئی تھیں۔

"پھر یہ کہ تم بھی میرے لیے اجنبی نہیں ہو کہ میں تمہیں تمہارے حال پر چھوڑ دوں۔" اس نے کہا تو اریبہ غصے سے لیکن دبی آواز میں بولی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب میری وجہ سے اگر تم پر کوئی آنچ آرہی ہے تو بتاؤ۔" اس کی بات پر اریبہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"کیا کروگے تم۔ کیا کرسکتے ہو۔ ساری دنیا اگر مجھ پر انگلیاں اٹھائے گی تو کاٹ دوگے سب کی انگلیاں؟"

"صرف انگلیاں ہی نہیں گردنیں بھی اڑا دوں گا۔" اس کا لہجہ ہنوز مضبوط تھا۔

"دماغ خراب ہے تمہارا اور سن لو! اول تو مجھے کسی ایسی صورت حال کا سامنا نہیں اور اگر ہوا بھی تو میں خود نمٹ سکتی ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ سمجھے تم!" اریبہ نے سلگ کر کہا اور آگے بڑھنا چاہتی تھی کہ اس نے پھر راستہ روک لیا۔

"میں جانتا ہوں' تم بہت بہادر ہو لیکن اب یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔"

اریبہ دانتوں پر دانت جما کر تیکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تو وہ ہلکے ہلکے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہاں میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ صرف تمہارا معاملہ نہیں ہے۔ اس لیے آئندہ غلطی سے بھی یہ مت کہنا کہ تم کون ہوتے ہو میرے ذاتی معاملے میں دخل دینے والے..... سمجھیں تم!"

اریبہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا کہ وہ فوراً شہادت کی انگلی اٹھا کر بولا۔

"جب تم زبردستی میرے دل پر قابض ہوسکتی ہو تو میں بھی زبردستی کرسکتا ہوں۔"

"شٹ اپ۔۔!" اریبہ اسے دھکیل کر تیزی سے آگے بڑھ گئی تو وہ چند لمحے اسی طرح کھڑا رہا پھر کچھ سوچ کر وہاں سے نکلا تو سیدھا آفس آگیا۔

اسے توصیف احمد کا نیا آفس جوائن کیے ایک ہفتہ ہوگیا تھا اور وہ بہت مطمئن تھا۔ توصیف احمد نے جس طرح اس پر اعتماد کیا تھا تو وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے لگن سے کام کررہا تھا۔ پھر اب تو ایک لگن بھی تھی جو اسے توصیف احمد کی نظروں میں خاص مقام حاصل کرنے پر اکساتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ اریبہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا کہ وہ انگیج ہے یا اس کے دل میں پہلے ہی کوئی جگہ بنا چکا ہے۔ اس وقت اس نہج پر سوچتے ہوئے وہ پریشان ہوگیا تھا اور اس روز جب تاجور اریبہ کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ کھو گئی تھی سب لوگ بہت پریشان تھے تو وہ ٹوک کر اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا لیکن اب وہ سب جاننا چاہتا تھا۔ جب ہی شام کو جب وہ گھر آیا تو اس نے تاجور کو پاس بٹھالیا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد پوچھنے لگا۔

"تمہاری اریبہ باجی کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں۔ کل میں نے فون کیا تھا اریبہ باجی سے بھی بات کی تھی۔" تاجور نے سادگی سے بتایا۔

"اچھا وہ جو اس دن تم نے بتایا تھا کہ اریبہ کھو گئی تھی تو پھر جب واپس آئی تھی تو اس کے گھر والوں نے کچھ کہا تھا اس کو' ڈانٹا تھا' سختی کی تھی؟" وہ تاجور کی سمجھ کے مطابق بات کررہا تھا۔

"نہیں ڈانٹا تو نہیں تھا۔ سب خوش تھے۔"

"اور خاندان کے لوگ کیا باتیں کرتے تھے جب اریبہ گھر نہیں آئی تھی؟"

"پتا نہیں بھائی! میں تو اپنے کمرے میں رہتی تھی' مجھے اریبہ باجی نے منع کیا تھا کہ میں کسی کے سامنے نہ آؤں' اس لیے جب کوئی آتا تھا تو میں کمرے سے نہیں نکلتی تھی۔"

"اچھا کرتی تھیں۔" وہ یہی کہہ سکا' پھر پوچھنے لگا۔ "اریبہ نے تمہارے بارے میں اپنے امی ابا کو کیا بتایا تھا؟"

"یہی کہا تھا کہ وہ میرا علاج کررہی ہیں۔"

"انہوں نے کچھ کہا نہیں؟"

"نہیں اریبہ باجی بہت اچھی ہیں نا' انہیں کوئی کچھ نہیں کہتا۔ سب پیار کرتے ہیں ان سے۔ بھائی! آپ مجھے کب لے کر جائیں گے ان کے گھر.....؟" تاجور کو اچانک اس گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔

"لے جاؤں گا۔ اریبہ کی شادی میں لے جاؤں گا۔" اس نے بظاہر بے نیازی سے کہا تو تاجور منہ پھلا کر بولی۔

"نہیں بھائی! ان کی شادی تو پتا نہیں کب ہوگی۔"

"منگنی ہوگئی؟" اصل میں تو یہی جاننا چاہتا تھا۔

"ہاں۔" تاجور نے انجانے میں اسے شاک پہنچایا تھا' پھر وہ کچھ بول ہی نہیں سکا۔

☼ ☼ ☼

سمیر پھر سارہ سے شاکی ہورہا تھا۔

"تم ایسی کیوں ہوگئی ہو سارہ! پہلے تو ذرا ذرا سی بات پر مجھے فون کرتی تھیں' اب اتنی بڑی بڑی باتیں چھپا جاتی ہو..... کیوں؟"

"کیا چھپایا ہے میں نے تم سے؟" خلاف توقع سارہ بہت پرسکون تھی۔

"اریبہ اور رازی بھائی کی منگنی ٹوٹ گئی۔" سمیر نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ سارہ بول پڑی۔

"ایسی باتیں تو جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ تمہیں بھی اسی روز پتا چل گیا ہوگا جب ڈیڈی تائی امی کو منع

کر آئے تھے پھر میں کیا بتاتی۔ ہاں! اگر تمہیں اس خبر کی سچائی پر شبہ تھا تو تم مجھ سے تصدیق چاہتے۔ اس انتظار میں کیوں رہے کہ میں تمہیں فون کر کے کہوں "سمیر تم نے جو سنا' سچ ہے۔ یہ کوئی خوشی کی بات تو نہیں تھی۔"

"اب میں کیا کہوں؟" سمیر واقعی لاجواب ہو گیا۔

"کچھ مت کہو... نہ اب' نہ آئندہ کبھی۔ پتا نہیں' آگے قسمت میں کیا لکھا ہے۔" سارہ نے کہا تو سمیر چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب؟"

"کچھ نہیں۔ تم بتاؤ تمہاری جاب کا کیا ہوا؟" سارہ نے بات کا رخ اس کی طرف موڑ دیا۔

"جاب... ہاں کوششوں میں لگا ہوا ہوں۔ تین چار جگہ اپلائی کر چکا ہوں۔ صرف ایک جگہ سے انٹرویو کال آئی تھی۔ اس کے بعد ابھی تک کوئی جواب نہیں آیا۔ دعا کرو۔"

"تم ڈیڈی سے کیوں نہیں کہتے؟ وہ اگر اور کہیں نہیں تو اپنے آفس میں..."

"امی بھی یہ ہی کہتی ہیں۔" سمیر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑا۔

"پھر...؟" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"پھر یہ کہ میں پہلے خود کوشش کرنا چاہتا ہوں۔"

"یعنی جب ہر طرف سے مایوس ہو جاؤ گے' تب ڈیڈی سے کہو گے؟" سمیر ہنسنے لگا تو وہ چڑ کر بولی۔

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ تمہیں وقت ضائع کرنے کا شوق ہے۔"

"بالکل نہیں۔" وہ فوراً سیدھا ہو بیٹھا۔ "میں نے کب وقت ضائع کیا ہے؟ جیسے ہی تم میرے دل میں سمائیں' میں نے اسی وقت تم سے اعتراف کیا تھا' جبکہ تم..."

"فضول باتیں مت کرو۔" اس نے ٹوک دیا۔

"یہ فضول باتیں نہیں' میری زندگی کا سوال ہے۔ تمہارے بدلتے رویوں کے باوجود میں نے کبھی پیچھے ہٹنے کا سوچا بھی نہیں۔ الٹا میرا دل تاویلیں گھڑتا رہا کہ تم اریبہ کی وجہ سے پریشان ہو' جب ہی ایسے بی ہیو کر رہی ہو۔ ایسا ہی تھا نا؟" آخر میں سمیر نے تصدیق چاہی تو وہ جز بز ہو کر بولی۔

"نہیں۔"

"پھر...؟" سمیر کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

"پھر یہ کہ میں نے تمہارے کہنے پر بہت بار تمہارے بارے میں سوچا' لیکن مجھے کوئی نیا احساس نہیں ملا تو اس کا یہی مطلب ہوا نا کہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے... اور یہ اچھا ہی ہے' کیونکہ اریبہ کی محبت کا انجام دیکھنے کے بعد میرا محبت پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے۔" سارہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تم جھوٹ بول رہی ہو۔" سمیر سُلگ گیا۔

"نہیں! میں سچ کہہ رہی ہوں۔ باقی تمہاری مرضی مانو نہ مانو۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تو سمیر نے لپک کر اس کی کلائی تھام لی۔

"مان لوں گا... مجھے دیکھ کر بات کرو۔"

"کیا بات؟ اب اور کیا سننا چاہتے ہو؟" وہ اپنی کلائی چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

"میری آنکھوں میں دیکھ کر کہو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔" سمیر نے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ پکڑ کر اپنی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں! نہیں ہے... مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

"پھر کس سے ہے؟" سمیر کے دونوں ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ تب وہ اسے دھکیل کر پیچھے ہٹ گئی۔

"کسی سے نہیں۔"

"تھینک گاڈ' تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" سمیر نے گہری سانس کھینچ کر کہا۔

"بے کار کی باتیں ہیں۔ کسی کی جان نہیں نکلتی۔ اپنی یک طرفہ محبت پر بھروسا مت کرو۔ لے ڈوبے گی نہیں۔" وہ اب تنفر سے بولی۔ سمیر نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ یاسمین کو آتے دیکھ کر اس سے مخاطب ہو گیا۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام! تم کب آئے؟" یاسمین نے جواب کے ساتھ پوچھا۔

"جی! کچھ دیر ہوئی..." سمیر نے کہا تو یاسمین سہولت سے گویا ہوئی۔

"تو بیٹا! تمہیں پہلے مجھے سلام کرنے آنا چاہیے تھا۔ میں یہ پسند نہیں کرتی کہ تم باہر ہی باہر میری بیٹیوں سے مل کر چلتے بنو۔ اگر حماد اس طرح تمہارے گھر صرف طیبہ سے مل کر چلا آئے تو تمہیں کیسا لگے گا؟"

سمیر یکدم سناٹے میں آگیا۔

"برا مت ماننا بیٹا! جو بات اپنے لیے ناپسند ہو' دوسرے کے لیے بھی اسی انداز سے سوچنا چاہیے۔ اب جاؤ! آئندہ خیال رکھنا۔" یاسمین نے بڑے پیار سے اسے دن میں تارے دکھا دیے تھے۔ جب وہ چلا تو اس کے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

سارہ چاہ کر بھی اسے جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکی تھی۔



اریبہ کے مزاج میں چڑچڑا پن عود کر آیا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر الجھنے لگی تھی۔ اسے خود بھی احساس تھا' لیکن وہ کیا کرتی۔ دل پر جو سانحہ گزرا تھا۔ اس کے بعد کسی بات' کسی کام میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ گھر میں بھی اکھڑی اکھڑی رہتی تھی۔ یاسمین اور سارہ اس کی کیفیت سمجھتی تھیں۔ جب ہی اسے ٹوکتی نہیں تھیں۔ بس اس کی ہاں میں ہاں ملاتیں' لیکن کالج اور ہاسٹل میں اس کے ساتھی اب اس سے کترانے لگے تھے' اور یہ نہیں تھا کہ اسے پرواہ نہیں تھی۔ وہ خود عاجز تھی۔ کوشش بھی کرتی کہ اگر وہ کوئی بھی بات برداشت نہیں کر پا رہی تو جواب میں خاموشی اختیار کرے اور کبھی تو وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاتی' ورنہ ہتھے سے اکھڑ جاتی۔

کسی وقت غیر جانب داری سے سوچنے بیٹھتی تو سب ہی بے قصور نظر آتے اور سارا کھیل قسمت کے کھاتے میں چلا جاتا۔ اور شاید یہ ہی سچ تھا کہ اس کا اور رازی کا جوڑ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہتی تو کبھی دل روٹھے بچے کی طرح دبک کر بیٹھ جاتا اور کبھی بدک جاتا۔ پھر اسی طرح اس کا مزاج بھی بدلتا تھا۔ اس وقت وہ یاسمین کی گود میں سر رکھے عاجزی سے کہہ رہی تھی۔

"مما! دعا کریں۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا۔ سب بھول جاؤں اور میرے دل کو قرار آجائے۔"

"میں دعا کرتی ہوں بیٹا! میری ساری دعائیں تمہارے لیے ہیں۔ تم بھی نماز پڑھو۔ دل کا سکون نماز میں ہے۔" یاسمین اس کے بالوں میں دھیرے دھیرے انگلیاں پھیر رہی تھی۔

"میں کیا کروں' میرا نماز میں دل نہیں لگتا۔" وہ اپنی بے بسی پر خود بھی کڑھ رہی تھی۔

"پھر بھی پڑھو۔ اللہ ضرور تمہارا دل اپنی طرف پھیر دے گا۔ اپنی طرف بڑھنے والی کوششوں کو اللہ کبھی نظر انداز نہیں کرتا۔ مجھے دیکھو۔" یاسمین یکدم خاموش ہوئی' پھر ہمت کر کے کہنے لگی۔

"میں بھٹکی ہوئی روح تھی۔ پھر بھی اللہ نے میری پکار سن لی۔ مجھے مایوس نہیں کیا۔۔۔ اور تم نے تو بیٹا! کوئی گناہ نہیں کیا۔"

"پھر میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی محسوس کر کے یاسمین تڑپ گئی۔

"صرف تمہارے ساتھ نہیں بیٹا! ہر ایک کو اللہ کسی نہ کسی آزمائش میں ضرور ڈالتا ہے اور پھر نکالتا بھی وہی ہے۔ انسان کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ اس لیے ہمیشہ اللہ سے مدد مانگو۔"

وہ یاسمین کی گود سے سر اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی تو یاسمین اس کی پیشانی چوم کر بولی۔

"کچھ وقت گزرنے دو۔ پھر تم خود جان جاؤ گی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا' وہ اچھا تھا یا برا۔"

"پتا نہیں مما! ابھی تو مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ پھر یاسمین کی گود میں سر رکھنا چاہتی تھی کہ سارہ کی آواز پر ادھر متوجہ ہو گئی۔

سارہ کاریڈور میں جانے کس سے بات کر رہی تھی۔

"شاید کوئی آیا ہے۔" یاسمین نے بھی آواز سن لی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سارہ کے ساتھ تاجور سامنے آ گئی۔

"کون ہے بیٹا۔" یاسمین نے پوچھا تو وہ دروازے میں آ کر بولی۔

"السلام علیکم آنٹی!"

"وعلیکم السلام! ٹھیک ہو بیٹا؟" یاسمین نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی آنٹی! آپ کیسی ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔ سارہ! بٹھاؤ اپنی دوست کو۔ کچھ خاطر مدارت کرو۔" یاسمین کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ! میرے کمرے میں چلو۔" اریبہ 'سارہ کو اشارہ کر کے اپنے کمرے میں آ گئی۔ تاجور کو دیکھتے ہی اسے شمشیر علی کی بات یاد آئی تھی۔

"جب تم زبردستی میرے دل پر قابض ہو سکتی ہو تو میں بھی زبردستی کر سکتا ہوں۔"

"اریبہ باجی!" وہ تینوں اریبہ کے کمرے میں آئیں تو تاجور اس سے لپٹ گئی۔

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ قصداً" مسکرائی۔

"پھر آپ میرے گھر کیوں نہیں آئیں؟ میں اتنا یاد کرتی ہوں آپ کو۔"

"اچھا! اتنا یاد کرتی ہو اور آئی اب ہو' اتنے دنوں بعد؟ یہ ہے تمہاری محبت۔" اریبہ نے نہ چاہتے ہوئے بھی جتا دیا۔

"اللہ' نہیں باجی! میں تو روز بھائی سے کہتی ہوں' مجھے آپ کے پاس لے آئیں اور آپ کو بھی اپنا گھر دکھا دیں۔"

"مجھے پتا ہے تمہارا بھائی۔۔۔" اریبہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ یکدم خاموش ہو گئی۔ پھر سارہ سے بولی۔

"سارہ! جاؤ پہلے اسے بی بی سے ملوا دو۔ بہت پوچھتی ہیں اس کا۔"

"ہاں چلو تاجور! بی بی سے مل لو۔" سارہ اس خیال سے کہ کہیں اچانک اریبہ کا موڈ خراب نہ ہو جائے' تاجور کو لے کر چلی گئی۔

ساجدہ بیگم کو ثنا کی شادی کی فکر تو تھی' لیکن اتنی نہیں۔ یہ ہی سوچتی تھیں کہ جب اللہ کو منظور ہو گا۔ لیکن جب سے یاسمین نے ان کے منہ پر کہہ دیا تھا کہ بیٹی تو آپ کے گھر میں بھی بیٹھی ہے' تو یہ بات ان کے دل پر ایسی لگی

تھی کہ اس کے بعد انہیں اور کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ بس یہی فکر گھیرے رہتی کہ جلد سے جلد ثنا کو ان کے گھر بار کا کر دیں۔ شاید اس لیے کہ یاسمین کی فطرت سے واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کا یا اپنا دفاع کرنے کی خاطر دوسروں پر تہمت دھرنے سے ذرا نہیں جھجکے گی اور ساجدہ بیگم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ ایسا کوئی اوچھا وار سہہ سکیں۔ یوں بھی عورت کے سر پر بیوگی کی چادر ہو تو وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہے۔

بہر حال دو دن پہلے ثنا کو کچھ لوگ دیکھنے آئے تھے۔ بظاہر ساجدہ بیگم کو اس رشتے میں کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی' لیکن چونکہ بالکل غیر لوگ تھے' اس لیے وہ آنکھ بند کر کے اعتماد بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ انہوں نے اجلال رازی کو پوری چھان بین کرنے کو کہا تھا اور پھر ان سے زیادہ صبر بھی نہیں ہوا۔ اس وقت رازی آفس سے آ کر بیٹھا ہی تھا کہ وہ پوچھنے لگیں۔

"پھر معلوم کیا تم نے' کیسے لوگ ہیں؟"

"جی! لڑکے کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ اتفاق سے وہ جس بینک میں ملازم ہے۔ وہاں کا منیجر میرا جاننے والا ہے اور وہ لڑکے کی تعریف کر رہا تھا۔ اخلاق' کردار کا اچھا ہے۔ محنتی بھی ہے۔" رازی غالباً" خود مطمئن ہو چکا تھا' جب ہی اس کے لہجے میں ہر طرح کا اطمینان جھلک رہا تھا۔

"اور گھر والے۔۔۔؟" ساجدہ بیگم نے پوچھا۔

"گھر والوں سے تو آپ مل چکی ہیں امی! اور مجھ سے زیادہ آپ سمجھ سکتی ہیں۔ ان کی بات چیت سے آپ نے کیا اندازہ لگایا؟" رازی نے الٹا ان سے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"ایسا کریں امی! آپ ابھی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ پہلے ان کا گھر اور گھر کا ماحول دیکھ لیں' پھر جب تک آپ کا دل مطمئن نہ ہو' سوچیں بھی نہ۔" رازی نے کہا تو ساجدہ بیگم اسی پر سوچ انداز میں اسے دیکھے گئیں۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جلد بازی نہ کریں۔ یوں بھی ابھی ثنا کی عمر ہی کیا ہے۔"

"لڑکیوں کی یہ ہی عمر ہوتی ہے شادی کی۔" ساجدہ بیگم نے فوراً" سخت لہجے میں کہا۔

"آپ بہتر جانتی ہیں۔" وہ زچ انداز میں کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ ساجدہ بیگم نے روک دیا۔

"بیٹھو ابھی۔۔۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

"جی۔۔۔!" وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا تو قدرے رک کر ساجدہ بیگم کہنے لگیں۔

"ثنا کا تو ٹھیک ہے۔ میں گھر بار دیکھ کر فیصلہ کروں گی۔ ساتھ میں میں چاہتی ہوں' تمہاری بات بھی ڈال دوں۔ تاکہ پھر دونوں کی ساتھ شادی کر سکوں۔"

"ہاں! لیکن۔۔۔" وہ اندر سے پریشان ہو گیا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ بتاؤ! تم نے کہاں لڑکی پسند کی ہے؟" ساجدہ بیگم اس وقت اپنے ازلی رعب سے پوچھ رہی تھیں۔

"بتا دوں گا امی! آپ پہلے۔۔۔"

"میں نے کہا نا' دونوں کے معاملات ساتھ ساتھ طے ہو جائیں گے۔ بتاؤ! کون ہے؟" ساجدہ بیگم کے تحکمانہ اصرار پر وہ جز بز ہو کر بولا۔

"آپ جانتی ہیں اسے۔۔۔"

"نام بتاؤ۔۔۔؟"

"سارہ۔۔۔" رازی کی اپنی سانسیں رک گئی تھیں۔

"سارہ۔۔۔؟ یاسمین کی بیٹی؟" ساجدہ بیگم کے وجود میں جیسے چنگاریاں بھر گئی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

یہ دل ٹکڑوں میں گرچہ کٹ گیا ہے
مگر آنکھوں سے پردہ ہٹ گیا ہے

خداوندا! اسے شبنم سے دھو دے
یہ گلشن دھول سے اب اَٹ گیا ہے

یہاں برسے گی اب کرنوں کی بارش
کہ بادل آسماں سے چھٹ گیا ہے

زمانے سے اسے کیا پھل ملے گا
قبیلوں میں جو انساں بٹ گیا ہے

بہت دُشوار تھا منزل کا رستہ
خدا کا شکر، لیکن کٹ گیا ہے

اسی کا نام انوؔر کہکشاں ہے
ستاروں سے جو رستہ اَٹ گیا ہے

انوؔر سدید

بساطِ دہر پہ کیسے کوئی نشاں ٹھہرے
جو رخشِ عمر تھمے ہے نہ آسماں ٹھہرے

زمیں مجھ کو بھی ہموار ہی نظر آئے
ورائے عرش اگر میرا آستاں ٹھہرے

ملا نہ سایۂ دیوار بھی رعایا کو!
ہُما کا سایہ تھا جن پر، وہ حکمراں ٹھہرے

کبھی رُکا ہے زمانے میں ہاتھ ظالم کا
کہ عرضِ حال کو مظلوم کی زباں ٹھہرے

کِسے یہ علم ہے کس غم گزیدہ کا آنسو
بہے نہ آنکھ سے اور بحرِ بیکراں ٹھہرے

میں کس رفیق کو تہمت دوں اس خرابی کی
بزعمِ خویش سبھی میرے مہرباں ٹھہرے

نظر نہ آیا وہ پردہ نشین مجھے پرتوؔ
توہمات مرے اس کے درمیاں ٹھہرے

پرتو روہیلہ



تھکن

یہی موسم تھا، سرد ٹھٹھرتا ہوا
یونہی یخ بستہ ہوائیں
میرا آنچل اُڑا کر میرا چہرہ چھپا دیا کرتی تھیں
آسمان سے برستی رِم جِھم بارش
اور درختوں سے ٹپکتی سفید برف
ایک دوسرے کو ہماری محبت کے قصّے سنایا کرتی تھیں
شیشم کے پیڑوں پر پھدکتی چڑیاں
کتنی سرشاری سے
اپنی سُریلی آواز میں ہماری
وفاؤں کے میٹھے گیت گایا کرتی تھیں
میں چشموں کے بہتے پانی میں
تمہاری ہنسی کی جھنکار سُنا کرتی تھی
بہار رُت نے کب خزاں کا لبادہ اوڑھا
مجھے خبر ہی نہ ہو سکی
وقت حسین خوابوں کے سحر سے نکال کر
مجھے حقیقت کی دُنیا میں لایا تو میں نے دیکھا
میرے ہاتھوں میں محبت کے سُوکھے گلاب تھے
چشموں کے بہتے پانی کا شور
تمہارے ہجر کی کہانی سُنا رہا تھا
شیشم کے درختوں پر پھدکتی چڑیاں
مجھے برف پر تنہا چلتے دیکھ کر
شور مچا رہی تھیں
اور درختوں سے ٹپکتی سفید برف نے
وہ سارے خواب جو ہم دونوں کی محبت سے جُڑے تھے
اپنے سفید گالوں کے نیچے دبا لیے
ایک مدّت کے بعد میں محبت کی نگری سے واپس آئی
تو میرا دل، میری آنکھیں، خالی ہو چکی تھیں
تمہیں معلوم ہی نہیں کہ
سب کچھ ہونے اور کچھ نہ ہونے کے اس سفر نے
مجھے اندر سے کتنا تھکا دیا ہے

نازیہ کنول نازی

میرے خون کے پیاسے ہوں گے لیکن لوگ جیالے تھے
ان کے سر پر دُھوپ کی چادر، ان کے پاؤں میں چھالے تھے

اُس گھر کے دیوار و در سے جانے کیسا رشتہ تھا
گھُوم گھُوم کر ہم نے دیکھا، دروازوں پر تالے تھے

کچھ نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا، کچھ نے رستہ روک لیا
ورنہ ہم نے سوچ لیا تھا، اُس سے ملنے والے تھے

تم بچھڑے تو ہم سے ملنے، کتنی خوشیاں، غم آئے
ہم نے اُن کی شکل نہ دیکھی، گورے تھے یا کالے تھے

"ممّی! ممّی! بولو یہ انکل اچھے ہیں یا پاپا؟"
اُس کے بچّے ... توبہ توبہ، آفت کے پرکالے تھے

اُس کو دیکھا تو آنکھوں میں لفظ اشکوں سے بھیگ گئے
مصحف ہم سے جھوٹ نہ بولو، تم کچھ کہنے والے تھے

مصحف اقبال توصیفی

شگفتہ جاہ

زندگی گلزار ہے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تم جائیدادیں نہ بناؤ، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری رغبت دنیا میں بڑھ جائے گی۔"
(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے)
ضَیعَۃ سے مراد زمین، صنعت وزراعت اور کاروبار ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان میں اتنا زیادہ انہماک اور دلچسپی نہیں ہونی چاہیے کہ انسان کا مقصد زندگی، رضائے الٰہی کے بجائے، یہی چیزیں بن جائیں اور اس کے شب وروز اسی تگ ودو میں صرف ہوں، ورنہ حسب ضرورت وکفایت تو زمین، کاروبار اور جائیداد وغیرہ بنانا اور رکھنا سب جائز ہے، ممنوع نہیں۔

جھوٹا انسان،

وہ انسان جھوٹا ہے جو حق گوئی کے موقع پر خاموش رہے یا ایسی بات کہے جس سے ابہام پیدا ہو۔
(واصف علی واصف)

غور طلب،

جب نبی کی وراثت موروثی نہیں تو اولیاء کی وراثت کس طرح موروثی ہوگئی؟ گدی نشین کا تصور غور طلب ہے۔
(واصف علی واصف)

مختصر مختصر،

- وہ موسیقی روح پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے جو رات کے ایک بجے پڑوسی کے گھر سے سنائی دے۔
- بعض بیویوں کو اپنے شوہر کی خوشی کی اتنی فکر ہوتی ہے کہ وہ اس کی وجہ جاننے کے لیے پرائیوٹ سراغ رسانوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔
- یہ درست ہے کہ متضاد عناصر میں ایک دوسرے کے لیے کشش ہوتی ہے۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ تمام شادی شدہ مرد غیر شادی شدہ لڑکیوں کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

مسز ارشد آسی۔ آلو والہ کھاریاں

سچ تو یہ ہے کہ،

"تم اس ماہ میں چار چھٹیاں لے چکے ہو۔" آفیسر نے اپنے ماتحت سے کہا۔
"ایک مرتبہ تم اپنی بیوی کو ٹرین میں سوار کرانے گئے تھے، دوسری مرتبہ تم اپنی ساس کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ تیسری مرتبہ تمہارے بیٹے کی سالگرہ تھی چوتھی مرتبہ تمہاری بیٹی بیمار تھی۔ اب یہ بتاؤ آج تم کو کس لیے چھٹی چاہیے؟"
ماتحت نے سر جھکا کر کہا۔ "سچ پوچھیے تو آج میری شادی ہے۔"

ارم کمال۔ فیصل آباد

تو بھی،

ہمارے ہاں شادیاں پسند کی جاتی ہیں۔ جی ہاں گھر والوں کی پسند کی۔ بقول عطاء الحق قاسمی "ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی سے پوچھتے ہیں۔ اگر وہ ایک دوسرے کو پسند کریں تو شادی کر دیتے ہیں۔"
سننے والے نے پوچھا۔ "اگر وہ ایک دوسرے کو پسند نہ کریں تو؟"
کہا۔ "تو بھی شادی کر دیتے ہیں۔"

قیمت،

ملا نصیر الدین نے ایک بار کسی کنجوس مہاجن کی جان بچائی تو اس نے اپنی جان بچانے کا اسے ایک روپیہ دیا۔ ملا نے یہ کہہ کر بخوشی قبول کر لیا۔ "مجھے یہ لیتے ہوئے اس لیے برا نہیں لگ رہا کیونکہ تمہاری زندگی کی قیمت اس سے زیادہ نہیں۔"

مومن،

مومن اس لیے پاک ہے کہ وہ کوئی ذاتی غرض وغایت نہیں رکھتا۔ وہ عطائے خداوندی کو رضائے خداوندی پر رکھتا ہے۔
(اشفاق احمد۔ زاویہ)

سدرہ انوار۔ منڈی بہاؤ الدین

لمحۂ فکریہ،

کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ انسانوں پر خطیب حکومت کریں جو لمبی تقریروں سے اس طرح گرجتے رہتے ہیں، جس طرح سے پیتل کے برتن، جو ضرب لگنے کے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں، جب تک ان پر کوئی ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔
(افلاطون)

مطالعہ،

مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تقریباً تمام دنیاوی غم وفکر سے نجات کے لیے اپنے ایک پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔
(سمرٹ ماہم)

یہ کائنات،

یہ کائنات ایک حادثہ نہیں ہے۔ حادثے میں اس قدر حسن نہیں ہو سکتا کیونکہ حسن، حسن ترتیب کا نام ہے اور حادثہ کسی ترتیب کے بکھر جانے کا نام ہے۔
(واصف علی واصف)

حنا سلیم اعوان۔ آخون بانڈی ہری پور

جواہرات،

- اگر آپ کسی بے وقوف کی شکل نہیں دیکھنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنا آئینہ آپ کو توڑنا پڑے گا۔
- تجربہ بہترین استاد ہے لیکن اس مدرسے کی فیس بہت زیادہ ہے۔
- ڈپلومیٹ شخص وہ ہے جو عورت کی سالگرہ کا دن تو یاد رکھے لیکن اس کی عمر بھول جائے۔
- شادی ایک مرتبہ کرنا ضرورت، دوسری بار کرنا حماقت اور تیسری بار اس غلطی کو دہرانا سراسر پاگل پن ہے۔
- ہجوم میں کئی سر ہوتے ہیں مگر دماغ نہیں ہوتے۔
- اکثر مہمان گھر سے چلے جانے کے بعد اچھے لگنے لگتے ہیں۔
- مچھلی اور مہمانوں میں سے تین دن کے بعد بو آنے لگتی ہے۔
- اگر موم کے پر ہوں تو سورج سے محبت نہیں کرنا چاہیے۔
- شام زندگی کی ہو یا دکھوں کی، بالآخر ڈھل جاتی ہے۔

صالحہ، اقصیٰ۔ فیروز پور آزاد کشمیر

رشتے رابطے،

- دنیا میں صرف تین رشتے کھرے ہیں۔ ماں کی ممتا، عشق الٰہی اور حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ باقی ہر رشتہ مصلحت، مطلب، منافقت اور تجارت کا ہے۔
- دوستوں، عزیزوں کا برا سلوک بھی آپ کے لیے ایک خزانے سے کم نہیں ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیں، یہ بہت سے موقعوں پر بروقت فیصلہ آپ کے کام آئے گا۔
- پیار کسی بھی رشتے میں ہو، اگر اس کا اظہار کسی سطح پر نہیں ہو رہا تو ایسے پیار کا سرے سے وجود ہی نہیں۔
- کیا یہ قیامت نہیں ہے کہ دنیا ایک دوسرے کے رشتے داروں سے بھری پڑی ہے لیکن رشتے مر گئے ہیں۔

ندا۔ کراچی

بات ہے سمجھنے کی،

☜ طنز وہ تیر ہے جو شہد میں بھگو کر بھی مارا جائے تو اس کی چبھن کم نہ ہو گی۔

☜ اگر زبان نہ ہوتی تو کوئی گناہ گار نہ ہوتا۔ اس لیے رشک کیجیے گونگوں پر۔

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

اقوالِ مس زرّیں،

• جو شوہر کبھی کبھار اپنی بیوی کو تھوڑا بہت جیب خرچ نہیں دیتا، عام طور پر اسے ہر ماہ پابندی سے خاصی بڑی رقم اپنی سابقہ بیوی کو نان نفقے کے طور پر دینا پڑ جاتی ہے۔

• نسیمہ نے بدمعاش کو زمین پر دے مارا پھر یہ سوچے بغیر کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اس نے بدمعاش کو اُٹھایا اور تین منزلہ عمارت کی کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔ اس سے نمٹ کر وہ دوسرے بدمعاش کی طرف متوجہ ہوئی۔

(اس نرم و نازک ناول کی اگلی قسط اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں)

(ماہنامہ لڑکی ڈائجسٹ)

جواب،

ایک ٹھیکے دار جس نے کچھ سُرنگوں کی کھدائی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ کام کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ مزدوروں کو جہاں کھدائی کرنا چاہیے تھی، وہ اس جگہ سے کافی ہٹ کر کھدائی کر رہے تھے۔ اس نے کارروائی اور سخت غصے میں پوچھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"سُرنگ بیٹھ گئی ہے، اس کی کھدائی کر رہے ہیں۔"

ایک مزدور نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا اور کھدائی جاری رکھی۔

"کیا فورمین کو اس سُرنگ کے متعلق پتا ہے؟"

ٹھیکے دار نے پوچھا۔

"اگر پتا نہیں ہے تو ہم بتا دیں گے مگر پہلے اسے کھود کر نکال تو لیں۔" مزدور نے جواب دیا۔

تحریم، عائشہ۔ گوجرہ

وجہ،

ایک ملک کا بادشاہ کچھ عرصے سے خاصا پریشان تھا کیونکہ ملکی خزانے کو کوئی خاص آمدنی نہیں ہو رہی تھی جبکہ بظاہر تمام ملکی شعبے بغیر کسی رکاوٹ کے رواں دواں تھے۔ ایک دن بادشاہ نے اپنے دربار میں اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ایک اجلاس بلوایا جس میں تمام شعبہ جات کے نمائندے شامل تھے۔

سب سے پہلے بادشاہ نے وزیرِ باتدبیر سے اس مسئلے کی وجہ پوچھی کہ ایسا کیوں ہے۔ ملکی خزانے کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

وزیر نے ایک برف کا ٹکڑا منگوایا اور سب سے پیچھے بیٹھے ہوئے افسر کو پکڑایا اور ہدایت کی کہ ایک ایک افسر کے ہاتھ سے ہوتا ہوا بادشاہ کے ہاتھ تک پہنچے۔ سب نے اس حکم کی تعمیل کی۔ چنانچہ جب برف بادشاہ کے ہاتھ میں آئی تو اپنے اصل سائز سے پچاس گنا کم ہو چکی تھی۔

"یہی صورتِ حال ہمارے ملکی خزانے اور آمدنی کی ہے جناب۔" وزیر نے ٹھنڈی سانس لے کر بادشاہ کو مطلع کیا۔

ندا، فضہ۔ کراچی

حاصلِ زندگی،

حاصلِ زندگی حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ کیا نہیں، وہ ہوا نہیں، یہ ملا نہیں، وہ رہا نہیں

عدیلہ شہزاد۔ لیہ



امت الصبور

قرۃ العین خرم

کی ڈائری سے

بھاگتی دوڑتی، تیز زندگی میں ہم خود اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں مگر جب دل کا پیمانہ بہت بھر جاتا ہے تو دل چاہتا ہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی، فضا میں فطرت کے رنگوں کو قریب سے دیکھا اور محسوس کیا جائے۔ اپنوں کے درمیان، سکھ کی چھاؤں میں اگر کچھ دیر زندگی سستا لے تو کیا زندگی کا اتنا بھی حق نہیں ہم پہ....

ابنِ انشاء کی یہ خوبصورت نظم ایسی ہی کسی خواہش کے نام۔

یہاں اُلجھے اُلجھے روپ بہت
پر اصلی کم، بہروپ بہت
اس پیڑ کے نیچے کیا رُکنا
جہاں سایہ کم ہو، دھوپ بہت
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں

کیوں تیری آنکھ سوالی ہے؟
یہاں ہر اک بات نرالی ہے
اِس دیس بسیرا مت کرنا
یہاں مفلس ہونا گالی ہے
چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں

جہاں سچے رشتے یاریوں کے
جہاں گھونگھٹ زیور ناریوں کے
جہاں جھرنے کومل سکھ والے
جہاں ساز بجیں بن تاروں کے

چل انشاء اپنے گاؤں میں
بیٹھیں گے سکھ کی چھاؤں میں

نوال افضل گھمن

کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر افتخار عارف کی یہ غزل میری عزیز از جان ماریہ اعجاز گھمن کے نام۔

سمجھ رہے ہیں اور بولنے کا یارا نہیں
جو ہم سے مل کر بچھڑ جائے وہ ہمارا نہیں

سمندروں کو بھی حیرت ہوئی کہ ڈوبتے وقت
کسی کو ہم نے مدد کے لیے پکارا نہیں

جو ہم نہیں تھے تو کون تھا سرِ بازار
جو کہہ رہا تھا کہ بکنا ہمیں گوارا نہیں

ابھی سے برف اُلجھنے لگی ہے بالوں سے
ابھی تو قرضِ ماہ و سال اُتارا نہیں

ہم اہلِ دل ہیں محبت کی نسبتوں کے امین
ہمارے پاس زمینوں کا گوشوارہ نہیں





نادرہ خاتون

ہمارے خط

خط بھجوانے کے لیے پتا

خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

شائستہ سعید۔۔۔ ساہیوال

عنیزہ جی کا "جور کے تو کوہ گراں تھے ہم" خوب صورت منظر نگاری سے سجا بے مثال ناول۔۔۔ نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" بھی زبردست جا رہا ہے۔ شاہین رشید صاحبہ سے ہمیں ایک شکایت ہے کہ وہ صرف کراچی کے فنکاروں کو ہی فنکار تصور کرتی ہیں۔ لاہور کے فنکار کس کھاتے میں جائیں بھئی۔ رواں سال پی ٹی وی سے ہمارے خواتین کی رائٹرز نگہت عبداللہ، رفعت سراج، فائزہ افتخار، سیما مناف اور دلشاد نسیم کی لکھی تحریریں بطور ڈرامہ پیش کی گئیں۔ اس لیے پلیز پی ٹی وی کو نظر انداز نہ کریں۔ عائشہ ثناء کے انٹرویو کی فرمائش کر، کر کے تھک گئے، لیکن آپ نے ہماری فرمائش پر توجہ ہی نہیں دی۔ ہمارے شہر ساہیوال کے F.M 96 کے آر جے عامر کا انٹرویو بمعہ تصویر شائع کریں۔

ج ۔ شائستہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ قبول کریں۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

عائشہ رانا۔۔۔ پشاور

سب سے پہلے نگہت عبداللہ کا ناول "میرے خواب لوٹا دو" پڑھا۔ نگہت عبداللہ کا انداز تحریر بہت منفرد ہے۔ عنیزہ سید کا ناول "کوہ گراں تھے ہم" مجھے بہت انوکھا سا لگتا ہے۔ وہ بندر والا اور پھر سعدیہ کی اصلیت۔ یہ سب بہت اسرار والے ہیں۔ مہوش افتخار کا ناول "تیرے میرے درمیان" بہت اچھا ہے۔ نگہت سیما کا ناول "زمین کے آنسو" بہت زبردست ہے۔ حضرت جی جیسے ناسور ہمارے معاشرے سے کب ختم ہوں گے؟ سلویٰ علی بٹ کا ناول پسند آیا، مگر وجیہہ احمد کے ناولٹ نے اداس کر دیا آخر میں۔ افسانوں میں "ارمان" رشک حبیبہ کا افسانہ، بے اختیار مسکرائے اس کے آخر میں۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ میں انیقہ انا کی بات سے بالکل اتفاق کرتی ہوں۔ میں نے خود یہ بات محسوس کی ہے، بلکہ سچ ہے کہ ہیرو یا ہیروئن کا نام آتا ہو گا، بلکہ پوری کہانی لفظ بہ لفظ یاد ہوتی ہے۔ لیکن ناول کا عنوان یا مصنفہ کا نام بالکل نہیں جانتے۔

ج ۔ پیاری عائشہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

شیریں ظفر۔۔۔ راجن پور

جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ آپ کے پرچوں کا مطالعہ کرتی چلی آ رہی ہوں۔ لکھنے والے آتے رہے، شاہکار لکھتے رہے، میں پڑھتی رہی، دل سے سراہتی رہی۔ زندگی بھی شب و روز کے چکر میں چلتی رہی۔ کبھی دکھ کی شام، کبھی سکھ کی سویر، کبھی ہونٹوں پر ہنسی اور کبھی آنکھوں میں نمی۔ زندگی نے سب رنگ دکھا دیے، سب ذائقے چکھا دیے۔ نشیب و فراز کی گردش میں کبھی ہمت پکڑے رکھی۔ کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ کبھی کسی نے اپنا ساتھی بنا لیا۔ پھر رستہ بدل لیا۔ تنہا رول دیا۔ سربازار، سر دنیا اور پھر زندگی میں دکھ کی برف، خوشی کی دھوپ سے پگھلی۔ ہم سفر نے ہاتھ تھاما تو تن کی دیوار پر پھول کھلے۔ تین بچوں کی ماں ہوں۔ امی کی ڈیتھ سے ٹوٹ پھوٹ گئی ہوں۔ نئے لوگوں میں گھل مل گئی ہوں۔ کچھ لوگوں سے بچھڑ گئی ہوں۔ اک ساتھ نہیں چھوٹا تو آپ کا ساتھ نہیں چھوٹا۔ مجھے ان کہانیوں نے سب کچھ سکھایا، بتایا، لہجوں، انسانوں، نظروں اور جملوں کو پہچاننا سکھایا۔ عمیرہ احمد، نمرہ احمد، عنیزہ سید، آسیہ رزاقی، فرحت اشتیاق، رخ چوہدری، غزالہ نگار اور بے شمار مصنفات کے نام سورج کو چراغ دکھانے سے بہتر ہے کہ خاموش رہوں۔

میں اب جو بتانا چاہتی ہوں، مجھے میرے اس سوال کا جواب دے دیں۔ مجھ سے لوگ چڑتے ہیں۔ کچھ مجھے سمجھ دار بھی سمجھتے ہیں، مگر پتا چلا کہ پیٹھ پیچھے کہتے ہیں کہ اس کو خالی خولی باتیں کرنی آتی ہیں۔ میں بہت زیادہ حساس بھی ہوں اور رومان پسند بھی۔ مجھے وہ کہتے ہیں کہ تم فینٹسی ورلڈ میں رہتی ہو کہ دنیا میں ایسی محبت اور توجہ ناپید ہے۔

ج ۔ پیاری شیریں! آپ کا طویل خط پڑھا۔ سب سے پہلی بات یہ کہ آپ ہم سے جدا نہیں ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ تعلق کی جس ڈور سے بندھے ہیں۔ وہ بہت مضبوط ہے۔ ہر ماہ آپ سے رابطہ ہوتا ہے۔

پیٹھ پیچھے برا کہنے والی بات کا یقین نہ کریں۔ پیٹھ پیچھے لوگ کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں، کبھی تو بلاوجہ ہی بغیر سوچے سمجھے بول دیتے ہیں۔ ان کی باتوں پر توجہ دینا، کڑھنا یا سوچنا لاحاصل ہے۔ البتہ ان لوگوں سے محتاط رہیں جو آپ کو آ کر یہ بتاتے ہیں کہ فلاں نے آپ کے متعلق فلاں بات کہی ہے۔ یعنی جو تیر آپ کو نہیں لگا، وہ آپ کو اٹھا کر مارتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کچھ اپنی طرف سے بھی اضافے کر دیتے ہوں۔

صبر، استقلال، رواداری، مروت، رحم دلی، سچائی اچھی صفات ہیں۔ اگر آپ میں یہ صفات ہیں تو ان کو قائم رکھیں، لیکن دوسروں سے اس کی توقع نہ کریں۔ دنیا کو اور اس کے لوگوں کو وہ جیسے ہیں ان کو اسی طرح قبول کر لیں۔ ہم دنیا کو نہیں بدل سکتے، لیکن خود کو بدل سکتے ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

حیا بخاری۔۔۔ ڈیرہ اسماعیل خان

شعاع اور خواتین کے دونوں شماروں کے لیے صرف اتنا ہی کہوں گی کہ یہ دونوں لاجواب ہیں۔ مگر ایک چیز جو مجھے ان دو رسالوں میں بہت پسند ہے۔ وہ شعاع میں پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور خواتین میں انشاء جی۔ میں صرف ان دو کالمز کے لیے بہت بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔ پلیز ان دونوں کو ہمیشہ ساتھ رکھنا۔ اس کے بعد تمام لکھاری بہنوں کو اتنا اچھا لکھنے پر مبارک باد، خصوصاً" نمرہ احمد کو لمبی عمر، ہدایت اور نیکی کی دعا۔ بہت قابل ہے نمرہ۔ دنیاوی محبتوں پہ تو ہر کوئی لکھ سکتا ہے۔ اللہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی باتوں کو بیان کرنا وہ بھی کہانی کی صورت میں۔ واہ بھئی۔

اور اب میں بات کروں گی اس خط کی۔ جس نے مجھے بے حد رلایا۔ ام ثمامہ! مجھے آپ کے حالات جان کے بے حد دکھ ہوا۔ اتنا بڑا صدمہ، لیکن یقین جانیں، ان سب کاموں پہ اختیار صرف اللہ کو ہے اور رونے سے صبر اور عبادت بہت اونچا درجہ رکھتے ہیں۔

ج ۔ پیاری حیا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ناول نئی مصنفین بھی لکھ سکتی ہیں، لیکن ضروری ہے کہ پہلے افسانے ناولٹ وغیرہ لکھیں، تاکہ قارئین میں شناخت بن سکے۔ آپ کی بہن کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ ان شاء اللہ آئندہ ماہ رس ملائی کی ترکیب شامل ہو گی۔

تہنیت خان، مومنہ خان۔۔۔ عمر کوٹ سندھ

ٹائٹل بس سو، سو تھا۔ ب سب سے پہلے نگہت سیما کا "زمین کے آنسو" پڑھا۔ سب سے اچھا کردار اریب فاطمہ کا لگتا ہے اور پلیز پلیز ایبک کے ساتھ اریب فاطمہ کی جوڑی بنایئے گا۔ نہ کہ رابیل کے ساتھ۔ اب آتے ہیں نگہت عبداللہ کے ناول "میرے خواب لوٹا دو" بہت زبردست۔ "تیرے درمیان" مہوش افتخار کے مکمل ناول کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ بہت اچھا، لیکن اس سے پہلے بھی اسی طرح کی کہانی پڑھ چکے ہیں۔ "پہلی کاولی" پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ پلیز اتنے محبت کرنے والوں کو الگ مت کیا کریں۔ باقی ناولٹ اور افسانے زبردست

تھے۔ شاہین رشید سے فرمائش ہے کہ مسعود رضا کا بھی انٹرویو لیں۔

ج ۔ تہنیت اور مومنہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہین رشید تک آپ کی فرمائش ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

صالحہ، اقصیٰ ۔۔۔ میرپور آزاد کشمیر

عنیزہ جی کہانی کو بڑی خوب صورتی سے آگے کی طرف بڑھا رہی ہیں۔ عنیزہ جی! اسعد اور ماہ نور کو جدا مت کیجیے گا اور آپا رابعہ کو بھی جلدی سے اب اپنے بیٹے کھاری سے ملوا دیجیے۔ سعدیہ ان کی سگی بیٹی نہیں ہے۔ نگہت آپی' اریبہ کی تائی امی سے ہمیں اس بے حسی کی امید نہیں تھی۔ رازی ویسے بھی اریبہ کے قابل نہیں تھا۔ نگہت سیما نے طویل غیر حاضری کا حق ادا کردیا۔ احمد رضا راستے سے بھٹک گیا ہے۔ پلیز اس کی واپسی کا راستہ کھلا رکھیے گا۔ ایبک کو اریب فاطمہ کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ سلویٰ علی بٹ کا ناول ابھی اچھا تھا۔ سعدیہ کا کردار مضبوطی لیے ہوئے تھا۔ وجیہہ احمد کا ناولٹ بھی اچھا رہا۔ بیلی کو اپنے نکاح کا ولی کو پہلے ہی بتا دینا چاہیے تھا' تاکہ وہ اتنا آگے نہ بڑھتا۔ سب سے اچھا افسانہ نعیمہ ناز کا تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ عندلیب گل نے فیصل آباد سے لکھا تھا کہ وہ جب 4th کلاس میں تھیں' انہوں نے قراقرم کا تاج محل پڑھی تھی اور اب B.A میں ہیں۔ جبکہ یہ کہانی جنوری 2009ء میں شائع ہوئی تھی۔ ابھی تو نمرہ بھی اتنی بڑی نہیں ہوئیں۔ آپ کیسے ہوگئیں۔

ج ۔ صالحہ اور اقصیٰ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

عنیزہ کے ناول میں آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ کھاری آپا رابعہ کا بیٹا ہے؟ ہمارے خیال میں تو ایسا نہیں ہے۔

عظمیٰ شاہین رفیق ۔۔۔ جڑانوالہ

خط لکھنے کی وجہ ہماری بہت پیارا لکھنے والی سائرہ رضا ہیں۔ پہلے ناولز کی طرح اور تحریروں کی طرح ان کا یہ افسانہ "یارو دعا کرو" بھی بے حد زبردست تھا۔ یقین مانیے یہ ہر محب وطن پاکستانی کے دل جذبات کی ترجمانی ہے۔ دسمبر جب بھی آتا ہے' ملک ٹوٹنے کا غم تازہ ہوجاتا ہے۔ قصوروار کس کو ٹھہرائیں؟ نقصان کس کا ہوا؟ اس کو ایک طرف رکھ کر بس اتنا کہوں گی۔

تاریخ کے اوراق میں لکھی جائے گی یہ بات
نعمت اک ہم کو ملی تھی جو سنبھالی نہ گئی

آخر میں ایک درخواست ہے کہ ہوسکے تو ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ڈاکٹر ثمر مند مبارک کا انٹرویو شائع کریں۔

ج ۔ عظمیٰ! ڈاکٹر قدیر خان تک رسائی ہوسکی تو آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ سائرہ تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔

اتنے طویل عرصہ سے خواتین ڈائجسٹ پڑھ رہی ہیں اور کبھی خط نہیں لکھا۔ یہ بات ہمیں اچھی نہیں لگی۔ اب باقاعدگی سے لکھتی رہیے گا۔

سمیرا انور ۔۔۔ جھنگ

آپ جس حوصلہ کن انداز سے قارئین کو جواب دیتی ہیں۔ اس نے مجھے لکھنے پر مجبور کردیا۔ دسمبر کا ٹائٹل واقعی نئے سال کی آمد کو ظاہر کررہا تھا۔ "کوہ گراں" اچھا جارہا ہے۔ مہوش افتخار کا مکمل ناول بہت اچھا لگا۔ مگر آخری قسط آئندہ ماہ دیکھ کر دل مسوس کر رہ گیا۔ "زمین کے آنسو" نگہت سیما کی بہت اچھی اور رشتوں میں اپنائیت ظاہر کرتی کہانی لگی۔ ناولٹ میں "بیلی کاولی" اچھا لگا ور دل میں بے انتہا دکھ کی ایک لہر آگئی۔ کچھ محبتیں قربانی مانگتی ہیں۔ اس کا اظہار بیلی اور ولی نے کردیا۔ پلیز۔ انیلا کرن سے گزارش کریں کہ وہ خواتین کے لیے ایک مکمل ناول لکھیں اور میں سلسلہ میری خامشی کو بیاں ملے میں لکھ سکتی ہوں۔

ج ۔ پیاری سمیرا! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں قارئین کے خطوط پڑھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے اور ان کے تفصیلی تبصرے سے ہی ہمیں قارئین کی پسند ناپسند کا اندازہ ہوتا ہے۔ انیلا کرن تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ انیلا اچھی رائٹر ہیں۔ آپ کو ان کی تحریریں پسند ہیں تو ہم ضرور شائع کریں گے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے' آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

اقرا اکرم ۔۔۔ گاؤں سلیمان شریف' ضلع سیالکوٹ

ہمارا گاؤں سلیمان شریف بارڈر لائن پر واقع ہے۔ دو یا تین کلومیٹر پر بارڈر ہے۔ بارڈر سے بھارتی فوجی نظر آتے ہیں اور وہاں کے لوگ بھی کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے ہیں۔ بس ہمارے اور ان کے درمیان بن بنے ہوئے ہیں۔ بنوں کے اوپر درخت بہت اچھا منظر پیش کرتے ہیں۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اسکول نہیں ہے۔ بچے دوسرے گاؤں پڑھنے جاتے ہیں' ہمارا سارا گاؤں تقریباً" پڑھا لکھا بن چکا ہے۔ آپ کی سب رائٹرز اچھا لکھتی ہیں' کسی ایک کے بارے میں کیا لکھوں' مجھے سب ہی افسانے اور ناول اچھے لگتے ہیں۔

ج ۔ پیاری اقرا! آپ لوگ یقیناً" بہت بہادر ہیں۔ بارڈر لائن پر بھارتی فوجیوں کے اتنے نزدیک رہنا آسان کام نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ گاؤں میں اسکول نہیں' پھر بھی آپ لوگ پڑھ رہے ہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

آپ صرف ایک دن میں پورا خواتین ڈائجسٹ پڑھ کر دوسرے دن ہمیں خط لکھ دیتی ہیں' اس محبت کے لیے شکریہ۔

نیلم ناز ۔۔۔ سکھر سندھ

بہت طویل عرصے بعد خط لکھ رہی ہوں۔ وجہ۔۔۔ امی کی طبیعت خرابی اور میری نااہلی' حالات زندگی نے الجھا کے رکھ دیا ہے۔ خیر۔۔۔ نگہت عبداللہ جی نے اب ناول زبردست موڑ پر لا کھڑا کیا ہے اور "بیلی کاولی" میں بیلی نے بہت غلط کیا۔ اس کو چاہیے تھا' وہ پہلے ولی کو بتا دیتی' کسی کے جذبات سے کھیلنا سنگین غلطی ہے۔ سلویٰ علی کا کوئی جواب نہیں جو روانی ہے ان کی تحریر میں وہ لاجواب ہے۔ رشک حبیبہ نے بیسٹ لکھا۔ نظیر فاطمہ کیا نئے لکھنے والوں میں سے ہیں؟ سبق آموز تھا۔ "کیسا انتقام" باقی تمام سلسلے بھی بہت اچھے لگے اور پوچھنا یہ تھا کہ کیا کوئی ردا بھی ناولز لکھتی ہیں؟

ج ۔ پیاری نیلم! آپ کی والدہ کی طبیعت خرابی کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ انہیں شفائے کلی عطا فرمائے۔ (آمین)

نظیر فاطمہ نئی لکھنے والی ہیں۔ ردا نام کی کسی مصنفہ نے ہمارے پرچوں میں نہیں لکھا۔

فوزیہ زبیر ۔۔۔ چشتیاں

عنیزہ جی نے تو پہلی قسط سے ہی باندھ لیا ہے۔ بے شک شروع میں کہانی کے خدوخال نمایاں نہیں تھے۔ مگر دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ دس سال پہلے شادی کے بعد میرا تینوں شماروں سے رابطہ بالکل ختم ہوگیا تھا۔ مگر صرف بصارت کا رابطہ۔ ورنہ دلوں کے تعلق تو یوں آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتے۔ مگر پھر چند سال بعد کسی نہ کسی طرح یہ رابطہ بحال کرلیا' کیونکہ حبس اور گھٹن کے زندان میں تازہ ہوا کا کوئی روزن تو چاہیے تھا۔ یہ تو نہیں کہوں گی کہ آپ کی تحریروں نے میرے مسائل کم کرنے میں میری مدد کی۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میں وقتی طور پر سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں ڈپریشن کے اس فیز سے باہر نکل آئی ہوں۔ جو بقول ڈاکٹرز ڈپریشن کا لاسٹ اسٹیج ہوتا ہے۔ لیکن میری خود اعتمادی صفر ہو کر رہ گئی ہے۔ کسی بھی غلط بات کو لے کر گھنٹوں کڑھ سکتی ہوں۔ رو سکتی ہوں۔ مگر ہونٹوں پہ لگی چپ کی باڑھ نہیں ٹوٹتی۔

تتلیوں' رنگوں اور خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کو جب ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اپنی پلکوں سے چننی پڑیں تو دل کے اندر سناٹے ہی گونجیں گے۔

ج ۔ پیاری فوزیہ! جو کچھ آپ کے ساتھ پیش آیا۔ وہ صرف آپ کا ہی نہیں ہر حساس ذہن کا المیہ ہے۔

بے شمار حساس اور ذہین لڑکیوں کے لیے زندگی کا یہ موڑ خوشیوں کے بجائے ایک بوجھ بن کر آتا ہے اور وہ خواب ٹوٹنے کا دکھ سہتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں کرے۔ (آمین) خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔





نیلم منیر سے ملاقات

شاہین رشید

کل آج ایک نجی چینل سے حسینہ معین کا سیریل "مایا میری بہن" ٹیلی کاسٹ ہو رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینہ معین کی تحریر بہت لاجواب ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لاجواب تحریر کو مزید لاجواب بنانے میں ڈائریکٹر کے علاوہ فنکاروں کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ مایا اور مایا کی بہن کا رول بالترتیب عینی جعفری اور نیلم منیر کر رہی ہیں۔ دونوں کا کردار بہت اہم اور مضبوط ہیں۔ دونوں ہی بہت محنت کے ساتھ بہترین پرفارمنس دے رہی ہیں۔ ہم دونوں بہنوں سے آپ کی ملاقات کروائیں گے مگر پہلے بڑی بہن نیلم منیر سے ملیے۔

"کیسی ہو.... ماشاء اللہ روز بروز چہرے کے ساتھ ساتھ اداکاری میں بھی نکھار آتا جا رہا ہے؟"

"اچھا.... بہت شکریہ.... آپ میرا کون سا ڈراما دیکھ رہی ہیں؟"

"میں آج کل تمہارا سیریل "مایا میری بہن" دیکھ رہی ہوں۔ بہت اچھا پرفارم کر رہی ہو اور کیا کیا کام ہیں تمہارے؟"

"بہت کام ہے اللہ کا شکر ہے۔ زندگی کافی مصروف ہو گئی ہے اور میں زندگی کو بہت انجوائے بھی کر رہی ہوں۔"

"بہت پرانی بات بھی ہے اور سوال بھی پرانا ہے.... فیلڈ میں کون لایا.... سفارش یا محنت؟"

"صرف اور صرف محنت.... کوئی سفارش نہیں تھی.... سفارش ہوتی تو بہت پہلے اس فیلڈ میں آ چکی ہوتی۔ یہاں جگہ بنانی بہت مشکل ہے۔ کیونکہ جن کی جگہ بن چکی ہوتی ہے وہ دوسروں کو آگے نہیں آنے دیتے' بلکہ ان کی جڑیں ہی کاٹتے ہیں۔"

"پھر بھی کوئی تو ہوتا ہے۔ جو بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوتا ہے؟"

"میں تو بچپن سے ہی اس فیلڈ میں آنے کے لیے جنونی تھی۔ جب میں اسکول میں پڑھا کرتی تھی تو ہمارے اسکول میں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی سے ایک ٹیم آئی۔ انہیں ایک کمرشل کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت تھی۔ میں اس کمرشل کے لیے منتخب ہو گئی۔ بس پھر تو مجھے کمرشلز ملتے چلے گئے۔ جن کی وجہ سے میں اسکرین کے ذریعے سب سے متعارف ہوتی گئی۔"

"تو محنت تو نہ کرنی پڑی نا؟"

"ایسا تو نہ کہیں۔ جب آڈیشن لینے آئے تو صرف میں تو نہیں تھی۔ میرے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ مگر ہماری اتنی خواری ہوئی کہ کئی لوگ تو گھبرا کر چھوڑ گئے مگر میں نہیں گھبرائی اور محنت جاری رکھی۔ بس پھر مجھے محنت کا صلہ مل گیا۔"

"اور ڈراموں میں کون لایا؟"

"کوئی بھی نہیں.... قسمت ہی لے کر آئی۔ اصل میں میں نے "نادیہ خان شو" میں ایک روڈ شو کیا تھا۔ اس کو دیکھ کر اور میرے کچھ کمرشلز دیکھ کر بابر جاوید نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور اپنے سیریل "دیا جلے" کے لیے سویرا ندیم کی بیٹی کا کردار دیا۔ بس اس کردار سے مجھے راتوں رات شہرت مل گئی۔"

"کردار بھی بہت اچھا تھا۔ ایک خود سر لڑکی کا جو سوتیلی ماں کو پسند نہیں کرتی۔"

"ارے! آپ کو یاد ہے.... جی! وہ میری زندگی کا پہلا اچھا اور فل اور بہترین رول تھا۔ بابر جاوید نے اس کے بعد جو بھی سیریل کیے تقریباً" ہر سیریل میں مجھے بک کیا اور بک کرتے ہیں۔"

"گویا بابر جاوید کو نئے چہروں کی تلاش رہتی ہے؟"

"بالکل رہتی ہے.... انہوں نے بھی مجھے اسکرین پہ دیکھا تو انہیں لگا کہ یہ لڑکی کچھ کر سکتی ہے.... اور شکر ہے کہ میں ان کی امیدوں پر پوری اتری۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بابر جاوید سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب دوسرے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کیا تو مجھے تھوڑا بہت کام کرنا آتا تھا۔"

"اپنا پسندیدہ ڈراما کون سا ہے اور رول کون سا پسند ہے؟"

"مجھے اپنے سارے ہی ڈرامے بہت پسند ہیں۔ کیونکہ میرے ہر کردار نے ہی مجھے آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس لیے کسی ایک کا نام تو لے ہی نہیں سکتی۔ جہاں تک رول کی بات ہے تو مجھے یہ نہیں کہنا کہ مجھے فلاں رول پسند ہے اور فلاں رول کرنا چاہتی ہوں۔ میں ہر طرح کے رول کرنا چاہتی ہوں' کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ مجھ میں ہر طرح کے رول کرنے کی صلاحیت ہے۔ چاہے وہ سیدھی سادھی لڑکی کا رول ہو یا کوئی بہت ہی ماڈرن قسم کی لڑکی کا۔"

"مشکل کیا ہے' اداکاری' ماڈلنگ یا ہوسٹنگ؟ کیونکہ تم نے ہوسٹنگ بھی کی ہے "گڈ مارننگ پاکستان" کی؟"

"اداکاری مشکل ہے۔ ٹائم بھی زیادہ لگتا ہے۔ مگر مجھے اداکاری ہی زیادہ پسند ہے۔ کیونکہ میں ایک مشکل پسند لڑکی ہوں اور مشکل کام کرنا مجھے پسند ہے۔ اس لیے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں مگر اداکاری نہیں۔ "گڈ مارننگ پاکستان" کی ہوسٹنگ کی۔ مجھے بہت مزا آیا۔ فیوچر میں اگر کوئی مارننگ شو ملا تو ضرور کروں گی اور آپ نے ماڈلنگ کے بارے میں پوچھا ہے تو بہت آسان ہے ماڈلنگ اور پیسہ بھی ٹھیک ملتا ہے۔ لیکن پھر بھی مجھے اداکاری کا جنون ہے۔ اسے کبھی نہیں

چھوڑں گی۔"

"اتنے سارے لوگوں کے سامنے اور کیمروں کے سامنے کام کرتے وقت کوئی جھجک تو نہیں ہوتی یا آسانی سے کر لیتی ہو؟"

"جب کسی کام کا جنون ہو تو پھر جھجک نہیں ہوتی۔ ہاں! ایسا کوئی سین جس میں عشق و محبت کی کوئی بات ہو یا شادی والے سین ہوں تو پھر مجھے تھوڑی بہت جھجک یا شرم آجاتی ہے۔"

"میں نے دیکھا ہے کہ ہمارے ڈراموں میں ماڈرن رول میں لڑکیاں، بہت برے لباس پہنتی ہیں۔ کیا ایسا ہونا چاہیے؟"

"ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن شاید رول کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ مگر میں اس معاملے میں بہت خیال رکھتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ ایسا لباس نہ پہنوں کہ جس سے میری فیملی میں شرمندگی ہو یا ان کو کوئی اعتراض ہو۔"

"بولڈ رولز کی پیش کش ہوتی ہے؟"

"جی! بہت ہوتی ہے مگر میں انکار کر دیتی ہوں۔ کیونکہ نہ مجھے ایسے رول کرنا پسند ہیں اور نہ ہی میری فیملی کو۔ ہم پٹھان فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ پٹھانوں میں کتنی شرم و حیا ہوتی ہے۔ مجھے میرے گھر والوں نے فیلڈ میں کام کرنے کی اجازت دے دی ہے یہی ان کی بہت بڑی مہربانی ہے۔"

"شادی کے معاملے میں اپنی پسند کو ترجیح دو گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی، جیسا اللہ نے چاہا ویسا ہی ہو گا گھر والوں کی طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔"

"ہر شعبے میں ایک دوسرے کو کاٹ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں اور یہ فیلڈ تو اس سلسلے میں بہت بدنام ہے۔۔۔ ایسا ہے؟"

"جی! بالکل ایسا ہی ہے۔ جو آپ کے سامنے آپ کی تعریف کر رہا ہو گا اور اپنے آپ کو آپ کا خیر خواہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو گا وہی دوسروں کے سامنے آپ کی برائی بھی کر رہا ہو گا۔ ایسے رویے مجھے بہت تکلیف اور بہت دکھ دیتے ہیں۔ وہ پتا نہیں ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کم سے کم میں تو ایسا کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی۔ ہر ایک کو اپنی قسمت کا رزق ہی کھانا ہوتا ہے۔"

"گزشتہ دنوں میں نے ایک ڈراما دیکھا، جو ملک سے باہر شوٹ ہوا تھا۔ کیسا لگتا ہے ملک سے باہر جا کر؟"

"بہت اچھا لگتا ہے۔ دوسروں کی ترقی پر رشک بھی آتا ہے۔ لیکن سچ بتاؤں! شروع شروع کے کچھ دن تو بہت اچھا لگتا ہے۔ مگر پھر اپنا گھر، اپنی فیملی اور اپنا ملک بہت یاد ہے اور دل چاہتا ہے کہ بس فوراً" واپس چلے جائیں۔ اپنا ملک ایسا ہی ہے۔"

"اس فیلڈ میں آکر کیا کھویا، کیا پایا؟"

"بہت کچھ پایا ہے دولت، شہرت۔۔۔ مگر کھویا بھی بہت کچھ ہے۔ پتا نہیں، میرا اللہ مجھ سے راضی بھی ہے کہ نہیں کیونکہ اس فیلڈ میں آنے کی وجہ سے پوری نمازیں نہیں پڑھ سکتی۔ گو کہ قضا پڑھ لیتی ہوں، مگر پھر بھی مجھے بہت ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔"

"کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہو؟"

"فضول خرچ تو خیر میں، بہت ہوں۔ کپڑوں کا بھی شوق ہے مگر نت نئے بیگز اور نئی ٹیکنالوجی کے موبائل لینے کا بہت شوق ہے۔۔۔ بس کچھ پسند آجائے تو پھر ہاتھ رکتا نہیں ہے۔"

"مزاج میں کوئی تبدیلی آئی۔۔۔ کہ میں تو بہت مشہور ہو گئی ہوں۔ اس لیے لوگوں سے دور رہوں؟"

"نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ میں تو پہلے سے بھی زیادہ نرم مزاج ہو گئی ہوں اور کبھی کبھی مجھے اپنی یہ خوبی "خامی" لگتی ہے کیونکہ لوگ نرم مزاجی کا، خوش اخلاقی کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور نقصان پہنچاتے ہیں۔"

"کبھی تو غصہ آتا ہی ہو گا؟"

"آتا ہے۔۔۔ مگر میں اظہار نہیں کر پاتی۔ بس خاموش ہو کر اس جگہ سے ہی اٹھ جاتی ہوں، جہاں

بحث ہو رہی ہو یا کوئی ایسی بات ہو رہی ہو، جو میرے مزاج کے خلاف ہو۔ مجھے غصے کا اظہار کرنا آتا ہی نہیں ہے۔"

"اپنے آپ میں کس چیز کی کمی محسوس کرتی ہو؟"

"شکر ہے اللہ تعالیٰ کا کہ اس نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔ اکثر لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ کے چہرے پر جو تل ہے، وہ نکلوا دو۔۔۔ مگر میں کہتی ہوں کہ یہی تل تو میری شناخت ہے اور بابرکت بھی۔۔۔ اسے نکلوانے کا تو سوچ ہی نہیں سکتی۔ ہاں! اگر مزاج کے حساب سے آپ پوچھیں تو میں چاہتی ہوں کہ میں تھوڑی سی سخت مزاج ہو جاؤں۔ اس فیلڈ میں ایسا ہونا بہت ضروری ہے۔"

"اپنے ملک کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟"

"بہت کچھ۔۔۔ یہاں کے حالات کے بارے میں سوچ کر بہت افسردہ ہو جاتی ہوں۔ خاص طور پر کراچی کے بارے میں۔ پتا نہیں، وہ دن کب آئے گا، جب ہمارے کراچی میں بھی امن و امان ہو گا۔ جب میں اپنے والدین سے سنتی ہوں کہ ایک زمانے میں کراچی میں صفائی ستھرائی بھی بہت ہوتی تھی اور امن و امان بھی، تو بہت حیرانی ہوتی ہے۔ ہم نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے، کراچی کے حالات خراب ہی دیکھے ہیں۔۔۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے یہاں کے لوگ جنگلی ہو گئے ہیں۔

"انٹرویو کے دوران لوگ زیادہ کیا سوال کرتے ہیں۔۔۔ جو تمہیں برا لگتا ہو؟"

"بہت سے سوال ہیں، جو مجھے برے لگتے ہیں مثلاً" جب کوئی مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ آپ ایک مہینے میں کتنا کما لیتی ہیں تو سچ مجھے برا لگتا ہے۔۔۔ بھئی! ہماری کمائی سے آپ کو کیا مطلب ہے۔"

"کردار کا مشاہدہ کس طرح کرتی ہو؟"

"ہمارے اردگرد بہت سے لوگ ہیں، جو کسی ڈرامے کا ایک کردار ہی لگتے ہیں اُن کا مشاہدہ کرتی ہوں۔ آپ سگنل پہ کھڑی ہو جائیں یا پیدل چلتے وقت لوگوں کا مشاہدہ کریں تو بہت کچھ مشاہدہ کرنے کو مل جاتا ہے۔ سب کردار ہم میں سے ہی تو ہوتے ہیں۔"

"آئینے کو کتنا وقت دیتی ہو۔۔۔ اور کس بات کو زیادہ محسوس کرتی ہو؟"

"زیادہ نہیں۔۔۔ جب بہت ضروری ہوتا ہے تو کھڑے ہو کر اپنا سراپا دیکھتی ہوں۔ میں میک اپ بھی کم کرتی ہوں، کیونکہ مجھے بغیر میک اپ کے بغیر رہنا اچھا لگتا ہے۔ ویسے اللہ نے پرفیکٹ بنایا ہے ماشاء اللہ۔ بس بال لمبے نہیں ہیں۔

"کس وقت اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہو؟"

"مجھے کام سے لگاؤ ہے اس لیے کام کے دوران اپنے آپ کو فریش محسوس کرتی ہوں۔ تھکن کا لفظ میری زندگی میں نہیں ہے۔ میں کام کو بھی اور زندگی کو بھی انجوائے کر رہی ہوں۔"

"چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہو؟"

"دیر تک سوتی ہوں۔ بہت ہی آرام سے اٹھتی ہوں اور جب اٹھتی ہوں اسی وقت ناشتا کرتی ہوں اور پھر اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں یا پھر اپنی دوستوں کے ساتھ کہیں گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں۔"

"چلو! آخری سوال۔۔۔ اپنی کوئی بری اور اچھی عادت بتاؤ؟"

"بری عادت تو یہ ہے کہ دوسروں پر بھروسا کر لیتی ہوں اور یہ بھی بری عادت ہے کہ لوگوں سے جلدی فری ہو جاتی ہوں۔ اچھی عادتیں خود سے کیا بتاؤں، میرے گھر والوں سے یا میری دوستوں سے پوچھیے۔"



میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

سفینہ ناز سٹھو ـــــــــ ملتان

آج آخری سطروں میں کہیں نام ہے اُس کا
احباب کی فہرست میں پہلا تھا جو ایک شخص

سونیا ربانی ـــــــــ قاضیاں محلہ بالا

ہر سمت کو پھیلی ہے محبت کی زمیں
دریا میرے اظہار کا کس سمت کو جائے
ابرار نئے سال کی دہلیز پر بیٹھے
تجھ کو ترے ماضی کا کوئی خواب سنائے

سورہ سانذ ـــــــــ روحل والی گاؤں

جس کی عہد نامنصفی میں ظلم نے پایا عروج
اُس پر میرے ملک میں پھولوں کی بارش کی گئی

فارحہ اقبال ـــــــــ کراچی

تمہیں یاد بھی نہ ہو گا، وہ جو کہہ کے دل لیا تھا
مرے بس میں کاش ہوتا جو سنا تھا بھول جاتا
نہیں تم سے کوئی شکوہ مگر ایک التجا ہے
جو بنا رہے ہو حالت، کبھی آ کے دیکھ لینا

نفیسہ نواز گیلانی ـــــــــ منڈی بہاؤالدین

نفیسہ گلے شکووں کے پہرے میں کھڑا ہے
دل آج بھی چاہت کے کٹہرے میں کھڑا ہے
یہ گردش ایام تو اس پہ بھی ہے گزری
خود آج کسی دَور سنہرے میں کھڑا ہے

سمیرا نوردین ـــــــــ لاہور

جدا کر کے اُسے خود سے میں گھر آ کر بہت رویا
جہاں جاتے تھے ہم دونوں وہاں جا کر بہت رویا
میں پہلے اُس کا رونا سوچ کر ہنستا رہا پہروں
میں پھر اُس کی ہنسی کو ذہن میں لا کر بہت رویا

ملائکہ کوثر ـــــــــ بسم اللہ پور

ماں تیرے بعد بتا، کون لبوں سے اپنے
وقتِ رخصت میرے ماتھے پہ دعا لکھے گا

مہک علی ـــــــــ لاہور

بات کھلنے پر وہ لے بیٹھا پرانی رنجشیں
ایسا لگتا ہے کہ وہ مجھ سے خفا پہلے سے تھا

صومیہ نذیر ـــــــــ ہری پور

تو ہے سورج تجھے معلوم کہاں رات کا دکھ
تو کسی روز میرے گھر میں اُتر شام کے بعد

ظلِ ہما ـــــــــ فیصل آباد

چمن ویران ہے اب تک شگوفے کھل نہیں پائے
بڑی تاخیر کر دی ہے کسی نے مسکرانے میں

سائرہ مجید ـــــــــ فیصل آباد

کتابیں بھی بالکل میری طرح ہیں
الفاظ سے بھرپور مگر خاموش

نوال افضل گھمن ـــــــــ گجرات

روٹھا تو شہرِ خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کر تازہ شرارت بھی کر گیا
دل کا نگر اُجاڑنے والا ہنر شناس
تعمیر حوصلوں کی عمارت بھی کر گیا

سدرہ وزیر ـــــــــ (پپل) خوشاب

اک بار وہ ملا تھا مجھے بے رُخی کے ساتھ
اس دن سے دل کا شہر برابر اُداس ہے
دیکھی ہے اُس کی آنکھ میں پہلی دفعہ نمی
یوں لگ رہا ہے جیسے سمندر اُداس ہے

اُوبیہ نذیر ـــــــــ بھائی وال فیصل آباد

ہم بھی تو قرار و قول بھولے
کون اپنا کہا نبھاتا ہے
اب یاد نہ آ کر کچھ دنوں سے
دل کسی اور کو چاہتا ہے

باتیں سجل علی سے

شاہین رشید

1 اصلی نام؟
سجل علی۔

2 پیار سے کیا پکارتے ہیں؟
سجایا سجو۔

3 تاریخ پیدائش / شہر؟
17 جنوری 1994ء / لاہور۔

4 تعلیمی قابلیت؟
پڑھ رہی ہوں اور سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں۔

5 ستارہ / قد؟
کیپری کورن / 5 فٹ 4 انچ۔

6 بہن بھائی آپ کا نمبر؟
ہم تین بہن بھائی ہیں۔ میں بڑی ہوں پھر بہن ہے اور پھر بھائی ہے۔

7 پہلا پروگرام / وجہ شہرت؟
محمود آباد کی ملکائیں اور یہی شہرت کا باعث ہے۔

8 شوبز میں کس نے متعارف کرایا؟
میں خود اپنی قابلیت سے آئی ہوں۔

9 پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟
مجھے تو یاد نہیں۔ مما ہی سارا حساب رکھتی ہیں اور مجھے تو بس کام کی ایکسائٹمنٹ تھی۔

10 سال کے کس دن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے؟
اپنی برتھ ڈے کا۔

11 کبھی ستارہ شناس کو ہاتھ دکھایا؟
نہیں کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ میں خود بھی ہاتھ کی لکیروں کو پڑھ سکتی ہوں۔

12 کس شہر میں گھر بنانے کی خواہش ہے؟
پیرس۔

13 کوئی تحفہ جسے پاکر بہت خوشی ہوتی ہو؟
17 جنوری جو کہ میرا برتھ ڈے ہے اس دن میں نے اپنا پہلا کنٹریکٹ سائن کیا تھا تو میں سمجھتی ہوں کہ اللہ کی طرف سے یہ میرے لیے بہت قیمتی تحفہ تھا۔

14 انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟
بہت زیادہ ہے مگر ٹائم نہیں دے پاتی۔

15 مستقبل میں کیا بننا ہے؟
ایک اچھی ڈائریکٹر۔

16 سمندر دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟
سمندر میں گہرائی بہت ہے۔ انسان کو بھی اتنا ہی گہرا ہونا چاہیے۔

17 زندگی میں پڑھائی کتنی ضروری ہے؟
بہت زیادہ ضروری ہے کیونکہ پڑھائی آپ کو سونا بنا دیتی ہے۔

18 اپنے ملک کی کوئی اچھی بات؟
یہ وقت صحیح نہیں پوچھنے کے لیے..... کیونکہ ابھی کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔

19 دوسرے ملکوں کی اچھی بات؟
بہت ساری اچھی باتیں ہیں۔ بہت امن و سکون ہوتا ہے وہاں۔

20 آپ کی شخصیت کی کمزوری اور طاقت؟
کوئی اگنور کرے اور طاقت ہارڈ ورکنگ۔

21 میک اپ ایجاد نہ ہوتا تو؟
اچھا ہی ہوتا پھر آپ ویسے ہی نظر آتے جیسے ہیں۔

22 میک اپ میں کیا چیز بری لگتی ہے؟
کچھ بھی برا نہیں لگتا۔

23 کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟
جب کوئی نظر انداز کرے۔

24 بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟
میں اتنی جولی ہوں کہ اپنے آپ کو بور ہونے نہیں دیتی آپ اکیلے کمرے میں بھی مجھے چھوڑ دیں گی تو میں انجوائے کروں گی۔

25 جب تنہا ہوتی ہیں تو کیا کرتی ہے؟
تنہائی کا بھی اپنا مزا ہے۔

26 کوئی تاریخی شخصیت جس سے ملنے کی خواہش ہو؟
قائد اعظم۔

27 کبھی ہجوم میں اکیلا پن محسوس ہوا؟
ہاں کئی مرتبہ۔

28 کیا ڈراموں میں فنکار کی شخصیت کا عکس ہوتا ہے؟
بالکل ہوتا ہے۔

29 صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟
بس کام کرنے کو دل چاہتا ہے۔ شوٹ پہ جانے کو دل چاہتا ہے۔

30 گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟
باتھ روم میں (قہقہہ)

31 شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟
کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اگر فوری طور پر کچھ کھانے کو نہ ملے تو بھوک مرجاتی ہے۔

32 کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟
مما کے ہاتھ کا۔ بہت مزے کا پکاتی ہیں۔

33 ناشتا جو شوق کرتی ہیں؟
نہیں، میں ناشتا نہیں کرتی۔ بس ملک شیک پیتی ہوں۔

34 اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہیں؟
کسی سے بھی نہیں۔

35 کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟
اب کچھ نہیں کہتی۔

36 آئینے کو کتنا وقت دیتی ہیں؟
بہت زیادہ.....



37 کیا آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزار رہی ہیں؟
نہیں، ایسا نہیں ہے۔ جو والدین کہتے ہیں میں وہی کرتی ہوں۔

38 زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے۔
یقیناً" اپنے آپ کے لیے۔

39 پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتی ہیں تو کیا لکھتی ہیں؟
786 عام طور پر اور اپنے سائن۔

40 کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟
ہاں غصے میں بھوک ہی نہیں لگتی۔

41 دل کب ٹوٹتا ہے؟
جب کوئی جان بوجھ کے اگنور کرے۔

42 کون سی بات جذباتی کردیتی ہے؟
میں بہت زیادہ جذباتی بندی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ لے لیتی ہوں۔

43 موڈ کب خراب ہوتا ہے؟
ہوتا ہی رہتا ہے۔ کسی وجہ کے بغیر بھی۔
44 ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہے؟
ہائے اللہ بہت ساری ہیں۔ ایک ہو تو بتاؤں۔
45 کیا آپ اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتی ہیں؟
ذرا مشکل سے ہی کرتی ہوں۔
46 پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہیں؟
کہ کاش یہاں سب کچھ اچھا ہو جائے۔
47 آپ کی زندگی دوسرے لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟
بہت مختلف ہے ہر لحاظ سے مختلف ہے۔
48 کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟
اپنے بیگ اور اس میں رکھے ہوئے میک اپ کے بغیر۔
49 تنہائی میں کس سے ہم کلام ہوتی ہیں؟
اللہ سے اور باقاعدہ باتیں کرتی ہوں۔
50 مذہب سے آپ کا لگاؤ؟
بہت زیادہ۔
51 اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکی ہیں۔
نہیں کرتی۔
52 سفر کے لیے بہترین سواری، رکشا، بس یا اپنی کار؟
ویسے تو اپنی کار..... لیکن تانگے میں سواری کا جو مزا ہے وہ کسی میں نہیں۔
53 کن چیزوں پر بہت خرچ کرتی ہیں؟
اپنے گھر کی چیزوں پر اپنے گھر والوں پر۔
54 کوئی ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟
بہت سے کردار ہیں ایک نہیں۔
55 اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟
دوسروں کی باتوں کو غور سے سنتی ہوں اور بری عادت یہ ہے کہ بہت زیادہ غصہ میں آجاتی ہوں۔
56 دھوکا اپنے دیتے ہیں یا پرائے؟
دونوں ہی دیتے ہیں۔
57 کس ملک کے لیے کہتی ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟
پیرس (فرانس) بہت پسند ہے۔ اس کے لیے کہوں گی۔

58 پاکستان میں کس چیز کی آزادی نہیں ہے؟
میرے خیال میں ہر چیز کی آزادی ہے۔
59 لائٹ چلی جانے پہ بے ساختہ جملہ؟
اللہ.....۔
60 لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟
تم بہت کیوٹ ہو۔
61 اگر آپ اس ملک کی صدر ہوتیں تو؟
غریب لوگوں کے لیے تعلیم کو فری کر دیتی۔
62 ٹی وی آن کرتے ہی پہلا چینل کون سا لگاتی ہیں؟
ہم ٹی وی۔
63 خدا کی حسین تخلیق؟
میں خود (قہقہہ)
64 دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تر و تازہ محسوس کرتی ہیں؟
ہر وقت دن کے ہر حصے میں۔
65 فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہیں؟
پانچ روپے۔
66 کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟
نہیں بار بار ہوتی ہے۔
67 غصہ کب اور کن باتوں پہ آتا ہے؟
جب کوئی زیادہ بول رہا ہو اور چپ ہونے کا نام ہی نہ لے رہا ہو۔
68 نصیحت جو بری لگتی ہے؟
نہیں..... نصیحت بری نہیں لگتی۔
69 شہرت کیسی لگ رہی ہے؟
بہت اچھی لگ رہی ہے۔ بہت مزا آرہا ہے۔
70 زندگی میں کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے؟
ابھی تک تو کوئی کمی نہیں ہے۔
71 زندگی کب بری لگتی ہے؟
خاص طور پر جب کسی سے لڑائی ہوتی ہے۔
72 اگر کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟
میں ایسے لڑکوں کو اگنور کرتی ہوں۔ کبھی کبھی ان کو مارنے کو بھی دل چاہتا ہے۔



73 بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے لڑکے یا لڑکیاں؟
کوئی بھی نہیں ہوتا۔ کسی پہ بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔
74 اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟
کچھ نہیں بلکہ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں۔
75 گھر آکر پہلی خواہش؟
کہ سو جاؤں اور کسی سے بات نہ کروں۔
76 موت سے ڈر لگتا ہے؟
ہاں..... بہت زیادہ۔
77 جھوٹ آسانی سے بول لیتی ہیں؟
نہیں میری آنکھیں چغلی کھانے لگتی ہیں کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں۔
78 سائنس کی بہترین ایجاد؟
موبائل فون۔
79 اگر موبائل فون ایجاد نہ ہوتا تو؟
تو کوئی بات نہیں۔ پہلے بھی تو لوگ رہتے ہی تھے اس کے بغیر۔
80 شوبز کی سب سے بڑی برائی؟
مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آئی۔
81 چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟
چھٹی کے دن میں گیارہ بجے تک سوتی ہوں اور پھر اٹھ کر فریش ہو کر اپنا اسکرپٹ پڑھتی ہوں۔
82 کون سا تہوار شوق سے مناتی ہیں؟
ہر تہوار۔
83 زندگی کب بدلی؟
جب آڈیشن دے کر آئی اور کامیابی کی خبر سب کو سنائی۔
84 اپنی شخصیت میں کیا چیز بہت پسند ہے؟
اپنی پوری شخصیت سے پیار ہے مجھے۔
85 پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہیں؟
آنکھیں۔
86 ٹریفک کب مسئلہ بنتا ہے؟
جب آپ کو کہیں جلدی پہنچنا ہو۔
87 ٹریفک جام ہو تو وقت کیسے گزارتی ہیں؟
بہت مشکل سے گزرتا۔ بس گانے لگا لیتی ہوں۔
88 اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟
ایپل کا لیپ ٹاپ خریدا ہے۔
89 بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتی ہیں؟
اپنے گلاسز، اپنا بیگ اور چھوٹی موٹی دوسری چیزیں۔
90 اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ۔
میرا تو سانس بند ہو جاتا ہے۔ آواز ہی نہیں نکلتی۔
91 بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں لیتی ہیں؟
نہیں فوراً" نیند نہیں آتی۔ آدھا پون گھنٹہ تو لگ ہی جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی ہوں۔
92 کھانے کے لیے پسندیدہ جگہ چٹائی یا ٹیبل؟
چٹائی۔
93 لڑکے کب برے لگتے ہیں؟
جب وہ پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں۔
94 کوئی انوکھی خواہش؟
دوسروں کے کام آؤں۔
95 اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟
ہائے اللہ..... ایسا کبھی نہ ہو۔



خبر یہ ہے

تبصرہ: نشاط

نیا موڑ مبارک

ان دنوں ڈراما سیریل "تنہائیاں" کا سیکوئیل مختلف چینلز سے نشر ہو رہا ہے۔ اس سیریل نے لوگوں کی توجہ آج بھی پہلے کی طرح کھینچ لی ہے۔ سیریل تنہائیاں کی قسطیں تو ابھی جاری ہیں۔ تاہم اس میں کام کرنے والے دو فنکاروں سائرہ یوسف اور شہروز سبزواری کی شادی کی قسطیں مکمل ہوگئی ہیں۔ جی ہاں! ان کے "نکاح" کی قسط کے بعد اب ان کی "رخصتی" کی قسط بھی خیر سے نشر ہوگئی ہے۔

سائرہ یوسف اور شہروز کی رخصتی کی تقریب دسمبر کے آخری ہفتے میں کراچی میں نہایت دھوم دھام سے منعقد ہوئی۔ گویا سال 2012ء جاتے جاتے انہیں ایک دوسرے کی سنگت دے گیا۔ تقریب میں فواد خان، ہمایوں سعید، نبیل، محمود اسلم، سلیم شیخ، شہزاد شیخ، جاوید شیخ، تجل علی اور میرا سمیت کئی فنکاروں نے شرکت کی۔ بہروز سبزواری اور علیشبا یوسف تو خیر میزبانوں میں سے تھے۔ تجل علی شوبز کی دنیا میں ابھی نووارد ہیں، لیکن وہ تقریب میں موجود دیگر تمام روشن ستاروں پر اس وقت چھا گئیں، جب رقص میں ان کا مقابلہ کوئی بھی فنکار نہ کرسکا۔ نوجوان فنکار شہزاد شیخ، دولہا کے والد بہروز سبزواری، یہاں تک کہ فلموں میں ایک عرصے سے رقص کرنے والے جاوید شیخ بھی میدان میں کودے، مگر تجل علی نے پالا مار ہی لیا۔ یوں وہ تقریب میں مرکزِ نگاہ بن گئیں۔ تاہم ان کا یہ سحر تھوڑی دیر ہی قائم رہا کہ تقریب کے اصل مرکزِ نگاہ تو دولہا دلہن ہی تھے۔ گلابی رنگ کے عروسی لباس میں سائرہ یوسف اور کریم رنگ کی شیروانی پہنے شہروز سبزواری لگ بھی بہت پیارے رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا گویا گڑیا گڈے کی شادی ہو رہی ہو۔ سائرہ یوسف اور شہروز سبزواری کو زندگی کے سفر کا یہ نیا موڑ مبارک ہو۔



ماہر

اداکارہ دیدار کا معروف حوالہ اداکاری کے علاوہ اداکارہ نرگس کی بہن ہونا بھی ہے۔ تاہم دیدار کے لیے محض اتنی شہرت کافی نہیں۔ اسی لیے تو بے چاری کو اتنی محنت کرنا پڑتی ہے۔ (جی ہاں! کبھی صائمہ چودھری سے لڑائی، کبھی کرکٹرز کے ساتھ دوستیاں، کبھی قیمتی تحائف کی وصولی تو کبھی کوئی اور کارنامہ۔ اف! بے چاری ایک دیدار کے ساتھ کتنے جھمیلے ہیں۔) اوپر سے لوگ انہیں سکون سے نہیں رہنے دیتے۔ دیدار اپنے والدین کے ساتھ حج کرنے گئیں تو پیچھے ادھر ان کی بہن نرگس نے ان کی شادی کا راز صحافیوں کے سامنے افشا کردیا۔ (لو بھلا! بندہ اپنے خون پر بھی بھروسا نہ کرے۔) دیدار واپس آئیں تو صحافیوں نے انہیں حج کے ساتھ شادی کی بھی مبارک باد دے ڈالی۔ دیدار نے حج کی مبارک باد تو قبول کرلی، تاہم شادی سے مکر گئیں۔ ابھی وہ شادی کی تردید کرہی رہی تھیں کہ اسی وقت ان کا موبائل بج اٹھا۔ دیدار نے فون کرنے والے کا نام دیکھا تو ان کے چہرے پر پھوٹتے ہوئے دھنک رنگ صحافیوں کو بہت کچھ سمجھا گئے۔ تب دیدار کو دال میں کچھ کالا ہونے کا اقرار کرنا ہی پڑا۔ اب آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ وہ موصوف بھی کالے ہیں۔ دیدار نے موقع پر موجود صحافیوں کو ان صاحب کی تصویر بھی دکھائی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ خاصے ہینڈسم ہیں۔ (بس تھوڑی نظر ہی کمزور ہوگی۔) دیدار نے بتایا کہ "میری شادی نہیں ہوئی۔ ابھی صرف لڑکا ہی پسند کیا ہے۔ ابھی میرے ہونے والے شوہر اپنے گھر والوں کو اس رشتے کے لیے راضی کررہے ہیں۔" (اوئے شاوا شے! ابھی رشتہ آیا نہیں اور ابھی سے ہونے والے شوہر۔)

دیدار کا کہنا ہے کہ لڑکے کا تعلق یورپ سے ہے۔ لہٰذا وہ شادی کرکے وہیں چلی جائیں گی۔ (چلو! یورپ والوں نے کوئی کام تو اچھا کیا) ایک سوال کے جواب میں دیدار نے کہا کہ وہ شادی پاکستان اور باہر، دونوں جگہ پر کریں گی۔ (ہائیں! تو دو شادیاں کریں گی کیا یا ایک ہی شادی کو "کاپی اینڈ پیسٹ" کریں گی؟) ان سب باتوں کے بعد دیدار کو خیال آیا کہ انہوں نے بھانڈا پھوڑنے والی بڑی بہن کو تو کچھ کہا ہی نہیں۔ یہ خیال آتے ہی انہوں نے کہا کہ وہ میری شہرت سے خائف ہیں۔ وہ پروپیگنڈوں کی ماہر ہیں اس لیے "شوشا" چھوڑ دیا۔ (چلیں! آپ نے ان کے کسی فن میں ماہر ہونے کا اعتراف تو کیا۔۔۔ اور آپ بھی کتنی ماہر ہیں، یہ تو سب کو نظر آہی رہا ہے۔)

چائنا برانڈ

یہ ابھی زیادہ پرانی بات نہیں ہوئی کہ معروف گلوکارہ پرنسز عینی "تو ہی ہے میرا پیار ماہیا" کہتی ہوئی نورید اعوان کے سنگ ایک حسین تعلق میں بندھی تھیں، مگر خدا جانے اس بندھن کی گرہ کمزور تھی یا کسی حاسد نظر نے اس پر "کھل جا سم سم" پڑھ کر پھونک دیا تھا کہ گرہ اتنی جلدی کھل گئی اور یہ رشتہ دوریوں کی کھائی میں جا گرا۔ یہ شادی محض دو، ڈھائی ماہ ہی قائم رہی۔ (چائنا برانڈ شادی تھی کیا؟) علیحدگی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے پرنسز عینی نے نورید اعوان پر الزام عائد کیا کہ وہ ان پر تشدد کرتے تھے۔ پرنسز عینی کے مطابق نورید اعوان کی تسلی محض مار پیٹ ہی سے نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ انہیں کان پکڑ کر مرغا بننے کی سزا بھی دیتے تھے۔ (چلو جی۔! اور بنائیں بالوں کو گھونسلے جیسا



..... اگلا تو پرندہ ہی سمجھے گانا..... بس موصوف یہ بھول گئے کہ مرغے عام طور پر پالتو ہوتے ہیں اور لوگ انہیں بڑے شوق سے ڈربوں میں رکھتے ہیں..... ان کا گھونسلوں سے کیا واسطہ..... ویسے کہیں عینی کی شکل نورید اعوان کی کسی خرانٹ ٹیچر سے تو نہیں ملتی، جنہوں نے انہیں بار بار کان پکڑ کر مرغا بننے کی سزا دی ہو۔ اب وہ عینی کو یہ سزا دے کر اپنے انتقامی جذبے کی تسکین کرتے ہوں۔ لیکن نورید صاحب! کوئی خاتون مرغا کیسے بن سکتی ہے، کیونکہ وہ تو مرغی ہوتی ہے ناں۔)

پرنسز عینی کا مزید کہنا ہے کہ "بات ہوتی سزاؤں تک تو سہہ لیتے ہم" لیکن جب نورید اعوان نے انہیں الٹا لٹکا کر جان سے مارنے کی کوشش کی تو وہ وہاں سے بچی جان بچا کر بھاگ آئیں۔ (ہائیں! الٹی لٹکی تھیں تو سر کے بل ہی بھاگ گئیں کیا؟)

نورید اعوان نے جب یہ سب سنا تو انہوں نے پرنسز عینی پر جوابی الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ ان کا کہنا ہے کہ عینی ان کے گھر سے سونے کے زیورات اور کروڑوں کی رقم لے اڑی ہیں۔ (الزامات در الزامات کا سلسلہ تو اب چل نکلا ہے۔ دیکھیے! اب بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ تاہم افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ ماضی میں اس طرح کی خبریں اور پھر الزامات کا سلسلہ صرف بالی وڈ کے فنکاروں کی طرف سے ہی دیکھنے میں آتا تھا۔ تاہم آج دنیا کے "عالمی گاؤں" بننے کے بعد سے مختلف تہذیبیں ایک دوسرے پر اپنے اثرات زیادہ تیزی سے مرتب کر رہی ہیں۔ ڈر ہے کہ تہذیبوں کا یہ ادغام کہیں ہماری تہذیب کی شناخت ہی نہ کھو دے۔)



یہ بیان کا لمانہ

○ اگر رینجرز کو کراچی میں فری ہینڈ نہیں مل رہا ہے تو یہ اپنی بدنامی کیوں کرا رہی ہے؟ اسے واپس چلے جانا چاہیے تاکہ یہ الزام نہ لگ سکے کہ یہ اپنی ڈیوٹی دینے اور کراچی میں امن وامان قائم رکھنے میں ناکام ہو گئی ہے۔

(رؤف کلاسرا..... رازو نیاز)

○ اس بات پر سب ہی احتجاج کرتے ہیں اور سو فیصد درست کرتے ہیں کہ بلوچستان میں ایجنسیوں کے ہاتھوں بلوچ نوجوان اغوا اور قتل ہو رہے ہیں، لیکن کوئی بھی یہ نہیں بتا رہا کہ جتنے نوجوان ایجنسیوں کے لوگ مبینہ طور پر اٹھاتے ہیں۔ اس سے زیادہ تعداد پنجابی آبادکاروں کی ہے۔

(عباس اطہر..... کنکریاں)

○ جامعہ حفصہ کی طالبات اور حکومت کے درمیان تنازعے کی اصل وجہ سو برس پرانی مسجد امیر حمزہ کی شہادت ہے، چوہدری شجاعت حسین مئی 2007ء میں لال مسجد تنازعہ طے کر چکے تھے، لیکن مشرف نہیں مانے، کیونکہ وہ لال مسجد تنازعے کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کر رہے تھے۔

(حامد میر..... قلم کمان)





آپ کا باورچی خانہ

شمیم افتخار سعید

1 سنا ہے شوہر کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے..... بس جی! جب سے یہ سنا' تب سے کھانا پکاتے ہوئے ہماری یہی دعا اور یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کو پسند آجائے اور وہ رغبت سے کھالیں۔ ساتھ ہی ہم صفائی کا خاص خیال رکھ کر کوکنگ کرتے ہیں' تاکہ پسند کے ساتھ ہی غذائیت اور صحت سب ہی کچھ حاصل ہوں۔

2 ویسے تو اکثر ہی مہمان بغیر اطلاع کے آجاتے ہیں اور زیادہ تر ہماری یہی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں کھانے پر روک کر ہم بھی کچھ ثواب گھر بیٹھے کمالیں۔ اگر ایسی ایمرجنسی ہو جائے تو جی اس کا حل ہماری بائیں چٹکی میں ہے۔ سب سے پہلے فٹافٹ فریزر سے چکن نکال کے پانی میں رکھ دیں تاکہ وہ جلد از جلد نارمل حالت میں آجائے۔ پھر جلدی سے سوئٹ ڈش تیار کر کے فریج میں رکھ دیں۔

چکن مسالا

اجزا :

چکن	ایک کلو
ادرک	ایک چمچ
لہسن	ایک چمچ
ہری مرچ کا پیسٹ	ایک چمچ
نمک' ہلدی' لال مرچ پاؤڈر	(حسب ضرورت)
دھنیا' زیرہ پاؤڈر	ایک چمچ
ٹماٹو پیوری	دو بڑے چمچے
بھنا اور پسا' سوکھا کھوپرا	ایک چمچ

ترکیب :

یہ ساری چیزیں چکن پہ مل دیں اور سائیڈ میں رکھیں۔ کڑھائی میں دو بڑی پیاز گولڈن براؤن کریں۔ ساتھ ہی ثابت گرم مسالا ڈالیں۔ پھر چکن ڈال کر خوب بھونیں پھر تھوڑی دیر ڈھک کر پکائیں۔ پک جانے پر ہرے دھنیا سے گارنش کریں۔ روٹی یا نان سے سرو کریں۔

(3) روز ہی کھانے کے برتن دھلتے ہی' گیس اسٹوو اور کوکنگ رینج کی صفائی ہوتی ہے۔ پھر کچن کی زمین کو بھی صاف کرتی ہوں۔ تفصیلی صفائی کا موقع بڑی مشکل سے بچے کے سونے پر اپنی نیند قربان کر کے حاصل ہوتا ہے۔

(4) ناشتے کے وقت میں تنہا ہوتی ہوں۔ ویسے تو ماشاء اللہ دو بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں۔ مگر ابھی وہ فرمائش کرنے کے دور سے تھوڑے دور ہیں۔ اسی لیے میں انہیں زبردستی کچھ کھلا کر خود بھی کچھ بھی ہلکا لے لیتی ہوں۔ ویسے جمعہ کو چھٹی ہوتی ہے اور افتخار کے ساتھ ہی ہمارے ڈیزرٹ بھائی صاحب کی بھی موجودگی ہوتی ہے۔ تب ہم خصوصی اہتمام کرتے ہیں۔ ویسے تو بہت سی چیزیں ہیں۔ مگر ایک خاص ترکیب جو آپ سب یقیناً" نہیں جانتی ہوں گی۔ کیونکہ یہ ہمارے گاؤں کی ڈش ہے۔ جو میں نے بھی ممی سے ابھی ابھی سیکھی ہے۔

سوئٹ رول

ترکیب :

ایک پیالی چاول کے آٹے میں اتنا پانی ڈالیں کہ نہ زیادہ گاڑھا نہ زیادہ پتلا آمیزہ بن جائے۔ اس میں ایک انڈا خوب پھینٹ کر مکس کریں اور علیحدہ رکھ دیں ایک پین میں ایک چمچہ گھی ڈال کر دو پیالی فریش ناریل کدوکش کیا ہوا ڈالیں۔ شکر' سرخ رنگ' ونیلا ایسنس شامل کریں اور ہلکا گولڈن ہونے تک بھون کر سائیڈ میں رکھ دیں۔

اب دوسرے پین میں چاول والا آمیزہ تھوڑا آئل ڈالنے کے بعد پھیلائیں۔ اس روٹی میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوں گے۔ اسے پلٹیے گا مت۔ بلکہ تیار ہونے پر تہہ کر کے پلیٹ میں نکالیں۔ ہلکا ٹھنڈا ہونے پر تہہ کھولیں۔ کھوپرے کا مکسچر ایک لائن بنا کر ڈالیں۔ پھر روٹی رول کر کے ٹکڑے کاٹ لیں۔

(5) کھانے کا فیشن تو پتا نہیں' مگر جب کوئی ایمرجنسی کام نکل آئے۔ بچوں کو ڈاکٹر کے ہاں لے جانا ہو یا اسکول میں فنکشن ہوں۔ اس کے علاوہ کسی بہت زیادہ خوشی کے موقع پر باہر کھالیتے ہیں۔

(6) ہاں! اکثر ایسا ہوتا ہے۔ گرمیوں میں کڑھی اور دال چاول جیسے ہلکے کھانے اور خاص طور پر کھیرے کی موجودگی ٹیبل پر ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح سردیوں میں گرم تاثیر والے کھانے پر زور ہوتا ہے۔ بارش میں جو کہ یہاں کبھی کبھار ہی ہوتی ہے' ہم بھی پکوڑوں کے مزے لوٹتے ہیں۔

(7) میری سسرال والوں کا کہنا ہے کہ دالوں' مسالوں' حتیٰ کہ قیمے وغیرہ کو بھی سل پر پیسنے سے جو لذت' ذائقہ کھانے میں آموجود ہوتا ہے' وہ مشینوں سے حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن میں اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتی آپ میں اگر شوق ہے۔ آپ لگن سے' محبت سے پکا رہی ہیں تو جدید مشینوں کی مدد سے بھی آپ ذائقہ دار پکا سکتی ہیں۔ محنت ضروری ہے۔ مگر اتنی نہیں کہ پکانے کے بعد آپ خود کھانے سے محروم رہ جائیں۔ ویسے کچھ ہاتھوں میں خدا داد صلاحیت ہوتی ہے۔ پریکٹس مزید نکھار پیدا کرتی ہے۔

(8) ٹپس تو بہت سی ہیں۔ مثلاً" چاول بوائل کرتے وقت ایک چھوٹا چمچہ آئل ڈال دیں تو چاول کھلے کھلے پکتے ہیں۔ فریش ناریل کدوکش کیا ہوا اور لیمن جوس فریزر میں مہینے تک تازہ رہتے ہیں۔



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کشمیری چائے

اجزا:

سبز پتی	دو چائے کے چمچے
خشک دودھ	چار چائے کے چمچے
پانی	چار کپ
چینی	حسب پسند
الائچی پاؤڈر	ایک چٹکی
میٹھا سوڈا	ایک چٹکی
پسے بادام	دو چائے کے چمچے
جائفل جاوتری	ایک چٹکی
لونگ	دو عدد

ترکیب:

دو کپ پانی میں دو تین ابال آنے کے بعد سبز پتی ڈال کر دس منٹ تک پکائیں، پھر میٹھا سوڈا ڈال کر مزید پانچ منٹ تک درمیانی آنچ پر پکائیں۔ اب چولہا بند کر کے دو کپ ٹھنڈا پانی ملائیں اور خوب پھینٹیں۔ جتنا پھینٹیں گی، اتنا ہی ذائقہ آئے گا۔ پھر چھان کر دوبارہ چولہے پر چڑھا دیں۔ ایک آدھ جوش کے بعد بقیہ تمام اجزا ڈال کر ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

مزے دار کشمیری چائے تیار ہے۔ مزید ذائقے کے لیے دو چمچے فریش کریم بھی ملا سکتی ہیں۔

کھٹے گوشت کا پلاؤ

اجزا:

چاول	تین پاؤ
املی	آدھا پاؤ
گوشت	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	چار کھانے کے چمچے
ثابت گرم مسالا مکمل	دو چائے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:

تیل گرم کر کے پیاز سنہری کریں۔ لہسن ادرک پیسٹ، ہلدی، مرچ اور نمک ڈال کر بھونیں۔ مسالا تیل چھوڑ دے تو ثابت گرم مسالا ڈال دیں پھر گوشت اور دو گلاس پانی ڈال کر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ چاول ابال لیں۔ املی بھی پانی میں ڈال کر رکھ دیں۔ گوشت گل جائے تو املی کو مسل کر گاڑھا سا پیسٹ بنا کر گوشت میں ڈال کر بھونیں اور آنچ دھیمی کر دیں۔ ایک پتیلی میں چاول اور گوشت کی تہہ لگائیں اور پندرہ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

فرنچ ٹوسٹ

اجزا:

ڈبل روٹی	چار سلائس
انڈا	ایک عدد
دودھ	آدھا کپ
مکھن	ایک چائے کا چمچہ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
دار چینی پاؤڈر	ایک چٹکی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

سلائس کو تکون کاٹ کر اس پر مکھن لگائیں۔ دودھ میں دار چینی پاؤڈر اور انڈے پھینٹ کر ڈال دیں۔ مکھن لگے سلائس کو دودھ میں ڈبو کر تیل میں ڈالیں۔ سنہری ہو جائیں تو اتار لیں۔ فرنچ ٹوسٹ میٹھے بنانا چاہیں تو دودھ میں چینی گھول لیں یا تیار ہونے کے بعد پسی ہوئی چینی چھڑک دیں۔

عدنان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

احساس برتری دراصل احساس کمتری کی دوسری شکل ہے اور پہلی کے مقابلے میں زیادہ بُری اور خوفناک ہے کیونکہ ہر انسان کسی نہ کسی انسان سے برتر بھی ہے اور کم تر بھی۔ لیکن وہ شخص جو احساس کمتری کو احساس برتری کے پردوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔

احساس برتری کا شکار جھوٹ' غلط بیانی اور ظاہری نمائش سے دوسروں کو مرعوب کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن اس کی باتوں میں معقولیت کم اور غلط بیانی زیادہ ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں اپنے احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر رہن سہن' دکھاوا' ظاہرداری اور لباس میں حد درجے بناوٹ دکھاتا ہے۔ تاکہ دیکھنے والے اس کی آن بان سے خوب متاثر ہوں بلکہ اکثر اوقات دعوتیں اس انداز سے کرتا ہے کہ جس کا مقصد دعوت کم اور گھر بار کی نمائش زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ احساس کمتری کو چھپانے کی خاطر سخاوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ دکھاوے کی خاطر تحائف دیتا ہے تاکہ سامنے والے پر اپنی بڑائی ثابت کر سکے۔ ان تمام چیزوں کے پیچھے خلوص نہیں' ریاکاری ہوتی ہے۔ ظاہرداری اور دکھاوا۔ سامنے والے کو اپنی امارت کا احساس دلانا ہوتا ہے۔

احساس برتری کے شکار لوگوں میں ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ وہ بے حد حاسد اور ابن الوقت ہوتے ہیں۔ نقالی ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ کسی کو کھاتا پیتا' خوش و خرم نہیں دیکھ پاتے۔ اسی وجہ سے ہر وقت الجھے ہوئے اور پریشان رہتے ہیں۔ حالانکہ وہ دوسروں پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بہت خوش حال زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی کمزوریوں اور برائیوں کی پردہ پوشی کی خاطر دوسروں پر الزام رکھ دیتے ہیں۔ دوسروں پر نکتہ چینی کرکے انہیں تسکین ملتی ہے۔ دوسروں کی تعریفیں سن کر اور خوش حالی دیکھ کر زود رنج ہو جاتے ہیں۔ حقیقت کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ دوسروں کو پریشان دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ دوسروں کے بارے میں باتیں کرکے' ان پر جھوٹے الزامات دھر کر اپنی بڑائی ثابت کرنے کی سعی رائیگاں کرتے ہیں ایسے لوگ لاشعوری طور پر اپنی کمی کی تلافی چاہتے ہیں یا اپنی کمزوری پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ تاکہ ایک تو ان کا بھرم قائم رہے دوسرا لوگ ان کے تصنع کو جان کر ان کی برائیاں نہ دیکھ لیں۔ حالانکہ ہوتا اس کے برعکس ہے۔ لوگ ایسے لوگوں کے منہ پر مروتاً" خاموش رہتے ہیں۔ ان کی ہاں میں ہاں بھی ملاتے ہیں لیکن دل ہی دل میں حقیقت کو سمجھتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

ثابت

میرے ذہن پر سوچوں کی یلغار رہتی ہے۔ رات کو خوابوں میں الٹی سیدھی جگہیں' مکان' رستہ' کھنڈر' چھت' اجنبی راہیں دکھائی دیتی ہیں ڈاکٹر نے ٹینشن اور نیند کی گولیاں دی ہیں' نیند کا نہ آنا' بے خوابی اور سوتے ہوئے بے آرامی' بے قراری' دماغ پہ بوجھ' مشتعل منفی باتیں جان کھپاتی ہیں۔ سسرال والوں کے ظالمانہ' بے حس احساسات نہیں بھولتے۔ زندگی سے گلہ نہیں' مگر ظالم کو ظلم نہ ماننا جیسے عمل والے لوگ زندگی کو بڑی گہری ضربیں لگا چکے ہیں۔ کسی پر اعتماد نہیں رہا ہر کوئی برا ہی دکھائی دیتا ہے۔

لوگوں کی ناپسندیدہ باتوں پر دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ موسم بھی بھلے نہیں لگتے۔ فراغت کاٹتی ہے۔ تنہائی

ڈراتی اور رُلاتی ہے' اپنائیت اجنبی سی ہو چکی ہے دماغ ہر وقت سوچ سوچ کر تھک جاتا ہے' بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے' سر کے بال ختم ہو کر ایک دمدار ستارے کی طرح چٹیا باقی ہے' سر پہ خارش کر کر کے زخم بن گئے ہیں رات آ جائے تو یہ فکر کہ کیسے گزرے گی۔ دن چڑھے تو یہ کہ کیسے بیتے گا وقت کیسے گزرے گا (جو کہ گزر رہا ہے) بیمار ہو گئی تو کون سنبھالے گا۔

ج: اچھی بہن! نیند نہ آنا' پریشان کن سوچیں' مستقبل کے خدشات نہ صرف ذہن کو متاثر کرتے ہیں بلکہ جسمانی بیماری کا سبب بھی بنتے ہیں۔ ڈاکٹر عام طور پر نیند کی گولیاں اور ڈپریشن کی دوائیں تجویز کرتے ہیں۔ لیکن ایک بہت اہم بات جو ڈاکٹر نظرانداز کر دیتے ہیں۔ وہ ان دواؤں کے مضر اثرات ہیں ان ہی مضر اثرات یا سائیڈ ایفیکٹ کی وجہ سے ان دواؤں سے فائدہ ہونے کے بجائے دوسرے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان مضر اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ایسی غذائیں استعمال کی جائیں جو ان کے مضر اثرات کو کم کر سکیں۔

سب سے اہم اور ضروری یہ ہے کہ آپ اپنی غذا میں پھل اور سبزیوں کی مقدار بڑھا دیں۔ آج کل گاجر اور کینو کا موسم ہے۔ روزانہ کچی گاجریں اور کینو کھائیں۔ ممکن ہو تو گاجر کا جوس بھی پییں۔ ایک ہفتہ میں آپ نمایاں بہتری محسوس کریں گی۔

رات کو کھانے میں ہلکی پھلکی غذا لیں' سونے سے پہلے آپ اپنے جسم پر سرسوں کے تیل کی مالش کریں پھر نیم گرم پانی سے غسل کریں۔ اس کے بعد ایک گلاس تیز گرم دودھ پییں۔ پھر سونے کے لیے بستر پر جائیں اور یاحی یا قیوم کا ورد کریں۔ چند منٹ بعد ہی آپ کو پرسکون نیند آ جائے گی۔

پرسکون نیند ہو گی تو خواب بھی خوشگوار ہوں گے۔

ان دواؤں کے اثر سے عموماً" قبض کی شکایت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کو یہ شکایت ہے تو پانچ دانے منقیٰ کو گرم دودھ میں ایک جوش دے کر کھا لیں۔

سسرال والوں کے غلط رویوں کو یاد کرکے آپ خود پر ہی ظلم کر رہی ہیں۔ آپ کے مطمئن رہنے کے لیے یہ بات کافی ہونا چاہیے کہ آپ مظلوم ہیں' ظالم نہیں۔ جو کسی کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ وہ اس دنیا میں اگر بچ بھی گیا تو آخرت تو ہے جہاں اسے ایک ایک ظلم کا حساب دینا ہو گا۔ خوش بخت ہیں وہ لوگ جو کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتے۔

وہ لوگ جو ظالموں کے شریک کار ہیں۔ ان کا انجام بھی ظالموں کے ساتھ ہو گا۔ آپ ان کے متعلق سوچ سوچ کر اپنی صحت کیوں برباد کر رہی ہیں۔

زندگی میں سب سے بہتر بات یہ ہے کہ انسان درگزر کرے اور ان تمام لوگوں کو معاف کر دے جنہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے اگر دل میں اتنی کشادگی نہ ہو تو پھر اپنے معاملات اللہ کے سپرد کر دے۔ وہ بہتر انصاف کرنے والا ہے۔ لیکن ان زیادتیوں کو یاد کرنا اور سوچ سوچ کر کڑھنا اپنے ساتھ ظلم کرنا ہے۔

خط سے اندازہ ہوتا ہے آپ ذہین لڑکی ہیں۔ اپنی صلاحیتوں کو فضول سوچوں میں ضائع نہ کریں۔

ثوبیہ

اچھی بہن' اچھے کپڑے' زیورات اور دولت کی افراط الگ چیزیں ہیں اور زندگی کا سکون علیحدہ چیز ہے۔

انسان کو یہ تمام چیزیں بہت آسانی سے دستیاب ہوں اور خواہشیں اس انداز میں پوری ہوں کہ ادھر منہ سے بات نکلی' ادھر پوری ہو گئی تو زندگی سے سکون غارت ہو جاتا ہے۔ جدوجہد' محنت کا نام ہی زندگی ہے۔ آپ صبر و قناعت سے کام لیں گی تو خوش رہیں گی۔

☼

ہاتھ اچھی طرح دھولیں۔ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو منہ کے اندر ڈالیں اور بائیں گال کو باہر کی طرف دبائیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ کے انگوٹھے کو منہ میں ڈال کر دائیں گال کو دبائیں۔

یہ عمل دو منٹ صبح، دو منٹ شام کریں۔ دائیں ہاتھ کو چہرے پر اس طرح رکھیں کہ ہتھیلی تھوڑی کے نیچے ہو، اب ہتھیلی کو آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کنپٹی تک لے جائیں۔ اسی طرح بائیں ہاتھ کی ہتھیلی تھوڑی کے نیچے رکھیں اور بائیں کنپٹی تک آہستہ آہستہ لے جائیں۔

یہ عمل تیس مرتبہ کریں۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

ثمینہ کریم..... بہاولپور

س : میری عمر صرف چالیس سال ہے، لیکن چہرے سے میں پچاس سے زیادہ کی نظر آتی ہوں۔ گال پچک گئے ہیں اور جلد پر بھی عمر کے اثرات نمایاں ہیں۔

ج : بہن عطیہ بانو ہماری بہت اچھی مصنفہ تھیں۔ انہوں نے ایک بار پچکے گالوں کے لیے ہمیں یہ نسخہ بتایا تھا۔

پچاس سال کے بعد جب چہرے پر عمر کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں تو سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ گال پچک جاتے ہیں۔ اگر گال پچکے ہوئے نہ ہوں تو آپ اپنی اصل عمر سے بہت کم نظر آسکتی ہیں۔ اس مسئلے کے لیے اس نسخہ پر عمل کریں۔

لبنیٰ..... لاہور

س : میرے چہرے پر بے شمار چھوٹے چھوٹے تل ہیں۔ چہرے کے مسام بھی کھلے ہوئے ہیں اور پسینہ بھی بہت آتا ہے۔ کوئی ایسا گھریلو نسخہ بتائیں جو میں آسانی سے کر سکوں۔

ج : آپ کو چاہیے کہ آپ کافی مقدار میں سادہ پانی اور پھلوں کا رس پئیں تاکہ آپ کے جسم میں نمی کی جو کمی واقعی ہوئی ہو، اس کو اس طرح پورا کر لیا جائے۔ کھلے مسام کے لیے آپ ایسا کریں کہ دن میں کم از کم تین بار صابن سے منہ دھوئیں۔ چہرہ خشک کرنے کے بعد اسٹرنجنٹ لوشن (جلد کو سکیڑنے والا لوشن) استعمال کریں۔ دھوپ میں باہر نہ نکلیں اور اگر نکلنا ہی پڑے تو چہرے کو دھوپ سے بچائیں۔ رات کو سوتے ہوئے دلیہ اور دودھ کا ماسک بنالیں اور اس کو چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ کے بعد اسے صاف اور ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔

